راشٹرپتی بھون میں کتاب "انجمن" کی رسم اجرا

جناب حسن الدین احمد، اپنی کتاب "انجمن"، فضیلت مآب جناب فخرالدین علی احمد صدر جمہوریہ ہند کو پیش کر رہے ہیں، تصویر میں عالیجناب جنرل شاہنواز خاں منسٹر آف اسٹیٹ ایگریکلچر بھی دکھائی دے رہے ہیں

آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے دسویں سالانہ اجلاس منعقدہ مدراس (مورخہ ۳۱ر دسمبر ۷۴ء تا ۲ر جنوری ۷۵ء) کے موقع کی ایک یادگار تصویر۔ سامنے کھڑے ہوئے دائیں طرف سے: جسٹس بشیر احمد سعید صاحب۔ عالی جناب حکیم عبدالحمید صاحب صدر آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس، آنریبل اے۔ کے۔ ایم۔ اسحٰق صاحب مرکزی نائب وزیر صحت۔ آنریبل مسٹر ایم۔ کرونا ندھی وزیر اعلیٰ تامل ناڈ۔ آنریبل مسٹر کے۔ انبازھاگن وزیر صحت تامل ناڈ اور مسٹر عبدالصمد [illegible]

بیرکانہ مطبوعہ مجلہ پنجاب وقف بورڈ

اوقاف

سہ ماہی

مجلسِ ادارت

مدیر

حکیم اجمل خاں

اشتراکات

سالانہ ــــــــــ ۱۲ روپے ــــ شمارہ ــــــــــ ۳ روپے

سکریٹری پنجاب وقف بورڈ (میگزین) ۵ سٹرا پیل مارگ انبالہ کینٹ

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر حکیم اجمل خاں نے پنجاب وقف بورڈ کی جانب سے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی سے چھپوا کر ۵ سردار پٹیل مارگ انبالہ کینٹ سے شائع کیا۔

امام المسلمین جلالۃ الملک کی جدائی

امام المسلمین جلالۃ الملک المعظم شاہ فیصل بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی اچانک جدائی ایک ایسا دردناک سانحہ ہے ۔ جسے ملّتِ اسلامیہ فراموش
ں کر پائے گی ۔

جلالۃ الملک کی شہادت کی غمناک اطلاع جیسے ہی ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعہ دنیا میں پھیلی ۔ عالم اسلام اور ملّتِ اسلامیہ پر غم
بادل چھا گئے ۔ ملّت کے پروانے شہادت کی غیر متوقع اور افسوس ناک خبر سُن کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے ۔ اور جب مسلمانوں نے شاہ فیصلؒ کے
ری الفاظ قاتل کے بارے میں سُنے ۔

اس پر رحم کرنا ، میرے دل میں اس کے لئے کوئی نفرت نہیں ہے میری
حکومت تمہارے ہاتھ میں ایک امانت ہے ۔ آپس میں منافقت سے بچو ۔ اتحاد
قائم رکھو میں محسوس کر رہا ہوں کہ اب زندہ نہ رہ سکوں گا ۔

ام مسلمانوں کو محسوس ہوا ۔ کہ جیسے وہ خلافتِ راشدہ کے مبارک اسلامی دور سے گذر رہے ہیں ۔ دورِ حاضر کے اس عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنی موت
ــ ت بھی اسلام کی عظمت کو قائم رکھا ۔ اور دنیا پر یہ واضح کر دیا ۔ کہ مسلمان کی زندگی اور موت صرف خدا اور اس کے دین کے لیے ہیں ۔

وہ مسلمان تو بہت ہی خوش قسمت ہیں ۔ جو جلالۃ الملک کی تجہیز و تکفین میں پہونچے اور جو نہ پہونچ سکے ۔ انھوں نے نماز جنازہ غائبانہ ادا کی ۔
عزیتی اجلاس کیئے خراجِ عقیدت پیش کیا ۔ یا وہ حکومتیں جنھوں نے اس عظیم سربراہ مملکت اسلامیہ کی تعزیت میں اپنے جھنڈوں کو سرنگوں کیا ۔ اور
ئی کئی دنوں تک سرکاری طور پر سوگ منایا وہ بھی خوش قسمت ہیں ۔

شاہ فیصل مرحوم بلا شبہ موجودہ عالم اسلام کی سب سے بڑی سیاسی اسلامی شخصیت تھے ۔ مرحوم نے گذشتہ چند سالوں میں اپنے تدبر ، تدین ،
ست اور آہنی عزم کی بدولت اپنی شخصیت کا لوہا منوایا ۔ اور عرب دنیا کو ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ۔ جہاں ہر انسان عرب دنیا کا محتاج نظر آتا ہے ۔
ایک عرصے سے یورپ کی یہ پالیسی تھی ۔ کہ وہ عربوں کو ہر چیز کا محتاج بنائے رکھیں ۔ تہذیبی ، سماجی ، و ذہنی طور پر اپنی یوروپین تہذیب کا دل دادہ

محتویات

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر حکیم اجمل خاں نے پنجاب وقف بورڈ کی جانب سے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی سے چھپوا کر دفتر سردار پٹیل مارگ انبالہ کینٹ سے شائع کیا۔

امام المسلمین جلالۃ الملک کی جدائی

امام المسلمین جلالۃ الملک المعظم شاہ فیصل بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی اچانک جدائی ایک ایسا دردناک سانحہ ہے۔ جسے ملتِ اسلامیہ نہیں کرپائے گی۔

جلالۃ الملک کی شہادت کی غمناک اطلاع جیسے ہی ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعہ دنیا میں پھیلی۔ عالم اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے بادل چھا گئے۔ ملت کے پروانے شہادت کی غیر متوقع اور افسوس ناک خبر سُن کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اور جب مسلمانوں نے شاہ فیصل یہ آخری الفاظ قاتل کے بارے میں سُنے۔

اس پر رحم کرنا، میرے دل میں اس کے لئے کوئی نفرت نہیں ہے میری
حکومت تمہارے ہاتھ میں ایک امانت ہے۔ آپسی منافست سے بچو۔ اتحاد
قائم رکھو میں محسوس کر رہا ہوں کہ اب زندہ نہ رہ سکوں گا۔

تو سوگوار مسلمانوں کو محسوس ہوا۔ کہ جیسے وہ خلافتِ راشدہ کے مبارک اسلامی دور سے گذر رہے ہیں۔ دورِ حاضر کے اس عمر بن عبدالعزیز نے اپنے وقت بھی اسلام کی عظمت کو قائم رکھا۔ اور دنیا پر یہ واضح کر دیا۔ کہ مسلمان کی زندگی اور موت صرف خدا اور اس کے دین کے لئے ہیں۔

وہ مسلمان تو بہت ہی خوش قسمت ہیں۔ جو جلالۃ الملک کی تجہیز و تکفین میں پہونچے اور جو نہ پہونچ سکے۔ انھوں نے نمازِ جنازہ غائبانہ اور تعزیتی اجلاس کئے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ یا وہ حکومتیں جنھوں نے اس عظیم سربراہ مملکت اسلامیہ کی تعزیت میں اپنے جھنڈوں کو سرنگوں کر کئی کئی دنوں تک سرکاری طور پر سوگ منایا وہ بھی خوش قسمت ہیں۔

شاہ فیصل مرحوم بلاشبہ موجودہ عالم اسلام کی سب سے بڑی سیاسی اسلامی شخصیت تھے۔ مرحوم نے گذشتہ چند سالوں میں اپنے تدبر فراست اور آہنی عزم کی بدولت اپنی شخصیت کا لوہا منوایا۔ اور عرب دنیا کو ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا۔ جہاں ہر انسان عرب دنیا کا محتاج نظر آ ایک عرصے سے یورپ کی یہ پالیسی تھی۔ کہ وہ عربوں کو ہر چیز کا محتاج بنائے رکھیں۔ تہذیبی، سماجی، وذہنی طور پر اپنی یورپین تہذیب

بنادیں۔ اور معاشی طور پر ان کے تیل کی دولت کو لوٹتے رہیں۔ اور اعلیٰ معاشی مفادات کا استحصال کرتے رہیں۔ امیر فیصل کے سیاسی تدبر، جرات، عزم نے ان کے ناپاک عزائم اور معاشی لوٹ کھسوٹ کی پالیسی کو ننگا کر دیا۔ اور عربوں کو ایک باوقار سیاسی پالیسی سے ہم کنار کیا۔

اہل یورپ نے دنیائے عرب کے عین وسط میں اسرائیل کو جنم دیا۔ جس کا مقصد عربوں کو اسرائیل کے ذریعہ ہمیشہ پریشان رکھنا ہے یعنی عرب اسرائیل کے چکر میں پھنس کر سیاسی و معاشی طور پر ہمارے محتاج رہیں۔ اور اس کی سب سے بڑی دولت تیل پر قابض رہیں۔ فیصل مرحوم نے اپنے مالی بحران پر قابو پایا۔ انھوں نے تیل کی دولت سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اسے قومیانے کا منصوبہ بنایا۔ تیل کی قیمتوں کا ایک معیار مقرر کیا۔ پھر اس کی آمدنی سے کروڑوں اربوں ڈالر عوامی فلاح و بہبود کے کاموں پر خرچ کئے۔ کارخانوں اور ہسپتالوں کا جال بچھایا۔ ملک کی فوج کو منظم کیا۔ عرب اسرائیل جنگ کے نقصانات کا ازالہ کرنے کے لئے امدادیں دیں۔ فلسطین کے لاوارث مسلمان مہاجرین کی مدد کی۔ تمام مسلم ممالک میں اتحاد کی کوشش کی۔ خاص طور پر عرب اتحاد میں کامیابی حاصل کی۔ اور اس مقصد کے لئے بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔

فیصل مرحوم کا دل مسلمان تھا۔ آن کے اسلامی ضمیر نے وقت آنے پر ایک لمحہ کے لئے بھی یورپ کی غلامی کو برداشت نہیں کیا۔ انھوں نے دنیا کی سب سے بڑی طاقت امریکہ کی ناپاک سازش اور مجرمانہ دھمکیوں کو چیلنج کیا۔ اور اعلان کیا کہ امریکہ کو دئے جانے والے تیل میں کٹوتی بدستور قائم رہے گی۔ تاوقتیکہ وہ اپنی عرب دشمن پالیسیوں پر نظر ثانی نہ کرے۔ یہی وجہ تھی کہ امریکی رسالہ ٹائمز نے انھیں ۱۹۷۴ء کی سب سے بڑی شخصیت قرار دیا۔ اور امریکی وزیر خارجہ ڈاکٹر کیسنجر نے ان کی سیاست فہمی اور بالغ نظری کو خراج تحسین ادا کیا۔

مرحوم شاہ بیت المقدس کی آزادی کے لئے بے حد کوشاں تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک بار اپنی زبردست خواہش کا اظہار فرمایا۔

"میری سب سے بڑی خواہش ہے۔ کہ میں مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کروں"

انھوں نے حرم پاک اور مسجد نبوی کی توسیع کے لئے خطیر رقم خرچ کی۔ اور حجاج کرام کی دیکھ بھال اور آسانی کے لئے سینکڑوں آسائشیں مہیا کیں۔ انتظامات کو بہتر بنایا۔ ملک میں صرف قرآن و سنت کے مطابق نظام حکومت چلایا جس پر ان کے والد بزرگوار قائم رہے۔

جلالۃ الملک مرحوم کی فراست ایمانی متقاضی ہوئی کہ

"دین خالص کو دنیا میں پھیلایا جائے"

آپ نے شیخ الاسلام امام محمد بن عبدالوہابؒ کے مسلک کو اپناتے ہوئے مدینہ یونیورسٹی قائم کی۔ جہاں دنیائے اسلام کے امیر و غریب مسلمان طلباء قرآن و حدیث و دینی تعلیم کے حصول کے لئے داخل کئے جاتے ہیں اور انھیں معقول وظائف دے کر تعلیم دی جاتی ہے۔

بعض ممالک میں جہاں تبلیغ و اشاعت دین کے کام کے لئے ضروری سمجھا۔ شاہی خرچ پر اعلیٰ تنخواہیں دے کر مبلغین و مدرسین کا تقرر کیا۔ بہت سے مدارس اسلامیہ میں اساتذہ مہیا کئے۔

رابطہ عالم اسلامی کے کام کو منظم کیا۔ اس کو توسیع دی۔ دنیا بھر کے مسلم علماء کو اس میں نمائندگی دی اعلیٰ اسلامی جماعتوں کے عہدیداران کو نامزد کیا۔ ان کو مختلف اسلامی اجتماعات کے لئے بھاری مصارف پر مدعو کیا۔

آپ نے اسلامی سکرٹریٹ کے قیام کی ضرورت محسوس کی۔ جدہ میں اسلامی سکرٹریٹ قائم کیا، اور اس کے مقاصد متعین کیے۔ ایک بین الاقوامی اسلامی بینک کا قیام بھی آپ کے زیر غور تھا۔

شاہ فیصل مرحوم آج اس دنیا میں موجود نہیں ہیں مگر اُن کے کارنامے، ان کی نیک خواہشات ضرور ہیں۔ کیا دنیا کے ۷۵ کروڑ مسلمان ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے "مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرنے کا عہد" پھر سے تازہ کریں گے۔ تاکہ مرحوم کو حقیقی خراج عقیدت پیش کیا جا سکے۔ ہماری دعا ہے۔ کہ خدائے تعالیٰ جل جلالہ مرحوم کو غریق رحمت کرے، اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور ان کے جانشین کو اسلام کے صحیح راستوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین !!!

فیصل

دل من بے راز دان جسم و جان است
نہ پنداری اجل بر من گران است
چہ غم گر یک جہان گم شد ز چشم
ہنوز اندر ضمیرم صد جہان است

وہ قافلہ کی متاعِ ═══ اِن بہا فیصل

سعودی عرب کے وقت کے مطابق دو بج کر تیرہ منٹ پر ہندوستانی وقت کے مطابق چار بج کر ۴۳ منٹ) جیسے ہی تمام پروگرام روک کر ریاض ریڈیو کے اناؤنسر نے بھرائی ہوئی آواز میں یہ اعلان کیا وہ شاہ فیصل ابن عبدالعزیز اپنے بھتیجے شہزادہ فیصل ابن مساعد ابن عبدالعزیز کے ہاتھوں گولیاں لگنے کے بعد اسپتال میں انتقال فرما گئے ہیں " تو پوری دنیا پر سکتہ سا چھا گیا۔ کچھ دیر تک لوگوں کو یقین نہیں آیا کہ یہ خبر سچ ہے۔ دنیا بھر میں سیاستدانوں کے لئے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ جس فرد واحد کے اشاروں پر پوری دنیا ناچ رہی تھی۔ وہ اچانک اس طرح سے ان کے درمیان سے اٹھ جائے گا لیکن آخرکار لوگوں کو اس خبر کی سچائی پر یقین کرنا ہی پڑا۔ پھر تو ایسا لگا کہ جیسے پوری دنیا میں زبردست زلزلہ آگیا ہو۔ اس زبردست زلزلے کا اثر ٹوکیو سے لے کر نیویارک تک اور ماسکو سے لے کر لنکا تک دنیا کے ہر حصے میں محسوس کیا جا رہا تھا۔ دنیا کے اس علاقے میں جہاں ابھی رات تھی اور سیاسی لیڈر محو خواب تھے انھیں نیند سے جگا کر شاہ فیصل کی شہادت کی خبر دی گئی جہاں کہیں میٹنگیں اور کانفرنسیں ہو رہی تھیں، تمام کارروائیوں کو روک کر شاہ فیصل کے انتقال کی خبر دی گئی۔ پارلیمنٹوں اور کیبنٹوں کے اجلاس درمیان ہی میں روک دیئے گئے۔ چند لمحوں کے لئے کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ اتنا طاقتور انسان جس نے پوری دنیا کو قدموں پر جھکنے کیلئے مجبور کر دیا تھا۔ اس طرح سے اچانک موت کا شکار ہو جائے گا۔ اس خبر سے تجارتی حلقوں میں ہلچل سی مچ گئی ڈالر کے بھاؤ گرنے شروع ہو گئے۔ شیئر بازار میں طوفان سا آگیا۔

عرب دنیا کا ایک اور درخشاں ستارہ ٹوٹ گیا تھا۔ دنیائے عرب میں اس خبر کے پھیلتے ہی جیسے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ ربیع الاول کی اس شام کو پوری دنیائے اسلام میں لوگ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے سلسلے میں ہونے والے تقریبات میں شرکت کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اچانک اس اندوہناک خبر نے انھیں اوپر سے نیچے تک ہلا کر رکھ دیا کانیں بند ہونی شروع ہو گئیں تمام تقریبات منسوخ ہو گئیں۔ لوگ سڑکوں پر نکل آئے ان میں عورتیں بھی تھیں بچے بھی اور بوڑھے بھی۔ سب شاہ فیصل کا نام لے کر بین کر رہے تھے۔ ہر وہ شخص جسے شاہ فیصل کی کوئی بھی تصویر ہاتھ لگی تھی اسے ہاتھوں میں اٹھا کر گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ بازاروں میں ہر طرف فیصل کی تصویریں ہی تصویریں نظر آرہی تھیں۔ یہی حال دنیائے عرب کے دوسرے شہروں میں تھا۔ ناصر کے انتقال کے بعد عرب دنیا میں اس طرح کا عوامی غم اور سوگ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ دمشق میں نوجوانوں کا ایک گروہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا " آہ! ہم یتیم ہو گئے۔ ہمارا باپ شہید ہو گیا " یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔

عرب یتیم ہو گئے۔

اور واقعی شاہ فیصل کی بے وقت شہادت سے عرب دنیا یتیم ہو گئی ہے۔ ان کے سر سے اب سب سے زیادہ تجربہ کار، باوقار اور دانشمند رہنما کا سایہ اٹھ گیا ہے یہ شاہ فیصل ہی تھے جو مصر، شام اور اردن جیسے عرب ممالک کو اسرائیل سے جنگ کرنے کے لئے اور اپنے ملکوں کی تعمیر نو کے لئے بے دریغ پیسہ دے رہے تھے۔ شاہ فیصل کے انتقال کا سب سے زیادہ اثر مصر کے صدر انور سادات پر ہوا جس وقت انھیں یہ خبر دی گئی تو ان پر سکتہ سا چھا گیا اور پھر ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بہہ نکلی۔ انھوں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا یا اللہ یہ کیا ہوا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایسا ہو چکا تھا اور ایک فرد واحد کے انتقال کے ساتھ مشرق وسطیٰ کی سیاست کا پورا نقشہ پلٹ گیا اور وہ منظر انتہائی رقت انگیز تھا جب ایک طرف مرحوم شاہ فیصل کے جنازہ کو لے کر جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف محل شاہی میں شہزادہ خالد کو باضابطہ طور پر مملکت کا حکمراں مقرر کرنے کے لئے سادہ مگر ایک پروقار تقریب کا انعقاد عمل میں آرہا تھا۔ تدفین سے قبل اس لئے ایسا ضروری سمجھا گیا۔ مبادا جانشینی کا سوال وجہ نزاع بن جائے۔

اس تقریب میں تمام افراد اپنی اپنی سیٹوں پر درجہ بدرجہ غم واندوہ کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ خاندان شاہی کے افراد پرنس عبداللہ ابن عبدالرحمٰن، پرنس محمد ابن عبدالعزیز، پرنس ناصر ابن عبدالعزیز، پرنس سعد ابن عبدالعزیز، پرنس فہد ابن عبدالعزیز اور دیگر شہزادگان مجلس علماء کے ممبران وزیر دفاع پرنس سلطان ابن عبدالعزیز کی زیر قیادت مختلف یونٹوں کے کمانڈران، مملکت کی معزز شخصیتیں اور قبائل کے سرداران سب اس محفل میں جمع تھے۔ تمام حاضرین بڑے ضبط وتحمل سے کام لے رہے تھے اس لئے کہ اسلام کی تعلیم یہی ہے لیکن غمی کے آنسوؤں کا نکل آنا قدرتی بات ہے۔ اس پر انسان کا اختیار نہیں۔ اور وہ شاہ خالد ابن عبدالعزیز شاہ کے لئے کہ انھیں اپنے بھائی سے والہانہ محبت تھی۔ جونہی اظہار وفاداری کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک ایک فرد نے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر نئے شاہ اور ولیعہد سے وفاداری کا حلف لیا شاہ خالد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اب کیا تھا آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئیں جیسے کہ تمام حاضرین اس کے منتظر تھے۔ کوئی چہرہ ایسا باقی نہ رہا جس کی آنکھ نم نہ ہو۔ یہ منظر اس شاہی محل نے آج سے قبل نہ دیکھا تھا۔

اس تقریب کا آنکھوں دیکھا حال ریڈیو سے نشر کیا گیا لیکن جو صبر اس غمگین محفل کا حال نشر کیا

ہوہ حال بیان کرتے کرتے خود رونے اور سسکیاں بھرنے لگا اور اس کے بعد پوری مملکت میں ہر
دکی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے ۔

یہ کوئی محفل تاجپوشی نہ تھی ۔ اس لئے کہ مملکت سعودی عربیہ میں کوئی تاج موجود نہیں ہے
یہ جانشینی کے انتخاب کی محفل تھی ۔ نئے شاہ اور ولیعہد دونوں ایک جگہ بیٹھے تھے اور دونوں
روایتی طور پر سفید پوشاک اور کتھئی رنگ کے جبوں میں ملبوس تھے ۔

جانشینی کی یہ تقریب ۹ منٹ تک جاری رہی ۔ اور اس کے بعد شاہ نے ریڈیو سے
ی بھرائی ہوئی آواز میں اعلان کیا کہ ۔

"میں اپنے بھائی کی پالیسی پر عمل کروں گا اور ان ہی کے مشن کو جاری رکھوں گا"
ان کی پہلی ریڈیائی تقریر تھی جو حکمراں بننے کے بعد انھوں نے نشر کی اور دنیا لے اسے سنا لوگوں کو
علوم کر کے اطمینان ہوا کہ بادشاہ کی تبدیلی سے مملکت سعودی عربیہ کی پالیسی تبدیل نہیں ہوگی شاہ نے
ہا ۔

"میں اللہ سے التجا کرتا ہوں کہ وہ مرحوم رہنما کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے
اور مجھے ان کے مشن کو کامیاب بنانے کی قوت عطا فرمائے "

اس تقریر کے خاتمے پر شاہ فیصل کے جنازے کو لے چلنے کی تیاریاں شروع ہوگئیں مملکت کے
مرکردہ [illegible] کرام نے سابق شاہ کو غسل دیا ۔ اور سفید کفن میں ملبوس کر کے انھیں علی العید مسجد لے جایا
یا ۔ جہاں مغموم عوام ہزاروں کی تعداد میں پہلے سے جمع تھے ۔ کوئی ایسی آنکھ نہ تھی جو نم نہ ہو ۔ پوری
فضا مغموم تھی ۔ اور اللہ اکبر اللہ اکبر اور دوسرے دعائیہ کلمات سب کی زبانوں پر تھے ۔ نماز جنازہ

پڑھی گئی اور چند لمحے کے لئے فضا میں موت جیسا سکوت طاری ہوگیا ۔ نماز اور دعا دس منٹ تک
جاری رہی ۔ شاہ خالد نے جنھیں خاندان شاہی کے افراد اور دوسرے ممالک کے بادشاہ اور سربرا
انھیں اپنے حلقے میں لئے ہوتے تھے ، دعا کی تو ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے ۔

موذن پکار پکار کر قرآن پاک کی آیتیں تلاوت کر رہا تھا اور تمام شرکا کو اللہ کے
اس پیغام سے روشناس کر رہا تھا کہ جو خدا کے لئے اپنی جانیں دیتے ہیں انھیں مردہ نہ سمجھو
اللہ بڑا ہے اللہ بڑا ہے ۔ اب جنازہ اٹھا اور لوگ کاندھا دینے کے لئے دوڑ پڑے ۔

ریڈیو کے اناؤنسر نے اپنی بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ ۔ سوگوار لوگ کاندھا دینے
کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ ان کا پیارا اور محبوب شا
ان سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا تھا ۔

بالآخر وہ وقت بھی آن پہنچا جب دنیا کی ایک مالدار مملکت کے سربراہ عرب اتحاد او
مسلم اتحاد کے علمبردار کے جسد خاکی کو سپرد خاک کر دیا لوگ مٹی دے رہے تھے اور پڑھ رہے
تھے منہا خلقناکم وفیہا نعیدکم ومنہا نخرجکم تارۃً اخریٰ ۔

ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا اور اسی میں تمھیں لوٹایا اور پھر دوبارہ اسی سے تمہیں اٹھائ
شاہ فیصل کو ان کے والد بزرگوار کے پہلو میں دفن کیا گیا ۔ قبر پر نہ نام کی کوئی تختی نصب
ہوگی اور نہ اس پر کوئی مقبرہ تعمیر ہوگا ۔ کہ یہ اسلامی اور وہابی تحریک کے اصولوں کے خلاف ہ
مبادا مقبرے پرستش گاہ بن جائیں کہ پرستش کے لائق صرف خدا ہے کوئی انسان نہیں خوا
ایک عام آدمی ہو یا بادشاہ ہو ۔

"مِن المھد الی اللحد"

ریگستان میں دور دور تک خاموشی چھائی ہوئی تھی سینکڑوں میل تک پھیلے ہوئے ریگستان میں دور جہاں زمین اور آسمان ملتے ہیں آہستہ آہستہ صبح کا غازہ پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ہلکی ہلکی فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ ریگستان کے کنارے پر کھجور کے چند پیڑوں کے نیچے پندرہ بیس خیمے لگے ہوئے تھے۔ ان خیموں میں زندگی کی گہما گہمی شروع ہو گئی تھی۔ مرد فجر کی نماز سے فارغ ہو کر اونٹوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے تھے۔ عورتیں خیموں کے پاس ہی آگ جلا کر صبح کے ناشتے کا انتظام کر رہی تھیں۔ ان ہی کے سب سے بڑے خیمے میں جو شاید امیر کا خیمہ معلوم ہوتا تھا ایک ۲۵، ۲۶ سال کا بارعب اور خوب صورت نوجوان فرش پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے کسی خیال میں غرق بیٹھا تھا۔ یہ نوجوان نجد کا حکمران عبدالعزیز ابن سعود۔ اس کے باپ دادا نجد کے حکمران تھے لیکن اسے آج برطانیہ اور مکہ کے حکمران شریف حسین کی سازشوں کے نتیجے میں دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ وہ کئی برس سے اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ ریگستان میں بھٹک رہا تھا۔ اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ حاصل کرے گا۔ اور صرف نہیں بلکہ جنوں قبیلوں اور ریاستوں میں بٹے ہوئے عربوں کے اس علاقے کو متحد کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کی زندگی کا اگر کوئی مقصد تھا تو صرف یہ کہ نجد، حجاز اور آذر کو متحد کر کے ایک عظیم ملک کی بنیاد رکھے جو برطانیہ یا ترکی کے اثر سے پوری طرح آزاد ہو۔ اس وقت بھی وہ بیٹھا ہوا مستقبل کے پلان بنا رہا تھا کسی کے کھنکار کی آواز سے اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اپنے خادم خاص کو ہاتھ باندھے کھڑا پایا۔ امیر کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر خادم نے کہا "اللہ نے آپ کو چاند سا بیٹا عطا فرمایا ہے" یہ امیر عبدالعزیز کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی "الحمد للہ۔ خدا مبارک کرے" یہ کہہ کر وہ شکرانے کے لئے سجدہ ریز ہو گئے۔

نئی صبح کا آغاز

یہ عبدالعزیز ابن سعود کا تیسرا لڑکا تھا جو ۴ر اپریل ۱۹۰۶ء کو ان کے لئے ایک نئی صبح کا پیغام لے کر نمودار ہوا۔ اس لڑکے کا نام رکھا گیا "فیصل" یعنی تلوار۔ وہ تلوار جسے نہ صرف اپنے باپ عبدالعزیز کا خواب پورا کرنا تھا بلکہ دنیائے اسلام کو متحد کرنے کا پوری دنیا کے مسلمانوں کا خواب پورا کرنا تھا۔ اس صبح کو عبدالعزیز کے پاس اپنے بیٹے کی جشن پیدائش منانے کے لئے کوئی سامان نہیں تھا۔ اس وقت ان کے پاس اس معصوم کو دینے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ فیصل کی زندگی تپتے ہوئے ریگستانوں میں اور تلواروں کی چھاؤں میں بسر کرنی تھی تاکہ وقت کی بھٹی میں پکنے کے بعد وہ اسلام کی ایسی مضبوط تلوار بن جائے جس کے آگے دنیا کو جھکنا پڑے۔

عبدالعزیز ابن سعود کی کامیابیاں

فیصل کی پیدائش کے بعد امیر عبدالعزیز کا ستارہ ایک بار پھر بلند ہونا شروع ہوا۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے ایک بار پھر جنگ شروع کر دی لیکن انھیں مکمل کامیابی اس وقت ہوئی جب ان کے تیسرے بیٹے فیصل نے جو اس وقت صرف ۲۰ برس کے نوجوان تھے ... ۴۵ بدو مجاہدوں کی مدد سے مکہ پر قبضہ کر لیا اور شریف حسین کو وہاں سے نکال دیا (شریف حسین اردن کے شاہ حسین کے پڑدادا تھے) ۱۹۲۵ء تک امیر عبدالعزیز نے حجاز نجد اور آذر کو ملا کر ایک متحدہ ملک کی بنیاد رکھی تھی جو بعد میں سعودی عربیہ کے نام سے مشہور ہوا اور جو آج دنیا کا طاقتور اور دولتمند ترین ملک ہے سعودی عربیہ کی بنیاد ڈالنے میں جہاں شاہ عبدالعزیز ابن فیصل کی دانائی، سیاسی سوجھ بوجھ، ہمت و شجاعت اور حوصلے کو دخل تھا وہاں نوجوان فیصل کے جنگی معرکوں نے بھی ان کی کامیابی کی راہ ہموار کرنے میں ایک بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ بچپن ہی سے بہادر، غیور، دانشمند اور سنجیدہ فیصل اپنے باپ کے عزیز ترین ساتھی بن گئے۔

وزیر اعظم فیصل ابن عبدالعزیز

۱۹۵۲ء میں سعودی عربیہ کے بانی شاہ عبدالعزیز ابن سعود کا انتقال ہوا۔ ان کے ۳۱ لڑکے تھے جن میں سعود سب سے بڑے تھے۔ اس لئے انھیں سعودی عربیہ کا حکمران منتخب کیا گیا۔ ان کے چھوٹے بھائی فیصل وزیر اعظم مقرر کئے گئے۔ لیکن شاہ سعود کے دوران حکومت سعودی عربیہ کے پاس تیل کی زبردست دولت ہونے کے باوجود ملک کا دیوالیہ نکل گیا۔ بد انتظامی اور پیسے کی بربادی کی وجہ سے ملک بری طرح سے مقروض ہو گیا۔ اس موقعے پر خاندان شاہی اور علما سعودی عربیہ نے مجبور ہو کر سعود کو معزول کر کے فیصل کو حکمران بنانے کا فیصلہ کیا۔ ۲ر نومبر کو صبح ہی اس وقت کے وزیر اطلاعات شیخ جمیل الرحمٰن عجیلان نے ریڈیو سے فیصل کے شاہ منتخب کئے جانے کا اعلان کیا۔ تو پورے ملک میں عقیدت و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ایک ترقی پسند شاہ جو اس سے قبل وزیر اعظم اور اقوام متحدہ میں سعودی عربیہ کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی قابلیت اور دور اندیشی کا مظاہرہ کر چکا تھا سعودی عربیہ کی ڈوبتی کشتی کو بچا سکتا تھا اور اسے دنیائے اسلام میں جائز مقام دلا سکتا تھا۔

شاہ فیصل۔ اسلام کی تلوار

ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد عربوں میں اور پھر دنیا بھر کے مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا تھا۔ اور یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جس وقت موت کے ظالم ہاتھوں نے انھیں ہم سے چھینا اس وقت دنیائے اسلام اور عرب ممالک میں جیسا اتحاد ہے آج سے پہلے کبھی نہیں تھا عرب اتحاد کا جو جذبہ ان کے اندر موجود تھا اس کا اقرار مصر کے صدر ناصر کو بھی تھا اور اس وقت کے صدر سادات کو بھی ہے۔ اتحاد کا یہ جذبہ نہ ہوتا تو صدر ناصر نے اپنی زندگی میں جس طرح یمن کی لڑائی لڑی اور جس طرح سعودی عربیہ کے علاقے میں بھی چھاپہ ماروں کو بھیجا تھا اس پر ایک بڑی لڑائی چھڑ سکتی تھی لیکن شاہ فیصل نے بڑے ضبط و تحمل سے کام لیا اور لڑائی کو نہ بڑھنے دیا۔

شاہ فیصل میں ایک خصوصیت ایسی تھی جس کی وجہ سے وہ بے پناہ مقبول تھے اور بڑے سے بڑے ممالک کے صدر بھی ان کی اس خصوصیت پر رشک کیا کرتے تھے۔ وہ یہ کہ وہ بادشاہ ہوتے ہوئے بھی صحیح معنوں میں اپنے آپ کو رعایا کا خادم تصور کرتے تھے۔ ان کی رعایا میں سے معمولی سے معمولی فرد بھی ان سے ملاقات کر کے براہ راست شکایت کر سکتا تھا۔ ان کے ایک قریبی مشیر نے بتایا کہ ایک بار وہ کہیں جانے کے لیے کار میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کا بایاں پیر کار میں تھا اور دایاں پیر زمین پر کہ ایک سادہ لوح بدو "یا فیصل، یا فیصل" چلاتا ہوا ان کی طرف دوڑا۔ باڈی گارڈ نے آگے بڑھ کر بدو کو روکنا چاہا لیکن شاہ فیصل نے اسے روک دیا اور کہا: "اسے آنے دو ہو سکتا ہے وہ مجھ سے کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہو"

میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ میں مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کروں

باڈی گارڈ پیچھے ہٹ گئے اور بدو نے آکر شاہ فیصل سے کچھ دیر بات کی اور پھر مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔ وہاں پر موجود لوگ بدو سے زیادہ شاہ فیصل کی سادگی اور انکساری دیکھ کر حیرت میں رہ گئے۔

شاہ فیصل زندگی کے ہر میدان میں اسلامی نظام کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ خود پابندی کے ساتھ پانچ وقت کی نماز ادا کرتے تھے۔ جب وہ جدہ میں ہوتے تو اکثر مصلی لے کر سمندر کے کنارے چلے جاتے اور وہاں مراقبہ کرتے۔ جمعرات کی شام کو جب وہ عبادت کے لیے مسجد میں جاتے تو دوسرے نمازیوں کو بعد نماز گھر پر مدعو کرتے اور ایک چھوٹا سا مذہبی اجتماع ہوتا۔ شاہ کی پرائیویٹ زندگی بہت سے فقیروں سے بھی زیادہ سادہ تھی۔ وہ تعیش کو سختی کے ساتھ ناپسند کرتے تھے۔ شاہ سعود کے بعد جب وہ اقتدار میں آئے تو انھوں نے جدہ میں اپنے بھائی کا الحمرا محل اس لئے بند کر دیا کیوں کہ ان کے خیال میں وہ کچھ زیادہ ہی شاندار اور پر تکلف تھا۔ انھوں نے وہ محل مہمانوں کے لئے مخصوص کر دیا۔ وہ دوسرے بادشاہوں کی طرح ہاتھ چومنا پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ ملاقاتیوں کو ان کا ہاتھ چومنے کی اجازت نہیں ملتی۔ اسی طرح وہ اپنے آپ کو "ہز میجسٹی" کہلوانا پسند نہیں کرتے تھے کیوں کہ یہ خطاب صرف خدائے تعالیٰ ہی کے شایان شان ہے اس لئے لوگ شاہ کو فیصل۔ یا اخی فیصل کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

شاہ جدید مغربی لباس قطعاً پسند نہیں کرتے، وہ خود روایتی عربی لباس پہنتے تھے اور دوسروں کے لئے بھی یہی پسند کرتے تھے۔ ان کا کھانا بھی بالکل سادہ ہوتا تھا جس میں ابلا ہوا چاول زیادہ ہوتا۔ وہ روزانہ سولہ سولہ گھنٹے کام کرتے جس کی وجہ سے انھیں پرائیویٹ زندگی کے لئے بہت کم موقع ملتا۔

اس ملک میں جہاں عام لوگ بھی کیڈلاک اور رولس رائس سے کم کاریں نہیں رکھتے فیصل پرانے ماڈل کی ایک کار کئی برس سے استعمال کر رہے تھے۔ اس کار میں وہ ڈرائیور کے بغل میں بیٹھا کرتے تھے۔ وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ ایک انسان آگے بیٹھ کر کار چلائے جب کہ وہ شان سے پیچھے بیٹھے رہیں۔

دنیا فیصل کے قدموں پر

چند سال قبل مغربی ممالک سعودی عرب کو بدوؤں کا ملک سمجھتے تھے۔ شاہ کی مغربی سیاست کی نظر میں ایک قدامت پسند، دقیانوسی فرمانروا کی تھی جو جدید سیاسی دنیا کے نشیب و فراز سے نا واقف تھا اور جیسے مغربی تیل کی کمپنیاں فی بیرل ۹۹ ڈالر دے کر اپنا آلۂ کار سمجھتی تھیں لیکن اکتوبر ۷۳، عرب اسرائیل جنگ نے کایا ہی پلٹ دی اور آن واحد میں بدوؤں کے سردار شاہ فیصل کا ستارہ چمکا کہ وہ تیل برآمد کرنے والے ممالک کے لیڈر بن گئے۔ دنیا کے اکثر ممالک ان کے سامنے جھکنے لگے۔ توسیع پسند اور استحصالی طاقتوں کے خلاف معاشی جنگ میں جس کے کمانڈر انچیف شاہ فیصل تھے مغربی ممالک نے اتنا نقصان اٹھایا کہ ان کے سر سے ایٹم بم اور [illegible] کا نشہ اتر گیا اور امریکہ جیسے طاقتور ملک نے بھی تیل بندی کو ختم کرانے کے لئے شاہ فیصل کے آستانے پر سر جھکا دیا۔

تیل کی برآمد سے عربوں کی دولت میں جو تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اسے دیکھ کر یورپ کے ماہرین معاشیات گھبرا گئے۔ ان کا خیال ہے کہ آئندہ چند برسوں میں تمام دنیا کی دولت عربوں کے ہاتھ میں پہنچ جائے گی اور وہ پوری دنیا کو اپنی انگلی کے اشاروں پر نچائیں گے۔ گذشتہ سال غیر کمیونسٹ ممالک کو تیل برآمد کر کے سعودی عرب نے ۷۰ کروڑ ڈالر کمائے تھے۔ جس طرح اتنی کثیر رقم حاصل کی اسی طرح اسے خرچ بھی کیا ہے انھوں نے اس رقم کا بہت بڑا حصہ کارخانوں، بندرگاہوں، ہسپتالوں اور اسکولوں کی تعمیر پر خرچ کیا ہے جس کی وجہ سے صرف ایک سال میں سعودی عرب کا نقشہ بدل گیا۔ اور اگر کچھ عرصہ اسی طرح ترقیاتی منصوبوں پر توجہ دی گئی تو جلد دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ شاہ فیصل نے اپنی مختصر مگر مضبوط فوج کو جدید ہتھیاروں سے مسلح کرنے کی طرف بھی توجہ دی۔

اس مقصد کے لئے انھوں نے ۲۰ کروڑ ڈالر کے جدید ترین ہتھیار خریدے تھے علاوہ ۲۲ کروڑ ۵۰ لاکھ ڈالر انھوں نے ان عرب ممالک کی امداد کے لئے دیئے تھے جو اسرائیل کے ساتھ برسر پیکار رہیں۔ مصر، شام، اردن اور فلسطینی تحریک کی مالی امداد سب سے زیادہ انھوں نے کی تھی۔ عرب دنیا کے باہر دوسرے غریب ممالک کو انھوں نے ۲۱ کروڑ ڈالر کی امداد دی تھی لیکن اتنی کثیر دولت خرچ کرنے کے باوجود سعودی عرب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ ان مصارف کے بعد ۱۹۷۴ء میں سعودی عرب کے پاس ۲۴ کروڑ ڈالر کی رقم بچ گئی۔

عالم اسلام کے لیڈر

شاہ فیصل تیل برآمد کرنے والے ممالک میں سب سے دولت مند ملک کے فرمانروا

مولانا عبدالسلام رحمانی

سیر وسوانح

سیدالتابعین حضرت حسن بصریؒ ۔ حالات و ملفوظات

(ولادت ۲۱ھ مطابق ۶۴۱ء وفات ۱۱۰ھ مطابق ۷۲۸ء)

سیدالتابعین حضرت حسن بصری رحمہ اللہ جلیل القدر محدث و امام اور مشہور ولی و بزرگ تھے۔ آپ کا نام حسن اور کنیت ابوسعید تھی۔ آپ کے ماں باپ غلام تھے اور آپکی پیدائش غلامی ہی کی حالت میں ہوئی تھی مگر اللہ تعالےٰ نے آپ کے تقویٰ و تقدس اور علم وفضل کے سبب آپ کو سیادت و پیشوائی کا مقام عطا کیا، آپ کا لقب "سیدالتابعین" ہوا اور لوگوں نے آپ کو اپنی عقیدت ومحبت کا مرکز ٹھہرایا۔

آپ کے والد کا نام یسار اور کنیت ابوالحسن تھی۔ اسلامی فتوحات میں فارس کے قیدیوں کے ساتھ پکڑکر آئے تھے، آپ کی ماں بھی انھیں میں شامل تھیں۔ ان کا نام خیرہ تھا۔ یہ دونوں اُم المومنین حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے حصہ میں آئے۔ وہیں اُمّ المومنین کے گھر میں حضرت حسن بصری پیدا ہوئے اور انھیں کے سایۂ عاطفت میں آپ کی پرورش ہوئی۔ اُمّ المومنین آپ سے بڑی شفقت فرماتیں بسا اوقات آپ کی والدہ باہر کسی کام سے چلی جاتیں اور آپ رونے لگتے تو اُمّ المومنین آپ کو اٹھالیتیں اور سینہ سے لگاکر چھاتی منہ میں ڈال دیتیں، بیان کیا جاتا ہے کہ اُمّ المومنین کو دودھ بھی آجاتا اور آپ پی لیتے۔

اُمّ المومنین حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہراتؓ میں بہت ممتاز مقام رکھتی تھیں۔ اُن کی فہم وبصیرت کا یہ حال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہم امور میں اُن سے مشورے لیا کرتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آپ نے صحابہ کو احرام کھولنے کا حکم دیا اور صحابہ نے آپ کو احرام کی حالت میں دیکھتے ہوئے احرام نہیں کھولا تو آپ بہت رنجیدہ حضرت اُمّ سلمہؓ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا۔ یہ عجیب معاملہ ہے کہ میرے کہنے کے باوجود کوئی احرام نہیں کھول رہا ہے۔ حضرت اُمّ سلمہؓ کی ذہانت نے فوراً محسوس کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو احرام کے لباس میں دیکھ کر صحابہ کو احرام کھولنے میں تامل ہو رہا ہوگا۔ بولیں۔ اے اللہ کے رسول پہلے آپ احرام کھول دیجئے اور قربانی کر دیجئے پھر کوئی وجہ نہیں کہ صحابہ کو آپ کی اتباع میں تامل ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا آپ کے احرام کھولتے ہی تمام صحابہ نے احرام کھول دیا۔

اُسی سراپائے فہم وبصیرت کی گود میں حسن بصری پلے بڑھے تھے اور اُن کے فیوض و برکات سے خوب خوب بہرہ ور ہوتے تھے۔ پھر آپ کی اپنی خداداد صلاحیت وبصیرت اور ذہانت وفطانت تھی جس نے آپ کی خوبیوں کو دوبالا کر دیا۔

اللہ تعالےٰ نے آپ کو زبان بھی بڑی فصیح عطا کی تھی، پھر وادی القُریٰ میں آپ کی نشوونما ہوئی اور بدوؤں کی خالص بے میل زبان نے آپ کی فصاحت کو اور اُجاگر کیا۔ آپ شکل وصورت میں بھی بصرہ کے خوب صورت ترین شخص تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد زریں میں ۲۱ھ ہجری مطابق ۶۴۱ء عیسوی میں آپ کی پیدائش ہوئی اُس وقت صحابہ کی بڑی تعداد موجود تھی، جن سے آپ نے ملاقاتیں کیں اور خوب خوب استفادہ کیا، آپ اُن صحابہ سے استفادہ کی فکر میں برابر رہتے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھنے اور سننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ آپ فرماتے ہیں۔ میں تین سو سے زیادہ صحابہ سے ملا ہوں جن میں صرف بدری صحابہ کی تعداد ستّر ہے۔

جب لوگوں میں آپ کے علم وفضل کا چرچا ہوا اور لوگ آپ سے استفادہ کے بہت مشتاق ہوئے تو آپ نے بصرہ کی ایک مسجد میں درس دینا شروع کیا جہاں بہت سے لوگ آپ سے فیض یاب ہوئے۔

آپ کو اللہ تعالےٰ نے بڑی علمی گہرائی وژرف نگاہی عطا کی تھی یہی وجہ تھی کہ بڑے بڑے صحابہ مسائل میں آپ کی طرف رجوع کرتے اور آپ سے دینی مسائل دریافت فرماتے ایک مرتبہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک مسئلہ پوچھا گیا تو فرمایا حسن بصری سے دریافت کرو سائل کو بڑی حیرت ہوئی کہ حضرت انس جیسے جلیل القدر صحابی خود مسئلہ بتانے کے بجائے حسن بصری کی طرف منتقل کر رہے ہیں۔ اس نے بڑی حیرت سے کہا۔ آپ یہ فرمارہے ہیں کہ حسن بصری سے دریافت کرو۔؟ فرمایا ہاں انھیں سے دریافت کرو۔ یقیناً انھوں نے سنا ہے اور ہم نے بھی سنا ہے لیکن انھوں نے ضبط کیا ہے اور ہم بھول گئے ہیں۔

ربیع بن انس کہتے ہیں۔ میں دس سال تک حسن بصری کی خدمت میں آتا جاتا رہا لیکن

لے اس مضمون میں زیادہ تر استفادہ "سیرۃ الحسن بصری" لابن الجوزی سے کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں "المذاہب الاسلامیہ" لابی زہرہ وغیرہ سے بھی اقتباسات آگئے ہیں۔

ان کی خدمت میں حاضری کا کوئی دن بہرے علم میں اضافے اور نئی معلومات سے خالی نہ گیا۔ اس سے ان کی وسعت علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ علمی حلقہ میں ایک مستقل فکر رکھتے تھے اور اجتہاد میں ہمیشہ سلف کی روشن کو ترجیح کرتے تھے ان کا شمار عظیم اسلامی مفکرین و مصلحین امت میں ہوتا ہے۔

حسن بصریؒ کا کردار

آپ کا کردار بہت صاف تھا اور گندم نما جو فروشی، کے آپ قائل نہ تھے، منکرات پر خاموش رہ جانا آپ کا شیوہ نہ تھا۔ آپ نے کبھی حق بات کہنے سے گریز نہ کیا۔ اور اس بات میں کسی حاکم و ظالم سے آپ مرعوب نہ ہوئے۔ حجاج بن یوسف کو اسکی کسی خطا پر ٹوکتے ہوئے اور اس سے کوئی کلمۂ حق کہتے ہوئے لوگ گھبراتے تھے مگر حسن بصری بلا کسی خوف و اضطراب کے اسے اس کی غلطیوں پر ٹوکتے اور اس پر سخت تنقید فرماتے۔

ایک بار حجاج نے بڑے طنطنہ کے ساتھ حسن بصری سے پوچھا حضرت عثمانؓ و علیؓ کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے۔ حضرت علیؓ او اہل بیت سے بنی امیہ کی جو سیاسی رنجش چلی آرہی تھی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے واقعۂ شہادت کو جس طرح حضرت علی کے خلاف استعمال کیا گیا تھا اور باہمی سیاسی جھگڑوں نے جو حالات پیدا کر دیئے تھے اُن حالات میں یہ سوال بہت اہم تھا۔ حضرت حسن بصری نے اس کے جواب میں قرآن کی وہ آیت پڑھ دی جس میں فرعون کا اسی جیسا ایک سوال اور موسیٰ علیہ السلام کا جواب مذکور ہے اور اس طرح حجاج کی فرعونیت پر ایک لطیف طنز بھی کردیا۔ فرمایا قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی ؟ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ، لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی۔ ....
(فرعون نے کہا جو نسلیں پہلے گذر چکیں ان کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا اس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتہ میں محفوظ ہے میرا رب نہ چوکتا ہے نہ بھولتا ہے) جب حجاج شہر واسط بنا رہا تھا تو آپ نے ایک خطبہ میں فرمایا، تو نے مضبوط و مستحکم محل تو بنا لیا ہے۔ اور فرش کو آراستہ و پیراستہ کرلیا ہے اور اس پر تو نے رنگ برنگ کے پردے لٹکا دیئے ہیں لیکن تو نے حقیقتاً آگ کا فرش تیار کیا ہے۔ تجھے خبر بھی ہے خلق خدا تجھے خائن کیا کہتی ہے۔ اے فاسقوں کے سردار! آسمان والے تیرے اوپر لعنت بھیجتے ہیں اور اہل زمین تجھ سے بیزار ہیں۔ جب حجاج کو اس خطبہ کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے حاشیہ نشینوں سے کہا بصرہ کے ایک غلام کی مجال کہ وہ مجھ کو گالیاں دیتا رہے تم وہاں منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے تم سے کچھ نہ ہو سکا۔؟

حضرت حسن بصری کے علم و فضل کا وہ رعب تھا کہ حجاج جیسا ظالم و خونخوار بھی ان کی زبان خاموش نہ کر سکا تو دوسرا کون انہیں خاموش کر سکتا تھا۔

یزید بن عبد الملک کی خلافت کا زمانہ تھا ایک شخص نے اُس زمانہ کے فتنے یزید بن المہلب اور ابن الاشعث کی شورش کے متعلق آپ کی رائے دریافت کی آپ نے فرمایا، نہ اُس کا ساتھ دو نہ اِس کا۔ ایک شامی کھڑا ہوا اور بولا، نہ امیر المومنین کا؟ آپ نے غصہ میں ہاتھ اٹھا کر فرمایا، ہاں نہ امیر المومنین کا۔

آپ ان علماء سوء پر بھی برملا تنقید فرماتے جو خلفاء و امراء کی حاشیہ نشینی و دربارداری کرتے آپ انھیں ان کا مقام یاد دلاتے اور علم دین کا وقار مجروح کرنے سے انھیں باز رہنے کی تلقین کرتے آپ نے خلفاء و امراء کو ان کی اصلاح کے لئے اور انھیں اُن کی ذمہ داریاں یاد دلانے کے لئے وقتاً فوقتاً خطوط بھی لکھے اور ان کے پاس پہونچ کر بھی انھیں نصیحت کی۔ آپ کے متعدد خطوط ابن الجوزی وغیرہ نے نقل کیئے ہیں جو بڑے حکیمانہ اور قیمتی نصائح پر مشتمل ہیں ایک بار خلیفہ وقت حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کو لکھا۔

"امیر المومنین! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ امام عادل (انصاف پسند حاکم) کا وجود ہر کجرو کے لئے راست روی کا موجب ہر مفسد کے لئے پیغام اصلاح، ہر کمزور کے لئے باعث قوت ونصرت، ہر مظلوم کے لئے دادرسی کا ذریعہ اور ہر پریشان کے لئے جائے امان و موجب سکون ہوتا ہے۔

امام عادل ایک گڈریے کی طرح ہوتا ہے جو اپنے ریوڑ پر بڑا مہربان ہو۔ ان کے لئے بہترین چراگاہ انتخاب کرے، مہلک چراگاہوں سے انھیں بچائے، درندوں سے محفوظ رکھے اور سردی گرمی سے بچاؤ کا اہتمام کرے۔

امام عادل ایک شفیق باپ کی طرح ہوتا ہے جو بچپن میں بچوں کی دیکھ بھال کرتا ہے بڑے ہونے پر انھیں پڑھاتا لکھاتا ہے، زندگی میں ان کے لئے کماتا ہے اور بوقت رحلت ان کے لئے ذخیرہ چھوڑ جاتا ہے۔

امام عادل ایک شفیق ماں کی طرح ہوتا ہے جو حالت حمل میں اولاد کو پیٹ میں رکھنے کی تکلیف اٹھاتی ہے پھر زحمت ولادت گوارہ کرتی ہے اور بچپن میں ان کی تربیت کرتی دودھ پلاتی پھر چھڑاتی ہے، اولاد کی خوشی میں اس کی خوشی اور ان کے رنج میں اس کا رنج ہوتا ہے

امیر المومنین! انصاف پسند امیر یتیموں کا غمخوار اور مسکینوں کا خزانچی ہوتا ہے۔ وہ چھوٹوں کی تربیت کرتا ہے اور بڑوں کا نان ونفقہ مہیا کرتا ہے، انصاف پسند امیر کو کسی ملک میں وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو دل کو جسمانی اعضاء میں۔ اگر دل درست ہے تو سب اعضاء صحیح و سالم ہیں اور اگر دل میں فساد پیدا ہو جاتے تو سارے اعضاء میں فساد آجاتا ہے امام عادل عبد اور معبود کے درمیان ایک واسطہ کا کام دیتا ہے۔ وہ اللہ کا کلام سنتا اور بندوں کو سناتا ہے خود خدا کی اطاعت کرتا اور بندوں کی قیادت کا فریضہ انجام دیتا ہے

امیر المومنین! آپ اس غلام کی طرح نہ ہوں جس کے آقا نے اسے امین سمجھ کر اپنا مال و متاع اس کے سپرد کر دیا لیکن اس غلام نے مال کو ادھر ادھر ضائع کر دیا اور اہل وعیال کو منتشر کر دیا جس کے نتیجہ میں آقا دونوں سے محروم ہو گیا۔

امیر المومنین! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ خدا نے شرعی حدود اسی لئے نافذ فرمایا ہے کہ لوگ فواحش و منکرات سے رُک جائیں مگر جب والی حکومت خود ہی ان کا ارتکاب کرنے لگے تو آپ ہی بتایئے اس کا انجام کیا ہوگا۔؟ خدا نے قصاص انسانی جانوں کے تحفظ کے لئے شروع فرمایا ہے جب قصاص لینے والا خود ہی لوگوں کو قتل کرنے لگے تو ان کی حفاظت کون کرے گا۔؟

امیر المومنین! موت اور اس کے بعد کے حالات کو یاد رکھئے جب آپکی امداد کرنے والا کوئی نہ ہوگا یعنی آپ موت اور اس کے بعد پیش آنے والے شدید حوادث کے لئے زاد راہ جمع کیجئے۔
امیر المومنین! جہاں آپ حکومت پذیر ہیں اسکے سوا بھی ایک منزل ہے وہ قبر جہاں عزت دار نہ

تک [illegible] رہیں گے، سب دوست احباب ایک گڑھے میں آپ کو تن تنہا ڈال کر چلے جائیں [illegible] لئے آپ ایسا توشہ جمع کیجئے جو اس آڑے وقت میں کام آئے۔ قرآن کی یہ آیتیں پیش نظر رکھئے۔ یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْہِ وَاُمِّہٖ وَاَبِیْہِ وَصَاحِبَتِہٖ وَبَنِیْہِ ۔ (یاد کرو اس دن کو جب آدمی اپنے بھائی سے اپنی ماں سے اور باپ سے اور اپنے بیوی بچوں سے راہ فرار اختیار کرے گا) اور وہ دن یاد رکھئے جب قبروں والے اٹھائے جائیں گے اور سینوں کے راز افشا کر دیئے جائیں گے۔

امیرالمومنین! ابھی اعمال صالحہ انجام دینے کا وقت ہے۔ ابھی آخری وقت نہیں آیا ہے نہ ابھی مایوسی کے آثار ظاہر ہوئے ہیں۔

امیرالمومنین! جہلاء کے قول کے مطابق فیصلہ نہ کیجئے۔ نہ ظالموں کی راہ پر چلئے، نہ بڑوں کو چھوٹوں پر مسلط کیجئے کیونکہ وہ کسی مومن کی قرابت داری اور عہد کی پرواہ نہیں کرتے اگر آپ ان امور کا خیال نہ کریں گے تو اپنے گناہوں کے علاوہ دوسروں کا گناہ بھی لادیں گے اور اپنے بوجھ کے ساتھ دوسروں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو لوگ عیش و تنعم کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ آپ کی تکلیف کا موجب ٹھہریں اور وہ لوگ جو دنیا میں لذات و طیبات سے لطف اندوز ہوتے ہیں کہیں آپ کو اخروی طیبات سے محروم نہ کر دیں۔ آپ اپنی موجودہ قدرت پر نگاہ نہ رکھیں بلکہ یہ دیکھیں کہ آیندہ آپ کو کس قدر قدرت حاصل ہوگی جب آپ موت کے پنجے میں جکڑے ہوں گے اور انبیاء و رسل اور فرشتوں کے زمرے میں خدا کے روبرو کھڑے ہونگے قرآن میں ہے۔ وَعَنَتِ الْوُجُوْہُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ .... (سارے چہرے خداوند حی و قیوم کے سامنے جھک جائیں گے)۔

امیرالمومنین! اگرچہ حکماء سلف کی طرح میں حکیمانہ نصیحت کا فریضہ انجام نہ دے سکا تاہم میرے یہ معروضات شفقت و ہمدردی کے ترجمان ہیں جس میں کسی کوتاہی سے میں نے کام نہیں لیا ہے میرے اس خط کو یوں سمجھئے کہ جیسے کوئی دوست کڑوی دوا پلا کر اپنے دوست کا علاج کرتا ہے کیونکہ اسے امید ہوتی ہے کہ اس دوا سے وہ صحتیاب ہو جائے گا۔ والسلام علیک یا امیرالمومنین ورحمۃ اللہ و برکاتہ"۔ —————— حضرت حسن بصری نے یہ طویل خط خلیفہ وقت حضرت عمر بن عبدالعزیز کو ان کے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا جس میں انھوں نے دریافت کیا تھا کہ امام عادل (انصاف پسند حاکم) کو کن اوصاف کا حامل ہونا چاہیئے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز عموماً آپ سے درخواست کیا کرتے تھے کہ آپ ہمیں کچھ نصیحت لکھ کر بھیج دیں۔

ایک دفعہ عمر بن عبدالعزیز آپ کی ایک نصیحت پڑھ کر بہت روئے اور فرمایا۔ حضرت حسن بصری پر خدا اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے وہ ہمیشہ ہمیں نیند سے بیدار کرتے ہیں اور غفلت سے ہوشیار کرتے ہیں۔ وہ کیا ہی مہربان ناصح اور کیا ہی سچے واعظ ہیں۔

ایک بار حضرت حسن بصری والی عراق عمر بن ہبیرہ کے پاس گئے اور اسے ایسی نصیحت فرمائی کہ وہ رو پڑا۔ اس نے کہا میرے پاس امیرالمومنین یزید بن عبدالملک کا ایک فرمان آیا ہوا ہے اگر میں اسے نافذ کروں تو ڈرتا ہوں اللہ تعالٰی مجھ سے ناراض ہو جائے گا اور نافذ نہ کروں تو امیرالمومنین ناراض ہو جائیں گے۔ فرمایا خدا کی قسم قریب ہے وہ دن کہ موت کا فرشتہ آن پہنچے گا اور تمھیں وسیع محل سے تنگ قبر میں پہونچا دیا جائے گا۔ اس وقت یزید بن عبدالملک تمھارے کچھ کام نہ آئے گا۔ اگر تم خدا کی رضا مقدم رکھو گے تو مجھے امید ہے اللہ تعالٰی تمھیں یزید کے غضب سے بچا لے گا لیکن یزید کی رضا کے لئے خدا کو ناراض کرو گے تو یاد رکھو یزید تمھیں خدا کے غضب سے ہرگز نہ بچا سکے گا۔ پس اے امیر! اللہ سے ڈرو۔ کیا عجب تم حکم خداوندی کے خلاف یزید کی اطاعت کرو اور اللہ ناراض ہو کر تم پر اپنی رحمت کا دروازہ بند کر دے کچھ دیر تک آپ اسی طرح اسے نصیحت کرتے رہے یہاں تک کہ وہ رو پڑا اور اس قدر رویا کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔

آپ کی زبان میں بڑا اثر اور بڑا سوز و گداز تھا اللہ تعالٰی نے آپ کے اندر دعوت و اصلاح کی بے پناہ صلاحیت رکھی تھی آپ کی شخصیت بڑی باوقار، متوازن اور پرکشش تھی، بڑی مؤثر و دل آویز گفتگو فرماتے۔ جب ذکر آخرت کرتے تو سننے والے غم آخرت میں ڈوبے نظر آتے اور آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ آپ خود بھی اکثر یاد آخرت میں ڈوبے رہتے اور خوف خدا سے روتے رہتے۔

ایک بار ایک شخص نے پوچھا کیف حالک یا ابا سعید۔ (ابوسعید کیا حال ہے آپ کا؟) فرمایا وہ شرّ حالٍ، "بہت برا حال ہے۔ سائل نے کہا کیوں؟ فرمایا اس لئے کہ صبح و شام موت کا ڈر لگا ہوا ہے اور یہ خبر نہیں موت کس حال میں آئے گی۔

ایک شخص نے آپ کو روتا ہوا دیکھا تو پوچھا، خدا آپ کی اصلاح حال فرمائے آپ روتے کیوں ہیں؟ فرمایا اللہ کا بڑا ڈر لگ رہا ہے سوچتا ہوں میرا مالک مجھ سے ناراض نہ ہوا ور کسی جرم کی پاداش میں مجھے جہنم کے حوالے نہ کر دے۔

عبدالواحد بن زید نے کہا۔ اگر تم حسن بصری کو دیکھو تو محسوس کرو گے کہ اس شخص پر ساری کائنات کا غم انڈیل دیا گیا ہے۔

ایک مرتبہ ایک اجنبی آیا اور امام شعبیؒ سے پوچھا حسن بصری کون ہیں، نہ میں نے انھیں دیکھا ہے نہ پہچانتا ہوں۔ فرمایا۔ اللہ تیرا بھلا کرے، جا مسجد میں اور لوگوں کو دیکھ، ان میں جو انوکھا شخص نظر آئے جس کی طرح تو نے کبھی کوئی آدمی نہ دیکھا ہو تو سمجھ لے کہ وہی حسن بصری ہیں۔

ایک دفعہ ایک بدوی بصرہ میں آیا اور لوگوں سے دریافت کیا اس شہر کا سردار کون ہے؟ لوگوں نے کہا حسن بصری بدوی نے کہا وہ کیونکر اہل بصرہ کے سردار ہوتے؟ لوگوں نے کہا وہ ایک صاحب علم و فضل مخلص و بے غرض و شریف النفس انسان ہیں وہ ہماری دولت دنیا سے بے نیاز ہیں اور ہم ان کی دولت علم و حکمت کے محتاج ہیں۔ بدوی نے کہا، پھر تو واقعی وہی سرداری کے حقدار ہیں۔

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب بصرہ کا والی و حاکم حجاج تھا اسی نے (ابھی ادپر گذرا) اپنے بارے میں حضرت حسن بصری کی تنقید سن کر آپ کو "بصرہ کا ایک غلام" کہہ کر ذکر کیا تھا اگر خدا کی قدرت دیکھئے کہ وہی حجاج بصرہ کا حاکم ہے مگر لوگ بصرہ کا سردار حضرت حسن بصری کو سمجھتے ہیں اور حجاج کی وقعت لوگوں کے دلوں میں کسی غلام کے برابر بھی نہیں۔

جن دنوں عدی بن الطاۃ بصرہ کے والی تھے ان کی بڑی خواہش تھی کہ حضرت حسن بصری بصرہ کا منصب قضا قبول کر لیں مگر آپ نے قبول نہ کیا۔ جب مسلسل انکار کے باوجود اُدھر سے اصرار ہوتا رہا تو آپ بصرہ سے باہر چلے گئے اور کچھ دن کسی نامعلوم جگہ مقیم رہے۔ آپ ایسی حکومت کے اعضاء میں شامل ہونا پسند نہیں کرتے تھے جو منہاج نبوت سے ہٹی ہوئی ہو۔

جب پانچویں خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے اور آپ سے منصب قضا قبول کر لینے کی درخواست کی تو آپ نے ان کی درخواست رد نہ کی اور قاضی بصرہ ہونا منظور کر لیا۔ اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کو بڑی خوشی ہوئی اور بڑی مسرت کے ساتھ اعلان کیا کہ میں نے سید التابعین کو بصرہ کا قاضی بنایا ہے۔

وفات

آپ کی وفات بصرہ میں ۱۱۰ھ مطابق ۷۲۸ء کو ہشام بن عبدالملک کے عہد خلافت میں ہوئی آپ کے جنازہ میں ایک بڑی خلقت امڈ آئی اور بصرہ کا ہر فرد جنازہ میں شریک ہوا یہ بصرہ کی تاریخ کا پہلا دن تھا کہ تمام لوگ جنازہ میں چلے گئے اور پورا شہر خالی ہو گیا چنانچہ اس دن بصرہ کی جامع مسجد میں عصر کی نماز نہ ہو سکی۔ یہ بصرہ کی جامع مسجد کا پہلا اور آخری واقعہ تھا نہ اس سے پہلے کبھی ایسا ہوا نہ اس کے بعد کہ اس میں کوئی نماز نہ ہوتی ہو۔

مالک بن دینار فرماتے ہیں میں نے حسن بصری کو ان کے انتقال کے بعد خواب میں دیکھا کہ وہ نہایت مسرور ہیں اور خوشی سے کھلے جا رہے ہیں وہی رخسار جس پر آنسوؤں کی قطاریں جاری رہتی تھیں غایت مسرت سے دمک رہا ہے تو میں نے کہا کیا آپکا انتقال نہیں ہو چکا ؟ فرمایا یقیناً ہو چکا ہے۔ میں نے کہا انجام کیا رہا خدا کی قسم آپ تو دنیا میں غم آخرت سے گھلے جا رہے تھے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے میرا غم دور کر دیا ہے اور مجھے ابرار و اتقیا کا مقام بلند عطا کیا ہے۔ اور خدا کی قسم یہ اس کی عظیم ترین مہربانی ہوتی ہے مجھ پر۔ میں نے کہا آپ ہمیں کیا پیغام دیتے ہیں ؟ فرمایا کیا خیال ہے تمہارا میں اس کے سوا کیا کہوں گا کہ جو شخص دنیا میں جتنا ہی غم آخرت کا مارا ہو گا آخرت میں اسی قدر شاداں و فرحاں ہو گا۔

ملفوظات

حضرت حسن بصری کی باتیں بڑی حکیمانہ ہوا کرتی تھیں۔ ایک بار امّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو بولتے ہوئے سنا تو فرمایا یہ کون شخص ہے جو صدیقین کی زبان بول رہا ہے ابن الجوزی نے سیرۃ الحسن البصری میں آپ کے بہت سے حکیمانہ ملفوظات نقل کئے ہیں جو ہماری نصیحت کے لئے بڑا قیمتی سرمایہ ہیں ان میں سے کچھ ملفوظات ملاحظہ ہوں۔

کھانے سے متعلق

حضرت حسن بصری نے فرمایا۔ کھانے سے متعلق بارہ خصلتیں ہیں۔ چار فرض، چار سنت چار ادب فرض یہ ہیں۔ بسم اللہ کہنا۔ کھانا کا طاہر ہونا، جو کھانا میسر ہو اس پر راضی ہونا اور اس نعمت کا شکر گذار ہونا۔

اور سنت یہ ہے دا ہنے پاؤں پر بیٹھنا، سامنے سے کھانا تینوں انگلیوں سے کھانا۔ اور کھانے کے بعد انگلیاں چاٹ لینی۔

اور ادب میں داخل ہے کھانے سے پہلے ہاتھ دھو لینا، لقمہ چھوٹا لینا اور اسے خوب چبانا۔ اور دوسرے کھانے والے کو تاکتے نہ رہنا۔

فرمایا : جو چاہتا ہو کہ اس کا دل نرم رہے اور خوف خدا سے اس کی آنکھ نم رہے اُسے چاہئے کہ کھانا آدھا پیٹ کھائے۔

پوچھا گیا، کیا چیز دل میں غم آخرت پیدا کرتی ہے ؟ فرمایا بھوک۔ پوچھا گیا اور کیا چیز دل سے غم آخرت دور کرتی ہے ؟ فرمایا آسودگی۔ فرمایا کرتے تھے لوگو! زیادہ سونے اور زیادہ کھانے سے توبہ کر لو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بھوکا رہنے والا ہی قیامت میں سب سے زیادہ ثواب لائے گا۔

مالک بن دینار کہتے ہیں۔ میں ایک دن حسن بصری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت وہ کھانا کھا رہے تھے، مجھے بھی کھانے پر بلایا، میں نے کہا کھا چکا ہوں۔ فرمایا پھر بھی کچھ کھا لو میں نے کہا اب بالکل گنجائش نہیں ہے۔ فرمایا سبحان اللہ! ایک مومن اور اتنا کھائے کہ مزید کھانے کی بالکل گنجائش نہ رہے، اور اتفاق پڑ جانے پر کسی مسلمان بھائی کے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہو سکے، یہ عجیب بات ہے۔

ریاکاری سے نفرت

حضرت حسن بصری کو ریا و تصنّع سے بڑی چڑ تھی، ایک دفعہ آپ ایک دعوت ولیمہ میں حاضر ہوئے، سامنے حلوہ آیا۔ آپ کھانے لگے۔ ایک صاحب جو پاس بیٹھے تھے اور بڑے بزرگ بن رہے تھے اپنا زہد جتانے کے لئے انھوں نے حلوہ کو ہاتھ نہیں لگا۔ آپ نے فرمایا۔ او نادان! کھا اسے، ٹھنڈا پانی حلوہ سے بھی بڑی نعمت ہے جسے تو شب و روز گھونٹتا ہے اور کوئی تامل نہیں کرتا پھر حلوہ کھانے میں کیوں تامل ہو رہا ہے۔

ایک شخص کے کھانے میں مرغی آئی اس نے مرغی الگ ہٹا دی۔ آپ نے فرمایا اس میں جو چیز حرام ہو اسے ہٹا دو اور کھاؤ خواہ مخواہ تصنّع نہ کیا کرو خدا تصنّع ناپسند کرتا ہے۔

جنازہ سب سے بڑی نصیحت ہے۔

حسن بصری نے ایک بوڑھے شخص کو ایک جنازہ میں دیکھا جب دفن سے فارغ ہوئے تو قریب جا کر فرمایا۔ بوڑھے میاں! کیا اس میت کو اب یہ آرزو ہو رہی ہو گی کہ یہ دنیا کی طرف لوٹا دیا جائے اور خوب نیک کام کرے اور اپنی خطاؤں کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے بزرگ نے کہا یقیناً اس کی یہ آرزو ہو گی۔ فرمایا تو پھر ہم کیوں نہ اس میت کی طرح ہو جائیں کہ ہماری بھی یہی آرزو ہو، اور جب کہ ہمیں اس آرزو کی تکمیل کا ابھی وقت ملا ہوا ہے کیوں نہ ہم یہ آرزو پوری کر لیں۔ پھر یہ کہتے ہوئے قبرستان سے لوٹے۔ یا اللہ! اگر دل میں زندگی باقی ہے تو اس سے بڑھ کر اور کیا نصیحت ہو سکتی ہے مگر افسوس دلوں میں زندگی نہیں رہی جو اس نصیحت پر کان دھریں۔

نفس کو پامال کرو

حضرت حسن بصری ایک رات تہجد کے لئے اٹھے تو انھیں اپنی طبیعت مزید آمادہ خواب نظر آئی، نماز کی طرف نفس کا میلان نہیں ہو رہا تھا۔ جھنجھلا کر بیٹھ گئے اور پوری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ ایک صاحب کو اس کی خبر ہوئی تو پوچھا۔ آپ نے ایسا کیوں کیا ؟ فرمایا میرا

نفس نیند کی خاطر تیرے ارادۂ نماز پر غالب آرہا تھا تو میں نیند کو خیرباد کہہ کر اپنے نفس پر غالب آگیا اور خدا کی قسم میں اسے پامال ہی کرتا رہوں گا یہاں تک کہ وہ میرے ارادہ پر غالب نہ آسکے پھر فرمایا نفس برائیوں کی طرف کھینچتا ہے لیکن جب طاعت میں وہ تمہارا ساتھ نہیں دیتا تو معصیت میں تم اس کا ساتھ کیوں دو۔

داماد کے انتخاب کا مسئلہ

ایک شخص نے حسن بصریؒ کی لڑکی کو پیغام نکاح دیا اور اس لڑکی کے لئے ایک لاکھ درم خرچ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ بیوی نے کہا اس شخص سے لڑکی کا نکاح کر دیجئے۔ آپ اس کے رغبت دیکھ رہے ہیں اور اسکے خرچ کا ارادہ بھی آپ نے سن لیا، فرمایا۔ وہ شخص جو شادی پر ایک لاکھ درم خرچ کرے وہ جاہل اور مغرور ہے اور ہم پر لازم ہے کہ ایسے شخص سے لڑکی کا نکاح ہرگز نہ کریں۔ چنانچہ آپ نے اس کا پیغام رد کر دیا، اور ایک نیک آدمی سے بیٹی کی شادی کر دی۔

ایک شخص نے حضرت حسن بصری سے اپنی بیٹی کی شادی کے بارے میں مشورہ کیا، کہنے لگا میری بیٹی کو ایک شخص نے پیغام نکاح دیا ہے جو دولتِ دنیا سے مالا مال ہے۔ آپ سے اس بارے میں مشورہ چاہتا ہوں۔ فرمایا اپنی بیٹی کو کسی نیک آدمی کے نکاح میں دو، وہ خوش رہے گا تو اس کی قدر کرے گا اور ناراض ہوگا تو اس پر ظلم نہ کرے گا۔

کاش اس دور کے لڑکیوں والے بھی یہ مشورہ سن لیتے جو دولت مند داماد کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ حضرات نہایت ہی ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں جو داماد کے انتخاب میں اس کی مالی حالت زیادہ دیکھتے ہیں تجربات گواہ ہیں کہ لڑکی کو مالدار گھروں میں دلی سکون و راحت و محبت کی نظر کم ملتی ہے بخلاف غریب و متوسط حال دین دار گھرانوں کے کہ وہاں میاں بیوی میں عموماً خوش گوار تعلقات ہوتے ہیں اور سکون و عافیت کی فضا ملتی ہے شریعت نے بھی شادی بیاہ میں مالداری سے زیادہ دینداری کو مدنظر رکھنے کی ہدایت کی ہے۔

خدا اُسے ذلیل کر دے گا

حضرت حسن بصری نے فرمایا۔ جس نے روپے پیسے کو زیادہ اہمیت دی خدا اُسے قیامت کے دن ذلیل کر دے گا۔ فرمایا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب روپیہ پیسہ ڈھالا گیا تو شیطان نے اُسے چوما اور آنکھوں سے لگایا اور کہنے لگا۔ جو تجھ سے محبت کریں گے حقیقت میں وہ میرے بندے ہوں گے۔ میں انھیں جس طرح چاہوں گا نچاؤں گا۔

شیطان کے طواہ

فرمایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے کہ دنیا شیطان کی کھیتی ہے اور دنیا دار شیطان کے طواہ و ملازم ہیں۔

خلوص و توکل

فرمایا: بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں سے فرمایا تھا۔ اللہ کے لئے عمل کرو۔ اپنے پیٹ کے لئے عمل نہ کرو۔ بے شک چڑیاں نہ بوتی ہیں نہ کاٹتی ہیں لیکن ہر صبح آشیانے سے نکلتی ہیں اور شام کو بھرے پیٹ واپس ہوتی ہیں۔ اگر تم کہو کہ تمہارا پیٹ اُن کے پیٹ سے بڑا ہے تو میں کہوں گا کہ تم سے بھی بڑے بڑے پیٹ والے جانور ہیں جو نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں، بس خدا ہی ہے جو انھیں بھی روزی دیتا ہے۔

بے وقوف نہ ہو

فرمایا۔ تم چرواہے کی بکری سے زیادہ بے وقوف نہ ہو۔ وہ چرواہے کی ایک آواز پر رک جاتی ہے اور اس کے اشارے پر چلنے لگتی ہے اور تم ہو کہ اپنے مالک کی بار بار کی زجر و توبیخ کے باوجود برائیوں سے نہیں رکتے ہو نہ تاکید شدید کے باوجود نیکیوں کی طرف سبقت کرتے ہو۔

عقل مند آدمی

حسن بصریؒ کی موجودگی میں ایک شخص نے دوسرے کو گالی دی۔ جسے گالی دی گئی وہ چہرے سے پسینہ پونچھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور یہ کہہ کر وہاں سے ہٹ گیا (جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کر جائے تو یہ بڑی اولو العزمی کا کام ہے) آپ نے فرمایا سبحان اللہ یہ شخص کیا ہی عقل مند ہے۔ اور افسوس ہے، ان جاہلوں پر کہ یہ عقل سے کورے ہیں۔ فرمایا۔ ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاریؓ کو ایک شخص نے گالی دی۔ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا میرے اور جنت کے درمیان ایک گھاٹی ہے۔ اگر میں وہ گھاٹی پار کر گیا تو جو بُرا بھلا تم مجھے کہہ رہے ہو میں اس سے اچھا ہوں۔ اور اگر گھاٹی پار نہ کر سکا اور خدا نخواستہ جہنم رسید کر دیا گیا تو اس سے بھی زیادہ برا ہوں جو تم میرے بارے میں کہہ رہے ہو۔ پس اے شخص تو گالی سے باز آ۔ تجھے بھی اس خدا کے حضور پہونچنا ہے جو ہر نیک و بد سے آگاہ ہے اور ہر ایک کے دل و نظر کی خبر رکھتا ہے۔

عقل مند و بے وقوف کی پہچان

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا۔ عقلمند آدمی کی زبان اس کے دل کے پیچھے ہوتی ہے جب وہ کچھ بولنا چاہتا ہے تو اس کا پہلا سابقہ دل سے ہوتا ہے وہ پہلے سوچتا ہے پھر بولتا ہے اور نادان و کم ظرف کا دل اس کی زبان کے پیچھے ہوتا ہے وہ پہلے زبان پر آئی بک جاتا ہے اور سوچتا بعد میں ہے۔

عجیب شخص

حضرت حسن بصریؒ نے ایک بوڑھے کو دیکھا کہ وہ کنکریوں سے کھیل رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔ یا اللہ! حور عین سے میری شادی کر دے فرمایا، بوڑھے میاں تم بھی عجیب ہو خواہش ہے حور عین کی اور کام ہے دیوانوں کا۔

غافل! ان مرطاعتوں کے واسطے۔ چاہنے والا بھی اچھا چاہئے۔

معاملہ بڑا ہولناک ہے

آپ ایک نوجوان کے پاس سے گذرے جو بہت ہنس رہا تھا۔ فرمایا۔ بیٹے! کیا تم نے پل صراط پار کرلیا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ فرمایا۔ کیا تمہیں معلوم ہوگیا ہے کہ تم جنت میں جاؤ گے یا جہنم میں؟ بولا نہیں۔ فرمایا خدا تمہارا بھلا کرے پھر کیسے اتنا ہنس رہے ہو حالانکہ معاملہ نہایت ہولناک ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ نوجوان پھر کبھی ہنستا ہوا نہ دیکھا گیا۔

فرمایا۔ یہ روایت مجھے پہونچی ہے کہ بسا اوقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگ سے اپنا ہاتھ قریب کردیتے اور فرماتے۔ اے خطاب کے بیٹے! کیا تو آگ کی جلن برداشت کرلے گا اور کیا تو خدا کی ناراضگی دفع کرنے کی طاقت رکھتا ہے؟ پھر جہنم کی آگ سے اللہ کی پناہ مانگتے۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا۔ یہ حال تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خوف کا جنہیں کئی بار جنت کی بشارت دی جاچکی تھی۔ تو اے لوگو! تم کیسے جہنم سے بے خوف ہوجاتے ہو۔

تین چیزوں سے پرہیز کرو

فرمایا: تین چیزوں سے پرہیز کرو تاکہ شیطان تم پر قابو نہ پائے (۱) کسی عورت کے پاس تنہائی میں نہ جاؤ اگرچہ قرآن پڑھانے کا ارادہ ہو۔ (۲) کسی بادشاہ اور حاکم کے پاس آمد و رفت نہ رکھو اگرچہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ارادہ ہو (۳) کسی بدعتی سے اُٹھا بیٹھک نہ رکھو ورنہ تمہارا دل مریض ہوجائے گا اور تمہارا دین خراب ہوجائے گا۔

تین چیزوں میں لذت محسوس کرو

فرمایا: تین چیزوں میں لذت محسوس کرو (۱) نماز میں (۲) تلاوتِ قرآن میں (۳) ذکر الٰہی میں۔ اگر یہ لذت حاصل ہو تو خوش ہوجاؤ اور اسے باقی رکھو، اگر اس سے محروم ہو تو سمجھ لو کہ رحمت کا دروازہ تم پر بند ہے تم اسے کھولنے کی کوشش کرو۔

قرآن

فرمایا: اے لوگو! بے شک یہ قرآن مومنوں کے لئے شفاء ہے۔ متلاشی حق کے لئے ہدایت ہے جس نے اس سے ہدایت حاصل کی اسے ہدایت مل گئی اور جس نے پہلو تہی کی وہ خسران نصیب ہوا اور مستحق مصائب بنا۔

فرمایا: قرآن پڑھنے والے تین طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو طلب دنیا کی غرض سے پڑھتے ہیں۔ دوسرے وہ جو حروف کی نوک پلک درست کرنے اور آواز بنانے سنوارنے کی فکر میں رہتے ہیں، انھیں قرآن کے احکام و حدود کی چنداں فکر نہیں ہوتی۔ حاملین قرآن کی یہ جنس بڑی تعداد میں ہے۔ خدا نہ کرے ان کی تعداد میں اضافہ ہو تیسرے وہ ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں اس کی آیات پر غور کرتے ہیں اور اس سے اپنے قلب و ذہن کا علاج کرتے ہیں۔ خدا ان کی تعداد بڑھائے۔

بہترین و بدترین کا اجتماع

مشہور شاعر فرزدق کی بیوی نوار کا انتقال ہوا تو اس کے جنازے میں کئی بڑے لوگ شریک ہوئے۔ حضرت حسن بصری بھی جنازہ کے ساتھ تھے۔ ایک جگہ فرزدق آپ سے قریب ہوا اور کہنے لگا حضرت! لوگ کہتے ہیں کہ آج جنازہ میں سب سے بہتر شخص اور سب سے بدتر شخص کا اجتماع ہوگیا ہے۔ فرمایا کیا مطلب؟ کہنے لگا۔ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت حسن بصری اس جنازہ کے ساتھ ہیں جو سب سے بہتر شخص ہیں۔ اور فرزدق بھی ساتھ ہے جو سب سے بدتر ہے۔ فرمایا۔ لوگ ایسا کیوں کہتے ہیں، نہ میں ان میں کا بہتر شخص ہوں نہ تم بدتر ہو لیکن فرزدق! ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم نے اس جیسے دن کے لئے کیا تیاری کر رکھی ہے۔ بولا ساٹھ سال سے لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دیتا ہوں۔ جب نوار دفن ہوچکی تو فرزدق نے چند اشعار کہے، جسے سن کر حسن بصری بہت روئے، پھر فرمایا۔ بعض اشعار حکمت سے پر ہوتے ہیں۔ اے ابوفراس (فرزدق) اللہ تم پر رحم کرے تمھیں حکمت و بصیرت اور نظر صحیح ملی ہوئی ہے تم اس دن کے لئے تیاری کرلو۔

جب فرزدق کا انتقال ہوا اور اک صاحب نے اُسے خواب میں دیکھا اور اس کا حال دریافت کیا تو اس نے کہا۔ حضرت حسن بصری سے اُس دن کی ملاقات نے بڑا کام کیا ان کی دعا اور نصیحت سے میں قابل رحم ٹھہرایا گیا، اور اللہ تعالےٰ نے مجھے اپنے آغوش رحمت میں لے لیا۔

غیبت پر ھدیہ

حضرت حسن بصری کو معلوم ہوا کہ فلاں شخص نے ان کی غیبت کی ہے تو اس کے پاس ایک طبق کھجور بھیج دیا اور کہلایا۔ تم نے میری غیبت کرکے مجھے اپنی نیکیوں کا ہدیہ دیا تو میں بطور بدلہ تمھیں یہ ہدیہ بھیج رہا ہوں۔ وہ بہت شرمندہ ہوا اور غیبت کرنے سے ہمیشہ کے لئے توبہ کرلی۔

مدح سرائی

حضرت حسن بصری نے فرمایا: کسی کی تعریف کرنا اُسے ذبح کرنا ہے اس سے پرہیز کرو روایت آئی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک آدمی کی تعریف کی۔ آپ نے فرمایا تم نے اس کی پیٹھ کاٹ دی۔ اگر اس نے یہ تعریف سن لی تو اندیشہ ہے کہ وہ اس کے بعد کبھی فلاح نہ پاتے گا۔

وہ حضرات جنھیں مدح سرائی کا چسکا لگا ہوا ہے اور بیجا و بجا تعریف کا پل باندھنا انھوں نے اپنی عادت بنالی ہے وہ ذرا اس ارشاد نبوی پر غور فرمائیں اور اپنی اس حرکت کی مضرتوں کا خیال کریں جو اس کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس حرکت مدح سرائی کی قباحت کا اندازہ اس روایت سے بھی کیا جاسکتا ہے جسے امام مسلم نے صحیح مسلم میں نقل کیا ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی شخص تمہاری تعریف کرے تو اس کے منہ میں دھول جھونک دو۔"

مگر افسوس یہ مدح سرائی و قصیدہ خوانی کی وبا نیز یہ طرفین سے قصائد مدحیہ کے تبادلے "من تُرا حاجی بگویم تو مُرا حاجی بگو" کی عادت اور یہ تعریف پسندی وہ بھوت ہے جو انسے بچھا

ہمالے [illegible] ا ء کا مرض، اور یہ وہ شاخ خود تجود ہے کا جرثومہ نہ صرف ان روایات سے ناواقف طائفہ میں بلکہ اس دور کے حاملین کتاب و سنت اور بڑے بڑے صاحبان جبہ و دستار تک کے رگ و ریشے میں سرایت کرگیا ہے۔ فانا للہ و انا الیہ راجعون۔

کمال خاکساری

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاکساری کا یہ حال تھا۔ آپ گدھے کی سواری کرتے، موٹا معمولی لباس پہنتے، کھانے کے بعد اپنی انگلیاں چاٹ لیتے۔ زمین پر بیٹھ کر کھالیتے اور آپ پر بے شمار درود و سلام ہو۔ فرماتے "میں ایک ناچیز بندہ ہوں۔ کھاتا ہوں جیسے بندۂ ناچیز کھاتے ہیں"۔

فرمایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث مروی ہے کہ وہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو دیکھا کہ سرکار دو عالم ابی و امی صلی اللہ علیہ وسلم ست کھجور کی رسی سے بنی ہوئی ننگی چارپائی پر سوتے ہیں اور جسم مبارک پر رسیوں کے گہرے نشانات پڑ گئے ہیں۔ حضرت عمر سے ضبط نہ ہو سکا اور آپ کی یہ حالت دیکھ کر وہ بے ساختہ رو پڑے۔ آپ نے فرمایا، عمر! روتے کیوں ہو؟ بولے۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر زمانہ کی یہ ستم ظریفی یاد آگئی کہ قیصر و کسریٰ تو عیش کر رہے ہیں اور آپ خدا کے محبوب و برگزیدہ ہو کر اس موٹی رسی سے بنی ہوئی چارپائی پر دراز ہیں فرمایا۔ عمر! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ان دونوں کو دنیا کا عیش فانی ملے اور ہمیں آخرت کا عیش جاودانی نصیب ہو؟ عمر بولے۔ یقیناً اے اللہ کے رسول ہمیں یہی پسند ہے۔ فرمایا تو ہماری اور اس دنیا کی مثال اس مسافر کی سی ہے جو سفر کر رہا ہو اور راستہ میں کسی سایہ دار درخت کے نیچے ذرا دم لینے کے لیئے رک گیا ہو۔ ظاہر ہے وہ تھوڑی دیر بعد ہی اسے چھوڑ کر آگے کی راہ لے گا۔

اسی سے ملتی جلتی وہ مشہور تمثیل بھی ہے ؎

زندگی انساں کی ہے مانند مرغ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا

حکام اپنے کرتوت کا نتیجہ ہوتے ہیں

حضرت حسن بصری کی موجودگی میں ایک شخص حجاج بن یوسف پر بددعا کرنے لگا، فرمایا اللہ تم پر رحم کرے، ایسا نہ کرو۔ وہ تمہارے کرتوت کی وجہ سے تم پر مسلط کیا گیا ہے۔ میں تو ڈرتا ہوں اگر وہ معزول ہوا یا مر گیا تو بندر اور سور اس کے بعد حاکم بنا دیئے جائیں گے۔ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ حکام تمہارے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں جیسے تمہارے اعمال ہونگے ویسے ہی حکام ہوں گے۔ مجھے یہ خبر پہونچی ہے کہ ایک شخص نے ایک بزرگ کے پاس خط لکھا اور حکام کے مظالم کی شکایت کی۔ ان بزرگ نے جواب میں لکھا میرے بھائی تمہارا خط مل گیا ہے جس میں تم نے حکام کے مظالم کی شکایت کی ہے مگر جو شخص گناہوں کا مرتکب ہو اُسے سزا کی شکایت نہ کرنی چاہیئے۔ میرا خیال ہے آپ لوگ جن مظالم کے شکار ہیں وہ آپ لوگوں کے گناہوں کی سزا ہے۔

فرمایا۔ مجھے یہ حدیث پہونچی ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے منبر نبوی پر خطبہ دیا اور فرمایا۔ اے لوگو! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں میں بادشاہوں کا بادشاہ ہوں سارے بادشاہوں اور حاکموں کا دل میری مٹھی میں ہے۔ جب لوگ میری اطاعت کرتے ہیں تو بادشاہوں اور حاکموں کو ان کے لیئے رحمت بنا دیتا ہوں، اور جب لوگ میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں حکام کو ان پر عذاب بنا دیتا ہوں، لہٰذا تم حکام کو گالی نہ دو بلکہ اپنے گناہوں سے توبہ کرو، میں انھیں تم پر مہربان بنا دوں گا۔

اگر فلاں نہ ہوتے

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا۔ اگر شرفا نہ ہوتے تو زمین دھنس جاتی، اگر صلحا نہ ہوتے تو امت ہلاک ہوجاتی۔ اگر علما نہ ہوتے تو لوگ چوپایوں کی طرح ہوجاتے۔ اگر بادشاہ اور حاکم نہ ہوتے تو لوگ ایک دوسرے کو کھا جاتے، اگر احمق نہ ہوتے تو دنیا ویران ہوجاتی (یہ عربی جملہ لولا الحمقاء لخربت الدنیا" ضرب المثل بن چکا ہے) اور اگر ہوا نہ ہوتی تو ساری چیزیں بدبودار ہوجاتیں۔

بیماری زکوٰۃ ہے

فرمایا۔ بیماری بدن کی زکوٰۃ ہے جیسے صدقہ مال کی زکوٰۃ ہے۔ جو جسم کبھی بیمار نہیں ہوا اس مال کی طرح ہے جس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی گئی۔

یہ مومن کا شیوہ نہیں

آپ سے پوچھا گیا، کیا خیال ہے آپ کا اس شخص کے بارے میں جو بار بار گناہ کرتا ہو اور توبہ کرلیتا ہو۔ فرمایا۔ یہ مومن کا شیوہ نہیں، مومن گناہ پر اصرار نہیں کرتا۔

مُردہ دلی ناپسندیدہ چیز ہے

فرمایا۔ سعید بن جبیر نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ مردہ دلی سے عبادت کر رہا ہے تو فرمایا۔ اے اللہ کے بندے اسلام جاندار ہے، جاندار عبادت کر۔ مردہ دلی سے عبادت نہ کر ورنہ خدا تجھے مردہ دل بنا دے گا۔

فرمایا۔ حضرت عائشہؓ نے ایک شخص کو جھکا ہوا دیکھا تو فرمایا۔ انھیں کیا ہوگیا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ ایک بزرگ آدمی ہیں جو غم دو جہاں سے نڈھال ہیں۔ فرمایا! عمر تو ان سے زیادہ بزرگ تھے مگر ان کا یہ حال تھا کہ جب چلتے تو زور سے چلتے، جب بولتے تو قوت کے ساتھ بولتے، اور جب پیٹتے تو خوب پیٹتے، بناوٹ سے باز آؤ، خدا بناوٹی عمل قبول نہیں کرتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ ایک شخص کو مریل چال چلتے دیکھا تو فرمایا۔ "ظالم ہمارے دین کو کیوں مارے ڈالتا ہے" ایک دفعہ ایک شخص کو سر جھکاتے ہوئے چلتے دیکھا تو فرمایا سر اٹھا کر چل، اسلام مریض نہیں ہے۔

گویا دینداری کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ آدمی بجھا ہوا رہے اور بیماروں کی طرح

پھونک پھونک کر قدم رکھے اور خواہ مخواہ مسکین بنا چلا جائے۔

سودائی لوگ

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا۔ میں نے ستر بدری صحابہ کو دیکھا ہے اگر تم انہیں دیکھو تو کہو گے یہ کوئی سودائی لوگ ہیں جنہیں کسی چیز کا سودا سمایا ہوا ہے۔ اور وہ تمہارے آج کے اچھے لوگوں کو کبھی دیکھیں تو اسلام سے ان کے تعلق کی یہ نوعیت دیکھ کر اس کے سوا کچھ نہ کہیں گے کہ انہیں اسلام سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ اور اگر وہ تمہارے آج کے بُرے لوگوں کو دیکھیں تو ان کی حالت کو دیکھ کر وہ یہی کہیں گے کہ یہ لوگ قیامت پر یقین نہیں رکھتے۔

آنکھ کا سرمہ

فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام سے کہ جب تم دیکھو، غافلوں کو ہنسی سوجھ رہی ہے تو تم گریہ وزاری کو اپنی آنکھ کا سُرمہ بناؤ۔

دنیا میں دیدار الٰہی ناممکن ہے

پوچھا گیا کیا دنیا میں دیدار الٰہی ممکن ہے؟ فرمایا۔ نہیں۔ پوچھا گیا اور آخرت میں؟ فرمایا۔ ہاں۔ سوال ہوا یہ فرق کیوں ہے؟ فرمایا۔ دنیا فانی ہے اور دنیا کی ہر شے فانی ہے آخرت باقی ہے اور اس کی ہر شے باقی غیر فانی ہے، اور محال ہے کہ فانی سے باقی کا دیدار ہو لیکن جب قیامت آجائے گی تو اللہ غیر فانی نظر عطا کرے گا جس سے اُس ذات غیر فانی کا دیدار ممکن ہوگا۔

واعظ کون ہے؟

فرمایا۔ واعظ وہ ہے جس کا عمل لوگوں کے لئے وعظ ہو نہ کہ اس کا قول۔
حضرت حسن بصریؒ کی حالت یہ تھی کہ جب وہ کسی شخص کو کسی بات کی تلقین کرنا چاہتے تو پہلے اپنے عمل کا جائزہ لیتے اور اسے پہلے اپنے اوپر نافذ کرتے پھر دوسروں کو اس عمل کی تلقین کرتے، اور جب کسی شخص کو کسی عمل سے روکنا ہوتا تو پہلے اپنے اوپر نظر کرتے اور خود کو اس سے باز رکھتے پھر دوسرے کو باز رہنے کی تاکید کرتے۔ کیوں کہ گفتار بلا کردار غیر موثر ہوتا ہے۔ واعظین قوم کی نصیحتیں اب بھی جاری ہیں۔ نہ پند و موعظت کے طول و عرض میں کوئی کمی ہوتی ہے نہ زور بیان میں کوئی کمی آئی ہے مگر واعظین کی بے عملی کے سبب قوم میں اثر پذیری درجہ صفر تک پہونچ گئی ہے۔
کاش! عہد حاضر کا یہ طائفہ واعظین و مصلحین اس نکتہ کو سمجھ لیتا اور اپنی نصیحتیں موثر بنانے کے لئے یہ تدبیر اختیار کرتا پھر نہ قوم بے اثری کا شکار ہوتی نہ ان کی چیخ و پکار بے کار جاتی۔

صحیفۂ اعمال کا املا

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا۔ لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارا صحیفۂ اعمال کھول دیا ہے اور دائیں بائیں دو فرشتے بٹھا دیتے ہیں، جنہیں تم میں ہر شخص املا کرا رہا ہے۔ اب یہ تمہاری سمجھ کا امتحان ہے کہ تم کیا املا کراتے ہو اور کس مقدار کی نیکی یا بدی سے اپنا صحیفۂ اعمال سیاہ کرتے ہو۔ تمہیں اس کا ہوش رہنا چاہئے کہ ہر چھوٹی بڑی بات درج ہو رہی ہے۔ قیامت کے دن کوئی بات بھی گم نہ پاؤ گے۔ اور اللہ تعالیٰ اس دن کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ کرے گا۔ مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی۔

(جو شخص بھی بدی کرے گا اس کی سزا پائے گا۔ خدا کے سوا وہاں کوئی اس کا حامی و مددگار نہ ہوگا)
تو اس آیت کو سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ خدا کی قسم یہ تو کمر دوہری کر دینے والی آیت نازل ہوئی ہے۔
حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔ جب ابوبکر صدیقؓ جیسے نیکوکار جنہیں بارہا جنّت کی خوش خبری دی جا چکی ہے دن قیامت کے محاسبہ سے اس قدر گھبرا رہے ہیں تو سوچو ہم گنہگاروں کی گھبراہٹ کا کیا عالم ہونا چاہئے۔ پس اے مسلمانو! عبرت حاصل کرو اور بدی سے پرہیز کرو تاکہ اس بڑے دن کے عذاب سے محفوظ رہ سکو۔

ٹال مٹول نہ کرو

فرمایا۔ اے لوگو! ہر شخص کو فقط ایک جان ملی ہوئی ہے اگر وہ عذاب خداوندی سے نجات پا گئی تو کوئی مبتلائے عذاب اسے ضرر نہ پہونچا سکے گا۔ اور اگر وہ ہلاک ہوئی تو کوئی نجات پانے والا اسے فائدہ نہ پہونچا سکے گا۔ پس اے لوگو! خدا تمہارا بھلا کرے نیکیوں میں ٹال مٹول سے بچو۔ موت کا وقت معلوم نہیں۔ تم سے پہلے بہت سے لوگ اسی ٹال مٹول میں رہ گئے اور موت نے آلیا پھر ذرہ بھی انہیں مہلت عمل نہ مل سکی، اور تمہارا بھی کچھ ٹھیک نہیں کب موت کا فرشتہ آن پہونچے اور کس ٹھکانے لگا دیئے جاؤ۔ خدا اس بندے پر رحم فرمائے جو عمر تمام ہونے سے پہلے ذخیرۂ عمل جمع کر لے اور زاد سفر تیار رکھے۔

فریب نہ کھاؤ

فرمایا۔ اے لوگو! فریب خوردہ نہ ہو تمہیں خدا کی طرف سے کوئی پروانۂ عمل نہیں ملا ہے، بے شک وہ عظیم اور ہولناک گھڑی تمہارے سامنے ہے، اور تمہیں لازماً قبر میں جانا ہے اور اپنے عمل کا سہارا لینا ہے۔ عمل نیک ہوا تو اچھا سہارا ملے گا اور بُرا ہوا تو بُرا سہارا میسر ہوگا۔ نیکیوں میں آگے بڑھو، فرصت کو ضائع نہ کرو۔ ٹال مٹول سے پرہیز کرو تمہیں ہر لحہ اس کا خیال رہے کہ قبر میں اترتے ہی سوالات شروع ہو جائیں گے اس لئے تم اس سے پہلے ہی جوابات تیار کر لو۔
فرمایا۔ اے انسان! اپنے اردگرد خدام و متعلقین کا اجتماع دیکھ کر فریب میں مبتلا نہ ہو۔ یہ درندے ہیں جو تجھے نوچ کھانے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ تو مرا کہ سب تیری دولت پر جھپٹ پڑیں گے اور تیرے دفن سے فارغ ہوتے ہی اُن سے غم کا اثر زائل ہو جائے گا، وہ کسی تاخیر کے بغیر اپنے رنگین ملبوسات زیب تن کر لیں گے اور اپنی رنگ رلیوں اور ہنسی قہقہہ میں لگ جائیں گے۔ اُدھر قبر میں تجھ سے سوال و جواب ہو رہا ہوگا اور نہ جانے

تجھ پر کیا گزر رہی ہوگی ادھر تیری آل اولاد اور متعلقین اپنی دلچسپیوں میں مصروف ہوں گے انہیں تیری کوئی فکر نہ ہوگی۔ پس اے انسان اپنا فکر آپ کر۔ اور قبر میں اپنے اعمال صالحات بھیج لے۔ آل اولاد ہی کی اصلاح حال کے پیچھے نہ پڑا رہ۔ اس دن کے لئے کچھ نیکیوں کا ذخیرہ کر لے جس دن کہ تو ہر نیکی بدی موجود پائے گا۔ خدا تجھے ہوشیار کرتا ہے اور وہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔

ابن الجوزی نے صفۃ الصفوۃ (ج ۴ صلا) میں یہ واقعہ ذکر کیا ہے کہ بصرہ کے ایک عابد کی موت کے وقت اس کا باپ رونے لگا۔ ماں بھی رونے لگی۔ بال بچے بھی رونے لگے۔ اس عابد نے سب سے الگ الگ پوچھا کہ آپ لوگ کیوں روتے ہیں؟ ماں باپ نے کہا۔ جدائی کے غم اور وحشت کے ڈر سے روتے ہیں۔ بچوں نے کہا۔ ہم اس لئے روتے ہیں کہ آپ کے بعد ہم یتیم و بے سہارا ہو جائیں گے۔ بیوی نے کہا میں بیوگی کے غم سے روتی ہوں۔ اس عابد نے کہا۔ افسوس تم سب بس اپنے لئے روتے ہو تم میں سے کوئی نہیں جو میرے لئے روتے میرے آخری معاملہ کو سوچ کر روتے۔ قبر میں میرے خاک آلود ہونے کو سوچ کر روتے، تم میں سے کوئی نہیں جو میرے لئے منکر نکیر کا سوال سوچ کر روتے۔ اور تم میں سے کوئی نہیں جو اللہ تعالیٰ کے حضور میری پیشی کو سوچ کر روئے۔

ابن الجوزی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب آدمی مرجاتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں ما قدم .... اس شخص نے آخرت کے لئے کیا عمل بھیجا ہے؟ اور وارث کہتے ہیں۔ ما اخر اس نے ہم لوگوں کے لئے کیا چھوڑا ہے؟ اکبر مرحوم فرماتے ہیں۔

کوئی مرا تو پوچھو کہ کیا لے گیا وہ ساتھ۔ بالکل فضول بحث ہے، وہ چھوڑ کیا گیا ہے

وہ یہ ہنسی تعجب انگیز ہے۔

حضرت حسن بصریؒ نے عید کے دن نماز فجر کے بعد کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ بہت کھل کھلا کر ہنس رہے ہیں اور بڑی ہنسی دل لگی میں مصروف ہیں۔ فرمایا۔ اے لوگو! رمضان کا مہینہ اللہ تعالیٰ نے اس لئے دیا ہے کہ لوگوں کو نیکیوں کی پریکٹس ہو جاتے، طاعت میں سبقت کر کے وہ رحمت خداوندی کے اہل بن جائیں اور کار خیر میں کوشش کر کے دخول جنت کے مستحق ہو جائیں، چنانچہ کچھ لوگوں نے اس مبارک موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور کامیاب ہو گئے، اور کچھ دوسروں نے کوتاہی کی اور ناکام ہوئے۔ آج کا دن نیکوکاروں کی کامیابی اور بدکاروں کی ناکامی کا دن ہے۔ آج آپ حضرات کی یہ قہقہہ بار ہنسی میرے لئے تعجب انگیز ہے۔ خدا کی قسم اگر پردہ اٹھ جائے اور حقیقت حال واضح ہو جائے تو نیکوکار و بدکار سبھی اپنی ہنسی اور اپنا بناؤ سنگار بھول جائیں گے۔ اور اپنے بیٹے کپڑوں سے غافل ہو جائیں گے۔ اگر آپ حضرات کو خبر مل گئی ہے کہ آپ کی محنت ٹھکانے لگیں اور آپ کی نیکیاں قبول کر لی گئی ہیں تو آپ پر شکر گذاری واجب ہے اور یہ قہقہہ بار ہنسی شکر گذاری کی علامت نہیں۔ اور آپ حضرات کو اگر اپنے عمل کی پذیرائی مشتبہ نظر آتی ہے تو یہ ہنسی کسی متردد و خائف کا وطیرہ نہیں۔

جو خیر میں ہوگا وہ شر سے ہوگا

فرمایا۔ وہ آدمی ہمیشہ خیر میں ہوگا جس کا دل اسے نصیحت کرتا رہے جو عمل کے بارے میں اور فکر کرتا رہے، جو اللہ کو یاد رکھے اور اپنا محاسبہ کرتا رہے، اور وہ آدمی شر میں ہوگا جو کار خیر میں ٹال مٹول کرے۔ خواہش نفس کی پیروی کرے، غافل و سست رہے اور طرح طرح کی آرزوئیں کرے۔

بہترین تمثیل

حضرت حسن بصریؒ نے ایک دن کچھ بوڑھوں اور کچھ جوانوں کو بلایا جب سب آگئے تو آپ بوڑھوں سے مخاطب ہوتے اور فرمایا۔ آپ حضرات ایک بات بتائیں جب کھیتی پک جاتی ہے تو کیا کی جاتی ہے؟ بوڑھوں نے جواب دیا کاٹ لی جاتی ہے پھر جوانوں سے مخاطب ہوتے فرمایا کتنی ہی شاداب کھیتیاں آپ لوگوں نے دیکھی ہوں گی جو ہری بھری اور لہلہا رہی ہوتی ہیں مگر جب کوئی آفت آن پڑتی ہے تو ساری شادابی ختم ہو جاتی ہے، کوئی حادثہ آتا ہے اور اس لہلہاتی فصل کو تباہ کر دیتا ہے گویا شادابی کا دور بھی کچھ پائدار نہیں ہوتا یہ کہتے ہی آپ آبدیدہ ہو گئے اور قرآن کی یہ آیت پڑھی ہ ویضرب اللہ الامثال للناس لعلہم یتفکرون .... " ..... اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے طرح طرح کی مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ لوگ سوچیں۔

آپ نے ان دونوں مثالوں سے دونوں طبقہ کو بڑی حکیمانہ نصیحت فرمائی۔ سمجھنے والوں کے لئے ان دونوں مثالوں میں بڑی نصیحت ہے۔ بوڑھوں کو احساس دلایا کہ بڑھاپے کے بعد موت کے سوا کوئی دوسری منزل نہیں، اور بڑھاپا و موت کے درمیان کوئی وقفہ نہیں، اس لئے بوڑھوں کو موت سے کسی لحظہ غافل نہ ہونا چاہئے اور کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر زاد آخرت تیار کر لینا چاہئے۔ جوانوں کو احساس دلایا کہ جوانی بھی کوئی قابل بھروسہ چیز نہیں، یہ جوانی کی تازگی و شادابی کسی وقت بھی نذر خزاں ہو سکتی ہے اس لئے موت سے غافل نہ رہو اور اپنی بے ثباتی کو فراموش نہ کرو۔ اور واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی بے ثباتی کا احساس اور موت کی یاد انسان کی عاقبت سنوارنے کا بڑا مؤثر ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ موت کو کثرت سے یاد کرو، اور فرمایا یہ موت کی یاد آخرت کی یاد دلاتی ہے" اور آخرت کی یاد انسان کو ٹھیک ٹھکانے رکھتی ہے۔

تنہا ہی سے تنہا

فرمایا۔ اے لوگو! تم تنہا مرو گے، تنہا اٹھائے جاؤ گے۔ تنہا تمہارا حساب لیا جائے گا کسی مرحلہ میں بھی کوئی تمہارا ساتھ نہ دے گا۔ اگر دنیا کے سارے انسانوں نے خدا کی اطاعت کی ہے اور تم نے نافرمانی کی ہے تو یاد رکھو سارے انسانوں کی اطاعت تمہارے کچھ کام نہ آسکے گی، تم تنہا اپنی سزا بھگتو گے۔ اور اگر سارے انسانوں نے نافرمانی کی ہے اور تم خدا کے تابع فرمان رہے ہو تو سارے انسانوں کی معصیت تمہیں کچھ بھی نقصان نہ پہونچا سکے گی پس تم اپنی فکر کرو، گنہگار نہ بنو۔ اگر تم گناہوں سے دور رہے تو تمہارا یہ جسم یہ گوشت پوست

جہنم کا ایندھن بننے سے بچ جائیں گے اور اگر تم گنہگار ٹھہرے تو یاد رکھو عذاب جہنم سے تمہیں کوئی نہ بچا سکے گا تمہارا جسم جہنم کا ایندھن ہوگا جہاں وہ برابر جلتا رہے گا۔ روح گھٹتی رہے گی مگر فنا نہ ہوگا۔

وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا

فرمایا۔ یہ روایت پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جنت میں نہ داخل ہوگا مگر وہ شخص جو رحم دل ہے۔ صحابہ نے کہا ہم سب رحم دل ہیں۔ فرمایا۔ رحم دلی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے نفس پر رحم کیا۔ اپنی اولاد پر رحم کیا اور خاص متعلقین پر رحم کیا پھر آپ کی آواز بلند ہوگئی اور آپ نے بہت زور دے کر فرمایا۔ رحم دل حقیقت میں وہ ہے جو عام انسانوں کے حق میں رحم دل ہو۔

اچھا اور برا آدمی

فرمایا۔ مجھے یہ روایت ملی ہے کہ ایک بار حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ کیا میں تمہیں اچھے اور برے کی پہچان نہ بتاؤں؟ لوگوں نے کہا۔ امیر المومنین ضرور بتایئے۔ فرمایا۔ اچھا آدمی وہ ہے جس کو عمر لمبی ملی اور اچھے کام کئے۔ لوگوں کو ہمیشہ اس سے خیر کی امید رہی۔ اور اس کے شر سے لوگ محفوظ رہے۔ اور برا آدمی وہ ہے جس کو عمر لمبی ملی اور اس نے برے کام کئے۔ لوگوں کو اس سے خیر کی امید رہی، نہ اس کے شر سے لوگ محفوظ رہے۔

ایک خواب

فرمایا۔ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ ایک بزرگ نے کسی فوت شدہ بزرگ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا میرے بھائی کیا حال ہے آپ کا؟ فرمایا دنیوی زندگی میں جو کچھ میں نے خرچ کیا تھا وہ سب مجھے محفوظ مل گیا لیکن جو چھوڑ کر آیا ہوں اس پر بڑا افسوس ہو رہا ہے کہ وہ میری محنت کی کمائی میرے کچھ کام نہیں آرہی ہے۔ کاش اس سے بھی میں نے ذخیرۂ آخرت بنالیا ہوتا۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔ پس اے لوگو! سمجھداری سے کام لو اور اپنی کمائی کو اپنے لئے ذخیرۂ آخرت بنالو مرنے کے بعد پچھتانا بیکار ہوگا۔

زیادہ نہ بولو

حضرت حسن بصریؒ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ بہت زیادہ بول رہا ہے۔ فرمایا بیٹے! ذرا کم بولا کرو۔ زبان پر بندش لگاؤ۔ عقلمندوں کا کہنا ہے کہ زبان سب سے زیادہ بندش کی مستحق ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث مروی ہے کہ لوگوں کو زیادہ تر ان کی زبان کے تراشے ہی جہنم میں لے جائیں گے۔

میں نے طبیعت ہی ایسی بنالی ہے

ایک صاحب نے حضرت حسن بصریؒ سے کہا۔ آپ کی مجلس میں کچھ ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو آپ کی غلطیاں تلاش کرتے ہیں تاکہ آپ کو بدنام کریں۔ فرمایا۔ کچھ حرج نہیں میرے بھائی! تم اس پر رنج نہ کرو میں نے اپنی طبیعت ہی ایسی بنالی ہے کہ لوگوں کی عیب جوئی مجھ پر گراں نہیں گزرتی۔ میں نے اپنی طبیعت کو دخول جنت، دیدار الٰہی اور رفاقت انبیاء کا آرزو مند بنالیا ہے۔ اب طبیعت کو ان خبروں سے کچھ گرانی نہیں کہ فلاں میرے عیوب ڈھونڈتا ہے اور فلاں میری خوبیاں تلاش کرتا ہے۔

ہر مسلمان دوسرے کے لئے آئینہ ہے

فرمایا۔ ہر مسلمان دوسرے کے لئے آئینہ ہے۔ جس طرح آئینہ داغ دھبہ واضح کر دیتا ہے اسی طرح ہر مسلمان کو چاہئے کہ دوسرے میں خرابی دیکھے اصلاح کی نیت سے اس پر واضح کردے تاکہ وہ شخص اپنی خرابی دور کر سکے۔

فرمایا۔ ہم سے پہلے جو سلف صالحین تھے وہ جب کسی سے ملتے تو اس سے کہتے میرے بھائی مجھے اپنی ساری خرابیاں نظر نہیں آتیں اور اپنے تمام عیوب خود نہیں جان پاتا۔ اس لئے آپ ہماری مدد کریں۔ آپ کو ہمارے اندر کوئی خرابی نظر آئے تو بتائیں اور ہمیں اس سے روکیں اور کوئی خیر نظر آئے تو اس کی رہنمائی فرمائیں۔

فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے۔ اللہ اس آدمی پر رحم کرے جو مجھ پر میری خرابیاں واضح کردے۔

یہ حال تھا ہمارے اسلاف کا مگر اب تو حالات ہی بدل گئے ہیں۔ اب خلوص کے ساتھ بھی کسی کو اس کی غلطی بتایئے اور اس کے کسی عیب کی نشاندہی کیجئے تو اسے ناگوار ہوتا ہے بلکہ بعض لوگ تو بری طرح الجھ پڑتے ہیں۔ پھر عیب کی نشاندہی کرنے والوں میں بھی عموماً اخلاص کی کمی ہوتی ہے اور اب تو عام طور پر لوگ تنقید برائے تنقید بلکہ برائے تنقیص کرتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ اب نہ کہنے والوں میں وہ خلوص رہا، نہ سننے والوں میں وہ خواہش رہی۔

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

کتابیں کا بقیہ

حقوق کی اہمیت و ضرورت، ان کی بقا و تحفظ اور ان کے خارجی و عملی پہلوؤں پر محققانہ نظر ڈالی گئی ہے ضمیمہ جات اور حوالوں کے اضافے نے اس کتاب کی اہمیت و افادیت کو اور زیادہ کردیا ہے۔ پالیٹکس کے طلباء اس کتاب سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اردو میں دوسری زبانوں کے تراجم کی کمی نہیں ہے لیکن معیاری ترجمے خال خال ہیں ترجمہ ایک مشکل ترین فن ہے انگلستان کے عالم کا قول ہے کہ "اپنا ہی خیال اپنی زبان میں صحیح طور پر خوبی سے بیان کرنا مشکل ہے چہ جائیکہ غیر کا قول غیر زبان میں کہا ہوا اپنی زبان میں پیش کیا جائے" کیونکہ اصل کتاب ہمارے سامنے نہیں ہے اس لئے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ فاضل مترجم ترجمہ کی اس دشوار گذار گھاٹی سے کس طرح پار ہوئے ہیں تاہم یا ترتیب الفاظ میں جملوں کے تسلسل زبان کی سلاست بیان کی شگفتگی اور روانی نے اس ترجمہ کو ذاتی تخلیق کی شان بخش دی ہے۔ (مرغوب امین کاظمی)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ

میری کتاب "پرانے چراغ" پریس میں تھی، خیال تھا کہ اس کے پریس سے باہر آنے تک ان پرانے چراغوں میں کسی ایسے نئے چراغ کا اضافہ نہ ہوگا جس سے ہماری بزم میں روشنی تھی، اور جس کے گل ہونے پر آنسو بہانے پڑیں گے، لیکن خدا کی ذات بے نیاز ہے، ان چراغوں میں ایک ایسے چراغ کا اضافہ ہوگیا جس کو گھر کا چراغ، بلکہ گویا شب چراغ کہنا بجا ہوگا اور جو کم سے کم فضلائے ندوہ کی بزم چراغاں میں (مشکل سے ایک دو ہستیوں کو مستثنیٰ کرکے جو عرصہ سے چراغ سحری ہو رہی ہیں) سب سے قدیم تھا، علم و فضل، ادب و انشاء، واقفیت و باخبری، مطالعہ و علمی خدمت، اور سب سے بڑھ کر متانت و شرافت، قدیم وضعداری و تہذیب، اور وقار و خودداری کے اس چراغ کے گل ہونے پر، اور بزم شبلی و سلیمان کے اس جانشین کے اٹھ جانے پر غالب کی زبان میں یوں فغاں سنج ہونا برمحل ہوگا، کہ ؎

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

جہاں تک ان سطور کے لکھنے والے کا تعلق ہے، اس کا تعلق تو مرنے والے سے چھوٹے بڑے بھائی کا تعلق تھا، احباب و واقفین سب جانتے ہیں، کہ وہ مجھ پر بڑے بھائی کی ہی شفقت فرماتے تھے اور میں بھی ان کا اسی طرح ادب کرتا، ان کے حکم کی تعمیل، انکی منشاء کی تکمیل میں روحانی مسرت محسوس کرتا، اور اس کو اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا جیسے ایک چھوٹا بھائی سمجھتا ہے جب سے ان سے مراسلت کا شرف حاصل ہوا، ہمیشہ ان کو برادر محترم کے الفاظ سے خطاب کرتا، اور وہ مجھے "برادر گرامی" لکھتے، گوناگوں روحانی و دوستانی تعلقات، مذاق و خیالات کے اتحاد، ان کی پرکشش ذات، علوئے نسبی، فطری شرافت، اور ایک طرح کی معصومانہ طبیعت کی وجہ سے انسے ایسی محبت اور انس محسوس ہوتا جو بہت کم معاصرین رفقاء اور اعزہ سے محسوس ہوتا تھا، آنے سے خوشی ہوتی، انکے جانے سے رنج، انکی مجلس سے اٹھنے کو جی نہ چاہتا، ان کے رہنے سے ایک عجیب طرح کی وابستگی محسوس ہوتی، دارالمصنفین کے جلسوں میں شرکت، اور اعظم گڑھ کی حاضری میں ایک کشش ان کی قربت اور شوق ملاقات ہی سے پیدا ہوتی، "دل را بہ دل رہیست"، غالباً ان کا بھی یہی حال تھا کہ ان کو جو موانست و وابستگی مجھ سے تھی وہ کم ہی لوگوں سے رہی ہوگی، اور آخر میں تو یہ تعلق بہت بڑھ گیا تھا، اس لئے ۱۳ر دسمبر ۷۴ء کو جب اچانک ان کی وفات کی خبر سنی تو بالکل یہ محسوس ہوا کہ ایک بڑے بھائی کا سایہ ایک چھوٹے بھائی کے سر سے اٹھ گیا اور زندگی میں ایک ایسا خلا محسوس ہونے لگا جس کا پر ہونا بظاہر ممکن نہیں معلوم ہوتا، اس کو کچھ وہی لوگ سمجھیں گے جنھوں نے قلم کو صرف فریضہ یا وظیفہ کی ادائیگی ہی کے لئے حرکت نہیں دی، بلکہ اس سے اپنا اور اپنے دوستوں اور بزرگوں کا دل خوش کرنا بھی پیش نظر رہا ہے، کہ مضمون لکھنے یا تصنیف کرنے کے دوران میں بے اختیار ان دوستوں اور بزرگوں کا تصور سامنے آجاتا ہے، اور وہ سامنے کھڑے نظر آجاتے ہیں، جو مضمون نگار کی خوشی سے خوش ہونے والے اس کی صحیح قدر کرنے والے اور مضمون کے صحیح نقاد اور جوہری ہوتے ہیں، یہاں مضمون نگاری کی سرحدیں شاعری سے مل جاتی ہیں اور یہ مضمون نگاری کا کوئی عیب اور مضمون نگار کا کوئی گناہ نہیں، جس سے وہ اپنی براءت ظاہر کرے، فطرت انسانی ہے، اور فطرت انسانی پر کبھی پہرہ نہیں بٹھایا جاسکتا، غالب کو غزل لکھتے وقت نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے تصور، اور ان کی رائے اور تاثر کے اشتیاق و انتظار سے روکا نہیں جاسکتا تھا، غالب کو ان کی داد تحسین سے جو تقویت و اطمینان حاصل ہوتا تھا، اور ان کو اس پر جتنا ناز تھا، اس کا اندازہ ان کے اس شعر سے ہوتا ہے ؎

غالب بہ فن گفتگو نازد بایں ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد

شاہ صاحب اگرچہ ہندوستان کے مستند و معتبر مصنفین میں تھے، ان کی تحریر و تصنیف کی عمر میری موجودہ عمر سے کچھ ہی کم رہی ہوگی، ہندوستان کی سب سے موقر علمی مجلس (دارالمصنفین) کے صدر نشین اور موجودہ اسلامی ہند کے سب سے بڑے مصنف (مولانا سید سلیمان ندویؒ) کے جانشین تھے، وہ زبان و ادب، الفاظ و محاورات کے استعمال، اور زبان کی صحت و سقم کے بارے میں سند کا درجہ رکھتے تھے، اور اب تھوڑے ہی لوگ زبان کی نوک پلک، اور اس کے مزاج سے اتنے واقف ہوں گے، جتنے وہ تھے۔ انھوں نے اردو کی معیاری مجلسیں لکھنؤ کی علمی ادبی صحبتوں اور اساتذۂ فن اور اساطین علم کی آغوش میں آنکھیں کھولی تھیں، اور تربیت پائی تھی، ہندوستان کی نہایت باوقار سرکاری اور غیر سرکاری مجلسوں، کمیٹیوں اور اکیڈمیوں کے ممبر تھے، "معارف" جیسے رسالہ کے مدیر اور کئی مقبول کتابوں کے مصنف تھے، اس سب کے نتیجہ میں اگر ان میں علم کا پندار اور احساس برتری پیدا ہو جاتا، تو محل تعجب نہ ہوتا اس کا تقاضہ تھا کہ وہ ضروری موقعوں پر بھی اپنے دلی تاثرات کو چھپاتے، اور چھوٹوں کی داد و تحسین میں تو بہت زیادہ محتاط رہتے، لیکن ان کی طبعی شرافت، محبت کے فطری عنصر اور تواضع و سادگی جو ان کی جبلت بن گئی تھی، ان کو اس سے باز رکھتی اور بعض اپنے خورد سال و نیاز مند معاصرین اور اہل قلم کو دل کھول کر داد دیتے، ان کی یہ تحریریں ان کی شرافت نفس کا آئینہ ہیں۔

اور اس کے بعد ان کی حیرت، اور اصل جوہر کا سمجھنا مشکل ہے، یہاں پر بہت ڈرتے ڈرتے ان کے خطوط کے دو اقتباسات پیش کرنے کی جرأت کی جاتی ہے، افسوس ہے کہ اس وقت وہی خطوط سامنے ہیں جو انھوں نے اپنے اس نیاز مند کو لکھے ہیں، میرے نزدیک (اگر نفس فریب نہ دے رہا ہو) تو یہ مکتوب الیہ کی اہمیت سے زیادہ مکتوب نگار کی عظمت کی دلیل ہے، اس سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ضمیر و خمیر میں محبت و شرافت کا کیا جوہر ا اور اس خاکستر میں کیسی آگ دبی ہوئی تھی، میری کتاب "تذکرہ مولانا فضل رحمٰن" شائع ہوئی تو میں نے ان کو بھی بھیجی، کتاب پڑھ کر جو انھوں نے خط لکھا اس کا ایک اقتباس پیش ہے۔

"مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ پڑھا، اس میں کچھ ایسی لذت ملی کہ ایک ہی نشست میں پوری کتاب ختم کر دی، اور ابھی مستقل مطالعہ جاری ہے، تصنیفی حیثیت سے آپ کی دوسری کتابیں کہیں اس سے بہتر ہیں، لیکن خدا جانے ان سادہ واقعات اور سادہ تحریر میں کیا تاثیر ہے کہ دل کو جو کیف و سرور اس میں حاصل ہوا وہ بڑی بڑی کتابوں میں نہیں ملتا، بعض بعض مقامات پر خصوصاً مولانا کی زبان فیض ترجمان کے برمحل اشعار پڑھ کر تو وجد کی کیفیت پیدا ہو گئی اور آنکھیں پرنم ہو گئیں، یہ صاحب تذکرہ کی روحانیت اور آپ کا قلم دونوں کا فیض ہے جس نے اس کو شراب دو آتشہ بنا دیا، مدتوں کے بعد دل کو ایسی لذت و حلاوت ملی، اور آپ کے لئے دل سے دعا نکلی ؎

کرم کردی الٰہی زندہ باشی

میں لاکھ بے عمل سہی لیکن الحمد للہ بے عقیدہ نہیں، دل میں ایمان کی چنگاری موجود ہے، جب کوئی شعاع پڑتی ہے تو اس میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے، میری طبیعت کو فطرتاً جمال اور عشق و محبت سے زیادہ مناسبت ہے، اس لئے خشک کتابوں کا زیادہ اثر نہیں ہوتا، مگر جب عشق و محبت اور کیف و مستی کا کوئی نغمہ کانوں میں پڑتا ہے تو دل کی کیفیت بدل جاتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کو مستقل فرما دے، سعدی کو تو چالیس ہی سال کی عمر میں طفلی کا شکوہ تھا، اور یہاں پچپن سال کی عمر گذر گئی اور اب تک وہی حال ہے، اور محض اللہ تعالیٰ کا رحم و کرم، اور اس کی رحمت و مغفرت پر بھروسہ ہے، آخر رحمت و مغفرت کی بشارتیں ہم ہی جیسے گنہگاروں کے لئے ہیں، کہ مستحق کرامت گنہگاراں اند، آپ میرے اصلاح حال کی دعا فرمایا کیجئے"۔

معین الدین۔ ۱۰ نومبر ۵۸ء

راقم سطور نے دینی تعلیمی کونسل کے ایک جلسہ میں جس میں گورکھپور کے خواص، اعیان شہر، اور معززین موجود تھے ایک تقریر کی تھی جس میں مسلمانوں کے سربرآوردہ حضرات، اہل ثروت اور صاحب وجاہت کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائی گئی تھیں، اور بتایا گیا تھا کہ خواص کا صحیح اسلامی اور قرآنی مفہوم کیا ہے۔ ان سے دین و ملت کی کیا توقعات وابستہ ہیں، انھوں نے تاریخ کے مختلف دوروں میں، اپنی اس حیثیت اور اثرات کا استعمال کس طرح کیا، اور ملت کو کیسے خطروں سے بچایا، مجھے نہ اس تقریر کے کرنے کے وقت اس کا احساس تھا، اور نہ اس کے تحریری شکل میں شائع ہونے کے بعد، کہ شاہ صاحب جیسے اہل نظر، اہل ذوق اس کو غیر معمولی اہمیت دیں گے، لیکن ۱۲ جنوری ۶۳ء کو انھوں نے راقم کو خط لکھ کر اس کی ایسی داد دی جس سے اس تقریر کی قدر و قیمت خود مقرر کی نظر میں پیدا ہوئی، یہاں اس خط کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے جس سے نہ صرف ان کی شرافت و بے نفسی کا اندازہ ہوتا ہے، بلکہ ان کی اسلامی حمیت، اور درد کا بھی پتہ چلتا ہے، جو ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

"مجھے نہ صرف آپ سے ملاقات، بلکہ ان لبوں اور ہاتھوں کے استلام کا اشتیاق ہے جن سے خواص کو خطاب کیا گیا ہے یہ تقریر تو دیوبند کی تقریر[1] سے بھی بڑھ گئی اور تاریخ میں زندہ رہنے کے قابل ہے، کس خوبصورتی سے کیسے کیسے حقائق ظاہر کئے گئے، اس کو پڑھنے کے بعد ہی سے آپ کو خط لکھنے کا تقاضہ تھا جو پورا نہ ہو سکا، اگر آپ ہندوستان میں ہوتے تو اسی وقت لکھتا"۔

شاہ صاحب کا تذکرہ شروع کرتے ہی بے اختیار اس خلا کا ذکر زبان قلم پر آ گیا جو ان کی وفات نے کم سے کم راقم سطور کی علمی و ادبی زندگی میں پیدا کر دیا ہے، یہ حادثہ یا المیہ ہمیشہ سے ان لوگوں کو پیش آیا ہے جن کے نقوش قلم کو دلچسپی و محبت سے پڑھنے والے، اگر وہ عمر میں چھوٹے اور علم و فضل میں کم رتبہ ہیں، یا علم و تصنیف کی بساط کے تازہ واردوں میں ہیں تو ان کو شاباش دینے والے، اور ان کا دل بڑھانے والے، دنیا سے اٹھتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان لکھنے والوں کو اپنی تقریر و تحریر بے سامع کی غزل، یا کسی ایسے زبان میں حرف مطلب ادا کرنے کے مرادف معلوم ہونے لگتی ہے جس کا کوئی سمجھنے والا نہ ہو، اور عرفی کی زبان میں ان کو کہنا پڑتا ہے کہ ؎

مدار صحبت ما ہر حدیث زیر لبی است
کہ اہل بزم عوام اند و گفتگو عربی است

شاہ صاحب قصبہ رُدولی ضلع بارہ بنکی کے اس نامور و بلند مرتبہ فاروقی خاندان کے چشم و چراغ تھے جس نے دور آخر میں حضرت مخدوم شیخ احمد عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے عزت و شہرت حاصل کی، مخدوم صاحب نویں صدی ہجری کے اکابر اولیاء اللہ اور شیوخ طریقت میں سے تھے، مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ بعض اہل نظر کا خیال ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد تھے، اور اس میں تو شبہ نہیں کہ سلسلہ چشتیہ صابریہ کو ان کی ذات سے نئی زندگی اور فروغ، اس شاخ پر ثمر میں ان سے بلند پایہ شیخ اور عارف و محقق نظر نہیں آتا، افسوس ہے کہ بیشتر اولیائے متقدمین، اور شیوخ طریقت کی طرح ان کے حالات و ملفوظات کو قلم بند کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا، اور جب اس کا ارادہ کیا گیا، تو اتنا زمانہ گذر چکا تھا کہ سوائے مشہور کرامات اور چند خاندانی روایات کے کوئی مواد نہیں مل سکا انھیں کے سلسلہ کے مشہور شیخ طریقت حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے جن کو دو واسطوں سے مخدوم صاحب سے اجازت و خلافت حاصل ہے ان کے حالات و ملفوظات جمع کرنے کی کوشش کی (جس کے اردو ترجمہ کی سعادت شاہ صاحب ہی کے حصہ میں آئی) لیکن اس میں بھی وہ تفصیلات اور جزئیات نہیں ملتیں جن سے ان کی شخصیت و مقام کا پورا اندازہ کیا جا سکے، لیکن بعض بزرگوں کا کوئی واقعہ اور ان کی زبان سے نکلا ہوا کوئی جملہ کتابوں میں ایسا نقل ہو گیا ہے، جو ان کی شخصیت و مرتبہ پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے، میرے نزدیک حضرت مخدوم صاحب کا فرمایا ہوا یہ جملہ ان کے فضائل و مناقب کے پورے پورے دفتر کی قائم مقامی کرتا ہے، اور حقیقتاً کوزہ میں دریا کو بند کر دیا گیا ہے، انھوں نے فرمایا کہ "منصور بچہ تھا جو اس کی زبان سے انا الحق نکل گیا، یہاں اللہ کے ایسے بندے ہیں جو سمندر کے سمندر پی چکے ہیں اور ڈکار نہیں لیتے"، یہ جملہ شاہ صاحب کی زندگی کے اصل جوہر اور ان کے مقام کی بلندی کو واضح کرتا ہے یعنی عالی ظرفی، تحمل و استقامت، اور دریا سے گذر جانا اور دامن کو تر نہ ہونے دینا۔

[1] ایک تقریر جو کچھ عرصہ پہلے دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کے سامنے کی گئی تھی اور جو "عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب" کے عنوان سے شائع ہو گئی ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے اس خط میں جو جو تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کا کیا تھا، جمال وعشق ومحبت سے اپنی فطری مناسبت کا جو تذکرہ کیا، اور لکھا کہ "عشق ومحبت اور کیف ومستی کا کوئی نغمہ کانوں میں پڑتا ہے تو دل کی کیفیت بدل جاتی ہے" یہ اسی نسب ونسبت کا فیض، اور اسی آتشکدۂ عشق کی چنگاری تھی، جس کو باد مخالف کے جھونکے اور علم وعقل کے چھینٹے بھی بجھا نہ سکے۔ اس خاندان میں شاہ صاحب کے بچپن اور جوانی تک اس دبی ہوئی چنگاری کو اجاگر اور فروزاں کرنے کا سامان موجود تھا، دئے سے دیا جلتا چلا آرہا تھا، سماع کی محفلیں گرم ہوتی تھیں اگرچہ شاہ صاحب اپنی تعلیم ومطالعہ کے نتیجہ میں بعد میں ان سے وہ دلچسپی نہیں لے سکتے تھے جو خانقاہوں اور سماع خانوں کا شعار ہے، لیکن ان محفلوں کا اثر ان کی طبیعت میں آخر آخر تک رہا، انھوں نے کئی بار فرمایا کہ اچھے اشعار سے لطف لینے کی صلاحیت، منتخب اور اثر انگیز اشعار کا یاد ہو جانا اور فارسی واردو کلام کا پاکیزہ ذوق سماع کی انھیں محفلوں کا فیض ہے، خود مجھے بھی جب ردولی میں ایک دو بار ایسی محفل میں شرکت کا اتفاق ہوا، جس میں مخدومی شاہ آفاق احمد صاحب سجادہ نشین خانقاہ حضرت مخدوم صاحب تشریف رکھتے تھے، اور ان دونوں حضرات سے اساتذۂ فارسی واردو کے منتخب ترین اشعار اور ترجمہ دلپذیر سننے میں آئے تو اس کا اندازہ ہوا کہ یہ بات ذوق آفرینی اور ادب آموزی کی حد تک بالکل صحیح ہے، ندوہ کی تعلیم، دار المصنفین کے قیام اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نیز بزرگان دیوبند کی تصنیفات وتحقیقات کے مطالعہ نے ان کی طبیعت میں اعتدال اور اصلاحی ذوق پیدا کر دیا تھا اور اسی کے نتیجہ میں انھوں نے اپنے خاندانی تعلقات اور اعتماد سے کام لے کر بعض ایسے رسم ورواج کی اصلاح کی خدمت بھی انجام دی تھی، جو صدیوں سے چلے آرہے تھے، اس میں جہاں ان کا جذبۂ اصلاح قابل تعریف ہے مخدومی شاہ آفاق احمد صاحب بھی قابل صد تحسین وآفریں ہیں کہ انھوں نے اپنے دور سجادگی میں بعض ایسے معمولات ورسوم کی اصلاح فرمائی جن کی طرف اس سے پہلے کسی کا خیال نہیں گیا تھا۔

شاہ صاحب کے نانا شاہ شرف الدین شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ شاہ صاحبؒ نے مکہ معظمہ میں ان کی بیعت کا واقعہ اور حضرت حاجی صاحب کا ان کے ساتھ خصوصی معاملہ کئی مرتبہ مزہ لے لے کر سنایا، شاہ صاحب کی تعلیم وتربیت میں ان کا بڑا حصہ تھا، فرنگی محل کے خانوادہ کے حضرت مخدوم صاحب کے خاندان سے تقریباً ساڑھے تین سو سال کے تعلقات تھے۔ بانی درس نظامی استاذ الہند ملا نظام الدین فرنگی محلی حضرت سید عبد الرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے، اور ان کے تعلق سے ان کے تینوں بھائی بھی سید صاحب کے دست گرفتہ اور وابستۂ دامن تھے، لیکن ملا نظام الدین کے والد، ملا قطب الدین شہید سہالوی مخدوم صاحب کے سلسلہ میں قاضی گھاسی بن داؤد الہ آبادی سے بیعت تھے اس وقت سے فرنگی محل کے علماء مخدوم صاحب سے نسب ونسبت کا تعلق رکھنے والوں کے ساتھ بزرگ زادوں اور صاحبزادوں کا سا معاملہ کرتے ہیں، شاہ صاحب نے کئی مرتبہ سنایا کہ فرنگی محل کے علماء ومشائخ نے ان کو نذر پیش کی، ایک مرتبہ قطب میاں صاحب نے (مولانا قطب الدین عبد الوالی)، جو حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے برادر زادہ اور جانشین تھے، ملاقات پر نذر پیش کی، شاہ صاحب نے عذر کیا کہ ان کا یہ معمول نہیں، اور وہ اپنے کو اس کا مستحق نہیں سمجھتے، قطب میاں نے فرمایا کہ یہ تو ہمارا حق ہے، اور آپ کو لینا پڑے گا۔

اسی روحانی وعلمی تعلق کی بنا پر شاہ صاحب کی تعلیم فرنگی محل میں شروع ہوتی، یہ حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی کا زمانہ تھا، یہ مجھے معلوم نہیں کہ انھوں نے کتنے سال فرنگی محل میں تعلیم پائی غالباً متوسطات تک انھوں نے پڑھا ہوگا، کہ خاندان کے بزرگوں نے ان کو دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل کر دیا، اور وہیں انھوں نے تعلیم کی تکمیل کی، تعلیم کے دوران ہی ان کی تحریری وعلمی صلاحیت نمایاں ہو گئی تھی، اسی بنا پر مولانا سید سلیمان ندوی کی نظر انتخاب ان پر پڑی، اور فراغت کے بعد ہی وہ دار المصنفین منتقل ہو گئے۔ اور کہنا چاہئے کہ ایسے گئے کہ وہاں سے مر کر ہی نکلے، جو آستانۂ شیخ، یہاں کے خاندان کے شیوخ اور ان کے خاندان کے مسترشدین کا بیٹھنا تاریخ میں بار بار نقل کیا جاتا ہے، لیکن مشیخت ومخدومیت کی مسند چھوڑ کر آستانۂ علم وتصنیف پر بیٹھنا ان کے حصہ میں آیا اور انھوں نے اس جانشینی اور علمی وتصنیفی عزلت گزینی کا وہ حق ادا کیا جس نے مشائخ پیشیں کے ترک وتجرید، زہد وتوکل اور انقطاع ویکسوئی کی یاد تازہ کر دی۔

دار المصنفین سے تعلق پیدا ہونے کے بعد انھوں نے کسی اور آستانہ کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا، ان کی رفیقۂ حیات کا انتقال ان کے عنفوان شباب ہی میں ہو چکا تھا (جن کی صرف ایک یادگار میاں ودود احمد سلمہٗ اہلیہ چودھری محمد ادریس ردولوی ہیں) اس کے بعد سے انھوں نے مسلسل چالیس سال کے قریب تجرد کی زندگی بسر کی، کسی بڑی سے بڑی ملازمت اور عہدہ ومنصب کی طرف انھوں نے کبھی نظر نہ اٹھائی، وہ کمیٹیوں کے ممبر تھے، اور ایکسپرٹ کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی میں انتخاب کے موقعہ پر بلائے جاتے تھے، ان کے لئے کسی بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو یا شعبۂ اسلامیات میں اونچی سے اونچی جگہ حاصل کرنا نہ صرف آسان، بلکہ اس دانش گاہ کے لئے سرمایۂ افتخار تھا، لیکن انھوں نے ان چیزوں کو کبھی درخور اعتنا نہ سمجھا، ان کو جو علمی اعزاز ایوارڈ صدر جمہوریہ کی طرف سے ملا، وہ بھی بے طلب، اور بے منت تھا، اور انھوں نے کبھی اس کو اہمیت نہیں دی، اس طرح وہ دار المصنفین کشتیاں جلا کر آئے۔ اور اپنی پوری زندگی اور صلاحیت اس کے نذر کر دیں، کسی اور منصب وجاہ کا شوق تو در کنار، انھوں نے کبھی اپنے مشاہرہ میں اضافہ کی خواہش وکوشش نہ کی بلکہ اکثر ارکان کمیٹی کی سفارش کے باوجود اس کے لینے سے معذرت کی اور کہا کہ جو کچھ ملتا ہے وہ میرے لئے کافی ہے، آخری دن تک شبلی منزل کے اسی کمرہ میں رہے جو ان کو بحیثیت رفیق کے ملا تھا، وہ رفیق سے دار المصنفین کے ناظم اعلیٰ اور مختار کل ہوتے، لیکن انھوں نے اپنا وہ طالب علمانہ کمرہ نہ چھوڑا، اور اس مکان میں بھی منتقل نہ ہوئے جو مولانا مسعود علی صاحب کی وفات کے بعد خالی ہو گیا تھا، اور برسوں خالی رہا، میاں ودود احمد سلمہٗ سالہا سال سے ان سے جدا اور پاکستان میں مقیم تھے، لیکن بہت کم لوگوں نے ان کو ان کی یاد میں بے قرار اور ملاقات کے لئے کوشاں پایا، انھوں نے نہ کوئی جائداد بنائی، نہ سرمایہ جمع کیا، نہ اپنے آبائی مکان کی تجدید کی فکر کی، وہ وہاں بھی مہمان کی طرح جاتے اور چلے آتے، ان کا اصلی نشیمن اور ان کے ذوق وروح کا مسکن دار المصنفین ہی تھا، اس طرح انھیں فقر واستغنار کی وہ شان تھی جو ان کے آبائے کرام کا شیوہ تھا، خانقاہوں کے ماحول میں تو اس ادا کا قائم رکھنا اتنا مشکل نہیں، لیکن علمی ودفتری ماحول میں اور اس پر آشوب مادہ زدہ دور میں خودداری کی اس آن اور فقر ودرویشی کی اس شان کو قائم رکھنا بڑے جگر گردے والوں کا کام ہے۔

سب سے زیادہ صبر آزما حوصلہ شکن اور کٹھن گھڑی وہ تھی، جب سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دار المصنفین کو خیر باد کہا اور پاکستان منتقل ہو گئے ہندوستان کے سر سے تقسیم ملک کی جو سخت خونی گذر گئی تھی تصنیفی وتحقیقی اداروں کے لئے جن کی بنیاد اسلام کے عناصر کی حفاظت و

اشاعت پر تھی، اور جن کا خمیر سیرت نبوی اور تاریخ اسلام سے اٹھایا گیا تھا، زندگی کا میدان تنگ، اور مستقبل تاریک سے تاریک تر نظر آرہا تھا، سیاسی اور اقتصادی انقلاب نے علمی ذوق، اسلامی کتابوں کی اشاعت، اور تحقیقی کام کو "بے وقت کی شہنائی" قرار دیدیا تھا، مسلمانوں کا جذبۂ اعانت وہ شاید مفلوج سا ہوگیا تھا، علمی و دینی اور خصوصیت کے ساتھ بلند پایہ تحقیقی کتابوں کی خریداری اور ایسے اداروں کی سرپرستی کا جذبہ سرد بلکہ مردہ ہوتا جارہا تھا۔ دارالمصنفین کی کتابوں کے دو بڑے مارکیٹ، اور اس کے قدردانوں کے دو اہم و فعال حلقے تھے، پنجاب اور حیدرآباد، ایک اس ملک سے کٹ چکا تھا، دوسرا انقلاب و حوادث کا شکار تھا، ایسی حالت میں انھوں نے دارالمصنفین کی بظاہر ڈوبتی ہوئی کشتی سے اپنی قسمت، اور اپنی سب صلاحیتیں وابستہ کردیں اور ایک قلندر صفت درویش اور ایک سرپھرے ملاح کی طرح بے رحم دریا کے بہاؤ کے خلاف اس کو چلانے اور ساحل مراد تک پہنچانے کا عزم کرلیا، مولانا مسعود علی صاحب ندوی جن کو دارالمصنفین کا حقیقی معمار کہنا چاہئے، اور جن کی ہمت مردانہ اور خداداد انتظامی صلاحیتوں نے اس ادارہ کو مستحکم بنایا تھا، اب جسمانی انحطاط اور دماغی اضمحلال کے دور سے گذر رہے تھے، یہاں تک کہ وہ وقت آگیا کہ اب انکی حیثیت ایک تبرک اور ایک یادگار کی رہ گئی، شاہ صاحب کے رفیق کار اور دست راست سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم۔ اے اگرچہ اپنے تحقیقی مقالوں اور بعض مقبول تصنیفات کی بنا پر ملک میں روشناس اور عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، اور خدا نے ان کو ایسی انتظامی صلاحیت اور جدوجہد کی قوت عطا فرمائی تھی جس سے وہ شاہ صاحب کے خلوص، علم اور کمالات کی تکمیل کرتے تھے، اور دارالمصنفین کے انتظامی و مالی شعبے کو سنبھالے ہوئے تھے، لیکن جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ

دارالمصنفین کا خمیر سیرت و تاریخ اسلام، اور جدید علم کلام سے اٹھایا گیا تھا، اس بنا پر اس ادارہ کا اعتبار و آبرو شاہ صاحب ہی کی ذات سے قائم تھی، انھوں نے نہ صرف اسلاف کی یہ شمع روشن رکھی، اور ادارہ اور اس کے ترجمان "معارف" کا معیار گرنے نہ دیا، بلکہ ادارہ کی توسیع و ترقی کے کتنے نئے کام کئے، انھیں کے عہد نظامت میں (۱۹۶۵ء) دارالمصنفین کی وہ پچاس سالہ جبلی منائی گئی، جس کی صدارت کے لئے نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان اعظم گڑھ آئے اور انھوں نے وہ مقالہ پڑھا جو ان کی ادبی و فکری صلاحیتوں کا بہترین آئینہ دار ہے اور جس میں انھوں نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ دارالمصنفین کے بانیوں اور رفقاء کی خدمات کو سراہا، اس کے مقاصد کی بلندی، اور اس کے موجودہ کارکنوں کی قربانی، بے لوثی اور عالی ہمتی کی داد دی، دارالمصنفین کا یہ جشن سیمیں جس میں ہر طبقہ کے چیدہ اور برگزیدہ فضلاء اور زعماء شامل تھے، دارالمصنفین کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، شاہ صاحب کا خطبۂ استقبالیہ اپنی مقصدیت و متانت اپنی سلاست و حلاوت کے ساتھ جو شاہ صاحب کے قلم کا جوہر ہے مجموعی طور پر، وقار اور بلندی کی ایک خاص شان لئے ہوئے تھا جو اقبال کے اس شعر کی تصویر ہے ؎

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو!

دارالمصنفین کے جشن سیمیں کے علاوہ بمبئی کا سفر اور وہاں دارالمصنفین کے تعارف کا کام علمی مجالس کا انعقاد جس میں شاہ صاحب عین وقت پر اپنی بیماری کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے

تھے، نیز اس ادارہ کی توسیع و ترقی کے لئے دوسری کوشش ملک کے بعض اعیان و معززین کی آمد، صوبہ و مرکز کی حکومت کی نگاہ میں اس ادارہ کی اہمیت و حقیقت کا پیدا ہونا اور ایسی سب ہی چیزیں اس ادارہ کے معیار و وقار اور روایات کو قائم رکھنا شاہ صاحب ہی کے عہد نظامت کے کارنامے ہیں، جن میں اگرچہ سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کی قوت عمل اور سعی پیہم کا بڑا ہاتھ ہے، لیکن اس کی کامیابی اس شہرت و عزت اور اس وقار و اعتبار کی بہت کچھ رہین منت ہے جس کو شاہ صاحب نے کامیابی کے ساتھ قائم رکھا تھا۔

شاہ صاحب جس طرح اپنے نامور استاد و مربی کے علمی و تعلیمی میدان میں جانشین تھے، اسی طرح اس "روح بیتاب" اور "قلب بیدار" کی وراثت بھی ان کو ملی جو اپنے عہد کے سب سے بڑے مسلمان مصنف، نامور عالم اور میخانۂ علم کے رہ نشین نہیں، بلکہ ساقی کو خانقاہ تھانہ بھون لے گیا تھا، شاہ صاحب ہندوستان کے ایک نامی گرامی، خانوادۂ روحانی کے فرد تھے، ان کے اندر جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، محبت و انابت کی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں، بالآخر انھوں نے اپنا کام ان کو اپنے اس خاندانی وراثت سے بھی حصہ حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور ان خوش قسمت مصنفین اور اہل قلم کی طرح جنھوں نے ہر دور میں روحانی پیاس محسوس کی، اور بجھانے کی مخلصانہ کوشش کی، ان کو بھی ایک روحانی مربی، اور خضر طریق کی تلاش ہوئی، قدرتاً ان کا ذہن اپنے سلسلہ کے شیوخ وقت کی طرف گیا جو عملاً بھی اس سلسلہ سب سے زیادہ زندہ اور فعال سلسلہ ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی نظر انتخاب حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری پر پڑی جن کی ذات جامع شریعت و طریقت بھی ہے، اور جن کا علمی مقام بھی مسلم ہے سید صاحب کے لئے مولانا تھانوی میں جو کشش کے اسباب تھے، قریب قریب وہی اسباب شیخ صاحب کی ذات میں شاہ صاحب کے لئے تھے، شاہ صاحب نے اس ناچیز کو جس کو شیخ کی خدمت میں عرصہ سے نیاز حاصل تھا، واسطہ بنایا اور ایک مرتبہ اس کی معیت میں سہارنپور تشریف لے گئے، داخل سلسلہ ہوتے، شیخ نے بھی اس نسبت گرامی کی بنا پر جو شاہ صاحب کو حاصل تھی، ان کے ساتھ خصوصی معاملہ فرمایا، مجھے یاد ہے کہ جب ان کو دوازدہ تسبیحات کی تلقین فرمائی، تو غالباً ان کے استفسار پر ارشاد فرمایا، کہ اتنی ہی تسبیحات ہمیں آپ کے گھر سے ملی ہیں، یہ اشارہ تھا حضرت احمد عبدالحق قدس اللہ سرہ کی طرف جن سے اس سلسلہ تمام شیوخ و مسترشدین کو تعلیم و فیض حاصل ہے

شاہ صاحب کا تعلق اپنے شیخ و مرشد سے روز بروز بڑھتا گیا، وہ ایک دو بار رمضان میں بھی سہارنپور گئے، اس میں بھی مجھے شرف ہم رکابی حاصل تھا گزشتہ سال جب وہ حکومت سعودیہ کے وزارت اطلاعات کی دعوت پر مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی کی معیت میں دوبارہ حج بیت اللہ کو گئے، تو مدینہ طیبہ میں شیخ کی محبت و التفات سے محظوظ ہوتے، برابر ان کی مجالس میں حاضر ہوتے رہے، یہ بھی عجیب اتفاق ہے، اور ان کے تعلق قلبی کی دلیل کہ اپنے انتقال سے چند ہی روز پہلے وہ سہارنپور جاکر شیخ سے ملے، یہ ان کی آخری ملاقات تھی، شیخ سفر حجاز کو ہوئے، اور شاہ صاحب سفر آخرت پر، درمیان میں چند ہی دنوں کا فصل تھا۔

ان کو اس سلسلہ کے اکابر شیوخ مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سب ہی سے عقیدت و محبت کا تعلق تھا، اور وہ سبھی کا نام بڑے احترام سے لیتے تھے، میرے شیخ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی وفات پر انھوں نے مجھے جو تعزیت نامہ لکھا ہے، اس سے ان کے اصلی خیالات اور اندرونی جذبات کا اندازہ ہوتا ہے، یہاں

طالب علم اور صحافت و سیاست کے نووارد ان سے حسن بیان، متانت تحریر اور اصابت رائے کا سبق لیں۔

آخر میں سید صاحب اور دارالمصنفین سے تعلق رکھنے والے تمام احباب اور بزرگوں کا تقاضہ تھا کہ دارالمصنفین سے سید صاحبؒ کی کوئی ایسی سوانح حیات یا تذکرہ شائع ہو جس میں ان کی علمی، ادبی اور دینی زندگی کا تنوع، ان کے کمالات کی رنگارنگی اور فتوحات سلیمانی کی وسعت و کثرت پورے طور پر عیاں ہو، یہ نازک اور دشوار کام وہی شخص انجام دے سکتا تھا جس کو نہ صرف سید صاحبؒ کی زندگی کے ان مختلف اور بعض اوقات متضاد شعبوں سے قریبی واقفیت ہو، بلکہ وہ ان کا قدر داں اور مرتبہ شناس بھی ہو، جس کو فطری طور پر توازن اور اعتدال کا جوہر ملا ہو، احساس نے سید صاحبؒ کو صرف ایک ہی رنگ میں نہ دیکھا ہو جو ہزار حسین و دلکش سہی، ان کے متنوع کمالات کا ایک گوشہ ہے، ہم سب کی نظر اس سلسلہ میں شاہ صاحب ہی پر پڑتی ہے کہ ؎

داستان فصل گل خوش می سراید عندلیب

اس کام میں بہت دیر لگ رہی تھی، اور کتابت و طباعت کی مشکلات کی بنا پر اس کا کبھی کبھی اندیشہ پیدا ہو جاتا تھا کہ کہیں یہ کام بھی بہت سے مصنفین کے بعض اہم کاموں کی طرح حوادث روزگار کا شکار نہ ہو جائے، بڑے مسرت و شکر کا مقام ہے کہ شاہ صاحب نے اپنی زندگی میں اس کی تکمیل کر دی اور "حیات سلیمانی" ان کے قلم سے مکمل ہو کر منظر عام پر آگئی، ہر انسانی کام کی طرح کوئی تصنیف بھی تنقید سے بالاتر، اور کمی کسر سے محفوظ نہیں، لیکن یہ ایک قیمتی، علمی اور تاریخی دستاویز تھی جس کے وجود میں آجانے سے بڑی حد تک مسلمانوں کی ملی، علمی، ادبی، و سیاسی تاریخ کا سلسلہ مکمل ہو گیا، جس کی اہم کڑیاں "حیات جاوداں"، "وقار حیات" اور "حیات شبلی" ہیں۔

جب جانشین سلیمان نے اپنی زندگی کا یہ اہم ترین کام انجام دے دیا تو خود اس کی کتاب زندگی کا آخری ورق الٹ گیا، اور وہ اپنے آبائے کرام کے پاس پہنچ گیا، جہاں تصنیفات کے اوراق کی تعداد نہیں، صحت اعتقاد، حسن عمل، حسن اخلاق، اور رضائے الٰہی کے طلب و کوشش کی قدر ہے، اور جہاں تک ہم کوتاہ نظروں کا تعلق ہے، اس جنس سے ان کا دامن خالی اور اس زاد راہ سے وہ محروم نہ تھے، ان کا دل محبت آشنا، ان کی آنکھیں پرنم، ان کی زبان شیریں، انکی طبیعت بے آزار اور ان کا قلب کینہ و عداوت سے بہت دور تھا جہاں تک ان کے ساتھ رہنے، اٹھنے بیٹھنے والوں کی معلومات اور تجربہ کا تعلق ہے۔

بہت کم لوگ شاید اس کی شکایت کر سکیں گے کہ انھوں نے ان کا دل دکھایا اور ان کو نقصان پہنچایا، ان کی طبیعت میں معصوم بچوں کی سی سادگی اور معصومیت تھی، انھوں نے زندگی جس آزادی اور روادار ستہ مزاجی کے ساتھ گذاری وہ کسی پر بوجھ نہیں بنے، ساری عمر سبک بار و بے ہمہ رہے، اسی شان سے انھوں نے دنیا کا سفر بھی کیا ۱۲ ردسمبر ۱۹۷۴ء کو جمعہ کا دن تھا، جمعہ کی نماز دارالمصنفین کی مسجد میں پڑھی، نماز کے بعد اپنے کمرہ میں آکر سو گئے، عصر کی نماز کے وقت اٹھے، وضو کے لئے پانی طلب کیا، پانی آیا تو وضو کرنے کے لئے کرسی سے اٹھے، گرے اور جاں بحق ہو گئے، اس طرح انھوں نے نہ طویل بیماری اٹھائی، نہ کسی سے خدمت لی، نہ کسی پر بار ہوئے انتقال کی خبر جس نے سنی وہ سناٹے میں آگیا، نعش آبائی وطن ردولی لائی گئی، ہفتہ کے روز ۱۴ ردسمبر ۱۹۷۴ء کو یہ گنجینۂ خوبی سپرد خاک ہوا، یہ سب کچھ اس طرح آناً فاناً ہو گیا کہ بہت سے عزیزوں، دوستوں اور عقیدت مندوں کو نماز جنازہ میں شرکت کی بھی سعادت حاصل نہ ہوئی کہ ؎

سبک بار مردم سبک تر روند

اللہ کی کریم ذات سے امید ہے کہ وہ ان کے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ فرمائے گا، ان کی لغزشوں سے جس سے کوئی فرد بشر خالی نہیں، در گذر فرمائے گا، اور اپنے مقام رحمت و رضا میں جگہ دے گا۔!!!

بقیہ ـــــ آزاد

قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے۔"

غالباً تحریر میں بار بار سوالیہ جملے لکھتے رہنا فن خطابت کا رہون منت ہے تقریر میں سامعین کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ رکھتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں اس انداز بیان سے سامع کی توجہ تقریر میں مرکوز ہو جاتی ہیں سامعین کا ذہن مشکل ہی سے غیر حاضر ہوتا ہے یہ طرز تقریر آزاد کی ثانیہ بن چکی تھی اس سے الگ ہونے کی نہ ضرورت تھی نہ ممکن تھا بغیر کسی کاوش کے یہ انداز تقریر میں بھی نمایاں ہو گیا جس نے اس معرکہ میں بھی خوبی سے اپنا کام کیا کتاب پڑھنے والے کو کبھی کبھی سے چونکا دیا جاتا ہے تو وہ خود بخود اپنے ذہن کو اپنے جواب کے لئے تیار کرتا ہے اور غور و فکر سے الگ نہیں ہوتا مفہوم کے دریا میں ذہن کو غوطے دیتے ہوئے پڑھنے والا اپنے سے بھی ہم الفاظ کے ذریعے سے پہنچ کر جو لذت محسوس کرتا ہے اس میں اپنے غور و فکر کی بھی بلندی پا کر لطف اندوز ہوتا رہتا ہے اور آزاد کی تحریر سے زیادہ سے زیادہ وابستگی محسوس کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہی شخص جو تقریروں کا بادشاہ ہو وہ تحریر کے میدان میں آتا ہے تو اپنا رویہ بالکل بدل دیتا ہے نہ خطابت ہوتی ہے نہ غیر ضروری باتیں اپنی زبان کی طاقت قلم کو سپرد کر دیتا ہے تصنیف کے وقت نہ خود نہیں بولتا اس کا قلم بولتا ہے وہ جانتا ہے کہ تحریر میں ناصح مشفق بننا اور جا بجا "میرے بھائی"، کہنا ہنر نہیں عیب ہے تحریر مجروح ہو جاتی ہے۔ اہل نظر سمجھتے ہیں کہ مصنف اپنے خیالات نہیں پیش کر رہا ہے بلکہ وہ قاری کو اپنے سے کمتر سمجھ کر اظہار علمیت کر رہا ہے جو نخوت و تبختر کی سرحد سے جا ملتا ہے آزاد نے اس کو ذہن میں رکھ کر اپنی عبارت کو عموماً اس طرح پیش کیا ہے جیسے کوئی دانائے راز یا عالم با عمل لوگوں سے باتیں کر رہا ہو یہی باتیں ادب پسند طبیعت کو ہمیشہ کے لئے اپنا لیتی ہیں اور ان کا طرز تحریر دل و دماغ کو ہی نہیں بلکہ رگ رگ کو بھڑ کا دیتا ہے۔

خطیب عموماً جذبات مشتعل کرتا ہے ادیب جذبات سے زیادہ اپنی تحریر میں دماغ کو متاثر کرتا ہے مولانا جس پایہ کے خطیب تھے اسکا ایک تقاضا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیان کو پرزور اور تحریر کو زوردار بنانے کے لئے وہی انداز اختیار کرتے جو عبارت سے دلوں میں ہیجانی کیفیت پیدا کرتا لیکن انھوں نے خطیب اور ادیب کے فرق و امتیاز کو ہر جگہ قائم رکھا۔ ام الہند میں بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ ادب کے میدان میں لفظی اشتعال انگیزی سے زیادہ منطق و دلائل سے کام لیتے ہیں مفکروں اور شاعروں کے اقوال سے اپنی بات کو مضبوط کرتے ہیں عبارت کی دلکشی و بیان کی معقولیت سے پڑھنے والوں کے دلوں کو گرماتے ہیں محض الفاظ کی بازیگری سے دلوں میں ہیجانات پیدا کرنے کی جگہ وہ شعور کو متاثر کرتے ہیں فہم و ادراک کو مشتعل کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے سبب ادب کا سرمایہ حیات بن جاتی ہے اور طرز تحریر وہ خصوصیت و انفرادیت حاصل کر لیتا ہے جس کی مثال اردو میں نظر نہیں آتی۔

اسوۂ حسنہ

قرآن حکیم میں ایک بڑا حصہ انبیائے سابقین کے قصص و اعمال کا ہے۔ اس کا عام انداز بیان ہے کہ وہ پہلے ایک خاص تعلیم پیش کرتا ہے اور پھر اس تعلیم کی صداقت کے لئے امم گذشتہ اور انبیائے سابقہ کے حالات و واقعات سے ایک خطابی استدلال کرتا ہے۔ تاکہ امت مرحومہ کے سامنے تعلیم اور اس کے عملی نمونے اور نتائج دونوں موجود ہوجائیں۔ لیکن تمام قرآن کریم میں اگر مسلمانوں کے سامنے کوئی کامل زندگی اور کسی زندگی کے ازسرتاپا اعمال بطور نمونے کے پیش کئے گئے ہیں۔ اور ان کے اتباع کی دعوت دی گئی ہے تو وہ صرف دو نمونے ہیں جو شریعت اسلامیہ کے داعی حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سورہ احزاب میں فرمایا ہے کہ۔

بے شک رسول اللہ کی زندگی میں تمہارے لئے کہ اللہ اور یوم آخرت سے ڈرتے ہو اور کثرت کے ساتھ اس کا ذکر کرنے والے ہو پیروی اور اتباع کے واسطے ایک بہترین نمونہ ہیں۔

(احزاب ۲۱)

اور پھر سورہ ممتحنہ میں ملت حنیفی کے داعی اول حضرت ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا و علیہ السلام کی نسبت ارشاد ہے۔ (ج ۲۸ ممتحنہ ۴)

بے شک تمہارے لئے ایک بہترین نمونہ عمل حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کے اعمال زندگی میں ہے۔ (ج ۲۸ ممتحنہ ۴)

پھر اسی رکوع میں حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی تعلیم کی تشریح کر کے مکرّر کہا کہ

بے شک تمہارے لئے کہ اللہ اور یوم آخرت سے ڈرتے ہو۔ ان لوگوں کی زندگی میں ایک بہترین نمونہ عمل ہے اور جو شخص اس کی طرف سے منہ موڑ لے تو اللہ کریم تو انسانوں کے اعمال کا کچھ محتاج نہیں ہے۔

(ممتحنہ ۶)

اصل یہ ہے کہ قرآن کریم اسلام کی جس حقیقت کو دنیا کے آگے پیش کرنا چاہتا تھا اس کے لحاظ سے اگر کوئی زندگی۔ اسوہ حسنہ ہوسکتی تھی۔ تو وہ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی زندگی تھی۔ اسلام ایک صداقت ہے اور اس لئے دنیا میں اس وقت سے موجود ہے جس وقت سے کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں صداقت ہے لیکن اس صداقت مبین کو ایک شریعت الہیہ کی صورت میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی نے پیش کیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے ہر جگہ ان کو ملت حنیفی کے اولین واعظ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتلائی کہ۔

جب حضرت ابراہیم سے ان کے پروردگار نے کہا کہ مسلم یعنی میرے فرمانبردار ہوجاؤ تو انھوں نے کہا کہ میں اسلام لایا تمام جہانوں کے پروردگار کے لئے۔"

یادگارِ خلیلؑ

چونکہ سیدنا ابراہیم اسلام کے پہلے داعی تھے۔ اس لئے ان کا وجود پیکر اسلام تھا اور اپنے ہر عملیات کے اندر اسلام کی حقیقت کا ایک عملی نمونہ رکھتا تھا وہ اسلام کے واعظ تھے اور واعظ کے لئے اولین شے یہ تھی کہ تعلیم کے ساتھ خود اپنی عملی زندگی کا نمونہ بھی پیش کردے اور جن حقیقتوں کی طرف دنیا کو دعوت دیتا ہے ان کو سب سے پہلے اپنے اوپر طاری کردے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان حقائق کو اپنے اوپر طاری کیا۔ اس لئے ان کا ہر عمل ازسرتاپا صدائے اسلام تھا اور وہی پیروان اسلام کے لئے عملی نمونہ یا اسوہ حسنہ ہوسکتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ خدائے تعالےٰ نے ان کی زندگی کے تمام اعمال ہمیشہ کے لئے محفوظ کردیئے ہیں اور ان کے ذکر کو بقائے دوام عطا فرمایا۔ دنیا کے بڑے کشورستانوں، عظیم الشان فاتحوں اور خشکیوں اور سمندروں پر حکمرانی کرنے والی قوموں کو ہم آثار قدیمہ کے کھنڈروں، بوسیدہ قبروں، قومی روایتوں کے کہنہ اوراق میں ضرور دیکھ سکتے ہیں مگر تمام مجمع اولین و آخرین میں ایک انسانی ہستی بھی ایسی نہیں مل سکتی جس کے اعمالِ حیات پتھروں اور مٹی کے ڈھیروں میں نہیں بلکہ کروڑوں زندہ انسانوں کے اعمال کے اندر سے اپنی حیات کا ثبوت دے سکتے ہوں۔ ذی الحجہ کی نویں تاریخ کو دنیا کے سامنے اسوۂ ابراہیمی کی لازوال زندگی کا کیسا عجیب منظر ہوتا ہے جب کہ تاریخ کتنی ہزار برس آگے بڑھ کر لوٹتی ہے۔ تاکہ اسلام کے واعظِ اوّل کی زندگی کو ایک مرتبہ پھر دہرادے۔ لاکھوں انسانوں کا مجمع ہوتا ہے جو دین سے ہر وجود پیکر ابراہیم بن جاتا ہے اور مقام خلّت کی سلطنت تعین اور تشخص کو فنا کر کے اس پورے مجمع کو ایک ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی صورت میں نمایاں کردیتی ہے۔

اور ہم نے ابراہیم اور ان کی اولاد کو اپنی رحمت میں سے بڑا حصہ دیا اور ان کے لئے ایک اعلیٰ صاشرت (طریق) ذکر خیر دنیا میں باقی رکھا۔

(پ ۱۶ ع ۶)

لبیک اللّٰہم لبیک کی صدائیں

آج ذی الحجہ کی نویں تاریخ ہے۔ جب کہ یہ سطور قلم سے نکل رہے ہیں چشم تصور سے دیکھئے تو

آپ کے آگے بندگانِ مخلص کا ایک شہر آباد ہے۔ لاکھوں انسان ایک ہی لباس ایک ہی صدا کے ساتھ ایک ہی کے لئے دیوانہ وار دوڑ رہے ہیں۔ بے شک حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا وجود تنہا دنیا میں باقی نہیں لیکن کیا ان لاکھوں عاشقانِ الہی میں سے ہر عاشق اسی عاشق اول کے عشق سے مستفیض نہیں ہے۔ اگر ہے تو یقین کیجئے کہ حضرت خلیل اللہ آج بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ جب کہ میدان حج میں لاکھوں انسانوں کی زبانوں سے صدائے لبیک لبیک اللھم لبیک نکلتی ہے تو وہ سب ایک ہی ابراہیم خلیل کی صدا ہوتی ہے۔ جس نے ایسے پانچ ہزار برس پیشتر اپنے دوست کی صدائے یا عبدی کے جواب میں عاشقانِ محویت کے ساتھ لبیک کا نعرہ لگایا تھا۔ وہ ایک ہی وجود کے اندر کب محدود تھا کہ فنا ہو جاتا۔ وہ تو اپنے اندر ایک پوری اُمت رکھتا تھا۔ اس لئے آج بھی اپنی امت کی صورت میں موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا۔

> بے شک ابراہیم (گویا) ایک پوری اطاعت شعار اُمت تھا اور ایک ہی خدا کا ہو رہا تھا۔

دراصل یہ وہی حقیقت اسلامیہ تھی جس نے ان کے وجود کو آنے والی امتوں کے لئے اسوۃ حسنہ بنا دیا تھا اور جس کی وصیت انھوں نے اسحاق اور اسمٰعیل علیہما السلام کو کی اور پھر انھوں نے یعقوب کو اور اس کے بعد نسلاً بعد نسلٍ سلسلہ ابراہیمی میں منتقل ہوتی رہی ہے۔

یہی حقیقت وہ روح اعظم تھی جو حضرت آدمؑ کے کالبد میں پھونکی گئی "اور خدا نے آدم میں اپنی روح پھونکی" اور یہی وہ روح الٰہی ہے جو شریعت ابراہیمی سے منسوب ہو کر سلسلۂ ابراہیمی کی آخری اُمت یعنی امت مرحومہ میں ظہور کرنے والی تھی اور جس کے یوم ظہور کی ایک رات ایام الٰہیہ کے گزشتہ ہزار مہینوں پر فضیلت رکھتی تھی۔

"ہم نے اسلام کو بصورت قرآن لیلۃ القدر میں نازل کیا اور تم جانتے ہو کہ لیلۃ القدر کیا ہے وہ ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں پر فضیلت رکھتی ہے اور اس رات ملائکہ اور روح کا نزول ہوتا ہے جو اپنے پروردگار کے حکم سے (نظم روحانی) کے تمام امور کے لئے آتے ہیں۔ وہ رات امن اور سلامتی کی رات ہے طلوع صبح تک"

حقیقت اسلامی کی اصلی آزمائش

اور سب سے آخر یہ کہ حقیقت جب اسلامی کی آخری مگر اصلی آزمائش کا وقت آیا تو وہ اسلام ہی تھا جس نے ابراہیم کے ہاتھ میں چھری دی تاکہ فرزند عزیز کو ذبح کر کے محبت ماسوی اللہ کی قربانی کرے اور اسلام ہی تھا جس نے اسمٰعیل کی گردن جھکا دی۔ تاکہ اپنی جان عزیز اس کی راہ میں قربان کر دے۔ جب کہ اس نے پوچھا۔

> اے فرزند عزیز میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گویا تجھے اللہ کے نام پر ذبح کر رہا ہوں پھر تیرے خیال میں بات کیسی ہے؟
>
> (پ ۲۳ ع ۷)

تو یہ وجود ابراہیمی کی بلکہ اسلام ہی کی صدا تھی اور پھر جب اس کے جواب میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے کہا کہ۔

> اے باپ یہ گویا اللہ ہی کی مرضی اور اس کے حکم کا اشارہ ہے اس کو بلا تامل انجام دیجئے۔ اگر اسی خدا کی مرضی ہوئی تو آپ دیکھ لیں گے کہ میں صبر کرنے والوں میں سے ہوں گا۔

تو یہ بھی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نہیں بلکہ اسلام ہی کی صدا تھی۔ پھر جب بیٹے نے اس ذوق و شوق کے ساتھ جو مدتوں کے پیاسے کو آب شیریں سے ہوتا ہے اپنی گردن مضطرب ہو ہو کر چھری سے قریب کر دی تو وہ حقیقت اسلام ہی کی محویت کا استیلا تھا جس نے نفسِ اسمٰعیل علیہ السلام کو فنا کر دیا تھا اور اسی فنا سے مقام ایمان کو بقا ہے۔

> "پس سلام ہو حقیقت اسلامی کی قربانی کرنے والے ابراہیم پر۔ ہم مقام احسان تک پہنچنے والوں کو بقائے دوام کا بدلہ ایسا ہی عطا فرماتے ہیں، بے شک وہ ہمارے حقیقی مومن بندوں سے تھا"

اللہ اللہ اس نیرنگ ساز ازل کے کاروبار محبت کی بوقلمونی کو کیا کہیے کہ اس کے حریم محبت کی ساری آرائش دوستوں کے خون کی چھینٹوں اور مضطرب لاشوں کی تڑپ ہی سے ہے۔ دوستوں کو کٹواتا ہے مگر دشمنوں کو مہلت دیتا ہے۔ باپ کے ہاتھ میں چھری دیتا ہے کہ بیٹے کو قتل کرے۔ اور بیٹے سے کہتا ہے کہ خوشی خوشی گردن جھکا دے کہ یہاں جان دینا ہی نہیں بلکہ جان دینے کو روز عیش و نشاط سمجھنا بھی شرط ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کے دل میں اپنی محبت کے ساتھ بیٹے کی محبت گوارا نہ ہوئی۔ اور اسمٰعیل کے پہلو میں اپنے گھر کو دیکھا تو محبت نفس و جان کی پرچھائیں نظر آتی ہیں۔ عشق است و ہزار بدگمانی۔

غیرتِ الٰہی نے اس کو بھی منظور نہیں کیا۔ حکم ہوا کہ پہلے محبت کے مکان کو ایک ہی مکین کے لئے خالی کر دو پھر اس طرف نظر اٹھا کر دیکھنا۔

> محبت کی عشق آموزی کا پہلا سبق غیرت ہے اور یہی معنے ہیں کہ
>
> اللہ تعالے تمہارے تمام گناہوں سے درگذر کر سکتا ہے۔ مگر اس کو کبھی معاف نہیں کر سکتا کہ تم اس کی محبت میں کسی دوسرے کو شریک کرو۔ (پ ۵ ع ۳)

پنجاب ہائی کورٹ کا بقیہ۔

اسی طرح سے مسجد کا مقدمہ خلاف کیا گیا تھا۔ یہ پتہ لگانا بہت مشکل ہے کہ مسجد کی بلڈنگ اور جائیداد کو پراپرٹی کے طور پر کیوں تصور نہیں کیا جا سکتا محض اس لئے مسجد بطور قانونی طور پر ایک شخص کے مقدمہ دائر کر سکتی ہے یا ان پر مقدمہ دائر کیا جا سکتا ہے مسجد خدا کا گھر ہے موروث نہیں ہے۔ مسجد بطور بلڈنگ کے صاف طور پر جائیداد ہے تابل ٹرائل کورٹ کا کا فیصلہ درست تھا اور غلطی سے قابل اپیلیٹ کورٹ نے اس کو الٹا کر دیا۔ زمین کو شاملات دیہہ بتایا گیا ہے۔ حد اسد رقبہ کھیوٹ دیہاتی کامن لینڈز (ریگولیشن) ایکٹ ۱ آف ۱۹۵۴ کے لاگو ہونے سے پہلے اس لئے یہ زمین پنچایت کی ہے اس ایکٹ کی رو سے اور پنچایت کی ہی کا رہے گی۔

مندرجہ بالا اسباب کی وجہ سے یہ اپیل منظور کئے جاتے ہیں۔ جو ڈگریاں قابل اپیلیٹ کورٹ نے دی تھیں اُن کو کہا جاتا ہے اور جو ٹرائل کورٹ نے دی تھیں ان کو بحال کیا جاتا ہے۔ پارٹیاں اپنا اپنا خرچ خود برداشت کریں گی۔

دستخط سراج علی
۲۸ جنوری ۱۹۶۹ء

مولانا آزاد مرحوم

ایک یادگار تقریر

میرے عزیزو! آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی چیز ہے، جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لئے شاہجہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے اس زمانہ میں جس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں، تمھیں یہیں سے خطاب کیا تھا جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد۔ آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمھیں یاد ہے؟ میں نے تمھیں پکارا، تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیئے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست، جو تمھیں آج داغ جدائی دے گئی ہے، اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمھیں خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا۔ لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا، بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج انہیں خطروں نے تمھیں گھیر لیا ہے۔ جن کا اندیشہ تمھیں صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گذاری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لئے چن لیا تھا، وہاں میرے بال و پر کاٹ لئے گئے ہیں۔ یا میرے آشیانے کے لئے جگہ نہیں رہی بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی اور میرے دل کو صدمہ ہے سوچو تو سہی، تم نے کون سی راہ اختیار کی؟ کہاں پہونچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں؟ کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آگیا ہے؟ یہ خوف تم نے خود ہی فراہم کیا ہے۔ یہ تمہارے اپنے اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا، جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لئے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں، لیکن تم نے سنی ان سنی برابر کر دی، اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمہارے لئے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمھیں بھروسہ تھا، وہ تمھیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے۔ وہ تقدیر جو تمہارے دماغی لغت کی منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے یعنی ان کے نزدیک فقدان ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی، اور راہ نمائی کے وہ بت، جو تم نے وضع کئے تھے، وہ بھی دغا دے گئے۔ حالاں کہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے، اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے۔ میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا۔ اور تمہارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ، تو تمہارے لئے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔

ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمھیں پکارا تھا اور کہا تھا۔

"جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلو تہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا، تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا، ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا، جو صفحہ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ آج ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔"

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی، بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی۔ اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمھیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی ہے اور اس کی جگہ بری شے آگئی ہے۔ ہاں تمہاری بیقراری اسی لئے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لئے تیار نہیں کیا تھا۔ اور بری شے کو ملجا و ماوی سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا کہ جب ہماری قوم کے قدم کسی جنگ کی آغاز کی طرف تھے۔ اور آج تم اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں؟ کہ ادھر سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور ادھر گمراہی کا خطرہ بھی پیش آگیا۔ میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاست کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے میں نے اس پرخار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لئے ہوتی ہیں۔ لیکن مجھے آج جو کچھ کہنا ہے، اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔ متحدہ ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے، جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات پر آج

ر رہے ہیں ۔

پچھلے سات برس کی روئیداد دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ ہے ۔ البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ریلا آیا ہے، وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت غلطیوں ہی کا نتیجہ ہے لیکن میرے لئے اس میں کوئی نئی بات نہیں ۔ میں پہلے دن ہی سے ج پر نظر رکھتا تھا ۔

اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے مسلم لیگ کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں ب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے انداز فکر میں بھی سوچ سکتے ہیں یا نہیں میں نے نومبر کے دوسرے ہفتے میں ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا عوت نامے بھیج دیئے گئے ہیں ۔ ہراس کا موسم عارضی ہے ۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ رے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا ۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ شک سے ہاتھ اٹھا لو، اور بدعملی کو ترک کر دو ۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس ی تلوار سے زیادہ کاری ہے، جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی ہیں ۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے، اس پر غور کرو، اپنے دلوں بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کرتے نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے نے وضو کیا تھا ۔ اور آج تم ہو کہ تمہیں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے ۔ حالانکہ دہلی تمہارے سینچی ہوئی ہے ۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو ۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش بیجا تھا، اسی طرح آج یہ تمہارا خوف و ہراس بھی بیجا ہے ۔ مسلمان اور بزدلی ۔ یا مسلمان اور ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے ۔ سچے مسلمانوں کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا ۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں ۔ انھوں نے تمہیں جانے کے ا کیا تھا ۔ آج انھوں نے تمہارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے، تو یہ عیب کی بات نہیں ہے ارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے ۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں تو ان کو جلوہ گاہ بنا دو، جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امی کی معرفت فرمایا تھا، جو ن لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لئے نہ تو کسی قسم کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم ۔ ہوائیں آتی ذر جاتی ہیں ۔ یہ صرصری، لیکن ان کی عمر کچھ زیادہ نہیں ۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گزرنے ۔ اور یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت ہی میں نہ تھے ۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں ہوں لیکن مجھے تمہاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار لتا ہے کہ تیسری طاقت اپنی گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے ۔ جو ہونا تھا وہ ہو کر سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے ۔ اگر اب بھی دلوں کا معاملہ بدلا نہیں، اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی، تو پھر حالت دوسری ہے واقعی تمہارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے، تو پھر اس طرح بدلو جس طرح نے اپنے تئیں بدل لیا ہے ۔ آج بھی کہ ہم ایک دور انقلاب کو پورا کر چکے ہیں ہمارے ملک

کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان صفحوں میں زیب عنوان بن سکتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لئے تیار بھی ہوں ۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے ۔ بلکہ اب تیار ہو جاؤ ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے، اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے ۔

میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفیکیٹ حاصل کرو ۔ اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو، جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کے یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں، وہ تمہارا ہی قافلہ تھا، انھیں بھلاؤ نہیں، انھیں چھوڑو نہیں، ان کے وارث بن کر رہو، اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لئے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی ۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لئے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے ۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو؟ کبھی تم خود اک زلزلہ تھے ۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو؟ کیا یاد نہیں کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا ۔ یہ بادلوں نے میلا پانی برسایا ہے تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائینچے چڑھا لئے ہیں ۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے، جو سمندروں میں اتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں، تو ان پر مسکرا دیئے ۔ بادل گرجے، تو قہقہوں سے جواب دیا ۔ صرصر اٹھی، تو اس کا رخ پھیر دیا ۔ آندھیاں آئیں ۔ تو ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے ۔ ایمان کی جاں کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے ۔ اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا ۔

عزیزو! میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے ۔ وہی پرانا نسخہ ہے جو برسوں پہلے کا ہے ۔ وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا ۔ اور وہ نسخہ ہے قرآن کا، یہ اعلان لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ....

آج کی صحبت ختم ہو گئی ۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ اختصار کے ساتھ کہہ چکا ہوں ۔ پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں ۔ حواس پر قابو رکھو اپنے گرد و پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو ۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کر لا دوں ۔ یہ تو دل کی دکان ہی میں سے اعمال صالحہ کی نقدی سے دستیاب ہو سکتی ہے

.... در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است
خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

عزت مآب ذکریا العادلی امام سفیر جمہوریہ مصر

ایوانِ غالب میں جشنِ میلادالنبیؐ

۱۶ اپریل کو ایوانِ غالب ماتا سندری لین نئی دہلی میں عید میلادالنبیؐ پر ایک شاندار تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ جس میں فضیلت مآب جناب فخرالدین علی احمد صدر جمہوریہ ہند نے شرکت فرمائی۔ اس مبارک موقعہ پر سفیر جمہوریہ مصر نے جو تقریر کی۔ اس کا متن حسب ذیل ہے

صدر محترم، عزت مآب حضرات و خواتین۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

میں عید میلادالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک اور پرمسرت موقع پر آپ حضرات کی خدمت میں مصری عوام کی جانب سے دوست ملک ہندوستان کی حکومت اور عوام کی خدمت میں نیک تمنائیں اور ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

میں آپ حضرات کا انتہائی شکرگذار ہوں کہ آپ نے مجھ کو اس بابرکت اور نیک تقریب میں شرکت کرنے کا موقع دیا۔ مجھ سے قبل حضرات مقررین اس نیک اور اہم موقع پر بہت کچھ کہہ چکے ہیں میرے لئے سعادت کا مقام ہے کہ میں بھی کچھ کلمات آپکی خدمت میں پیش کروں۔

میں سمجھتا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد کا سب سے افضل اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم ان اقدار اور اصولوں کو یاد کریں جن کی خاطر آں حضرت کی بعثت ہوئی۔ یہ اصول و اقدار ہمارے لئے آج کی مشکلات بھری دنیا میں روشن چراغ کی حیثیت رکھتے ہیں یا مشعل راہ ہیں۔

دوستو! اسلام دین بھی ہے اور دنیا بھی وہ جس طرح آخرت کی طرف توجہ دلاتا ہے اس طرح دنیا کی طرف بھی انسان کی رہنمائی کرتا ہے قرآن کریم بیک وقت ایک ایمانی منشور بھی ہے اور دستور حیات بھی۔ اس امر کی طرف برطانوی انسائیکلوپیڈیا میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے۔

وہ اسلام جس کی دعوت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی وہ بیک وقت ایک مذہب اور اجتماعی زندگی کے معاملات کو چلانے کا دستور ہے۔

اسلام صرف آسمان پر ہی بھروسہ نہیں کرتا بلکہ دنیا کی طرف بھی نظر رکھتا ہے۔ اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس پر زور دیتے تھے کہ میں بشر ہوں میں صرف ایک انسان ہوں۔

فضل بن عباس کا کہنا ہے کہ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صاحبزادے ابراہیم کی موت پر رو دیئے اور آپکی چشم مبارک پرنم ہوگئیں تو وہ گھبرا کر بول اٹھے کہ یا رسول اللہ کیا آپ رو رہے ہیں؟ تو آں حضرت نے فرمایا۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔

اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طہارت عمل کا ایک مجسم نمونہ تھے آپ نے بچپن میں بکریاں چرائیں اور پھر تجارت کی اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو سچا اور امانت دار پایا۔ اور اس طرح آپ نے یہ نمونہ پیش کیا کہ انسان کو چاہئے کہ وہ کام کرے اور اپنی محنت اور پیشانی کے پسینہ سے کمائی ہوئی روزی کھائے۔

حضرات! یہ ہیں بعض وہ اصول اور نظریات جن کو اسلام نے پیش کیا۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اپنے قول بلکہ عمل سے ان کا نمونہ پیش کیا۔

اسلام کے دوسرے اہم ترین اصولوں میں سے تعلیم اور علم کی اہمیت اور اس کا احترام ہے سب سے پہلے آنحضرت پر جو وحی نازل ہوئی وہ تھی اقرا یعنی پڑھو۔ ہمیں قرآن کریم کی یہ آیت یاد رکھنی چاہئے (اقرا باسم ربک الذی خلق) ترجمہ۔ پڑھو اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا۔

اسلام نے علم کو افضل اور بہتر قرار دیا ہے۔ وہ لوگوں کو تعلیم کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اس نے اہل علم کو غیر اہل علم پر فضیلت بخشی ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون۔ ترجمہ۔ تم کہہ دو کوئی برابر ہوتے ہیں سمجھ والے اور ناسمجھ۔ اس طرح قرآن حکیم میں ایک جگہ ارشاد ہے۔ وقل رب زدنی علما۔ ترجمہ۔ کہہ اے میرے پروردگار میرے علم میں اضافہ کر۔

اس سلسلہ میں مجھے ڈاکٹر عبدالعزیز کامل۔ نائب وزیر اعظم اور وزیر اوقاف حکومت مصر کی وہ بات یاد آگئی جو انھوں نے غار حرا سے واپسی پر کہی ہے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز کامل نے غار حرا اور اس مقدس مقام کی زیارت کی تھی جہاں وحی نازل ہوئی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ آج اس جگہ

جہاں آنحضرت کی ولادت باسعادت ہوئی تھی ایک پبلک لائبریری ہے۔
بتایئے کہ تعلیم اور علم کی اہمیت پر اس سے زیادہ عمدہ اور بہتر کوئی ثبوت ہو سکتا ہے؟
ہمیں آنحضرت کی یہ حدیث یاد رکھنی چاہیئے کہ

العلماء ورثۃ الانبیاء علماء انبیاء کے وارثین ہیں۔

عربوں کی فتوحات اور جنگوں کے متعلق بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ لیکن الزام تراشی کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلامی سوسائٹی میں علم کا کیا مقام ہے۔ اگر ہم اسلام کے ابتدائی دور پر نظر ڈالیں اور مدینہ کی سوسائٹی کو ایک نظر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تعلیم و علم کی کیا اہمیت تھی ہمیں پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر کے موقع پر فیصلہ کیا کہ ایک جنگی قیدی کو اس شرط پر رہا کیا جا سکتا ہے کہ وہ دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم توہم پرستی اور خرافات کے سخت خلاف تھے۔ آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم جو ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھے دو سال سے بھی کم عمر میں وفات پا گئے۔ ان کی تدفین کے بعد قبرستان سے لوٹتے وقت آسمان پر بادل چھا گئے اور سورج چھپ گیا۔ لوگوں نے جب یہ دیکھا تو آپس میں کہنے لگے کہ ابراہیم کی موت کی بنا پر سورج چھپ گیا۔ جب آپ نے یہ سنا تو صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا لوگو! چاند اور سورج خدا کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ کسی کی موت یا زندگی کی بنا پر نہیں چھپتے۔

اسلام دنیا میں اس لئے آیا تاکہ خدا کی وحدانیت کو پختہ اور پکا کر دے۔ وہ سابقہ مذاہب کی برائی نہیں کرتا بلکہ انکی خوبیوں کا اعتراف کرتا ہے اور اسلام نے خود ان کی بہت باتوں کو برقرار رکھا ہے۔

میں اس موقع پر بعض دوسرے ذرائع کا حوالہ دوں گا۔ کیوں کہ غیر کی بات کو بطور ثبوت اور دلیل پیش کرنا زیادہ غیر جانبدارانہ ہوتا ہے۔

برطانوی انسائیکلوپیڈیا میں درج ہے کہ نبی اکرم ہمیشہ اپنے مواعظ اور خطبات میں توحید کے بنیادی عقائد میں اتحاد پر زور دیتے تھے۔ اور اس باب میں قرآن کریم میں بہت سی آیات وارد ہوتی ہیں۔

شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ۔

ترجمہ۔ راہ ڈال دی دین میں تمہارے لئے وہی جس کا حکم کیا تھا نوح کو اور جس کا حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور جس کا حکم کیا ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو۔

اسلام اور نبی اسلام نے ہمیشہ بقائے باہم اور ایک ساتھ مل کر رہنے کی دعوت دی ہے اسلام ہرگز نفرت اور حقارت نہیں سکھاتا۔ اسلامی فتوحات کے دوران لوگوں کو کبھی بھی دین اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ ان کو یہ اختیار دیا جاتا تھا کہ وہ یا اسلام قبول کر لیں یا ٹیکس ادا کریں۔

نبی اکرم یہود مدینہ کے ساتھ مل کر رہے اور اس سلسلہ میں آپ نے مکمل قواعد اور ضابطے طے کئے۔ آپ نے کبھی بھی ان سے دشمنی نہیں کی۔ آپ بھی سامی تھے اور یہود بھی سامی النسل تھے لیکن یہودیوں کا تکبر اور نخوت اس درجہ بڑھ گیا کہ وہ اپنے آپ کو "خدا کی پسندیدہ قوم" قرار دینے لگے۔ جب آپ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں چاروں طرف یہود کی آبادی تھی تو آپ نے ان سے معاہدے کئے اور فرمایا کہ یہودیوں کے لئے ان کا مذہب اور مسلمانوں کے لئے ان کا مذہب۔ اور آپ کے بعد بھی مسلمان اسی اصول پر کاربند رہے۔

ابھی ماضی قریب کی بات ہے کہ مسلمانوں نے جب اندلس (اسپین) کو فتح کیا تو وہاں یہودی کس طرح امن و چین اور اطمینان سے رہے اور آج تک تاریخ میں وہ دور یہودی قوم کی تاریخ کا سنہرا دور سمجھا جاتا ہے۔

نبی کریم کی زندگی جمہوریت کا زندہ جاوید نمونہ تھی۔ آپ کی وفات کے بعد خلافت بذریعہ انتخاب طے پائی۔ آپ مساوات کامل کا پیکر تھے۔ آپ نے صاف فرمایا۔ کہ کسی عرب کو عجم پر کوئی فضیلت نہیں ہاں صرف تقویٰ کی بنا پر آپ نے کتنے ہی قیدی رہا کر ڈالے اور کتنے ہی غلاموں کو آزاد کر دیا۔ غلاموں کی عزت اور توقیر کا سب سے بڑا نمونہ بلال حبشی کی ذات ہے۔ یہ وہ غلام ہیں جن کو آں حضرت نے آزاد فرمایا اور یہ اسلام کے سب سے پہلے موذن تھے۔ اسلام اور نبی کریم کی سیرت مال و دولت کو افضلیت اور بڑائی کا معیار نہیں تسلیم کرتی۔ آپ نے فرمایا جب اپنے سے زیادہ دولت مند شخص کو دیکھو تو فوراً اپنے سے نیچے اور کم درجہ کے آدمی کا تصور کرو۔ اسلام غریبوں اور فقیروں کی باعزت زندگی کا ضامن ہے لیکن بھیک اور سوال کے ذریعہ نہیں۔ اسلام نے بیت المال کا نظام قائم کیا ہے جس میں امراء اور اصحاب ثروت سے مال لے کر اس میں جمع کیا جاتا ہے اور وہ غریبوں کی ضروریات پر خرچ کیا جاتا ہے۔

ہم کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ اسلام نے عورت کو کیا مقام عطا کیا ہے عرب زمانہ جاہلیت میں لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دیتے تھے۔ بلکہ بعض تو لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر ڈالتے تھے۔ قرآن کریم نے اس کی سخت مذمت کی ہے اس نے عورت کا رتبہ بلند کیا۔ اسلام میں سب سے پہلی مسلمان خاتون حضرت خدیجہ ہیں۔ آپ ایک کام کرنے والی عورت کا نمونہ ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا عالم تھیں ان کو احادیث یاد تھیں وہ اشعار بھی بیان کرتی تھیں علم فلکیات میں ان کو گہرا درک تھا۔ نسب اور تاریخیں ان کو یاد تھیں۔ مسلمان عورتیں مجاہدین کے ساتھ میدان جنگ میں جاتی تھیں اور زخمیوں کی تیمارداری کرتی تھیں اسلام نے عورت کا مقام بلند کیا اور پہلی بار اس کو میراث کا حقدار قرار دیا۔

اکثر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی کے متعلق کہا جاتا ہے حالانکہ مخالفین اور حملہ آور یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام تعدد ازدواج کو کم کرتا ہے۔ قرآن کریم میں صاف طور پر کہا گیا ہے۔

(ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم)

ترجمہ۔ اور تم ہرگز برابر نہ رکھ سکو گے عورتوں کو اگرچہ اس کی حرص کرو۔

آنحضرت نے بیوہ اور بوڑھی عورتوں سے بھی شادی کی تاکہ ان کو ضائع ہونے سے بچا سکیں آپ صحابہ کو اس بات کی ترغیب دیتے تھے کہ ان عورتوں سے شادی کرو جن کا کوئی سہارا نہ ہو تاکہ ان کو فقر و فاقہ اور بربادی کی مصیبت سے بچایا جا سکے۔

اکثر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام میں طلاق کی اجازت ہے۔ حالانکہ لوگ یہ بھول

حسن الدین احمد آئی اے ایس

مسجد قرطبہ

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل (اقبال)

سات سو اڑتیس سال کے بعد مسجد قرطبہ کو (جس کو مسجد الحمراء بھی کہتے ہیں) مسلمانان عالم
ے حوالے کیا گیا ہے یہ طویل مدت حساس دل رکھنے والوں کے لئے جیسی کچھ تکلیف دہ رہی ہو گی
ں کی ترجمانی علامہ اقبال نے

آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

بر کر دی تھی۔ اس طویل عرصہ میں خود مسجد قرطبہ بھی یقیناً بڑی کرب سے گزری ہو گی لیکن میری نظر میں
ت صدیوں کے کرب کا احساس اتنا تکلیف دہ نہیں ہے جتنا تکلیف دہ اس غیر معمولی اہمیت کی
ل خبر کے بعد کا سکوت کا ہے۔ سید غلام سمنانی کی خوبصورت نظم اور چند انفرادی تاثرات کے
دہ ہر طرف ایک سناٹا ہے۔ اس تغافل کی کیا وجہ ہو سکتی ہے یہ میری سمجھ سے باہر ہے بہت غور کیا
سوس کیا کہ شاید ہم کھونے کی خبروں سے اتنے مانوس اور خساروں کا ماتم کرنے کے اتنے عادی ہو چکے
ا کہ پانے کی خبر ہمارے لئے اجنبیت رکھتی ہو۔ کیوں کہ یہ تو مسلمہ ہے کہ ایسی خوش خبری مسلمانان عالم نے
ریوں سے نہیں سنی تھی یا پھر یہ وجہ ہو کہ ان طویل صدیوں کے حائل ہونے کی وجہ سے خود اس عالیشان
جد کی عظمت ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہو چکی ہو اگر ایسا ہے تو یہ زیادہ تکلیف دہ بات ہے۔

اس خبر کو سننے کے بعد میرے پیش نظر تو کچھ اور ہی بات تھی میں سوچ رہا تھا کہ علامہ اقبال کے
د جب مسجد قرطبہ جس زمانہ کا خواب دیکھ رہا تھا اور خود علامہ اقبال جس عالم نو کی سحر کو بے حجاب دیکھ
ہے تھے کہیں اس کی ابتداء تو نہیں ہو گئی ہے اگر واقعی ایسا ہے تو ہم خاموش تماشائی کیوں رہیں۔؟
خوش خبری کے مضمرات کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم قریباً بارہ سو سال
پیچھے جائیں۔

مسلمان ۷۱۱ء میں ایک بربری الاصل جنرل طارق بن زیاد کی سرکردگی میں اسپین پہنچے اور اس
ن ہے کہ طارق نے ساحل پر قدم رکھتے ہی اپنے جہازوں کو آگ لگا دی اور اپنے ساتھیوں کو
طب کرتے ہوئے کہا تمہارے پیچھے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور تمہارے آگے اجنبی ملک ہے۔
س طرح مسلمانوں نے عزم کے ساتھ اس اجنبی دیس میں قدم رکھا اور اس کو اپنا وطن بنا لیا اس طرح اسپین
ایک بڑا حصہ مسلمانوں نے اسی سال فتح کر لیا یہ خلیفہ ولید بن عبد الملک کا دور تھا۔ یہ علاقہ ایک عرصہ
خلافت بنی امیہ کے زیر تسلط رہا جب ۷۴۹ء میں خلافت بنی امیہ کا خاتمہ ہو گیا تو اندلس میں خانہ جنگی
ان اور اختلافات کا پیدا ہونا فطری عمل تھا۔ بنی امیہ کے ایک فرد عبد الرحمن الداخل کچھ عرصہ شمالی افریقہ
میں گذار کر ۷۵۵ء میں اسپین وارد ہوئے اور دوسرے ہی سال امیر قرطبہ مقرر ہوئے اس طرح انھوں
نے ایک عظیم سلطنت کی بنیاد ڈالی جو آئندہ ۲۸۴ سال تک قائم رہی اور جس نے یورپ میں علم و ہنر
کو پھیلایا اور یورپ کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر اہل یورپ کے ذہنوں کو صاف کیا اور بیداری
پھیلائی اس طرح نشاۃِ ثانیہ کے سامان فراہم کئے۔

امیر عبد الرحمن نے اپنے دورِ حکومت کے آخری حصہ میں مسجد بنانے کا منصوبہ بنایا اور ۷۸۵ء
میں یعنی آج سے ۱۱۹۸ سال پہلے قرطبہ کے مشہور دریا وادی الکبیر کے کنارے اس کی بنیاد ڈالی۔

یہ خیال کہ اس مسجد سے قبل اس جگہ ایک کلیسا تھا اور مسلمانوں نے اس کلیسا کے نصف حصہ
کو مسمار کر کے اس پر مسجد تعمیر کی محض افسانہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سلسلہ میں جو تفصیلات بیان کی
جاتی ہیں وہ بعینہ وہی ہیں جو حضرت خالد بن ولید کے ہاتھوں دمشق کی فتح کے بعد کلیسا کی جگہ مسجد
تعمیر کرنے سے متعلق ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس جگہ بہت پہلے کوئی کلیسا رہا ہو۔

امیر عبد الرحمن نے ۷۸۸ء تک اس مسجد کے بڑے حصہ کی تعمیر مکمل کرا دی۔ البتہ اس زمانہ
میں کوئی مینار تعمیر نہیں ہوا تھا۔ عبد الرحمن کے بعد خلیفہ ہشام کے زمانہ میں ایک مینار تعمیر ہوا اور تکمیلہ
کام کے اختتامی امور کی جانب توجہ دی گئی۔ اس کے بعد خلیفہ عبد الرحمن ثانی کے زمانہ میں مسجد کی
توسیع عمل میں آئی ان کے فرزند خلیفہ محمد نے مغربی باب الداخلہ کی تعمیر کی۔ خلیفہ عبد اللہ نے اپنے محل
سے مسجد تک مسقف راستہ تعمیر کیا اور آخر میں خلیفہ عبد الرحمن ثالث نے جدید مینار تعمیر کئے خلیفہ ہشام
ثانی کے زمانہ میں ان کے وزیر المنصور کے زیر انتظام ۹۸۷ء میں مسجد کی وسیع پیمانہ پر توسیع عمل میں
آئی۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر کا سلسلہ دو صدیوں تک جاری رہا۔

مذکورہ بالا تفصیلات تاریخی کتب میں ملتی ہیں۔ المقری اور دوسرے مورخین نے اس بارے
میں وضاحت سے لکھا ہے۔

اس وقت مسجد کی یہ کیفیت ہے کہ یہ ایک مستطیل شکل کی عمارت ہے جس کا طول ۱۸۰ میٹر
اور عرض ۱۳۰ میٹر ہے اطراف میں ایک فصیل ہے جس سے یہ مسجد باہر سے قلعہ نظر آتی ہے۔

اس مسجد کی تعمیر میں عربوں نے یقیناً مقامی انجینیروں اور فن کاروں سے کام لیا لیکن ان کے
سامنے جو مقصد اور منصوبہ رکھا اور پھر اس منصوبہ کو روبہ عمل لانے کا جو اہتمام کیا اس سے ان کی اولوالعزمی
ظاہر ہوتی ہے اور ساتھ ہی جذبہ خلوص و عقیدت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ حکمران عربوں نے خانہ خدا
کی شاندار پیمانہ پر تعمیر کے اعلیٰ مقصد کو زندگی کا نصب العین بنایا اور عشق الٰہی کو اپنا مطمح نظر اسی کی طرف
علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم مسجد قرطبہ میں ذکر کیا ہے یہ نظم اتنی ہی خوب صورت ہے جتنی خوب صورت

خود مسجد قرطبہ یہی وجہ ہے کہ اس نظم کو اردو کی بہترین نظموں میں شمار کیا جاسکتا ہے فرماتے ہیں ۔

اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف صوت معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود " وہ خون جگر " جس کے متعلق فرماتے ہیں ۔ قطرہ خون جگر سل کو بناتا ہے دل ۔

یہ خون جگر وقت کے شاہجہانوں نے فراہم کیا ۔ اولوالعزمی کا مظاہرہ کیا اور اپنے بلند حوصلوں کو دوام بخشا ۔

یقیناً مسجد قرطبہ کو دل سے مشابہت دی جاسکتی ہے ۔ کائنات میں دل سب سے عجیب و غریب اور بیش بہا چیز ہے جو حسین ہے اور جس سے خالق کائنات کی صناعی ظاہر ہوتی ہے ۔ پھر جس دل میں نور ایمان ہو وہ یقیناً حسین ترین شے ہو گا ۔ مسجد قرطبہ کا حسن کا بیان کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلب مسلمان میں ہے اور نہیں ہے کہیں

یہ عمارت مسلمانان عالم کے لئے باعث فخر تو ہے لیکن فن تعمیر کی باریکیوں ۔ نزاکتوں اور علمی گہرائیوں کا جو اظہار اس عمارت کی تعمیر میں ہوا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے ۔ آج بھی دور دور سے انجینئر اور آرکیٹکٹ اپنے شاگردوں کو یہاں درس دینے کے لئے لاتے ہیں ۔ اس کی تعمیر کے دوران دو صدیوں میں فن تعمیر میں جو ارتقا ہوا اس کو سمجھاتے ہیں اور فن کار اس کے نقوش کی خوبیوں کا مطالعہ کرتے ہیں اسی لئے تو اقبال نے اس کو " کعبہ ارباب فن " کہا ہے ۔

کعبہ ارباب فن سطوت دین مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں

اس مسجد نے فن تعمیر کو ایک خاص موڑ دیا بعد میں جو عظیم اور خوبصورت عمارتیں تعمیر ہوئیں وہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئیں ۔

اس مسجد میں قرآن شریف کا وہ نسخہ موجود ہے جس کو حضرت عثمان غنیؓ بوقت شہادت تلاوت فرما رہے تھے اور جس کے چار صفحوں پر ان کے خون کے نشانات موجود ہیں ۔

اس مسجد میں خلافت اندلس کے زمانے میں نہ صرف پنج وقتہ اور جمعہ کی نماز ہوتی تھی بلکہ یہ مسلمانوں کا ایسا مرکز تھا جہاں تمام امور انجام پاتے تھے فوجوں کو کوچ سے پہلے یہیں سے خدا حافظ کہا جاتا تھا اور دعا دی جاتی تھی اور واپسی پر یہیں ان کا خیر مقدم کیا جاتا تھا اہم تصفیے اور فیصلے یہیں ہوتے تھے ۔ درس کا یہاں انتظام تھا ۔ مسجد قرطبہ کی مرکزی حیثیت اس وقت تک رہی جب تک مسلمانوں کا اقتدار اندلس میں باقی رہا ۔

تقریباً پانچ صدیوں کے جاہ و جلال کے بعد سرزمین اندلس میں مسلمانوں کے اقتدار کو زوال آیا ۔ ۲۹ جون ۱۲۳۶ء کو فرڈیننڈ سوم قرطبہ میں فاتحانہ داخل ہوا ۔ اس کے بعد اس مسجد کو اندر وقتاً فوقتاً گرجا بناتے گئے ۔ ۱۵۲۶ء میں ایک اور بڑا گرجا تعمیر کیا گیا ۔ ۲۱ نومبر ۱۸۸۲ء کو اس مسجد و کلیسا کی مخلوط حیثیت کو تبدیل کر کے قومی میوزیم بنایا گیا ۔

ستمبر ۱۹۷۴ء میں اسپین کے ارباب حل و عقد نے اسلامی سکریٹریٹ کے مساعی کے زیر اثر مسجد قرطبہ کو واگزاشت کر دیا ۔ عبادت گاہوں پر ناجائز قبضے یا ان کی بازیافت میں میدان جنگوں کا دخل رہا ہے یا مادی قوت کا استعمال کیا جاتا ہے اس مرتبہ اس مسجد کو مذاکرات اور گفت و شنید سے حاصل کیا گیا اس مقصد کی کامیابی فرانکو کی حکومت کے خاتمہ کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکی ۔

یہ حکومت اور اس سے قبل کی ہسپانوی حکومتیں بڑی تنگ نظر متعصب اور سامراجی ذہنیت کی حامل تھیں ۔

موجودہ حکومت کا رویہ ان سے بالکل مختلف ہے اور یہ حکومت وسیع النظر ہے چنانچہ موجودہ حکومت نے حکومت ہند سے بھی دوستانہ تعلقات اور روابط قائم کرنے کے لئے سازگار ماحول پیدا کیا ہے اور ۲۲ سال کے بعد ہندوستان سے سفارتی تعلقات قائم ہونے کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں

بقیہ — ایوان غالب

جانتے ہیں کہ اسلام میں طلاق پر سخت پابندیاں ہیں حدیث میں ہے کہ خداوند تعالےٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ حلال چیز طلاق ہے ۔ اسلام میں عورت کی حفاظت اور اس کے حقوق کی بہت رعایت ہے ۔ اس کو بعد از طلاق نفقہ اور خرچ کا حق ہے ۔ خاوند سے تنازعہ کی صورت میں عدالت سے رجوع کرنے یا ثالثی کا اختیار ہے ۔ روز فرانسیسی قانون ساز پلانیول اور ریپر کا کہنا ہے کہ طلاق بری چیز ہے لیکن یہ ایک ایسی چیز ہے کہ سوسائٹی اور معاشرہ کو اس سے بچانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے ۔ بعض اوقات کسی بڑے نقصان سے بچنے کا یہی ایک ذریعہ ہوتا ہے ۔ کبھی کبھی طلاق باعث تکلیف بھی ہوتی ہے لیکن طلاق کو حرام قرار دینا ایسا ہے کہ کوئی شخص ڈاکٹر کو آپریشن کرنے سے روکے حالانکہ وہ مریض کے اعضاء میں سے ایک عضو کا آپریشن کرنے پر مجبور ہے ۔

نبی اکرم امن کے حامی تھے ۔ آپ کی روزمرہ کی زندگی کا ایک واقعہ اس بات کے ثبوت میں کافی ہے ۔ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لڑکا تولد ہوا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کا نام حرب تجویز کیا ۔ نبی اکرم تشریف لائے اور فرمایا کہ مجھے اپنا لڑکا دکھاؤ ۔ اور تم نے اس کا کیا نام رکھا ۔ انھوں نے کہا حرب آپ نے فرمایا یہ حسن ہے ۔

صدر محترم ، بہنو اور بھائیو

بات بڑھتی ہی جاتی ہے ۔ اگر ہم آنحضرت کی سیرت طیبہ اور آپ کی جد و جہد سے حاصل ہونے والے واقعات بیان کرنا شروع کر دیں تو کوئی انتہا نہیں لیکن میں اس پر اکتفا کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ خداوند کریم آپ کو ترقی اور خوش حالی سے سرفراز کرے ۔ والسلام علیکم و رحمۃ اللہ

* * *

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

مولانا آزاد بحیثیت صاحبِ طرز

اُردو میں اس نام کے یوں تو بہت سے ادیب ہوتے ہیں لیکن محمد حسین آزاد، سید محمد نواب آزاد اور مولانا ابوالکلام آزاد خاص طور پر مشہور ہوتے۔ اس فہرست میں اگر رتن ناتھ سرشار کا پیدا کردہ کردار آزاد بھی شامل کر لیا جائے تو چاہیں گونا گوں خصوصیات سے ادب میں زندہ جاوید کا مرتبہ حاصل کر چکا ہے تو ان ممتاز آزادوں کی تعداد چار تک پہنچتی ہے۔ بزمِ ادب کے یہ چار درویش مختلف اوقات میں اپنے کارناموں کے ساتھ تاجدارِ سخن کے بزم میں آئے اور ہر ایک کی محبوبۂ اردو نے نگاہِ جوہر شناس سے سب کو حیاتِ جاوید سے سرفراز فرمایا۔ مولانا ابوالکلام آزاد سب کے آخر میں آئے مگر اس انداز میں آئے کہ ادبی راہیں جگمگا اٹھیں اور دیکھنے والوں کو محسوس ہوا کہ شاید اس شان سے کوئی اور آزاد اس محفل میں اب سے پہلے نہیں آیا۔ ان کے طرزِ خرام نے اہلِ نظر کو غیر مقدم پر مسحور کر دیا اور طرزِ خاص کی لطافت و بلندی پر نظر کر کے تاجدارِ سخن نے بھی جی کھول کر داد دی۔ آئیے ان کے طرزِ خاص پر ایک نظر ڈالیں کہ ہم بھی غور کریں کہ اس کی دلکشی کے اسباب کیا تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد ادبی دنیا میں سچ مچ ابوالکلام کیوں ہوتے۔

فنکاری کا نام ہے طرزِ ادا و تخیل کی ندرت کا۔ جس قدر ہم آہنگی ان دونوں میں ہوگی اتنا ہی فنکار عروج سے قریب ہوتا جائے گا۔ مواد اور بیان اس کے آسمان و زمین ہیں بغیر ان دونوں کے بنا ہوئے دنیائے فن آباد نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کا سہارا لے کر کوئی ادیب میدانِ ادب میں نمایاں ہو سکے لیکن ثبات و دوام پانا ممکن ہے، ہر دلعزیزی ممکن ہے لیکن ہمہ گیری و استحکام نصیب ہونا مشکل ہے۔ فن کے نمایاں ہونے میں طرزِ تحریر اور مواد کا تناسب کیا ہے اس کا فیصلہ آسان نہیں لیکن عام طور پر یہ مانتے ہیں کہ مواد کی اہمیت اس سلسلے میں زیادہ ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے اسی مرتبہ کے الفاظ بھی ساتھ ہی ساتھ دماغ میں ابھر آتے ہیں کوئی خیال بغیر الفاظ کا سہارا لیے ہوئے ذہن میں نہیں آتا۔ مواد کے ذخیرے سے تخیل جب کوئی موضوع چنتا ہے الفاظ ہی اس کو صورت عطا کرتے ہیں گویا خیال زندگی ہے اور الفاظ پیکر۔ ظاہر ہے کہ زندگی بغیر پیکر کے آسانی سے نہ دیکھی جا سکتی ہے نہ سمجھی جا سکتی ہے مگر اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ روح بغیر قالب کے ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے ماننے والوں کے نزدیک اس کا ہونا مسلم ہے۔ حال روح بغیر جسم کے اور جسم بغیر روح کے بے معنی تو نہیں مگر ناقابلِ فہم ضرور ہے۔ ان دونوں کا ساتھ یہ ہے۔ دنیا زیادہ تر جسمانی حسن سے متاثر ہوتی ہے روح کی رعنائی کا معیار اسی کو سمجھتی ہے اس کو پرکھنا آسان کام نہیں اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ ؎

عشق کا حسن کہاں دیکھ سکے اہلِ جہاں
ورنہ یوسف سے زیادہ تھا زلیخا کا جمال

الفاظ و مواد کے تناسب و اہمیت کی بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ ادیب کو میدانِ عمل میں امتیاز کب اور کیوں حاصل ہوتا ہے تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بغیر دونوں کی ہم آہنگی و ندرت کے انفرادیت نصیب نہیں ہوتی اور عام و روایتی شاہراہ سے ہٹ کر جب تک ادیب اپنا کوئی راستہ نہیں پیدا کرتا وہ کاروانِ ادب میں ممتاز و منفرد بھی نہیں ہوتا۔ زمانہ بغیر جوہرِ خاص کے کسی کو یکتا و منفرد ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ اس انفرادیت کے لیے اوگھٹ گھاٹی سے گزرنا پڑتا ہے، بہت سوچ سمجھ کر راستہ چلنا پڑتا ہے۔ غالب کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ دنیائے شاعری میں ان کے ابتدائی نقوش باوجود طرزِ تخیل کی ندرت کے کوئی جگہ ادب میں نہ پا سکے لیکن جب انھوں نے زبان و بیان کی رعنائی میں ایک معقول تناسب پیدا کر لیا تو وہی سب سے بلند جگہ پر نظر آتے۔ اگر انہی اور اپنے طرزِ گفتار میں اصلاح نہ کرتے تو باوجود بلندیِ خیال شاید عنقا صفت ادب کی دنیا سے گم ہو جاتے۔

ان باتوں کے بعد آئیے اب دیکھیں کہ ابوالکلام آزاد دنیائے ادب میں اردو کو کچھ ایسی چیز دے سکے جو ان کا تحفہ سمجھا جائے یا اوروں کی طرح آتے اور کارواں کے ساتھ بڑھتے کو نمایاں کیے چلے گئے۔ ایسا نہیں ہے۔ پہلی ہی نظر میں محسوس ہوتا ہے کہ کم از کم ایک ایسی طرزِ نگارش اردو کو وہ دے گئے جس میں زندگی، تموج اور سیلابی کیفیت رواں دواں ہے جس کو انکی ہمہ پہلو شخصیت، تبحر علمی، غیر معمولی حافظہ اور حسنِ طبع کا امتیاز مل جل کر طرزِ تحریر کو وہ انفرادیت عطا کرتے ہیں جو کسی اور کے یہاں مشکل سے ملتی ہے۔

کسی زبان میں ایسے صاحبِ طرز مشکل ہی سے پیدا ہوتے ہیں جو اپنی طرزِ نگارش کا پرچم اس انداز سے بلند کریں کہ ادب اس کو طرۂ امتیاز سمجھے اور لوگ اس کے سایہ میں شگفتگی و توانائی کی لہریں محسوس کریں۔ طرزِ بیان کے ساتھ واقفیت و بلندیِ خیال بھی دل و دماغ کو متاثر کرے۔ مثال کے لیے اردو ادب کے چند نثر نگار پیش کیے جا سکتے ہیں۔ دورِ جدید سے اب تک جو اہلِ قلم اپنی طرزِ نگارش کے لیے مشہور ہیں ان میں آزاد، شبلی، حالی، مہدی افادی، حسن نظامی، نیاز فتح پوری، سجاد انصاری، مجنوں گورکھپوری اور دو چار نام اور یاد آئیں گے۔ بظاہر یہ تعداد اچھی خاصی ہو جاتی ہے مگر ذرا سخت گیری سے کام لیا جائے تو یہ فہرست ایک چوتھائی مشکل سے باقی رہ جاتی ہے یعنی اگر اس نقطہ سے دیکھا جائے کہ ان میں سے کتنے ادیب ایسے ہیں جو صرف طرزِ نگارش کے بل بوتے پر

میدانِ ادب میں زیادہ دور تک گھوڑے رہ سکتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ انے گنے اہلِ قلم باقی رہ جاتے ہیں ان ہی چند رہنے والوں میں ہم ابوالکلام آزاد کو پاتے ہیں ۔

ہم نے جیسا اوپر عرض کیا کہ علاوہ اور خصوصیات کے مخصوص طرز کے لئے ضروری ہے کہ اس میں مواد و الفاظ کی ہم آہنگی ہو اور عام روایتی شاہراہ سے علیحدہ ایک نئی راہ بھی اس کی تحریر میں نمایاں ہو ابوالکلام آزاد کے یہاں سب سے پہلے یہی خصوصیت جاذبِ نظر ہو جاتی ہے اس عمل میں ان کی شخصیت کارفرما ہے تبحرِ علمی، عملی سیاست، تجربات و مشاہدات نے ان کی ذہنیت کو ایک خاص بلندی عطا کر دی تھی وہ علم و عمل کے دوراہے پر نہیں بلکہ سنگم پر کھڑے تھے چونکہ ان کے ذہن میں خیال کی صورت میں آنا وہ اپنی نشو و نما کے لئے اس مقام سے متاثر ہونے پر مجبور ہوتا اس لئے کہ مولانا کی ذہنیت کی تشکیل ان ہی اجزاء سے ہی ہوئی تھی ان کے غور و فکر میں وسیع النظری، وعلومات کے عناصر خیال کو پختگی و رعنائی دینے کے علاوہ الفاظ کا ذخیرہ بھی اس پیمانے پر پہونچاتے ہیں جو خیال سے ملتے جلتے ہوئے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے نامناسب نہ ہوتے نتیجہ یہ تھا کہ خیالات و الفاظ میں یک رنگی و ہم آہنگی خود بخود پیدا ہو جاتی لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خصوصیت ہر شخص کے لئے قدرت نے عام کر دی ہے جو جس طرح سوچتا ہے اسی قبیل کے الفاظ بھی ذہن میں آتے ہیں یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے لیکن ہر شخص کی خیال آرائی بقدرِ ظرفِ علم ہوتی ہے۔ اگر علم یا معلومات کا پیمانہ وسیع نہیں ہے تو خیال کی پرواز بھی معمولی ہوگی، اور اگر علم و تجربات کا پیمانہ وسیع ہے تو خیالات بھی بلند ہونگے اور ان پیدائش کیساتھ ہی الفاظ بھی ایسے لائینگے جو پرواز میں کوتاہی نہ پیدا ہونے دیں بلکہ خیال کی ندرت سے ہم آہنگ ہوں۔ ... سے ادیب مطمئن نہیں ہو جاتا پیش کرنے سے پہلے ان کو تراش خراش کرنے کے بعد قلم بند کرتا ہے یہ تراش خراش حسن و قبح کی مقراض سے ایک خاص صورت میں لائی جاتی ہے اگر مصنف یا فن کار کا جمالیاتی حسن کوئی مخصوص سطح تک نہیں پہونچ سکا ہے تو الفاظ بھی ناہموار اور ترتیب بھی ناخوشگوار ہو جائے گی گویا حسن و قبح کا انداز ہی بندش کو خوب صورت یا بدصورت بناتا ہے اور یہی بندش خیال کی مقبولیت یا کراہیت کا باعث ہوتی ہے اس بات کا سوچنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا اس کو پر اثر انداز میں پیش کرنا اور اس انداز پر شاعر یا ادیب کی کامیابی و ناکامی کا انحصار ہے اس اصول کے لحاظ سے جب ہم ابوالکلام کے طرزِ تحریر پر نظر ڈالتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اس کا جمالیاتی حسن اس بلندی پر پہلے ہی پہونچ چکا تھا جو بہت کم لوگوں کے یہاں نظر آتا ہے ۔

مولانا کے حسن و قبح کا اندازہ ان اشعار سے بھی ہوتا ہے جو غبارِ خاطر میں جا بجا ملتے ہیں تمام اشعار کو غور سے دیکھئے تو ان کے اندر لطافت و معنویت کا ایک دریا موجزن نظر آتا ہے یہ نہیں ہے کہ یہ اشعار اتفاقیہ طور پر آ گئے ہیں یا بغیر سوچے ہوئے چمک دمک یا بحر کی روانی سے مرعوب ہو کر مولانا نے پیش کیا ہے ان کی نظر زیادہ تر معنویت و الفاظ کی رعنائی پر ہے مثال کے لئے ایک شعر کو دیکھئے جس کی تشریح سے مولانا کی ژرف نگاہی و جمالیاتی حسن کا اندازہ ہوتا ہے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"حسبِ معمول سو کر اٹھا تو بغیر کسی ظاہری مناسبت اور تحریک کے یہ شعر خود بخود زبان پر طاری تھا !

کم لذتم و قیمتم افزوں ز شمار است
گوئی ثمرِ پیشترِ از باغ وجودم....!!

غور فرمائیے کیا عمدہ مثال دی ہے آپ نے اکثر بے فصل کے میوے کھائے ہوں گے مثلاً جاڑوں میں آم جو دراصل بے فصل کی چیز ہوتی ہے نایاب بھی سمجھی جاتی ہے لوگ بڑی بڑی قیمتیں دے دے کر خریدتے ہیں اور دوستوں کو بطور تحفہ بھیجتے ہیں لیکن جو علت اس کی کمی اور گرانی کی تھی یہی بے لذتی کی بھی ہوگئی کھاتے تو مزہ نہیں ملتا اور مزہ ہو تو کیسے ہو؟ جو موسم ابھی نہیں آیا اس کا میوہ ناوقت پیدا ہوگیا یہ زمین کی غلط اندیشی تھی کہ وقت کی پابندی بھول گئی اور اس غلط اندیشی کی پاداش ضروری ہے کہ میوہ کے حصّے میں آئے تاہم چونکہ چیز کمیاب ہوتی ہے اس لئے بے مزہ ہونے پر بھی بے قدر نہیں ہو جاتی کھانے والوں کو مزہ نہیں ملتا پھر بھی زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر خریدی گئے اور کہیں گے کہ یہ جنس نایاب جتنی بھی گراں ہو ارزاں ہے ۔

ایک دوسرے خط مورخہ ۱۷ اکتوبر ۴۲ء میں ایک دوسرے شعر کی تشریح کرتے ہیں شعر یہ ہے ؎

چندان کہ دستِ و پا زدم آشفتہ تر شدم
ساکن شدم، میانِ دریا کنارہ شد

شعر کی معنویت پر نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

"اگر جسم میں روح بولتی ہے اور لفظ میں معنی ابھرتا ہے تو حقائقِ ہستی کے اجسام بھی اپنے اندر کوئی روحِ معنی رکھتے ہیں یہ حقیقت ہے کہ معمۂ ہستی کے بے جان اور بے معنی جسم میں صرف اسی ایک حل سے روحِ معنی پیدا ہو سکتی ہے، ہمیں مجبور کر دیتی ہے کہ اس حل کو حل تسلیم کریں۔ اگر کوئی ارادہ اور مقصد پردے کے پیچھے نہیں ہے تو یہاں تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن اگر ایک ارادہ اور مقصد کام کر رہا ہے تو پھر جو کچھ بھی ہے روشنی ہی روشنی ہے ہماری فطرت میں روشنی کی طلب ہے ہم اندھیرے میں کھوئے جانے کی جگہ روشنی میں چلنے کی طلب رکھتے ہیں اور ہمیں یہاں روشنی کی راہ صرف اسی ایک حل سے مل سکتی ہے "

ان مثالوں سے بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ آزاد کا ذہن کتنا روشن تھا ان کی پسند معانی و مطالب میں ندرت و بلندی چاہتی تھی الفاظ کے بندوبست میں رعنائی تلاش کرتی تھی اور یہ طلب و جستجو ان کی طبیعت کا جز و لاینفک ہو گئی تھیں جو ان کے طائرِ تیز تقریر و تحریر کے لئے پر و پرواز بن گئی تھیں ۔

آزاد کے شعور کی بالیدگی اور مزاج کی شعریت نے طبیعت پر غلبہ حاصل کر لیا تھا جو ہر جگہ سیلاب بن کر تقریر و تحریر میں ابل پڑتی تھی شعریت کا ایک تقاضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بات برجستگی کے ساتھ کہی جاوے الفاظ ایسے لائے جائیں جو مفہوم کو زیادہ سے زیادہ اور جلد سے جلد تر ذہن نشین کر دیں سننے یا پڑھنے والے مطالب بھی سمجھ لیں اور الفاظ کی ترتیب سے جو حسن بیان ہوا اس میں محو ہو کر دیر تک لطف لیتے رہیں یہ جب ہی ممکن ہے کہ بات بھی کام کی ہو اور انداز بیان میں ادبیت بھی آزاد کے گوناگوں تجربات اور فارسی عربی کے وسیع مطالعے نے ان کی فطرت کو ادب کے سانچے میں ڈھال دیا تھا ان کے غیر معمولی حافظہ نے شعراء کے منتخب اشعار کا لامحدود ذخیرہ ذہن میں جمع کر دیا تھا چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ غبارِ خاطر نثری شاہکار ہے مگر اس میں اشعار کی تعداد نثر کے تناسب سے زیادہ ہے لیکن ان کا سبب یہ تھا کہ آزاد اپنے شعر پسند طبیعت کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کی یادداشت میں خیالات و واقعات کے لحاظ سے اتنے اشعار جمع ہو گئے تھے کہ نثر کے میدان میں بھی موقع پاتے ہی بے تحاشا سامنے آ جاتے تھے گویا ان کی جمالیاتی حسن کو خوب سے خوب تر بنانے میں ہر ادبی لطافت کا سہارا لینا چاہتی تھی اور آزاد اپنی بے چین طبیعت سے مجبور ہو کر کسی منزل کو منزل نہیں سمجھنا چاہتے تھے ۔

دوڑی جاری تھی ۔ ان کے بعد میدان گذرتے جاتے تھے ایک منظر پر نظر جمنے نہیں پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا اور ایسا ہی باہر میرے دماغ کے اندر بھی گذر رہا تھا احمد نگر اپنی چھ سو برس کی داستان کہنے کے لئے ورق پر ورق الٹتا جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ ایک صفحہ پر اپنی نظر جمنے نہ پاتی کہ دوسرا آجاتا ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے خیال ہوا اگر ہمارے قید و بند کے لئے یہی جگہ چنی گئی ہے تو انتخاب کی موزونیت میں کلام نہیں ہم خرابا تیوں کے لئے کوئی ایسا ہی خرابہ ہونا تھا "

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آزاد ایسے الفاظ و تراکیب نہیں لاتے جو ثقیل یا نامانوس ہوں ، بلکہ جیسا ہم نے عرض کیا کہ ان کے تخیل کے مد پر لفظیات رواں ہوتے ہیں اگر موضوع بجائے خود ادق ہے ، تو فطری مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے ہم پلہ الفاظ لائے جائیں لفظیات کے ضمیر پر غور کیجئے تو جاندار افراد کی سوسائٹی کے خواص کی جھلک ملتی ہے جس طرح حیوان اور انسان اپنے جنس کی سوسائٹی میں خوش رہ سکتا ہے ، یہی چاہتا ہے کہ نداق ذہنی سطح کے اعتبار سے ہم جلیس قریب قریب یکساں ہو بعینہ یہی مطالبہ الفاظ کا بھی ہوتا ہے وہ بھی اپنے قبیل و معیار کے ساتھ چاہتے ہیں نرم و گرم ناہمواری سے جیسے ان کا بھی دم گھٹتا ہو اس عیب کو آپ فنی اصطلاح میں تنافر کہیں یا کچھ اور بہرحال اہل نظر ہمیشہ سے الفاظ ، موضوع یا طرز گفتار کی غیر ہم آہنگی کو مکروہ یا بدنما سمجھتے آئے ہیں آزاد کی نکتہ رس طبیعت نے ابتدا ہی سے زبان و خیال کی ناہمواری کا انداز پالیا تھا وہ موزوں کا سانچہ دیکھ کر اظہار بیان کے لئے الفاظ ڈھالتے ہیں اور اسی لحاظ سے انتخاب و ترتیب کا کام شروع کرتے ہیں اوپر کے اقتباسات سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ موضوع کوئی خاص وزن کا نہ تھا اس لئے انھوں نے الفاظ بھی اسی کے اعتبار سے سادہ و عام فہم پیش کئے لیکن جہاں کہیں موضوع بلندی خیال کا پرتو لئے ہوتا ہے وہاں اظہار بیان و نکات کو روشن کرنے کے لئے وہ مشکل الفاظ و مخصوص تراکیب و تشبیہات صرف کرنے میں تکلف بھی نہیں کرتے کیوں کہ ایسے موقع پر تکلف مخل کے مترادف ہو جاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ فن کار سہل الفاظ و انداز کا اتنا گرویدہ ہو گیا ہے کہ اس کے دائرہ سے باہر قدم رکھنا ہی نہیں چاہتا یا وہ موضوع و الفاظ کی ہم آہنگی کا قائل نہیں صرف اپنے الفاظ پر قدرت رکھنے اور ان کو قلم بند کر دینے ہی میں وہ طرز نگارش و تاثیر آفرینی کے ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا ہے آزاد نے ہر موقع پر اس بات کا خیال رکھا ہے کہ زبان و بیان میں ناہمواری نہ آنے پائے چنانچہ اقتباسات سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا اب ایک مثال اس نوع کی بھی دیکھ لیجئے جو موضوع کے ادق ہونے کے لحاظ سے کسی قدر مشکل الفاظ و نامانوس تراکیب کے ساتھ آزاد کے بیان میں آتی ہے ۱۸ اکتوبر ۴۳ء کے خط میں لکھتے ہیں غور و فکر کی یہی منزل ہے جو ہمیں ایک دوسری حقیقت کی طرف بھی متوجہ کر دیتی ہے یہ کیا بات ہے کہ انسان خدا کے ماورائے تعقل اور غیر شخصی تصور پر قانع نہ رہ سکا اور کسی نہ کسی شکل میں اپنے فکر و احساسات کے مطابق ایک شخصی تصور پیدا کرتا رہا ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ شخصی تصور کے مختلف مدارج ہیں ابتدائی درجہ تو شخص محض کا ہوتا ہے جو شخصیت کا اثبات کرتا ہے لیکن پھر آگے چل کر شخصیت خاص خاص صفتوں اور فعالیوں کا جامہ پہن لیتی ہے سوال یہ ہے کہ جامہ ناگزیر کیوں ہوا ؟ اس کی علت بھی یہی ہے کہ انسان کی فطرت کو بلندی کے ایک نصب العین کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کی پیاس بغیر ایک شخص اور علائق نواز تصور کے بجھ نہیں سکتی حقیقت کچھ ہی ہو لیکن یہ تصور جب کبھی اس کے سامنے آئے گا تو تشخص کی ایک نقاب چہرے پر ضرور ڈال لے گا یہ نقاب کبھی بھاری رہی کبھی ہلکی ہو گی کبھی ڈرانے والی رہی کبھی لبھانے والی بن گئی لیکن چہرے سے کبھی اتری نہیں یہیں سے ہمارے دیدۂ صورت پرست کی ساری درماندگیاں شروع ہو گئیں ۔

غیر صفاتی تصور کو انسانی دماغ پکڑ نہیں سکتا اور طلب اسے ایسے مطلوب کی ہوتی جو اس کی پکڑ میں آسکے جس کے حسن گریزاں کے پیچھے والہانہ دوڑ سکے جس کا دامن کبریائی پکڑنے کے لئے اپنا دست و نیاز بڑھا سکے جس کے ساتھ راز و نیاز محبت کی راتیں بسر کر سکیں جو اگرچہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو لیکن پھر بھی اسے ہر دم جھانک سکے جو جھانک رہا ہو "

یہاں آزاد سے عام فہم زبان کا مطالبہ کیا ہی نہیں جا سکتا اس لئے کہ یہ موضوع بذات خود ادق ہے اور صرف اہل دماغ ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں اس قسم کی باتیں عوام کے لئے نہیں ہوتی اس کا تعلق خواص سے ہوتا ہے جو اہل علم ہونے کے علاوہ مسائل کی اہمیت سے بھی دلچسپی لیتے یا لے سکتے ہیں یہ خیالات ہر لحاظ سے کسی قدر مشکل الفاظ کے جامہ پہن کر سامنے آنا چاہتے ہیں ہلکا پھلکا لباس ان کا وزن برداشت نہیں کر سکتا اس مکتوب میں جس شخص سے خطاب ہے اول تو وہ خود عالم ہے اور دوسرے مسئلہ زیر بحث تصوف یا فلسفہ کی زبان چاہتا ہے جو مصطلحات و مخصوص الفاظ کے بغیر واضح نہیں ہو سکتا اس کے لئے یہی انداز بیان موزوں ہے کیوں کہ باوجود اس کے کہ مسئلہ کی بنیاد ذہن کی تہ در تہ کاوشوں پر ہے آزاد نے الفاظ کو اس طرح سجایا ہے کہ موضوع اپنی متانت بھی قائم رکھے اور مفہوم الفاظ و تراکیب کے گورکھ دھندے میں الجھ کر مدہ ہو جاتے جہاں زور بیان و ترتیب الفاظ سے فضا جتنی دل کش ہو گئی ہے وہ آزاد کی طرز تحریر کو ایک ایسی خصوصیت عطا کرتی ہے جو شبلی کے یہاں ملتی ہے نہ محمد حسین آزاد کے یہاں کاش ابوالکلام آزاد نے ایسے موضوعات پر اردو میں کوئی مستقل تصنیف چھوڑی ہوتی تو اردو کی دنیا میں ایک نئے باب کا قابل قدر اضافہ ہوتا اور ایک بڑی کمی پوری ہو جاتی ۔

ابوالکلام آزاد کی طرز تحریر اور اسباب پر غور کرتے وقت دل کشی کی ایک اور خاص وجہ سمجھ میں آتی ہے ان کی خطابت کے سلسلہ میں ہم کو یہ نہ بھول جانا چاہیے کہ اپنے دور کے بہترین مقرروں میں سے تھے بلا خوف کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں اس لحاظ سے ان کا کوئی ثانی نہ تھا وہ اپنی تقریر کے لئے سارے ہندوستان میں مشہور تھے ان کی خطابت ساحری تھی لب و لہجہ کے علاوہ بیان کی شگفتگی دل سے نکلتے ہوئے جوش خروش اس طرح بالقوہ بات میں محسوسات کو متحرک کرتے تھے کہ سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو جاتا تھا ان کی تقریریں سننے والوں کو وہی لذت ملتی جو ایک اچھے مغنی کے نغمہ دلنواز یا باکمال شاعر کے رومانی اشعار سے نصیب ہو سکتی ہے تقریر کا یہ جوہر آزاد کی تحریر کو بھی دلکش بنانے میں معاون ہوا الفاظ کے اتار چڑھاؤ سے دلوں کو متاثر کر لینا یہاں بھی کام آیا جملوں کے مفہوم و معنی کے لحاظ سے یکے بعد دیگرے اس طرح منبط تحریر میں لانا کہ تاثر کے مدارج ذہن کی تہہ کو کھولتے چلے جائیں اور الفاظ اثر لینے والی طبیعت کے تخم ہی پیدا کر کے جنبش میں لے آئیں غالباً فن خطابت کے ہی پرتو کا نتیجہ ہے غور سے آزاد کی تحریر کو دیکھئے تو ایک جملہ کے بعد دوسرا جملہ اپنی ساخت و کیفیت کے لحاظ سے پہلے جملہ کی وضاحت اور آگے کے جملہ کی گہرائی میں اضافہ کرتا جاتا تھا اور یہ سلسلہ کلام مبتدا کو خبر سے اتنا مربوط کر دیتا ہے کہ پوری عبارت فن کاری کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے مثال کے لئے یہ عبارت لے لیجئے ۔

جس قید خانے میں صبح مسکراتی ہو ۔ جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہو جہاں دوپہر روز چمکے شفق ہر روز نکھرے پرندہ ہر صبح شام چہکیں اسے باقی صفحہ ۲۷ پر

جناب قاضی عبدالغفار صاحب مرحوم

مولانا ابوالکلام آزاد انشاء و ادب کے میدان میں

ایک ادیب کی حیثیت سے مولانا آزادؒ کی ادبیت کا مطالعہ کرنا کوئی آسان کام نہیں
لانا کے علم و فضل کی انفرادیت ان کے ادب پر اس قدر چھا گئی ہے کہ ان دونوں چیزوں کو ایک
دوسرے سے جدا کرنا بہت ہی دشوار ہے اردو زبان کے صاحب طرز ادیبوں میں ہم آسانی کے ساتھ
غالب، محمد حسین آزاد، سرسید احمد خان اور چند ایسے صاحب طرز ادیبوں کی ادبیات کا تجزیہ کر سکتے ہیں
لیکن مولانا کی شخصیت ان کے ادب سے اس قدر وابستہ ہے کہ انفرادیت سے جدا کر کے ان
کے ادب کا مطالعہ کرنا ایک بڑا ہی کٹھن کام ہے خاص طور پر مولانا کے فکر و نظر کا انداز آپ کی تحریر
کی بلاغت اور فصاحت میں ان کی انفرادیت کو اس قدر نمایاں کرتا ہے کہ کوئی لفظ کوئی فقرہ ان
کے قلم سے ایسا نہیں نکلتا جو ان کے پیش رو ادیبوں کے طرز نگارش سے ملتا جلتا ہو۔ غالب ہی
تنہا ایک شخص ایسا تھا جس نے اپنی نثر اور نظم کا انداز اپنے ہی لیے مخصوص کر لیا تھا یعنی کوئی ادیب
اس کی تقلید نہیں کر سکا لیکن مولانا غالب کی اس خصوصیت سے بھی دو قدم آگے نکل گئے اور انھوں
نے جو کچھ بھی لکھا اس کو اپنی بے مثل شخصیت کے قدرتی سانچے میں اس طرح ڈھال دیا کہ بہت سے
اہل قلم اس طرز تحریر کو اپنانے کی کوشش کر کے ہار گئے لفظوں کی قوت اور جذبات کی بے پناہ
روانی کے ساتھ مولانا کا طرز تحریر ایک لطیف آرٹ بن گیا ہے مجھے مولانا مرحوم کی شخصیت اور ان
کے مخصوص طرز تحریر کا مطالعہ کرنے کے کافی مواقع حاصل ہوئے اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر مولانا اتنے
بڑے انشاء پرداز ادیب نہ ہوتے تو بہت بڑے مصور یا ماہر موسیقی یا شاعر ہوتے ان کی روحانیت کو
اگر ایک طرف مذہب کے تقدس اور دوسری سیاست کی سنجیدگی نے پابند کر لیا ہوتا تو ان کے
قلم کا یہ آبشار جو آزاد ہندوستان کے دور جدید کا نقیب ہوا ہمیں وجدانیت اور رومانس
کی پر فضا وادیوں میں بہائے جاتا۔

مولانا کا طرز تحریر اور اسلوب بیان اپنے اندر چند خصوصیات رکھتا ہے جو اردو ادب میں
ی حد تک [illegible] اس کے لیے مخصوص ہیں جیسا کہ میں نے ابھی اشارہ کیا مولانا کی فطری انفرادیت
سے ان کا ادب بھی بھرپور ہے وہ کوئی ایسی بات قلم سے لکھ ہی نہیں سکتے جس کا انداز اظہار ادا
عام اصول سے مماثلت رکھتا ہو وہ ایک پیش پا افتادہ بات کو بھی اسی طرح لکھیں گے جس طرح
کسی نے نہ لکھا ہو اور اس کے ساتھ فصاحت و بلاغت کا اشارہ و کنایہ اور قوت اظہار ان
لفظوں کی معنویت بہت بھاری بھرکم اور دماغوں پر اثر کرنے والا بنا دیتی ہے بعض اوقات
سادہ حقیقتیں اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ وہ دلدل میں الجھ جاتی ہیں۔
اگر ہم "الہلال"، "البلاغ"، "تذکرہ" اور "غبار خاطر" کی تحریروں کا ایک جائزہ لیں
تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کے قلم سے جو نقش و نگار بنتے ہیں وہ ایک آرٹسٹ کی روح ہیں جو اپنے کو کبھی
روحانیت کبھی فلسفہ اور کبھی طنز و مزاح اور کبھی اذیت نواز غمگینی کے پیرایے میں ظاہر کرتی ہے اگر
مولانا کے سحر انداز بیان اور ادبی اسلوب کا تجزیہ کیا جا سکے تو معلوم ہوگا کہ مولانا کے افکار......
کا بہاؤ ایک صحرائی چشمہ کی طرح آزاد ہے جب وہ بہتا ہے تو کوئی رکاوٹ اس کی راہ میں حائل نہیں
ہو سکتی اس چشمہ پر نہ تو کوئی پل باندھا جا سکتا ہے نہ اس کے پانی پر ملاحوں کی کشتیاں تیرتی ہیں اور
نہ اس کا پانی نہروں اور بستیوں کے خس و خاشاک سے آلودہ ہو سکتا ہے۔

یہ چشمہ ایک خاموش وادی کے آغوش میں جو مولانا کی فطرت ہے بہتا چلا گیا ہے اس نقطۂ
نظر سے مولانا کی دوسری تحریروں پر غبار خاطر قابل ترجیح ہے جن کے مکتوبات غالباً اس لحاظ سے لکھے
گئے تھے کہ وہ کبھی شائع نہ ہوں گے اور اس لیے ان مکتوبات میں مولانا نے اپنے افکار کے بہت
سے گوشے بے تکلف ظاہر کر دیئے ہیں۔

مولانا کے ادب کی بنیادی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ناقدین کی خوش قسمتی یہ ہے کہ مولانا نے
"غبار خاطر" میں اپنے ادب کی فطرت کے حقائق کو بے تکلف بے نقاب کر دیا ہے وہ اپنے
ادب کی اشاعت کے لیے "انانیتی ادب" کی اصطلاح استعمال فرماتے ہیں ایک مکتوب میں اپنے
اہل قلم کی نفسیات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

"ایسے افراد اپنے "میں" کا جوش کسی طرح دبا نہیں سکتے ان کی خاموشی بھی چیخنے والی اور ان
کا سکون بھی پر شور ہوتا ہے"

ایسے افراد جب کبھی "میں" بولتے ہیں تو اس میں قصداً بناوٹ اور نمائش کو کوئی دخل
نہیں ہوتا ہے ایسے اشخاص بالخصوص افراد کو معیار نظر میں دور رکھنا پڑے گا ایسے لوگ فکر و نظر کی
عام ترازوؤں میں نہیں تولے جا سکتے ادب و تصنیف کے عام قوانین انھیں نہیں پکڑ سکتے زمانے کو
ان کا یہ حق تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ وہ جتنی مرتبہ بھی چاہیں "میں" بولتے رہیں ان کی ہر "میں" ان
کی ہر "تو" اور "تم" سے زیادہ دلپذیر ہوتی ہے۔

اس آئینے میں مولانا کی نفسیات کا جو عکس نظر آتا ہے اس سے ان کے ادب کو ناپنے
اور تولنے کے بہت سے ڈھنگ معلوم ہو جاتے ہیں بہت سی راہیں کھل جاتی ہیں اور بہت سے
دھندلے نقوش ابھر آتے ہیں زندگی کے فلسفہ کو مولانا نے خود اپنی زندگی کے بعض گوشے بے پردہ
کر کے بیان فرمایا ہے مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"انسان کا اصلی عیش دماغ کا ہے جسم کا نہیں"

غور کیجئے تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہے کہ ہم سامان کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈتے رہتے ہیں اگر یہ پردہ فریب کو ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں بلکہ خود ہمارے اندر ہی موجود ہے ۔"

اپنی سیاسی زندگی کے متعلق ایک جگہ بہت بلیغ فلسفیانہ انداز میں فرماتے ہیں "طبیعت کی رفتار نے بڑا کام یہ دیا کہ زمانے کے بہت سے تجربے میرے لئے بے کار ہو گئے لوگ اگر میری طرف سے رخ پھیر لیتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند رہے اور منت گزار ہونے لگتا ہے چوں کہ جو ہجوم لوگوں کو خوش حال کرتا ہے وہ میرے لئے بسا اوقات ناقابل برداشت ہو جاتا ہے میں اگر عوام کا رجوع اور ہجوم گوارہ کرتا ہوں تو میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی اور تکلف کی مجبوری ہوتی ہے میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈھا تھا سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا ۔"

ایک اور مقام پر زندگی کے فلسفہ کو اپنی فطرت کے آئینے میں اس طرح نمایاں کرتے ہیں ۔

"وہ زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود کے باہر تھا اگر چھن گیا کوئی مضائقہ نہیں وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا تھا سینے میں چھپائے ساتھ لایا ہوں اسے سجاتا ہوں اور اس کی سیر اور نظارے میں محو رہتا ہوں ۔"

مولانا کے ادبی افکار کا ایک نیا پہلو "غبار خاطر" میں نظر آیا جو ان کے مطالعہ کی گہرائی اور قوت کا آئینہ دار ہے غبار خاطر کے صفحات پر مولانا نے اپنے خاص انداز میں چڑیا چڑے کی ایک کہانی لکھی ہے جس میں انھوں نے مطالعہ فطرت کے جواہر پارے بکھیر دیئے ہیں کہنے کو تو آپ اسے چڑیا چڑے کی کہانی کہہ لیجئے لیکن حقیقت میں مولانا نے اس پردے میں جو فلسفۂ زندگی بیان کیا ہے وہ حسن بیان، اور مشاہدۂ فطرت اور مطالعۂ تخلیق کا ایک مخصوص انداز ہے اس کہانی کی چند سطریں مختصراً پیش کرتا ہوں ۔

"پھر جوں جوں بچوں کے پر بڑھنے لگتے ہیں وجدان کا فرشتہ آتا ہے اور ان کے کان میں سرگوشیاں شروع کر دیتا ہے کہ انھیں اڑنے کا سبق سکھانا چاہئے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ موتی (یہ نام مولانا نے احمد نگر کے قلعہ میں اپنے کمرے کی ایک چڑیا کا رکھ دیا تھا) کے کانوں میں یہ سرگوشی شروع ہو گئی تھی ایک دن صبح کیا دیکھتا ہوں کہ گھونسلہ سے اڑتی ہوئی اتری تو اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ بھی ادھ ہی پروں کے پر عیالی کے ساتھ نیچے گر گیا موتی بار بار اس کے پاس جاتی اور اڑنے کا اشارہ کر کے اوپر کی طرف اڑ نے لگتی موتی چاول کے ٹکڑے چن چن کر لاتی اسے کھلا دیتی وہ چوں چوں مدھم آواز نکال دیتا اور پھر دم بخود آنکھیں بند کئے پڑا رہتا ۔۔۔ میرا خیال تھا کہ اب یہ بچے گا نہیں لیکن تیسرے دن صبح کو ایک عجیب معاملہ پیش آیا دھوپ کی ایک لکیر کمرے کے اندر دور تک چلی گئی تھی یہ اس پر جا کر کھڑا ہو گیا اور اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ آنکھیں کھول کر ایک جھرجھری سی لے رہا ہے پھر گردن آگے کر کے فضا کی طرف دیکھنے لگا پھر پر ہوئے پروں کو سکیڑ کر ایک دو مرتبہ کھولا بند کیا پھر جو ایک مرتبہ جست لگا کر اڑا تو ایک دفعہ تیر کی طرح میدان میں جا پہنچا اور پھر موتی کی طرح فضا میں اڑ کر نظروں سے غائب ہو گیا دراصل یہ بچہ نہ تھا زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک بھولا سا تماشہ تھا ۔

چڑیا کے بچے میں اڑنے کی استطاعت ابھری تھی جب تک وہ اپنی حقیقت سے بے خبر تھا ماں بار بار اشارے کرتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن جوں ہی اس کی سوئی ہوئی خود شناسی جاگ اٹھی اور اسے حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا کہ میں اڑنے والا پرند ہوں اچانک قلب بے جان کی ہر چیز میں جان دوڑ گئی چشم زدن کے اندر جوش پرواز کی ایک برق آسا تڑپ نے پورا جسم ہلا کر اچھال دیا اور پھر جو دیکھا تو درماندگی اور بے حالی کے تمام بندھن ٹوٹ چکے تھے ۔"

مولانا نے اس کہانی کے انداز میں اسرار خودی کا سارا فلسفہ بیان کر دیا اور اپنے مطالعہ کی گہرائی سے چڑیا چڑے کی کہانی میں زندگی کی بے پناہ حقیقتیں ظاہر فرما دی ہیں ۔

مولانا کے ادب کا ایک اور پہلو طنز و مزاح ہے جو ایک شمشیر بے نیام ہے "الہلال" میں اس کے نمونے نظر آتے ہیں مولانا کے ادب کی قوس و قزح میں یہ رنگ بھی بہت دلنواز اور ان کی ہمہ گیر شخصیت کو ظاہر کرنے والا ہے مولانا کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی ذہانت بہت تیزی سے ہر شخص یا ہر چیز کی تضحیک کا پہلو دیکھ لیتی ہے اس قسم کے نظاروں کے زیادہ نمونے "غبار خاطر" ہی میں ملتے ہیں مثلاً اپنی قید کے ساتھی ڈاکٹر سید محمود کے مشاغل میں مزاح اور تفنن کا پہلو دیکھتے ہیں اور اپنے ایک مکتوب میں بے ساختہ اس کو اجاگر کر دیتے ہیں ۔

"وہ (ڈاکٹر صاحب) روز روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لے کر نکل جاتے ہیں اور صحن میں جا کھڑے ہوتے اور پھر جہاں تک حلق کام دیتا آ آ کرتے جاتے اور ٹکڑے فضا کو دکھا کر پھینکتے رہتے یہ صلائے عام بینواؤں کو تو ملتفت نہ کر سکی البتہ شہرستان ہوا کے دریوزہ گران ہرجائی یعنی کوؤں نے ہر طرف سے ہجوم کر دیا بہر حال محمود صاحب آ آ کے تسلسل سے تھک کر جوں ہی مڑتے یہ دریوزہ گران کوتہ آستین فوراً بڑھتے اور دسترخوان صاف کر کے رکھ دیتے محمود صاحب کی صلائے عام سے پہلے یہاں کوؤں کی کائیں کائیں کی رونق چہکی بجتی رہتی تھی اب جو دسترخوان کرم بچھا تو نقاروں پر بھی چوپ پڑ گئی ایک دو دن تک لوگوں نے صبر کیا آخر ان سے کہنا پڑا کہ آپ کے دست کرم کی بخششیں رک نہیں سکتیں تو کم از کم چند دنوں کے لئے ملتوی ہی کر دیجئے ورنہ ان ترکان یغما کی ترک تازیاں کمروں کے اندر کے گوشہ نشینوں کو بھی امن و چین سے رہنے نہ دیں گی اور ابھی تو صرف احمد نگر ہی کے کوؤں کو خبر ملی ہے اگر فیض کا یہ لنگر خانہ اسی طرح جاری رہا تو عجب نہیں کہ دکن کے تمام کوے احمد نگر پر حملہ بول دیں ۔"

مولانا کے مزاج کی یہ خصوصیت ہے کہ کہیں عامیانہ لہجہ یا بدمذاقی کا شائبہ بھی پیدا نہیں ہوتا طنز میں بھی مولانا کے قلم کی نوک کتنی ہی باریک ہو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ زہریلی یا تعصب و عناد سے آلودہ ہے طنز کے پیرایہ میں مولانا کے مشہور مضامین میں سے ایک وہ ہے جو "حدیث الغاشیہ" کے عنوان سے مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تجویز کے متعلق الہلال میں لکھا گیا تھا ۔

مولانا کے طنز کا یہ رنگ چند ہی مضامین تک محدود رہا اور سن تیرہ سو چودہ عیسوی کے بعد اس رنگ کا کوئی مضمون نظر سے نہیں گذرا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب میں یہ جو کچھ سرمایہ مولانا کے قلم نے جمع کیا ہے وہ معیاری ہے باقی رہنے والا اور سدا بہار ہے صدیوں بعد بھی مولانا کے فکر و نظر کے شاہکار اپنے مقام پر باقی رہیں گے اور ہر عہد کی ادبیات کا فاضل جب ہندوستان کے ادب کا تحقیقاتی مطالعہ کرے گا تو یہ ناممکن ہے کہ اس ملک کی اجتماعی زندگی اور سیاسی اور تہذیبی جدوجہد میں مولانا کے ادب نے جو حصہ لیا ہے اسے نظر انداز کر سکے ۔

نذر حسن گوپال پوری

خط بنام مضامین

مذکورہ مسرخی یہ نظم علامہ مولانا شبلی کی جو مشہور نظم ہے۔ اس پر تبصرہ حاضر ہے واقعہ خلاصۃً یوں ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں کسی جنگ میں مال غنیمت آیا تھا جس میں چادریں بھی تھیں حسب دستور وہ چادریں تقسیم ہوئیں اور لوگوں کو ایک ایک چادر ملی حضرت عمرؓ نے اپنے چادر کا کرتہ بنوانا چاہا مگر چونکہ قد لمبا تھا اس لئے ایک چادر میں کرتہ نہیں بن رہا تھا تو ان کے فرزند نے اپنے حصہ کی چادر بھی انھیں دے دی اور وہ کرتہ تیار ہوا۔ اس کرتہ کو وہ پہنے ہوئے تھے۔ چند دنوں کے بعد اسی کرتے کو پہنے ہوئے مسجد نبوی میں آئے، اور مجمع سے مخاطب ہوئے کہ "میں تم لوگوں کو جو حکم دوں گا بجالاؤ گے نہ؟"، مجمع سے ایک بدوی اٹھا اور بولا "میں آپ کے حکم کو نہیں مانوں گا اس لئے کہ تو عادل نہیں تو نے دو چادر رکھ لی تھی جس سے تیرا یہ کرتہ تیار ہوا، تو تو خلافت کے لائق کب رہا...... اس پر حضرت عمرؓ (فاروق) نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اصل واقعہ کو تم جانتے ہو واضح کردو کہ یہ شبہ دفع ہو جائے۔

اس مقام پر شبلی صاحب نے یوں چند شعر فرمارہے ہیں۔

اپنے فرزند سے فاروق معظم نے کہا
تم کو ہے حالت اصلی کی حقیقت پہ عبور

تمہیں دے سکتے ہو اسکا مری جانب سے جواب
کہ نہ پکڑے مجھے محشر میں مرا رب غفور

اس نظم میں ادبی اور تکنیکی کتنی غلطیاں ہیں، انھیں میں لکھنا نہیں چاہتا مگر تحت خط جو تحریر ہے اس پر ایک تبصرہ مقصود ہے۔ نظم کو پڑھنے پر معلوم ہو جائے گا کہ جب کہ حضرت عمرؓ کا کرتہ ایک چادر میں تیار نہ ہو سکا تو ان کے فرزند نے اپنی چادر دے دی۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ حضرت عمرؓ اور ان کے فرزند پر پروردگار عالم بھی جانتا تھا دریں حالات میدان محشر میں رب غفور کے پکڑنے کا خیال بالکل غلط ہے۔ ہاں حضرت فاروقؓ یہ کہہ سکتے تھے کہ اے فرزند تم اصلی حالت کو کہہ دو تاکہ اس اعرابی کا شبہ دفع ہو جاتے، حضرت عمرؓ جیسے تیز ذہن اور فہم و فراست کے مالک اس کی طرف اس قول کی نسبت علامہ نے کیسے دی بدو حال سے خالی نہیں یا تو کہئے کہ روایت ہی میں ایسی عبارت موجود ہے۔ تو پھر ہم کہیں گے کہ وہ روایت ہی غلط ہے کیوں کہ راوی نے حضرت عمرؓ کو ایسے غلط جملہ سے متہم کیا ہے دریں صورت ایک ضعیف روایت پر اولاً تو بھروسہ نہ کرنا چاہئے تھا نہ کہ اسے ایک موثق انسان منظر عام پر رکھ دے۔ اور اگر کہا جائے کہ نہیں روایت میں یہ الفاظ نہیں ہیں بلکہ ضرورت شعری کے ماتحت علامہ ممدوح نے یہ الفاظ فٹ کر دیئے ہیں۔ تو میں کہوں گا کہ ممدوح جیسے نقاد انسان کے لئے نہ تو وہ درست تھا کہ کمزور روایت پہ بھروسہ کر لیا اور نہ یہ اتہام درست تھا۔

مزید لطیفہ۔ یہ کہ اس نظم کو ناسمجھوں نے اتنا اہم سمجھا کہ اسے کتابوں میں اہمیت دے بیٹھے اور بڑا الجیند و کٹ اپیٹ ڈالا۔

مجھے امید ہے کہ کوئی بزرگ میرے اس شبہ کا جواب اسی پرچہ کے ذریعہ مرحمت فرمائیں گے تاکہ میں اپنی غلطی پر ساکت ہو رہوں۔

مولانا شبلی کی ایک اور نظم

یہ وہ نظم ہے جس میں ممدوح نے جناب سیدہ کے گھر کی تنگ حالی بیان کی ہے جس کی ابتدا یوں کی ہے۔

افلاس سے تھا سیدہ زہرہ کا حال یہ
گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا

اس میں شبہ نہیں کہ یہ نظم آپکی محبت پر دال ضرور ہے۔ مگر پہلی لفظ "افلاس" یا انتہائی کریہہ لفظ ہے اور اس کے معنی عموماً برے سمجھے جاتے ہیں۔ پھر اگر آپ بھی ذوق سلیم رکھتے ہوں گے تو سیدہ کو افلاس کا مارا کہنا ضرور ہی برا سمجھیں گے۔ بنا علیہ اس لفظ سے بجائے عظمت کے ایک طرح کی سبکی پیدا ہو جارہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ممدوح کو رفندرہ محاورات اردو پر پورا عبور نہ تھا یہ پھر یہ "افلاس" کی لفظ کسی دوسری مصلحت کے ماتحت رکھ دی ہے۔ تنگ حالی و تنگ مالی اور چیز ہے اور افلاس اور چیز ہے۔ سیدہ عالمیان اپنے سارے گھریلو فرائض کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی مزدوری بھی کر کے مسلمان عورتوں کو بے کار بیٹھنے کی جگہ مزدوری پر رغبت دلاتی تھیں۔ باہر علی برابر مزدوریوں میں لگے رہتے تھے۔ پھر بھی سیدہ کے یہاں تنگ حالی و مالی ضرور ہو جاتی تو اس کا سبب ان حضرات کا ایثار تھا خود بھوکے رہ جاتے مگر غربا مساکین بیوگان و یتیموں کو کھلا دیتے۔ افلاس کی لفظ نہایت رکیک ہے یہاں ہونا چاہئے تھا ایثار جو حقیقت حال کو بھی ظاہر کرتا ہے اور ان حضرات کے شایان شان بھی ہے۔

سید محمد عبدالرشید فاضل ایم۔ اے

مقدمہ شرح بالِ جبریل

بالِ جبریل کی متعدد شرحیں ہو چکی ہیں۔ چنانچہ تین شرحوں کے دیکھنے کا مجھے بھی اتفاق ہوا ہے ایک بہت ضخیم ہے۔ جس میں دینی، اخلاقی، علمی، ادبی، تاریخی بلکہ اور بھی ہر قسم کا مواد تو خوب جمع کیا ہے ۔جس میں سے بعض اجزا اسکار آمد بھی ہیں، مگر اشعار کی شرح بہت کم ہے۔ دوسری بھی کسی قدر مفصل ہے مگر پہلی شرح جیسے معلوماتی مواد سے خالی ہے۔ نیز اشعار کی شرح اس میں بھی کم ہے اور جو ہے اس میں بھی غیر ضروری طوالت کے ساتھ جو مطلب لکھا ہے وہ ایک عام طالب علم کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ تیسری شرح بہت مختصر ہے بعض جگہ تو ایسی مختصر جیسے ایک زبان کے اشعار کا دوسری زبان میں ترجمہ کر دیا جاتا ہے مطلب سے کوئی بحث نہیں ہوتی۔

ان شرحوں کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ یہ نہ ایک عام ناظر کے لئے مفید ہیں نہ ایک طالب علم کے لئے۔ بلکہ پہلی ضخیم شرح سے تو یہ بھی عجیب و غریب انکشاف ہوا کہ بالِ جبریل میں شروع سے آخر تک تصوف ہی کے معانی و مطالب کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے اور تصوف بھی وہ تصوف جس پر اقبال نے سخت تنقید کی ہے۔ غرض کہ یہ شروح اگر پیشِ نظر کام کی ہیں تو کچھ شرح فی صد بے کار بلکہ اقبال کی شہرت پر حرف لانے اور غلط فہمی پیدا کرنے والی۔!

بہرحال یہی ہیں وہ اسباب جو میرے لئے بالِ جبریل کی شرح لکھنے کا باعث ہوئے کہ اس سے ایک ضرورت کی تکمیل بھی پیشِ نظر تھی اور مذکورہ بالا شروح سے جو نقصان یا غلط فہمیاں پھیل رہی ہیں اُن کا سدِ باب بھی مطلوب تھا۔ ضرورت کی تکمیل سے میری مراد یہ ہے۔ چونکہ اقبال نے بڑی عمدگی کے ساتھ اس کتاب میں اپنے اُن تمام افکار کو ایک حد تک جمع کر دیا ہے جو ان کی مختلف فارسی تصانیف میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر اس کتاب کی شرح ڈھنگ سے ہو گی تو جو لوگ فارسی زبان سے ناآشنا ہیں وہ اس شرح سے بیک وقت اُن افکار سے بھی کسی حد تک استفادہ کر سکیں گے جو فارسی میں بیان ہوتے ہیں۔

قیامِ لندن کے زمانے میں ایک معمولی سے واقعہ سے متأثر ہو کر اقبال نے اُردو کے بجائے فارسی کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا تھا چنانچہ ایک مدت تک ان کا اردو کلام کسی اخبار یا رسالے میں نظر نہیں آیا تو شیدائیانِ اردو میں بے چینی پیدا ہو گئی کیوں کہ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ شاید اب اقبال نے اردو میں شعر کہنا بالکل ترک کر دیا ہے۔ جیسا کہ مولوی عبدالسلام مرحوم فرماتے ہیں۔

"اس کے بعد اُن کی توجہ زیادہ تر فارسی شاعری پر مبذول رہی اور اب وہ فارسی شاعری میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ اُن کے احباب کو خطرہ پیدا ہوا کہ مبادا اُردو اُن کے فیض سے بالکل محروم ہو جائے اس لئے شیخ عبدالقادر نے مقدمہ بانگِ درا میں ڈاکٹر صاحب سے یہ درخواست کی کہ وہ پھر کچھ عرصے کے لئے گیسوئے اُردو کے سنوارنے کی طرف متوجہ ہوں اور ہمیں موقع دیں کہ ہم اس مجموعہ اُردو کو جو اس قدر دیر کے بعد چھپا ہے ایک دوسرے کلیاتِ اردو کا پیش خیمہ سمجھیں۔" (اقبالِ کامل)

یہی وجہ ہے کہ جب بالِ جبریل منظرِ عام پر آئی تو اس کا نہایت پرجوش خیر مقدم کیا گیا اور دلدادگانِ اردو کے حلقوں میں اس سرے سے اُس سرے تک مسرت کی لہر دوڑ گئی اور ایسا ہونا لازمی امر تھا۔ کہ ایک مدت کے بعد ان کو اقبال کا اردو کلام ملا تھا اور پھر وہ بھی ایسا نادر، پاکیزہ اور بلند پایہ کلام کہ اپنی مثال آپ۔!

بالِ جبریل جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے پہلے حصے میں زبورِ عجم کے طرز کی کچھ غزلیں اور پیامِ مشرق کے طرز کی کچھ رباعیاں یا قطعات ہیں اس لئے اس حصے کو زبورِ عجم کا چربہ سمجھنا چاہئے کہ اس میں تقریباً وہی باتیں جو فارسی میں کہی ہیں اردو میں بھی دہرادی ہیں اور اُن میں وہ تمام خصوصیات یعنی جوشِ بیان، بلندیِ خیال، اور متانت و پختگی موجود ہیں جو زبورِ عجم میں پائی جاتی ہیں۔ دوسرے حصے میں مختلف موضوعات پر نظمیں ہیں۔ کچھ نظمیں اندلس کی مشہور عمارات و مقامات پر ہیں۔ اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس کی شرکت کے بعد اسپین کی سیر کی تھی اور ان عمارات و مقامات پر ذاتی طور پر مشاہدہ کیا تھا۔ یہ نظمیں انہی تاثرات کا نتیجہ ہیں۔

بقول ایک نقاد کے "یہ کتاب اقبال کے ارتقائے تخیل کی چوتھی منزل کو پیش کرتی ہے۔" مگر ہمارے خیال میں ان کی اردو شاعری کے اعتبار سے اس کتاب کو اُن کے فکری ارتقا کی آخری منزل کہنا زیادہ مناسب ہوگا اس لئے کہ اس کے بعد ان کی دو کتابیں ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز (اردو حصہ) شائع ہوئیں مگر ضربِ کلیم میں فلسفیت زیادہ اور شعریت کم ہے اور رفعتِ تخیل میں اس کو بالِ جبریل سے کوئی نسبت نہیں اسی طرح ارمغانِ حجاز میں جذبات کی فراوانی ضرور ہے مگر رفعتِ تخیل میں یہ بھی بالِ جبریل کو نہیں پہونچتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس انداز کا بلند، لطیف اور پاکیزہ کلام اس سے پہلے اردو زبان میں موجود نہ تھا۔ تمام کتاب دینی اور اخلاقی تعلیمات سے بھری ہوئی ہے۔ نوجوانوں کا زاغ و زغن بننے کے بجائے شاہین بننے، سستی، سہل انگاری اور آرام طلبی سے اجتناب اور کوشش اور محنت کو شعار بنانے اور طلسمِ مغرب میں گرفتار نہ ہونے کی ہدایت ہے تو رہنمایانِ قوم کو خود غرضی

وخود نمائی ترک کرنے اور خلوص و دلسوزی کے ساتھ باہمی اختلافات ختم کرکے ایک متفقہ ملی نصب العین کے حصول کے لئے قوم کی صحیح خطوط پر رہنمائی کرنے کی تلقین ہے۔ اہل جاہ و ثروت کو منصب و دولت سے محبت کرنے کے بجائے دینی و اخلاقی اقدار سے محبت کرنے کی نصیحت ہے تو عام مسلمانوں کو صحیح معنی میں مرد مومن بننے اور عرفانِ خودی کے ذریعہ اپنے کھوئے ہوئے مقام کو پھر سے حاصل کرنے کی تعلیم ہے، پھر یہ نصائح اُس خشک طریقے پر نہیں کی ہیں جو ہمارے واعظوں کا عام انداز ہے۔ بلکہ ان کی شوخیٔ گفتار نے اخلاقی موضوعات کو ایسے لطیف اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے کہ سامع کے دل کو ان کے سننے سے سیری نہیں ہوتی اور بلاغت کلام کا یہ حال ہے کہ علم و حکمت کے وہ جواہر جو گنجینۂ دل و دماغ میں محفوظ تھے۔ ایسے عام فہم اور دلنشین انداز میں بیان ہوئے ہیں کہ شربت کے گھونٹ کی طرح دل میں اترتے چلے جاتے ہیں اور پھر ایک ایک لفظ حقائق و معانی کی ایک دنیا اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اقبال کے پختہ اور منظم خیالات زیادہ تر ان کی فارسی تصانیف میں ملتے ہیں مگر جیسا کہ ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں، بالِ جبریل میں بھی بیشتر وہی خیالات اسی جزالت و متانت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں جو ان کی فارسی تصانیف کی خصوصیت ہے۔ اس لئے کہنا چاہئے کہ اس اعتبار سے بھی اس کتاب میں ان کی اردو شاعری انتہائی بلند مقام پر پہونچ گئی ہے اور ساتھ ہی ان کی فکر نے فلسفہ و منطق کے بجائے شعر کی زبان اختیار کر لی ہے۔

اقبال کے نزدیک وہ شاعری جس سے انسان کی خودی باقی نہ رہے، قوم کے حق میں سمِ قاتل کا حکم رکھتی ہے اس لئے ان کی شاعری کا مقصد قوم کی خفتہ و مُردہ قوتوں کو زندہ کرکے سرگرمِ عمل بنانا ہے۔ وہ جمود اور بے عملی کو موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ بلکہ اُن کے نزدیک تو دو دن بھی ایک حالت پر قائم رہنا زندگی کے نقصان کا پتہ دیتا ہے ؎

اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است   بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

ان کے نزدیک آدم کی فضیلت بھی اسی میں ہے کہ وہ نت نئے جہان پیدا کرے۔ ستاروں کے موجودہ نظام سے وہ اس لئے ناخوش ہیں کہ یہ ہزاروں برس سے ایک ہی لگے بندھے آئین پر چل رہا ہے ؎

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ   جہاں وہ چاہئے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز!

یہ بات انسان کو اس وقت حاصل ہوتی ہے کہ جب وہ اپنی ذات کی معرفت حاصل کرکے اپنی خفیہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے جب تک انسان اپنے آپ کو نہیں پہچانتا بے عمل سے محروم رہتا ہے اور اس کی زندگی کاہلی، بے علمی اور بے حسی کی نذر ہو کر رہ جاتی ہے ایسا شخص آرام و آسائش کے حصول ہی کو مقصدِ زندگی سمجھ لیتا ہے۔ حالانکہ آرام پسندی انسان کی ترقی کے راستے کا وہ سنگِ گراں ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا ؎

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر   یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

لیکن اس کتاب میں خودشناسی کی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس موضوع پر اس قدر لکھا ہے کہ کسی پہلو کو تشنۂ تکمیل نہیں چھوڑا ہے۔ اور ہر پہلو کو نادر اسلوب میں بیان کیا ہے۔ ایسے اسلوب میں کہ اس پر مزید اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ؎

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں   یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

عجب مزا ہے مجھے لذتِ خودی دے کر   وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں   تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی   کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے   جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیٔ افلاک   خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے   خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی   خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش   خودی کی زد میں ہے ساری خدائی
حکیمی نامسلمانی خودی کی   کلیمی رمزِ پنہانی خودی کی
تجھے گُر فقر و شاہی کا بتا دوں   غریبی میں نگہبانی خودی کی

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے   خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات   خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں   پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں
سفر اس کا انجام و آغاز ہے   یہی اس کی تقویم کا راز ہے
خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب   وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند   رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
خودی شیرِ مولا جہاں اس کا صید   زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید

نیز اس فلسفے کے جتنے اجزا ہیں وہ سب بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ مثلاً فضیلتِ آدم جو اس فلسفہ کا ایک اہم جزو ہے اس کتاب میں اس پر بڑے موثر اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں   کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن   زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

ایک پوری غزل میں اس جہانِ آب و گِل سے خطاب کیا ہے اور اس کے مقابلے میں فضیلتِ آدم ثابت کی ہے ؎

عالمِ آب و خاک و باد! سرِ نہاں ہے تو کہ میں؟   وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں؟
وہ شبِ درد و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے   اس کی سحر ہے تو کہ میں؟ اس کی اذاں ہے تو کہ میں؟
کس کی نمود کے لئے شام و سحر ہیں گرمِ سیر   شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تو کہ میں؟

دوسرا جو ہر وہ عشق و عقل کی پیکار ہے چنانچہ اس موضوع پر بھی اس کتاب میں بہت کچھ لکھا ہے اور ہر جگہ ایک اچھوتے اسلوب کے ساتھ مگر لفظ عشق کو اقبال نے بڑے وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ عشق ان کے ہاں مجاز و حقیقت دونوں کا ترجمان اور خودی کو محکم کرنے کا ذریعہ ہے عشق سے ان کی مراد وہ جوشِ وجدان ہے جو کسی اعلیٰ درجے کے مقصد کے حصول کے لئے دل کی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ جس کی بدولت انسان تکمیل ذات کے لئے جذب بے پناہ پیدا ہوتا اور ہر قسم کے موانع پر قابو پاتے ہوئے لامتناہی طور پر ارتقاء کی منزلیں طے کرنے کا متمنی رہتا ہے۔ اسی کے ذریعہ انسان زمان و مکان کی قید سے نکل کر حقیقی آزادی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ اسی سے اس کے اندر تولید آرزو ہوتی ہے جو قوائے عمل کو سرگرم رکھتی ہے ورنہ بغیر آرزو کے انسان عمل کی طرف ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ عشق ہی سے اندر پاکیزہ جذبات پیدا ہوتے ہیں جو مکارم اخلاق کی طرف راغب اور رذائل سے مجتنب رکھتے ہیں۔ غرضکہ اقبال کا تصورِ عشق دوسرے شعراء کے تصورِ عشق سے بالکل مختلف ہے اُن کے یہاں عشق سرتاپا عمل و حرکت بلکہ زندگی ہے، جس کی بدولت انسان کی نظر اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی ہمت مردانہ کے آگے جبریل کو بھی ”صید زبوں“ سمجھنے لگتا ہے اور یزداں پر کمند ڈالنے کی کوشش کرتا ہے ؎

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے ۔۔۔ یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

اقبال عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں اس لئے کہ اس کے ذریعہ حقیقتِ اشیاء کا علم حاصل ہوتا بلکہ انسان کی بصیرت پر مابعد الطبیعی حقائق کا انکشاف ہو جاتا ہے اس کی وجہ سے دنیا میں چہل پہل اور رجاہمی نظر آتی ہے ورنہ اگر دل بھی عقل کی طرح فرزانہ ہوتا تو جینے کا سارا لطف جاتا رہتا ؎

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم ۔۔۔ عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق ۔۔۔ شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم

متاع بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی ۔۔۔ مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

سبق عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی ۔۔۔ کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام ۔۔۔ اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

وصول کے کیا بیاں کروں سِرِ مقامِ مرگِ عشق ۔۔۔ عشق ہے مرگِ با شرف، مرگ حیاتِ بے شرف

نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی ۔۔۔ کہ میری زندگی کیا ہے وہی طغیانِ مشتاقی

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ ۔۔۔ عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو ۔۔۔ عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا ۔۔۔ اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

عشق دمِ جبریل، عشق دلِ مصطفیٰ ۔۔۔ عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود ۔۔۔ عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

لیکن یہ خیال غلط ہے کہ وہ عقل کو بالکل بے کار اور ہر حال میں اس کی مخالفت ضروری سمجھتے ہیں۔ اول تو وہ مطلق عقل کے مخالف نہیں بلکہ اس عقل کے مخالف ہیں جس کا دوسرا نام زیرکی ہے اور جس کا سلسلہ شیطان کی زیرکی سے ملتا ہے جو ہر چیز کو استدلال کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھتی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

اک دانشِ نورانی، اک دانشِ بُرہانی ۔۔۔ ہے دانشِ بُرہانی حیرت کی فراوانی

دوسرے ان کا خیال ہے کہ عقل کی ایک حد ہے اگر وہ اپنی حد میں رہ کر کام کرے تو اس سے یقیناً اچھے نتائج نکلیں گے۔ مگر جب وہ اپنی حد سے تجاوز کرتی ہے تو ناقابل تلافی نقصان کا موجب بنتی ہے اگر اپنی حد میں رہتے ہوئے عشق کے رفیقِ کار کی حیثیت سے کام کرے تو وہ انسان کی بہترین خادم ثابت ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں انسان کی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں جس سے وہ فطرت کی تسخیر بھی کرتا ہے اور عجیب و غریب مگر مفید ایجادات کر کے نوعِ انسانی کے لئے فلاح و سعادت کے سامان بھی فراہم کرتا ہے۔

اقبال فرماتے ہیں کہ جب عقل اس مادی دنیا کے معاملات کو درست کرنے کے بجائے حقائق مابعد الطبیعی کے متعلق حکم لگانے لگتی ہے تو انسانی سوسائٹی کے لئے فساد کے اسباب پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ یہ کام عشق اور محض عشق کا ہے عقل کا نہیں ہے اور وہ شکایت کرتے ہیں کہ زمانہ عقل ہی کو رہنما سمجھ بیٹھا ہے اور عشق کو بے کار بلکہ دیوانگی سے تعبیر کرتا ہے۔ حالانکہ جو قوت اور بصیرت عشق کو حاصل ہے عقل اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی ؎

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ ۔۔۔ کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

ایک مستقل نظم ”عقل و دل“ کے عنوان سے لکھی ہے اور اس میں دونوں نے مناظرانہ انداز میں اپنی اپنی فضیلت کی وجوہ بیان کی ہیں ؎

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا ۔۔۔ بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں زمیں پر، گزر فلک پہ مرا ۔۔۔ دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا ۔۔۔ مثل خضرِ خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسرِ کتابِ ہستی کی ۔۔۔ مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں
بوند اک خون کی ہے تو لیکن ۔۔۔ غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں
دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے ۔۔۔ پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں
رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے ۔۔۔ اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے ۔۔۔ اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے ۔۔۔ تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی ۔۔۔ اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفلِ صداقت کی ۔۔۔ حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا ۔۔۔ عرش ربِ جلیل کا ہوں میں

اس نظم میں عشق کے بجائے دل کو لاتے ہیں جو مصدر [illegible] ہے۔

فلسفۂ خودی کا تیسرا جزو خیر و شر کا امتزاج [illegible] ہے اور اس کی بھی بہت سی نمایاں نہیں مگر بہرحال اس کتاب میں جابجا مثالیں ملتی ہیں۔ ایک نظم لکھی ہے جس کا عنوان ہے "جبریل و ابلیس" اس میں جبریل و ابلیس سے مکالمہ نظم کیا ہے۔ ہم اس مکالمے کو ذیل میں درج کرتے ہیں ؎

جبریل

ہمدمِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؟

ابلیس

سوز و ساز و درد و داغ و جستجوئے آرزو!

جبریل

ہر گھڑی افلاک پہ رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو؟

ابلیس

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو
اب یہاں میری گذر ممکن نہیں ممکن نہیں کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کو
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا

جبریل

کھو دیئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

ابلیس

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو؟
خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو!
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو!

فلسفۂ خودی کا چوتھا جزو بقائے دوام اور حیات جاوداں ہے۔ اس کو بھی اقبال نے بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

یہ نکتہ میں نے سیکھا ابوالحسن سے کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں باقی ہے نمودِ سیمیائی!

تو زندگی ہے، پائندگی ہے باقی ہے جو کچھ سب خاکبازی

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ

اقبال نے مختلف موقعوں پر جو اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ان کو شاعر نہیں سمجھنا چاہئے تو اس سے ان کا منشا یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کو نہ فن کی حیثیت سے اختیار کیا ہے نہ پیشہ بنایا ہے اور نہ ان کی شاعری وہ ادب برائے ادب کے بے جان نظریے کا مصداق ہے بلکہ قدرت نے جو موزونیِ طبع عطا فرمائی تھی اور ساتھ ہی درد آشنا دل بھی دیا تھا تو ان کی شاعری کو ان دونوں کا قدرتی نتیجہ سمجھنا چاہئے، یعنی قوم کی پستی اور زبوں حالی پر ان کا دل دکھا ہے تو بے ساختہ یہ پرسوز نالے نکل گئے ہیں بالکل اسی طرح جیسے ساز کے تار وں پر مضراب کے لگنے سے نغمے نکلنے شروع ہو جاتے ہیں وہ ان پرسوز نالوں سے اپنی خوابِ غفلت میں سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر کے منزل کی طرف گامزن کرنا چاہتے ہیں۔ شاعری ان کے لئے مقصود بالذات نہیں ہے۔ پھر انھوں نے دینی و اخلاقی اقدار ہی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اس لئے کہ وہ ایک ایسا اعلیٰ درجہ کا پاکیزہ معاشرہ وجود میں لانا چاہتے ہیں جس کو ان کی چشمِ بصیرت نے قرآن کے اوراق میں دیکھا ہے مگر عالمِ شہود میں اس کا کہیں نشان نہیں پایا۔ چنانچہ اس معاشرے کو اپنے تصور کے آئینے میں دیکھ کر کبھی کبھی فرطِ مسرت سے پکار اٹھتے ہیں ؎

مرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاودانہ!

رہی یہ بات کہ ان کے ہاں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اعلیٰ درجے کے شاعر کے کلام میں پائی جاتی ہیں اور جن کو مختصراً ہم "بالِ جبریل کی بعض اہم خصوصیات" کے عنوان سے اس کتاب کے آخر میں لکھ رہے ہیں، اس کو موہبتِ کبریٰ سمجھنا چاہئے۔ اور شاعری کی تاریخ میں اور بھی ایسی مثالیں، شاذ و نادر سہی، بہرحال ملتی ہیں۔ مولانا رومؒ نے بھی یہی فرمایا تھا کہ ع من ندانم فاعلات فاعلات۔ مگر اس کے باوجود ان کے شعر میں کلام کی وہ کون سی خوبی ہے جو موجود نہیں غرض کہ بالِ جبریل شاعری کے اعتبار سے بھی ایک اعلیٰ درجہ کا شاہکار ہے کہ جو لوگ زبان اور فن کے اعتبار سے اقبال کی شاعری کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے بھی بالِ جبریل کو دیکھا تو اپنے سابقہ خیالات سے رجوع کر کے اقبال کو خراجِ تحسین ادا کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بالِ جبریل کی بعض اہم خصوصیات

۱۔ طنز نگاری کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ؎

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی؟

مرے لئے تو ہے اقرار باللساں بھی بہت ہزار شکر کہ ملا ہیں صاحبِ تصدیق

نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا!

۲۔ رمز و ایما سے بھی جابجا کام لیا ہے۔ اور ان کے رمز و ایما میں لطافت کے ساتھ دل سوزی کا بھی بڑا دلکش امتزاج پایا جاتا ہے۔ مثلاً ؎

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی!

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

اسی پیکرِ خاکی میں اک شے ہے سو وہ تیری   میرے لئے مشکل ہے اُس شے کی نگہبانی

۳۔ اس کتاب کے اکثر اشعار سے اُن کے اس والہانہ تعلق خاطر کا پتہ چلتا ہے جو ان کو قوم کے ساتھ تھا اور یہ اشعار ایسے گہرے اور شدید جذبات کے حامل ہیں کہ دلوں میں تیر و نشتر کی طرح اترتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً ؎

نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہیں   اس دمِ نیم سوز کو طائرک بہار کر

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی   مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر   زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے   مرا عشق میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں   مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز   مری خلوت و انجمن کا گداز
اُمنگیں مری آرزوئیں مری   امیدیں مری جستجوئیں مری
مری فطرت آئینۂ روزگار   غزالانِ افکار کا مرغزار
مرا دل مری رزمگاہِ حیات   گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر   اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

۴۔ بالِ جبریل میں اقبال نے جو اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے وہ نہایت شگفتہ بھی ہے اور دلکش بھی اور سب سے الگ بھی۔ مثلاً ؎

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا   مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے   علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا   یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

۵۔ بالِ جبریل میں جدید و قدیم شاعری کا بہترین امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔ اس میں تغزل اور تصوف بھی ہے اور فلسفیانہ اور سیاسی خیالات بھی ہیں۔

۶۔ اس کتاب میں اقبال نے زندگی کے بعض اہم مسائل کو پیر رومی کے اشعار کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی بڑی عقیدتمندی کے ساتھ رومی کی عظمت کا بیان بھی کیا ہے اور ان کی تعلیمات سے استفادہ کرنے کی تلقین بھی کی ہے۔ مثلاً ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے   وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

علاجِ آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا   تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش   لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

۷۔ سیاسی موضوعات پر بھی اس کتاب میں بعض عمدہ نظمیں ملتی ہیں۔ مثلاً نظم "فرمانِ خدا"، "لینن" وغیرہ اور اس مجموعے کی سب سے زیادہ پرجوش نظم "ساقی نامہ" ہے۔ اس نظم میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرجوش الفاظ اور مست خیالات کا ایک سیلاب امڈتا چلا آتا ہے۔ اس نظم میں قوم کی پستی و زبوں حالی کے اسباب بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں اور نہایت دلسوزی کے انداز میں ان کے درماں کی تدبیر بھی بتاتی ہے۔

۸۔ فارسی تراکیب کے لئے اردو شاعری میں مرزا غالب کو ایک آئیڈیل کی حیثیت حاصل ہے۔ فارسی تراکیب سے کلام میں زور، بلندی اور شکوہ پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی ایک بڑا مضمون کبھی کبھی چند الفاظ میں بڑی خوبی سے ادا ہو جاتا ہے۔ اقبال بھی شروع ہی سے اس معاملے میں غالب کے پیرو نظر آتے ہیں۔ چنانچہ انکی فارسی ترکیبوں میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو غالب کی تراکیب کا امتیازی وصف ہیں۔ مثلاً ؎

کہیں اُس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری   وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ ہو جائے

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے   غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب   بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پا بہ رکاب

نخچیرِ محبت کا قصہ نہیں طولانی   لطفِ خلشِ پیکاں، آسودگیٔ فتراک

۹۔ بعض اشعار سلاست، روانی اور مبنی بر حقیقت ہونے کی وجہ سے ضرب المثل کی طرح زبان زدِ خاص و عام ہو گئے ہیں یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ کلام کو درجۂ قبولِ خاطر و لطفِ سخن کا مقام حاصل ہے۔ مثلاً ؎

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو   جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی   جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے   شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات   تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

یہ مصرعہ لکھ دیا کس شوخ نے دیوارِ مسجد پر؟   یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

۱۰۔ کلام میں زورِ بیاں یوں تو ہر جگہ موجود ہے مگر بعض اشعار میں کمال پر پہنچ گیا ہے۔ ؎

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ   یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا   غلط تھا اے جنوں تیرا مگر اندازۂ صحرا

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن ۔۔۔ مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن
الٰہ رفعتِ تخیل بھی درجہ کمال پر پہنچ گئی ہے مثلاً

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا ۔۔۔ وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

قلی خان سے چھپے تھے جو بے بال و پر نکلے ۔۔۔ ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

محبت ذرے سے ملے پیا سے کو شبنم دیا ۔۔۔ تخیل سے جسے رزاقی نہیں ہے

حقانی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں ۔۔۔ نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم ۔۔۔ کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا ۔۔۔ یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

۱۲۔ اکثر غزلوں اور نظموں میں شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی کا بھی بڑا لطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔ مثلاً ؎

غزل .... گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
" .... وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی
" .... عالم آب و خاک و باد سرِ عیاں ہے تو کہ میں
" .... دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
" .... جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی

۱۳۔ اس کتاب میں بعض جگہ خدا کے ساتھ شاعرانہ شوخیاں بھی پائی جاتی ہیں جو اگرچہ سنجیدہ طبائع پر گراں گزرتی ہیں اور ہمارے نزدیک بھی ایسی باتوں سے اجتناب کرنا ہی اچھا ہے تاہم اس کو نازِ عبدیت پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ؎

بہرحال کتاب کا تمام تر حصہ ایسے بلند اور پاکیزہ مضامین کا مجموعہ ہے ایسے بلند و پاکیزہ مضامین کا جن کی اس سے پہلے اردو شاعری میں مثال نہیں ملتی۔ ممکن ہے پوری کتاب میں سے تعلیم کے نوجوانوں کو وہی دو ایک نظمیں پسند آئیں جن کو وہ اپنے نظریئے کی تائید سمجھتے ہیں یا مغرب زدہ دین باختہ اشخاص انہی اشعار کو پڑھتے اور سناتے رہیں جن میں اقبال نے ملّا، دوسرے ریاکار مذہبی لوگوں کی مذمت کی ہے لیکن اس کے برخلاف جو لوگ نہ محض یہ کہ دین پسند ہیں بلکہ دینی و اخلاقی اقدار کے لذت آشنا بھی ہیں وہ اس کتاب کو عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھریں یا مصحف کی طرح سینے میں محفوظ کرنا چاہیں تو بالکل حق بجانب ہیں کہ ہر شخص اُسی چیز کو پسند کرتا ہے جس کو اس نے مقصدِ زندگی سمجھ لیا ہے اور یہ بات ہم اپنے مشاہدے کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔ ہم نے ایسے دنی الطبع کور ذوق اشخاص کو بھی دیکھا ہے جو بالِ جبریل کے اُن اشعار کو جو آبِ زر سے لکھنے اور موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں تمسخرانہ انداز میں پڑھتے اور اقبال کی شان میں گستاخانہ کلمات بھی استعمال کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو بالِ جبریل کے ایک ایک شعر پر سر دھنتے اور اُس کی خوبیاں بیان کرنے سے سیر نہیں ہوتے۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست! ؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
شاہیں کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور

اسلام کو اس وقت نئے خون، نئی امنگ، نئے ولولے، نئے جوشِ عمل اور جذبہ قربانی کی ضرورت ہے۔ یہ نیا خون نیا جوش اور جذبہ قربانی بہت سی جگہ موجود ہے۔ لیکن پست مقاصد اور غلط میدانوں میں صرف ہو رہا ہے۔ جو چیز اسلام کے کام نہیں آرہی ہے۔ وہ صرف ضائع نہیں ہو رہی ہے۔ بلکہ دنیا کی تباہی کا باعث ہو رہی ہے۔ اسلام کی دعوت ابھی ان گوشوں میں نہیں پہونچی۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم اسلام کو ان قوموں اور طبقوں تک پہنچا کر اسلام کی طاقت اور ایمان کی ان کیفیات کا تماشہ دیکھیں ______ جو ہمیں دنیا کی تاریخ میں نومسلموں کی زندگی میں وقتاً فوقتاً نظر آتی ہیں۔

______ مولانا ابوالحسن علی ندوی ______

حکیم اجمل خان

میواتی زبان و ادب

میو قوم اور علاقہ میوات کی زبان میواتی کہلاتی ہے۔ جو دلی کی جنوبی سے شروع ہو کر جنوب میں الور، مغرب میں ہیرداں شیخاواٹی، اور مشرق میں برج کے علاقہ تک بولی جاتی ہے میوات کے تمام باشندے بلالحاظ قوم و مذہب میواتی زبان بولتے ہیں۔

میواتی کی اصل و نسل

شمالی ہندوستان کی مشہور و ممتاز ہند آریائی زبان علاقائی جغرافی اور تمدنی تبدیلیوں کی بنا پر برج بھاشا، بانگرو، ہریانی، راجستھانی، پنجابی، میواتی، ودھی، پوربی وغیرہ مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ بعض لوگ انھیں زبانوں کو ہندی یا ہندوستانی کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ یہ ہندی یا ہندوستانی پورے شمالی مغربی ہندوستان میں الفاظ اور لہجے کے معمولی ہیر پھیر کے ساتھ رائج ہے موجودہ اردو زبان کو اسی ہندوی یا ہندوستانی کی ایک ترقی یافتہ شکل سمجھا جاتا ہے۔

مسٹر گریرسن جسے لسانیاتی تحقیقات کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے، نے اس زبان ہندی یا ہندوستانی کی مندرجہ ذیل تقسیم کی ہے۔

۱۔ بیرونی زبانیں	۲۔ وسطی زبانیں	۳۔ اندرونی زبانیں	۴۔ پہاڑی زبانیں
پنجابی مغربی	پوربی ہندی	مغربی ہندی	مشرقی پہاڑی نیپالی
سندھی		پنجابی (مشرقی)	وسطی پہاڑی
مرہٹی		گجراتی	مغربی پہاڑی
آسامی		راجستھانی	
بنگالی		بھیلی	
اڑیا		خاندیسی	
بہاری			

پھر مغربی ہندی کی پانچ بولیاں گناتی ہیں۔

۱۔ کھڑی بولی ہندوستانی ۲۔ ہریانی ۳۔ جاٹکی یا بانگرو ۴۔ قنوجی ۵۔ بندیلی

لسانیات کے بعض ماہرین نے گریرسن کی اس تقسیم کو مبہم قرار دیا ہے۔ جناب ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے اپنی کتاب "مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں ڈاکٹر چیٹرجی کی تقسیم کو درست تسلیم کیا ہے۔

مدھیہ دیش کی زبانیں	درمیانی زبانیں	شمال مغربی ہند کی زبانیں	مشرقی ہند کی زبانیں
مغربی ہندی	پنجابی	مغربی پنجابی	بہاری
	راجستھانی	سندھی	اڑیا
	گجراتی		بنگالی
	پہاڑی		آسامی
	پوربی ہندی		

جنوبی ہند کی زبانیں

مرہٹی

پھر جناب ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے راجستھانی کی حسب ذیل تقسیمیں بتائی ہیں۔ اور میواتی زبان کو راجستھانی کی شاخ فرمایا ہے۔

۱۔ مارواڑی

۲۔ مالوی

۳۔ جے پوری

۴۔ میواتی

اس وقت ہمارا مقصد چونکہ میواتی زبان و ادب پر بحث کرنا ہے، اس لئے ہم صرف میواتی زبان کے ماخذ و علیہ پر بات کریں گے۔

بات اصل یہ ہے۔ کہ ہند آریائی زبانوں کی جب ہم تقسیم کرنے بیٹھتے ہیں۔ تو ان میں دو زبانیں قدیم ملتی ہیں۔

۱۔ ڈونگل (راجستھانی) ۲۔ پنگل (برج)

ڈونگل و پنگل قدیم زبانیں ہیں جن کو اہم اور ماخذ زبانیں اس لئے بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ ڈنگل زبان کا دیس "راجستھان" شمالی ہند میں سیاست و ریاست کا مرکز رہا ہے۔ اور پنگل کا دیس "برج" قدیم آریائی تہذیب و تمدن کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ اتفاق سے میوات کا علاقہ جہاں میواتی زبان رائج ہے۔ وہ راجستھان و برج کا درمیانی علاقہ ہے۔ اس لئے میواتی

زبان پر ہر دو زبانوں کے اثرات کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ جس کی بنا پر بعض محققین نے تو میواتی کو راجستھانی کی شاخ بتا دیا ہے۔ اور بعض نے برج بھاشا کی۔

چنانچہ ماہر لسانیات کے خیالات اس سلسلے میں حسب ذیل پائے جاتے ہیں۔ بابائے اردو جناب ڈاکٹر عبدالحق صاحب مرحوم فرماتے ہیں۔

"میواتی زبان دوسری آس پاس کی زبانوں میں مدغم ہو گئی ہے۔"

یعنی آپ کے خیال میں میواتی زبان کا اصل روپ ختم ہو چکا ہے۔ اور دوسری زبانوں میں اس کا ادغام ہو گیا ہے۔ اگرچہ آپ نے کسی مخصوص زبان کی نشاندہی نہیں فرمائی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں۔ کہ آپ کا اشارہ یقیناً برج بھاشا اور راجستھانی کی طرف ہوگا۔

جناب ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے میواتی زبان کے بارے میں کافی تحقیقات فرمائی ہیں۔ آپ کے یہاں بھی غالباً اسی لئے تضاد موجود ہے۔ آپ نے ایک طرف تو میواتی کو راجستھانی کی شاخ بتایا ہے مگر دوسری طرف آپ "مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں فرماتے ہیں۔

ان چاروں بولیوں کی ساخت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جے پوری اور مارواڑی گجراتی سے، اور میواتی برج بھاشا سے اور مالوی بندیل کھنڈی سے ملتی جلتی ہے۔

ایک اور مقام پہ فرماتے ہیں۔

متھرا کی برج بھاشا معیاری مانی جاتی ہے۔ دوسرے اضلاع کی برج بھاشا میں مقامی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بلند شہر کے ضلع میں یہ کھڑی بولی میواتی سے گھل مل جاتی ہے۔ جے پور میں راجستھانی کے اثرات قبول کر لیتی ہے۔ شمال میں گوڑگانوہ ضلع میں اس پر میواتی کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے ایک اور مقام پر میواتی کا تطابق دکنی کے ساتھ کیا ہے۔

دکنی اور میواتی

پچھلے ابواب میں ہم نے قدیم اردو اور میواتی کے اثرات کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میوات کا ذکر پرتھی راج راسو تک میں ملتا ہے۔ میواتی راجستھان کی شمال مغربی بولی ہے۔ جس کے ڈانڈے ایک طرف برج بھاشا سے اور دوسری طرف بانگرو سے جا ملتے ہیں۔ اس کا مرکز ریاست الور ہے۔

گوڑگانوہ کے مغربی حصے پالودی اور ضلع دہلی کے بعض علاقوں میں اس کی بولی اہیرواٹی رائج ہے تحصیل جھجر، دہلی اور رہتک کی اہیرواٹی میں بانگرو کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ راجستھانی کی طرح میواتی بانگرو (ہریانی) اور مشرقی پنجابی میں بہت سی مشترک لسانی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ شیرانی نے اپنے لسانیاتی نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ دہلی میں مسلمانوں کے آمد کے وقت کونسی بولی، بولی جاتی تھی یقیناً وہ راجستھانی ہوگی یا برج،

دوسرے الفاظ میں شیرانی کھڑی بولی اور ہریانی کی قدامت سے تو انکار کیا ہے لیکن برج کے ساتھ راجستھانی کی قدامت کو تسلیم کیا ہے۔ راجستھانی کی قدامت کو تسلیم کرنا اس لئے بھی ناگزیر تھا۔ کہ [illegible] سے راجستھانی کے اثرات نمایاں ہیں۔ ہم یہ دکھا چکے ہیں۔ کہ قدیم اردو (یا [illegible] قدیم دکنی) کی بعض خصوصیات کی توجیہہ میواتی بولی سے کی جائے گی۔ جن کی قدامت کے شیرانی بھی قائل ہیں۔ اور جو صرف نواح دہلی بلکہ ضلع دہلی کے جنوب [illegible] رائج ہے۔

جناب ڈاکٹر صاحب کی میواتی کے بارے میں تحقیقات اور رائے جاننے کے بعد ہم اس نتیجے پہ پہونچے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب میواتی زبان کو راجستھانی مانتے ہوئے برج سے متأثر مانتے ہیں اور اس اثر کی وجہ سے آپ میواتی کو ایک دم راجستھانی بتاتے ہوئے ہچکچاتے رہے ہیں۔ حالانکہ میواتی زبان سو فیصدی ڈینگل (راجستھانی) کی شاخ ہے۔ میوات کا بیشتر علاقہ ریاست بھرت پور کے قیام سے پہلے ریاست جے پور کا حصہ تھا جس کی زبان راجستھانی ہے۔ اسی طرح میوات کے میو باشندے جو میواتی زبان بولتے ہیں۔ راجستھان ہی کے قدیم چھتری راج پوت خاندانوں اور نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کی زبان راجستھانی ہی ہے۔

البتہ میوات کا وہ علاقہ جو برج کے ساتھ ملتا جلتا ہے وہاں کی میواتی بولی پر برج کے اثرات ضرور پائے جاتے ہیں جس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔

ایک یہ کہ میوات کا علاقہ برج کے ساتھ لگتا ہے۔ برج کے لوگوں کے ساتھ میوؤں کے نہ صرف قریبی تعلقات ہیں۔ بلکہ آپس میں بھائی چارہ بھی موجود ہے۔ دن رات باہمی اختلاط ربط و ضبط رہتا ہے۔ قصبات ہوڈل، کوسی، کامنہ، ڈیگ، بھرت پور میں برج اور میوات کے لوگوں کا مجاری سنگم رہتا ہے۔ اس لئے ان قصبات کی زبان ملی جلی ہے اور اُن پر برج کا اثر ہے۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ۱۷۲۳ء میں میوات کا کافی علاقہ جو پہلے راجستھانی ریاست جے پور کا حصہ تھا۔ ایک نئی ریاست بھرت پور کی شکل اختیار کر گیا۔ مہاراجگان بھرت پور کی عملداری سہنہ اور کشن گڑھ تک قائم ہو گئی تھی۔ میوات کے اس حصے میں جو بھرت پور میں چلا گیا۔ برج بھاشا کو کافی فروغ حاصل ہوا حتیٰ کہ اس عہد کے [illegible] سعداللہ خاں کی میواتی شاعری پر بھی برج کی گہری چھاپ موجود ہے۔

میواتی کا اصلی روپ

ہم اوپر بتا چکے ہیں۔ کہ قدیم آریائی زبان کی دو شاخیں ہیں۔ ایک ڈینگل دوسرے پنگل ہریانی، بانگرو، میواتی، برج، راجستھانی وغیرہ وغیرہ انہیں دونوں زبانوں کی شاخیں ہیں ہندوی، یا ہندوستانی جو اردو کی ماں کہلاتی ہے۔ انہیں زبانوں کے باہمی ربط و ضبط کے بعد وجود میں آئی ہے۔

میواتی زبان ڈینگل کی شاخ ہونے کی بنا پر سو فیصدی کھڑی بولی ہے جس کی بنیادی وجہ میوؤں کا راجستھان اور راج پوتوں سے نسلی تعلق ہے۔ یہ علاقہ ہمیشہ راجستھان کا حصہ رہا ہے۔ خود میو اور راجستھان کے چھتری راج پوت اس پر حکمران رہے ہیں۔ اس لئے قدرتی طور پر میوات کے لوگوں کی زبان راجستھان کے دوسرے خطوں کی طرح سے کھڑی بولی ہے۔ اور اس میں ذرا بھی لچک نہیں۔ میواتی میں برج کا رسیا پن صرف اس حصہ میوات میں

ملتا ہے۔ جو برج کے علاقے کے ساتھ ساتھ دور دور تک چلا گیا ہے۔
کھڑی میواتی زبان کا اصل روپ الور میں پایا جاتا ہے۔ جو میواتی تہذیب و تمدن کا قدیم ترین مرکز ہے۔ الور کے چاروں طرف دور دور تک میوات کا علاقہ ہے جس میں میوؤں کے علاوہ دوسری اقوام بھی آباد ہیں مگر یہاں کے تمام باشندے میواتی زبان بولتے ہیں۔

میواتی زبان کا لب و لہجہ

میواتی کا لب و لہجہ کھڑی بولی ہونے کی بنا پر سخت کھردرا ہے۔ مگر میواتی کے ادب میں جو بڑی حد تک برج سے متاثر ہے۔ کافی رسیلا پن پایا جاتا ہے۔
میواتی، ل، ڑ، اور ن کا استعمال بہت سختی سے ہوتا ہے جس سے میواتی ایک کرخت زبان معلوم ہوتی ہے۔ اس زبان کو ہم کسی بھی لپی میں اس کے مخصوص لب و لہجہ کے ساتھ نہ بول سکتے ہیں۔ اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ میواتی کا "ل" تامل کے "لے" کی طرح ہوتا ہے۔ میواتی کا "ل" نہ راجستھانی میں ملتا ہے۔ اور نہ برج میں۔ برج میں تو "ل" اور "ڑ" دونوں کی جگہ "ر" مستعمل ہے۔
ذیل ہم راجستھانی، برج اور میواتی کی کچھ مثالیں پیش کر رہے ہیں:

ہندی	راجستھانی	برج	میواتی
پلول	پلول	پرور	پرول
سڑک	سڑک	سرک	سیڑک
بڑا	بڑا	بڑو	بڈا
یہاں	یہائیں	ہت رہوں	ہیں یہائیں
گنا	گنا	گانڈے	گنڈا

اس فرق کے باوجود کہ میواتی ایک کھڑی بولی ہے۔ میواتی ادب یا شعر پر برج بھاشا کا کافی اثر ہے۔ کیوں کہ میواتی زبان کے بیشتر شعرا میوات کے اسی خطہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو برج کے ساتھ لگتا ہے۔
میواتی کی صوفیانہ شاعری ہندوی زبان کے شعرا سے مماثلت رکھتی ہے۔ کبیر داس کی شاعری اور میواتی کے سائیں لال داس کی زبان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی طرح بھیک جی اور عبدالرحیم خان خاناں ایک ہی زبان میں بولتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔
سعد اللہ خاں کی مہابھارت جو میواتی ادب کا شاہکار ہے، ڈینگل اور پنگل زبان کا سنگم ہے۔ اس میں بھاری بھرکم کھڑی بولی بھی ہے۔ اور برج بھی۔ ملاحظہ فرمایئے۔

پتر جنے تو بھینو سا جو جن جیو سہاتے
ایک بول کے کارنے تینے کیچک مار ددھاتے

ایک خالص میواتی کھڑی بولی کا شعر ملاحظہ فرمائیں۔

برج دیا چندن بڑا میسر پہاڑ اموڑ!!
گیڑ کھگن لنکا لوں راج کلی راجپر را ٹھوڑ

بہرحال میواتی زبان کی شاعری کھڑی اور برج بولی کا حسین امتزاج ہے۔ اور وہ ہندوی یا ہندوستانی شاعری سے قریب تر ہے۔

ہندوی یا ہندوستانی اور میواتی

میواتی زبان میں مستقل سرمایہ ادب موجود ہے۔ اس کی قدیم شاعری اور ادبی انداز ہے۔ جو ہندوی یا ہندوستانی شاعری کا ہے اور جو۔

چندر بردائے	۱۲۰۰ء
حضرت امیر خسرو	۱۲۵۳-۱۳۲۵ء
وارث شاہ	۱۲۷۵-۱۳۳۵ء
کبیر داس	۱۴۴۰-۱۵۱۵ء
گورونانک	۱۴۶۹-۱۵۳۸ء
ملک محمد جائسی	۱۴۹۳-۱۵۴۳ء
شیخ باجن	۱۵۰۶ء
رحیم	۱۵۵۳-۱۶۲۶ء
بلھے شاہ	۱۶۸۰-۱۷۵۲ء

وغیرہ وغیرہ اپنے عہد میں کہہ کر چلے گئے ہیں۔ گورو نانک، وارث شاہ، شاہ حسین، بلھے شاہ تو پنجابی زبان کے ادیب ہیں جن کا ادب ٹکسالی پنجابی ادب ہے۔ اور جو قطور پر ہندوی یا ہندوستانی کا حصہ ہے۔ چندر بردائے، امیر خسرو، کبیر داس، تلسی داس، ملک محمد جائسی، شیخ باجن، گنگ کوی، تان سین، بیربل، میرا بائی، ہندوی یا ہندوستانی کے ٹکسالی ادیب و شاعر ہیں۔
ان قدیم ادیب و شاعروں کے کلام کو جب ہم دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔ کہ ان کا کلام میواتی زبان و ادب سے مطابقت رکھتا ہے۔
چندر بردائے کی پرتھی راج راسو میں جو زبان استعمال کی گئی ہے۔ وہ میواتی زبان سے ملتی جلتی ہے خود پرتھی راج چوہان میوؤں کی چوہان نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ایک زمانے میں میوات کے ایک حصے پر اس کی حکومت بھی رہ چکی ہے۔ پرتھی راج راسو میں میوات کا اور میوات کی لڑائیوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ کتاب کی زبان میں عربی فارسی کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔
حضرت امیر خسرو اور سنت کبیر داس کے کلام و بھجنوں کو جب باآواز بلند پڑھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی میو شاعری کر رہا ہے۔ یہی حال سنت تلسی داس کی رامائن اور ملک محمد جائسی کی پدماوت کا ہے۔ عبدالرحیم خان خاناں تو اصلاً میواتی تھا۔ جمال خاں میواتی کی لڑکی بیرم خاں کو بیاہی تھی۔ عبدالرحیم خان خاناں اسی لڑکی کی اولاد تھے۔ بعض لوگ خان خاناں کو صرف برج بھاشا کا شاعر کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ ذیل میں ہم ہندوی اور میواتی زبان کا تقابلی نمونہ پیش کر رہے ہیں۔

چندر بردائے

اور تھارا ابنس کا سبوت کپوت دیگا جی نے گام گوڑ رو
انڑے راج میں کھائیا پائیا جائے گا اور تھارا چاکر گوڈا

زبان پر ہر دو زبانوں کے اثرات کم و بیش پائے جاتے ہیں جس کی بنا پر بعض محققین نے تو میواتی کو راجستھانی کی شاخ بتا دیا ہے۔ اور بعض نے برج بھاشا کی ۔

چنانچہ ماہر لسانیات کے خیالات اس سلسلے میں حسب ذیل پائے جاتے ہیں۔ بابائے اردو جناب ڈاکٹر عبدالحق صاحب مرحوم فرماتے ہیں ۔

"میواتی زبان دوسری آس پاس کی زبانوں میں مدغم ہو گئی ہے ۔"

یعنی آپ کے خیال میں میواتی زبان کا اصل روپ ختم ہو چکا ہے ۔ اور دوسری زبانوں میں اس کا ادغام ہو گیا ہے ۔ اگرچہ آپ نے کسی مخصوص زبان کی نشاندہی نہیں فرمائی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا اشارہ یقیناً برج بھاشا اور راجستھانی کی طرف ہو گا ۔

جناب ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے میواتی زبان کے بارے میں کافی تحقیقات فرمائی ہیں۔ آپ کے ہاں بھی غالباً اسی لئے تضاد موجود ہے ۔ آپ نے ایک طرف تو میواتی کو راجستھانی کی شاخ بتایا ہے مگر دوسری طرف آپ "مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں فرماتے ہیں ۔

> ان چاروں بولیوں کی ساخت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جے پوری اور مارواڑی گجراتی سے، اور میواتی برج بھاشا سے اور مالوی بندیل کنڈی سے ملتی جلتی ہے ۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں ۔

> متھرا کی برج بھاشا معیاری مانی جاتی ہے ۔ دوسرے اضلاع کی برج بھاشا میں مقامی اختلافات پائے جاتے ہیں ۔ بلند شہر کے ضلع میں یہ کھڑی بولی میواتی سے گھل مل جاتی ہے ۔ جے پور میں راجستھانی کے اثرات قبول کر لیتی ہے ۔ شمال میں گوڑگانوہ ضلع میں اس پر میواتی کا اثر دکھائی دیتا ہے ۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے ایک اور مقام پر میواتی کا تطابق دکنی کے ساتھ کیا ہے ۔

دکنی اور میواتی

پچھلے ابواب میں ہم نے قدیم اردو اور میواتی کے اثرات کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میوات کا ذکر پرتھی راج راسو تک میں ملتا ہے۔ میواتی راجستھان کی شمال مغربی بولی ہے۔ جس کے ڈانڈے ایک طرف برج بھاشا سے اور دوسری طرف بانگرو سے جا ملتے ہیں۔ اس کا مرکز ریاست الور ہے ۔

گوڑگانوہ کے مغربی حصے پالوندی اور ضلع دہلی کے بعض علاقوں میں اس کی بولی اہیرواٹی رائج ہے تحصیل جھجر، دہلی اور رہتک کی اہیرواٹی میں بانگرو کی آمیزش پائی جاتی ہے ۔ راجستھانی کی طرح میواتی بانگرو (ہریانی) اور مشرقی پنجابی میں بہت سی مشترک لسانی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ شیرانی نے اپنے لسانیاتی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا ہے ۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ دہلی میں مسلمانوں کے آمد کے وقت کونسی بولی، بولی جاتی تھی یقیناً وہ راجستھانی ہو گی یا برج،

دوسرے الفاظ میں شیرانی کھڑی بولی اور ہریانی کی قدامت سے تو انکار کیا ہے لیکن برج کے ساتھ راجستھانی کی قدامت کو تسلیم کیا ہے ۔ راجستھانی کی قدامت کو تسلیم کرنا اس لئے بھی ناگزیر تھا۔ کہ راجستھان کے قبیلوں کی شعریات سے راجستھانی کے اثرات نمایاں ہیں ۔ ہم یہ دکھا چکے ہیں۔ کہ قدیم اردو (بالخصوص قدیم دکنی) کی بعض خصوصیات کی توجیہہ میواتی بولی سے کی جائے گی۔ جس کی قدامت کے شیرانی بھی قائل ہیں۔ اور جو نہ صرف نواح دہلی بلکہ ضلع دہلی کے جنوب مغربی حصوں میں رائج ہے ۔

جناب ڈاکٹر صاحب کی میواتی کے بارے میں تحقیقات اور رائے جاننے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب میواتی زبان کو راجستھانی مانتے ہوئے برج سے متاثر مانتے ہیں اور اس اثر کی وجہ سے آپ میواتی کو ایک دم راجستھانی بتاتے ہوئے ہچکچاتے رہے ہیں۔ حالانکہ میواتی زبان سو فیصدی ڈینگل (راجستھانی) کی شاخ ہے۔ میوات کا پورا علاقہ ریاست بھرت پور کے قیام سے پہلے ریاست جے پور کا حصہ تھا جس کی زبان راجستھانی ہے۔ اسی طرح میوات کے میو باشندے جو میواتی زبان بولتے ہیں۔ راجستھان ہی کے قدیم چھتری راج پوت خاندانوں اور نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کی زبان راجستھانی ہی ہے ۔

البتہ میوات کا وہ علاقہ جو برج کے ساتھ ملتا جلتا ہے وہاں کی میواتی بولی پر برج کے اثرات ضرور پائے جاتے ہیں ۔ جس کی دو بڑی وجوہات ہیں ۔

ایک یہ کہ میوات کا علاقہ برج کے ساتھ لگتا ہے ۔ برج کے لوگوں کے ساتھ میوؤں کے نہ صرف قریبی تعلقات ہیں ۔ بلکہ آپس میں بھائی چارہ بھی موجود ہے ۔ دن رات باہمی اختلاط ربط و ضبط رہتا ہے۔ قصبات ہوڈل، کوسی، کامنہ، ڈیگ، بھرت پور میں برج اور میوات کے لوگوں کا بھاری سنگم رہتا ہے ۔ اس لئے ان قصبات کی زبان ملی جلی ہے اور ان پر برج کا اثر ہے ۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ۱۷۳۰ء میں میوات کا کافی علاقہ جو پہلے راجستھانی ریاست جے پور کا حصہ تھا۔ ایک نئی ریاست بھرت پور کی شکل اختیار کر گیا۔ مہاراجگان بھرت پور کی عملداری سہنہ اور کشن گڑھ تک قائم ہو گئی تھی ۔ میوات کے اس حصے میں جو بھرت پور میں چلا گیا۔ برج بھاشا کو کافی فروغ حاصل ہوا حتیٰ کہ اس عہد کے میو شاعر جاکوی سعداللہ خاں کی میواتی شاعری پر بھی برج کی گہری چھاپ موجود ہے ۔

میواتی کا اصلی روپ

ہم اوپر بتا چکے ہیں۔ کہ قدیم آریائی زبان کی دو شاخیں ہیں ۔ ایک ڈینگل دوسرے پنگل ہریانی، بانگرو، میواتی، برج، راجستھانی وغیرہ وغیرہ انہیں دونوں زبانوں کی شاخیں ہیں ہندوی، یا ہندوستانی جو اردو کی ماں کہلاتی ہے ۔ انہیں زبانوں کے باہمی ربط و ضبط کے بعد وجود میں آئی ہے ۔

میواتی زبان ڈینگل کی شاخ ہونے کی بنا پر سو فیصدی کھڑی بولی ہے جس کی بنیادی وجہ میوؤں کا راجستھان اور راج پوتوں سے نسلی تعلق ہے ۔ یہ علاقہ ہمیشہ راجستھان کا حصہ رہا ہے ۔ خود میو اور راجستھان کے چھتری راج پوت اس پر حکمران رہے ہیں۔ اس لئے قدرتی طور پر میوات کے لوگوں کی زبان راجستھان کے دوسرے خطوں کی طرح سے کھڑی بولی ہے ۔ اور اس میں ذرا بھی لچک نہیں۔ میواتی میں برج کا رسیا پن صرف اس حصہ میوات میں

ملتا ہے۔ جو برج کے علاقے کے ساتھ ساتھ دور دور تک چلا گیا ہے۔

کھڑی میواتی زبان کا اصل روپ الور میں پایا جاتا ہے۔ جو میواتی تہذیب و تمدن کا قدیم ترین مرکز ہے۔ الور کے چاروں طرف دور دور تک میوات کا علاقہ ہے جس میں میوؤں کے علاوہ دوسری اقوام بھی آباد ہیں۔ مگر یہاں کے تمام باشندے میواتی زبان بولتے ہیں۔

میواتی زبان کا لب و لہجہ

میواتی کا لب و لہجہ کھڑی بولی ہونے کی بنا پر سخت کھردرا ہے۔ مگر میواتی کے ادب میں جو بڑی حد تک برج سے متاثر ہے۔ کافی رسیلا پن پایا جاتا ہے۔

میواتی، ل، ڑ، اور ن کا استعمال بہت سختی سے ہوتا ہے جس سے میواتی ایک کرخت زبان معلوم ہوتی ہے۔ اس زبان کو ہم کسی بھی لپی میں اس کے مخصوص لب و لہجہ کے ساتھ نہ بول سکتے ہیں، اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ میواتی کا "ل" تامل کے "ل" کی طرح ہوتا ہے۔ میواتی کا "ل" نہ راجستھانی میں ملتا ہے۔ اور نہ برج میں۔ برج میں تو "ل" اور "ڑ" دونوں کی جگہ "ر" مستعمل ہے۔

ذیل ہم راجستھانی، برج اور میواتی کی کچھ مثالیں پیش کر رہے ہیں۔

ہندی	راجستھانی	برج	میواتی
پلول	پلول	پرور	پرول
سڑک	سڑک	سرک	سیڑک
بڑا	بڑا	بڑو	بڈا
یہاں	یہائیں	ہٹ ریہوں	ہین یہائیں
گنا	گنا	گانڈے	گنڈا

اس فرق کے باوجود کہ میواتی ایک کھڑی بولی ہے میواتی ادب پا شعر پر برج بھاشا کا کافی اثر ہے کیونکہ میواتی زبان کے بیشتر شعرا میوات کے اسی خطے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو برج کے ساتھ لگتا ہے۔

میواتی کی صوفیانہ شاعری ہندوی زبان کے شعرا سے مماثلت رکھتی ہے۔ کبیرداس کی شاعری اور میواتی کے سائیں لال داس کی زبان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی طرح بھیک جی اور عبدالرحیم خان خاناں ایک ہی زبان میں بولتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

سعداللہ خاں کی مہابھارت جو میواتی ادب کا شاہکار ہے، ڈینگل اور پنگل زبان کا سنگم ہے۔ اس میں بھاری بھرکم کھڑی بولی بھی ہے۔ اور برجی بھی۔ ملاحظہ فرمائیے۔

پتر جنے تو بھینو سا جو جن جیو سہاتے
ایک بول کے کارنے تینے کیچک مارو دھاتے

ایک خالص میواتی کھڑی بولی کا شعر ملاحظہ فرمائیں۔

برج دیا چندن برا میر پہاڑ امو ڑ ...!!
گیڑ کھگن لنکا نو ن راج کلی راجہ راٹھوڑ

بہرحال میواتی زبان کی شاعری کھڑی اور برجی بولی کا حسین امتزاج ہے۔ اور وہ ہندوی یا ہندوستانی شاعری سے قریب تر ہے۔

ہندوی یا ہندوستانی اور میواتی

میواتی زبان میں مستقل سرمایہ ادب موجود ہے۔ اس کی قدیم شاعری اور ادب کا وہی انداز ہے۔ جو ہندوی یا ہندوستانی شاعری کا ہے اور جو

چندربردائے	۱۲۰۰ء
حضرت امیر خسرو	۱۲۵۳-۱۳۲۵ء
وارث شاہ	۱۲۷۵-۱۳۴۵ء
کبیرداس	۱۴۴۰-۱۵۱۵ء
گورونانک	۱۴۶۹-۱۵۳۸ء
ملک محمد جائسی	۱۴۹۳-۱۵۴۳ء
شیخ باجن	۱۵۰۶ء
رحیم	۱۵۵۳-۱۶۲۶ء
بلھے شاہ	۱۶۸۰-۱۷۵۲ء

وغیرہ وغیرہ اپنے عہد میں کہہ کر چلے گئے ہیں۔ گورونانک، وارث شاہ، شاہ حسین، بلھے شاہ تو پنجابی زبان کے ادیب ہیں جن کا ادب ٹکسالی پنجابی ادب ہے۔ اور جو قطعی طور پر ہندوی یا ہندوستانی کا حصہ ہے۔ چندربردائے، امیر خسرو، کبیرداس، تلسی داس، ملک محمد جائسی، شیخ باجن، گنگ کوی، تان سین، بیربل، میرابائی، ہندوی یا ہندوستانی کے ٹکسالی ادیب و شاعر ہیں۔

ان قدیم ادیب و شاعروں کے کلام کو جب ہم دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔ کہ ان کا کلام میواتی زبان و ادب سے مطابقت رکھتا ہے۔

چندربردائے کی پرتھی راج راسو میں جو زبان استعمال کی گئی ہے۔ وہ میواتی زبان سے ملتی جلتی ہے خود پرتھی راج چوہان میوؤں کی چوہان نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ایک زمانے میں میوات کے ایک حصے پر اس کی حکومت بھی رہ چکی ہے۔ پرتھی راج راسو میں میوات کا اور میوات کی لڑائیوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ کتاب کی زبان میں عربی فارسی کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔

حضرت امیر خسرو اور سنت کبیرداس کے کلام و بھجنوں کو جب با آواز بلند پڑھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی میو شاعری کر رہا ہے یہی حال سنت تلسی داس کی رامائن اور ملک محمد جائسی کی پدماوت کا ہے۔ عبدالرحیم خان خاناں تو اصلاً میواتی تھا۔ جمال خاں میواتی کی لڑکی بیرم خاں کو بیاہی تھی۔ عبدالرحیم خان خاناں اسی لڑکی کی اولاد تھے۔

بعض لوگ خان خاناں کو صرف برج بھاشا کا شاعر کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ ذیل میں ہم ہندوی اور میواتی زبان کا تقابلی نمونہ پیش کر رہے ہیں۔

چندربردائے

اور تھارا نبس کا سبوت کپوت دیکا جی نے گام گوڑو
انترے راج میں کھایا پایا جائے گا اور تھارا چاکر گوڑا

لوناموکوتھارسوں یلاجاتے گا۔

سرد)پرتھی ساٹھ سوستھانم اجارج ریکیس دھنرتم ۔امیری تم کوباقی سری پرتھوکورن کے ساتھ ہتایپوسے چترکوٹ کوعیا۔تمھارا ایک چہووان کے راج میں سایت ہے۔تمہاری اولاد کاسپوت کپوت ہوگا۔جب چہوان کی پھل آوے گا جنم کوبھاتی سی طرح سمجھے گا۔تمہارا اکارکن ہی گھٹے گا۔تم جملکھاتری سے باتی کے آ

امیر خسرو

سگری رین موہے سنگ جاگا
بھور بھئی جب بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت ہیا
اے سکھی ساجن ناسکھی دیا
گوری سوئی سیج پے مکھ پے ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چہوں دیس
خسرو رین سہاگ کی جاگی پیو کے سنگ
تن میرا من پیو کا دو بھئے اک رنگ

بھگت کبیر داس

لوٹ سکے تو لوٹ لے رام نام کی لوٹ
پیچھے جب پچھتاوگے، پران جہیں جب چھوٹ
کال کرے سو آج کر، آج کرے سو اب
پل میں پرلیہ ہوئے گی، پھیر کرے گا کب

سری گورو نانک

آوت کو جاتا کہیں جاتے کو آیا
پر کی کر اپنی کہیں اپنو نہیں سمجھایا

وارث شاہ

ہیرآکھیا فکر نہ کریں، رانجھاتری چھوروی بری بلامیاں
نہیں سنگدے سولیاں پھانسیاں رتوں قاضی شرع دے تیگیاں جاپیاں

گنگ کوی

اکبرساہ جی آم کھاس (عام خاص) میں تکھت (تخت) اوپر وراجمان ہو رہے او رآم کھاس بھرن لگو۔جس میں تمام امرا آئے آتے۔کنس بجائے کراپنی اپنی بیٹھک پر بیٹھ جایا کریں۔

رحیم

رحیم دھاگا پریم کا مت توڑو چٹکائے
ٹوٹے سے پھر نا ملے، ملے گانٹھ پڑجائے

بلھے شاہ

دوئی دور کر و کوئی شور نہیں	ایہہ ترک ہندو کوئی ہور نہیں
سب سادھو کہو کوئی چور نہیں	ہر گھٹ وچ آپ سمایا رے
ٹک بوجھ کون چھپ آیا رے	کس بھیکی بھیک بنایا اے
اک روز جہان نوں جانا ہے	جا قبرے وچ سمانا ہے
تیرا گوشت کیڑیاں کھانا ہے	کر چیتا مرگ وسار نہیں

میواتی ادب

میواتی زبان میں ہر قسم کا ادب ملتا ہے۔ سب سے پہلے آپ صوفی شاعروں کا ملاحظہ فرمائیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا۔ کہ مندرجہ بالا ہندوی اور میواتی کلام میں فرق نہیں ہے۔

سائیں لال داس۔ بعہد دارا شکوہ

کہے لال سائیں کو پیارو، سردن منوایک سبھ ہارو
ہندو ترک کو ایکہی صاحب، راہ بناتی دوئے عجائب
بھگت بھیک منگئی جگت آوے سرم
گھر گھر ہنڈت دوس ہے کیا بادساکیا حرم
سادھو ایسا چاہئے روکھا کھائے گرا اس
اوپر اوڑھے کامل تلے بچھاوے گھاس

چوہڑ سادھ

یہ لے تیری لاٹھی لوگڑی یہ لے تیری گائے
ہم پہ مہرمدار کی ہم کس کی گھیراں گائے

بھیک جی

کرن دے نا بندگی دھرن دے نا دھیان
سندرا بیرن بھیک جی ہیں بی گھیرو آن
پارس گر، ہمائے گر، گر ملیا گر جان
تج گر دیپک بھیک جی لیجو تنت پچھان

ایک میواتی شعر

پردیسی کی پیت کو، سب کو من للچائے
اے پریا میں کھوٹ ہے رہے نا سنگ لیجائے

ایک میواتی شعر

کال کرا جائے آج کر آج کر اجائے اب
پل پل بیتی جات ہے اور کرا گو کب

سعداللہ خان

سعداللہ ای دیکھ بنا درتھونی کھمّا
ٹڈا اچنبھا موئے ادھرلے کیسے تھمّا

دانشاہ۔ میواتی شاعر

اُو جوڑ کیڑہ پھر باں بچھڑا بی مل جا لے
گرا نہ ملے ساں دانساہ چاہو جگ کتنا ہو جال

ایک میواتی شاعر

کھلے من پنچے کر و مت کر من بھاری
یائی رستا جاتے گی کھلک اللہ ساری

میواتی کبیشر

برج دیا چندن بڑا میر پہاڑا موڑ
گیر لکھن نکا لون راج کلی راجہ راٹھوڑ

ایک میواتی شعر

تارا کی پت دھوپ ہے، اٹل پربت کی پت میر
سب پیرن کو پیر معین الدین تیرو تخت پت اجمیر

ایک میواتی شعر

مندر پہ سندر کھڑی کھڑی سوکھاوے کیس
جی مالین کا ہاگ ہاوے مالی پردیس

ہندی اور میواتی زبان وادب کی ایک تقابلی جھلک آپ نے ملاحظہ فرمائی جس سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا۔ کہ امیر خسرو کی ہندوی، تلسی داس اور ملک محمد جائسی کی اودھی، کبیرداس کی پوربی اور رحیم کی برج بھاشا میواتی زبان سے کس قدر مطابقت و قریبی تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بالکل بجا ہوگا۔ کہ دہلی اور اس کے اطراف میں بولی جانے والی زبان کو ہندی، ہندی یا ہندوستانی کہا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر میں میواتی زبان کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنی دہلی کے اطراف میں بولی جانے والی اور زبانوں کا۔ بلکہ میں تو کہوں گا۔ کہ میواتی زبان کا زیادہ اس لئے بھی ہے کہ میوات کا علاقہ دہلی سے شروع ہو گیا ہے۔ اس علاقے نے دہلی کے بڑا نشیب و فراز دیکھے ہیں اس کی حفاظت کی خاطر بے پناہ خون بہا کر ایک شاندار مثال قائم کی ہے۔

میواتی زبان اور اس کے اقسام

اصل میں تو میواتی کی صرف دو قسمیں ہیں، ایک کھڑی میواتی، اور دوسرے پڑی میواتی مگر بعض لوگوں نے میواتی کی حسب ذیل اقسام بیان کی ہیں۔

کھڑی میواتی	راٹھی میواتی
منیڑا میواتی	کٹھیڑ میواتی
برج میواتی	

راٹھی اہیر دال کے قریب، نہیڑی ڈھونڈار کے نزدیک، کٹھیڑ بھرت پور کے علاقے کے آس پاس اور کھڑی الور میں بولی جاتی ہے۔ کامنہ، اور پونا ہانہ کے علاقہ کی میوات میں پڑی میواتی رائج ہے۔ میواتی کی بعض اقسام کو قومیت کے ساتھ بھی منسوب کیا جاتا ہے:

میو میواتی
برہمنی میواتی

اس خیال کے مطابق میو، میواتی صرف میو بولتے ہیں۔ برہمن اور بنئے برہمنی میواتی بولتے ہیں مگر یہ تقسیم صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ کیوں کہ میوات کے علاقہ میں میواتی کا استعمال بلا لحاظ قوم و مذہب ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں۔ میواتی کی دو بڑی قسمیں میوات میں رائج ہیں۔ ایک کھڑی میواتی، اور دوسرے پڑی میواتی کھڑی میواتی پورے الور اور گوڑگانوہ کے اس حصہ میں رائج ہے۔ جو الور کے ساتھ ملتا جلتا ہے۔ پڑی میواتی گوڑگانوہ اور بھرت پور میں رائج ہے۔ مگر بھرت پور کی میواتی میں برج کے اثرات کافی نمایاں ہیں۔ کھڑی اور پڑی میواتی کا فرق آپ مندرجہ جدول میں ملاحظہ فرمائیں۔

عام زبان	کھڑی میواتی	پڑی میواتی
میلا	میلو	میلے

[1] یہ شعر کبیر بیجناولی میں بھی ملتا ہے۔

مہسر	مہٹر	مہسر
مینا	مینو	مینے
جلسہ	جلسو	جلسا
کبھی	کھتی	کبھی
کتنہ	کھتو	کھتہ
تھانہ	تھانو	تھانے
اِت لو	نوتو	نوکو
کت لو	کنکھے تو	کت لو
ہیں	یہائیں	ہین
ہوں	واہئیں	ہونی

میواتی زبان میں "ن" اور "ل" کا استعمال بہت سختی سے ہوتا ہے۔ "ن" ہندی کے انا سے زیادہ سخت اور "ل" تامل زبان کی "ٹے" سے بہت سخت ہوتی ہے جس کی ادائیگی ہم اردو یا ہندی رسم الخط میں نہیں کر سکتے۔ البتہ بعض لوگوں کا ایسا خیال ہے کہ میواتی زبان کے لہجہ اور انداز کی ادائیگی سندھی لپی میں کی جا سکتی ہے میواتی زبان میں عربی اور فارسی کے الفاظ بھی کافی تعداد میں گھل مل گئے ہیں جنھیں مکمل طور پر میواتی لہجے میں ڈھالا جا چکا ہے۔ ذیل میں آپ اس کی مثال ملاحظہ فرمائیں۔

عربی فارسی انگریزی	میواتی	عربی فارسی انگریزی	میواتی
افراط	ابھرات	انجن	انجن
تبلیغ	تبلیگ	ٹائم	ٹیم
گواہی	گرائی	آفیسر	اپسر
طوفان	توپھان	سائن بورڈ	سین بورٹ
رونق	رونک	سارٹیفیکٹ	ساٹی ٹکٹ
ملاحی	ملاتی	ہارمونیم	ہرمنیا
خلیفہ	کھلیپہ	کمپونڈر	کمپوٹر
زمیندار	جمی دار	ڈاکٹر	ڈانکدھر
نماز	نواج		
وضو	اوجو		
شوقین	سوکین		
جنازہ	جناجو		
اسماعیل	اسمال		
وکیل	اکیل		
وکالت	اکیلات		
بقرعید	بکراتیار		
خلق اللہ	کھلک اللہ		

چند فقرے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

کہاں جا رہے ہو	کہاں تو جا رو ہے
بھاگنگل اچھا آدمی ہے	بھاگنگل بھلو مانس ہے
مویشی چرالا	ڈھوںدن نے گھرلالا

میواتی ادب

میواتی زبان بے حد دلچسپ ہے جس اعلیٰ ادبی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ شاعری میں رزمیہ، بزمیہ، رسمیہ، اور رومانی ادب موجود ہے جس کی مختلف اقسام ہیں۔ میواتی ادب کا زیادہ حصہ نظم میں ملتا ہے جس کی اقسام مندرجہ ذیل ہیں۔

دوہا میواتی شعر کی سب سے بڑی صنف ہے جس میں میواتی تہذیب، اخلاق، عادات اور عام معاشرتی واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔

برہیڑا رومانی شاعری (وصل) کی ایک قسم ہے۔

سہیڑا یہ بھی رومانی شاعری (فراق) کی قسم ہے۔

رتوائی بحر طویل کا گیت ہوتا ہے جس میں نازک تلمیحات و کنایات کے بزمیہ و عشقیہ چیزیں گائی جاتی ہیں

کبد کسی کی بڑائی و بزرگی بیان کرنے کے لئے گایا جاتا ہے۔

جس توصیفی اشعار کو کہا جاتا ہے۔

مجس ہجو کے اشعار کو کہتے ہیں۔

ڈھولا تک بندی، اور برجستہ گوئی کی صنف ہے۔

ہولی سماجی مسائل پر تک بندی کی جاتی ہے۔

بات طویل قصے و کہانیاں ہوتی ہیں۔

میواتی ادب کی تمام اصناف سینہ بسینہ چلی آتی ہیں۔ وہ آج تک کسی کتاب میں جمع نہ ہو سکی تاہم میراثی، نٹ، بھاٹ، اور کبیشر، لوگ ان چیزوں کو یاد رکھتے ہیں جو عرصہ دراز ہی سے میو قوم کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ میو قوم ان لوگوں کو ادبی شہ پاروں کے یاد رکھنے اور انھیں موقع بموقعہ سنانے پر بڑے انعامات سے نوازتی ہے۔ اس لئے یہ لوگ بھی کوشش کرتے ہیں اور قومی ادب اور روایات کو یاد رکھیں۔ اور انھیں موقعہ بموقعہ سنائیں۔

میواتی ادب کا گراں قدر حصہ قومی شاعر مہا کوی سعداللہ خاں آکیڑوی مرحوم کی مہابھارت ہے۔ جسے انھوں نے میواتی زبان میں قلم بند کیا ہے۔ یہ مہابھارت "پانڈوؤں کے کڑے" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کڑے میواتی میراثیوں کو زبانی یاد ہوتے ہیں۔ اور انھیں یہ وقتاً فوقتاً برادری کی پنچایتوں اور مجلسوں میں سناتے ہیں سعداللہ خاں مرحوم کی اس مہابھارت کو میواتی ادب میں شاہکار کا درجہ حاصل ہے جس سے میو قوم کے کیرکٹر اور اس کے رجحانات کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔

ذیل میں آپ مہابھارت کا ایک بند ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

مہابھارت کا ایک بند

سلہ لڑاں تہج بل سبل لب رین اندھیاری
سُو سُو ہاتھی بل مہابل وہ ہنکاری
چیکرے ٹنڈ بھج ڈنڈ پکھنڈ ن دیہہ بھرانوان
لات ٹھوکا گھونس سیس سو سینس پھوڑا نوآں

محل دولت نگر کا تھر ہر کمپت ھالے
جو کوئی جا گورین کو دائے بھیو بھونچال
تھر ہر کمپت ھال گراں جب ہوتے دھماکو
اٹھاں سنبھالاں پھیر کا وکو بالن با نکو
کیچک تھپکی مار پکڑ لیو بھینو پچھاڑو
اٹھو بھینوڑا کوپ کیس گہہ کیچک مارو
سعد اللہ دھن بھینوڑا کیچک مارو رین
چور جار مار بھلا جا سو ہوتے جگت میں چین

مہاکوی سعد اللہ خاں کی شاعری میں مناظر قدرت، فلسفیانہ موشگافیاں؛ اور باریک نکات بھی پائے جاتے ہیں۔

تحت الارض

دھرتی تل ہے جل، جل پہ مچھ براجے　　مچھ تلے پاکھان ملائک سر پہ ماجھے
چن ملائک پیٹھ باسک کی بیٹھو　　باسک کنڈلی مار پیٹھ باسک کی بیٹھو
کچھ تلے ہے جھگ، جھگ تل پون بھری ہے　　پون تلے اندھیار، سب بھار کھڑی ہے
جہاں تک حرپ قرآن کے ہوں تک بانچ سعد اللہ
آگے اگم اتھاہ ہے میرو جانت ہے اللہ

روزہ، نماز

پچھنیہ تو پانچ[1] کو ڈ لرٹی تیس[2] لڑی کی ہوتے
ان باتن نے ساد کے واپی سو لمنو ہوتے

جواہر سنگھ کی بات کا ایک بند

کا ٹر رنگ پلٹ سور ما بھراں ترارا
چڑھے برج پت کوپ نگر جا نمبوڑارا
اک برنا گھوڑا سجا ایک نبی سم سوتے
جا ملے جواہر سنگھ سو ہوتی سورج کی سی لوتے

پانچ پہاڑ کی بات کا ایک بند

پانچ پہاڑ کا راؤ جی تمھاری امر سدا گونبگ
کنوا بچھڑا دے الکھ کو نا ترست تڑپھیری سیج
سسر و بسے پہاڑ میں اور باپ بسے پالی
کنوا پوجوں الکھ کو میں تونا وں جاد لالی

پولس چوکی پر

ستم سو ظلم کہے شن میرا بھائی
چل کے توڑاں لینا کو پھر کد جنے کی نانی

رستم میو پوندلوت کی شخصیت

پونا لوت کا دیس کی گھاٹی عجب بنی
دگڑاں چالاں ٹھبکتا آوے رستم لیں جنی

دور اندیشی

الک بگلا اک گو تال میں نت آٹھ مچھی کھائے
ایک دن وائی تال میں سرپ رہو منڈلائے
سرپ رہو منڈلائے چوچ بگلا نے میلی
واکے بکرڑے با جو بنار گھٹ پنچ گیری سیلی
کہے گردھر کوی رائے سوچ یگ دھر پوا گلا
تیری ایسے گت نا ہوئے ہوتی گت جیسے بگلا

سچائی

ست سو، سمپت ہوئے ست سو، بیاپت کٹے ؛ ست سو سمپت ہوتے ست سو سے پنٹے
ست سو سمپت ہوئے کرے نردھن کو راجا ؛ ست سو سمپت ہوئے سراں جب منکے کا جا
ست لاکھوں ناپنٹ ہوا ست سو سمپت لین
سعد اللہ رہے ہی سمے پھیر گسیاں دین

میواتی ادب کی زیادہ اصناف شعر میں ملتی ہیں۔ جو عام طور پر حسب ذیل موضوعات پر ملتی ہیں۔ کہانی قصے، مذہبی گیت، تو ہاری گیت، رتو گیت، سماجی گیت، سیاسی گیت، معاشی گیت، پیدائش، چھٹی، مسلمانی بارات کے استقبال، بدھار، وداع، کنواں و چاک پوجن، بنوارہ، ہلدبان، بھات، سیہرا، نکاسی، رتنگا، جوا، احدحلو وغیرہ وغیرہ۔

میواتی ادب میں شعر کے علاوہ نثر بھی پایا جاتا ہے۔ جو قصہ اور کہانیوں کی شکل میں ہے۔ اسے میواتی کی اصطلاح میں "بات" کہتے ہیں۔ میراثی لوگ ان باتوں کو بڑی بڑی مجالس میں سناتے ہیں۔ یہ باتیں پرانے زمانے سے رائج ہیں۔ حسب ذیل باتیں مشہور ہیں۔

کنھیاجی کی بات، راجہ بھوج کی بات، راہو سالار کی بات، رستم سہراب کی بات، بکرماجیت کی بات، میراں حسین خنگ سوار کی بات، بین شہزادی کی بات، حاجی کی بات، جاہر کی بات، جگمال پنوار کی بات، چندر راول گوجری کی بات، شمس الدین پٹھان کی بات، دریا خاں کی بات، پانچ پہاڑ کی بات، شیر سنگھ رجپوت کی بات، الاکا تیر کی بات، جواہر سنگھ کی بات، راؤ مالبا کی بات، راؤ بہادر کی بات، راسینہ کی بات، کولانی کی بات،

---

[1] نماز پانچ وقت، [2] روزہ ۳۰ یوم

قرچھی میوناں کی بات، چودھری یٰسین کی بات، میواتی ادب میں پہیلیاں، کہاوت، اور مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔

پہیلیاں

سوال ہریاٹونڈی لال کمان ؛ تو بہ توبہ کرے پٹھان
جواب مرچ
سوال جنگل میں دیکھو ایک جناور، پیٹ میں پاؤں آنت ماں باہر
جواب تنبو۔
سوال راتو چلے دِن نو، چلے، چلے ایک ہی پینڈ
جواب کواڑ

کہاوت

اونچی دکان پھیکو پکوان ؛ آندھو بانٹے جیوڑی پیچھے بچھڑا کھائے
کھوکلو چنو باجے گھنو ؛ جا کی لاٹھی وا کی بھینس
جیسو دیس ویسو بھیس ؛ بارہ برس میں کوڑی کی بی بگدے

مثلات

میو کی اڑی اور پہاڑ کی چڑھی میو مرد جب جانیو جب تیجو ہو جائے
میو دھرتی کو دیو ؛ میو کبھو لے ناٹیو
دیکھو بھالو جگنا چیر وسید ہوتے۔

میواتی زبان اور اردو

نواح دتی میں چار بولیاں رائج ہیں۔
برج، ہریانی، میواتی، بانگرو،

دتی ان چاروں زبانوں کا مرکز ہے جمنا پار اور بلب گڑھ کی طرف برج کا زور ہے۔ رہتک کے ساتھ والی دتی میں ہریانی گوڑگانوہ ریواڑی میں بانگرو رائج ہے مگر دتی کے جنوب مشرقی حصے میں میواتی کا دباؤ ہے۔ دتی کے جنوب میں میوؤں کے گاؤں بھی ہیں یہ دتی کے کھنڈرات بھی یہاں مہرولی میں ہیں۔ مہرولی ہی سے میوات کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ مہرولی اننگ پال کے عہد میں تو میوؤں کی راجدھانی تھی۔ جو گڑھ دھامینہ کے نام سے مشہور تھی۔ دہلی میں میوؤں کا پورا عمل دخل تھا۔ مسلمان بادشاہوں سے یہ ہمیشہ لڑتے تھے۔ بنابریں دہلی میں میواتی زبان کے مکمل عمل دخل کا ہونا ایک قدرتی بات تھی اس لئے اردو زبان کی تعمیر و ترویج میں میواتی زبان کا پورا حصہ رہا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں دو مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں بجا فرماتے ہیں۔

میواتی یہ انور دہلی کے جنوب میں گوڑگانوہ میں بولی جاتی ہے۔ قدیم اردو کی ساخت پرداخت میں اس کا بھی حصہ رہا ہے حالانکہ اس پر تحقیق کم ہوئی ہے۔ کیونکہ ادبی اعتبار سے یہ بولی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ آگے فرماتے ہیں۔

میواتی ادبی نمونے ناپید ہیں۔ لوک گیتوں کے علاوہ کوئی قابل قدر چیز نہیں ملتی لیکن دہلی سماج کے نچلے طبقات میں میوات کے رہنے والے مسلم میوؤں کا قدیم زمانے سے اثر رہا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے بھی میوات کا علاقہ دہلی سے قریب ترین ہے۔ اسی لئے بعید از قیاس نہیں کہ قدیم اردو کا پنجابی پن نہ صرف اس کا ہریانی پن ہے۔ بلکہ میواتی پن بھی ہے۔
دہلی کے اصلی باشندے آج بھی جو زبان بولتے ہیں۔ اسے میواتی کا ترقی یافتہ روپ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کی زبان میں نہ تو ہریانی یا بانگرو کا کھردرا پن ہے۔ اور نہ برج کا رسیا پن۔ ایک درمیانی زبان ہے۔ جو گوڑگانوہ کی میواتی سے زیادہ قریب ہے۔ اس لئے یہ بات قطعی طور پر صحیح ہے۔ کہ دہلوی زبان کی تعمیر میں دوسری نواحی بولیوں کے مقابلہ میں میواتی کا زیادہ حصہ ہے۔ جو لوگ برج کو اردو زبان کا منبع بتانے پر مصر ہیں۔ مغالطہ کرتے ہیں۔ دہلوی زبان کی تعمیراتی بولیوں کی ترتیب اس طرح کی جا سکتی ہے۔
میواتی، برج، اور ہریانی،

سید مرغوب امین کاظمی امروہوی

نعت سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم

ایک ترا وجود ہے مطلعِ سرِّ کائنات
ایک ترا وجود ہے باعثِ نظمِ شش جہات

ایک ترے وجود سے دینِ حنیف کو ثبات
ایک ترے وجود سے مل گئی کفر سے نجات

ایک ترے وجود سے ذکر ہے لا الہ کا
لات وہبل ہیں سرنگوں سجدہ کناں ہے سومنات

ایک ترے وجود سے گلشنِ زیست میں بہار
اہلِ زمین ہو گئے واقفِ لذتِ حیات

نوعِ بشر کے واسطے تیرا نظامِ زندگی
امن وسکون کی فضا، شاہِ رہِ ترقیات

حُرمتِ سود میں نجات، فرض زکوٰۃ میں حیات
مان رہا ہے آج کا ماھرِ اقتصادیات

خالقِ کائنات ہی اصل میں حکمراں ہے بس
ہیچ ہیں سارے حکمراں، ہیچ تمام نظریات

بت کدہ ھائے رنگ وخوں توڑ کے ایک کر دیا
حد بیاں سے دور تر ہادیِ حق تری صفات

رہبرِ انس وجاں ہے تو، رحمتِ دو جہاں ہے تو
محرمِ لامکاں ہے تو، ختمِ رسل ہے تیری ذات

شورش کاشمیری

غریبِ شہر ہوں، لیکن بلند بام ہوں میں
حضورِ سرورِ کونین کا غلام ہوں میں

کسی حریف سے ڈوبنا مرا شعار نہیں
بپاسِ جادہ و منزل خجستہ گام ہوں میں

مرا سلام نئی پود کے جوانوں کو
حکیمِ شرق کا ان کے لئے پیام ہوں میں

دل و دماغ کو بطحا نے کر دیا مضبوط
محاذِ جنگ پہ شمشیرِ بے نیام ہوں میں

مرے رفیق مری لغزشیں معاف کریں
شریکِ حلقۂ رندانِ تیز گام ہوں میں

میں ایک روز مدینے ضرور جاؤں گا
بہ فیضِ سیّدِ کونین خوش مقام ہوں میں

کسی ذلیل قلم کار سے تعلق کیا!
خدا کا شکر ہے تلمیذِ بوالکلام ہوں میں

تمام عمر سلاسل سے واسطہ رکھا
یہی سبب ہے کہ محبوبِ خاص و عام ہوں میں

شہنشہوں سے تعلق نہیں مجھے شورش
خدا کا لطف و کرم ہے کہ نیک نام ہوں میں

قاری محمد اسحاق حافظ سہارن پوری مدیر نوائے وطن انبالہ

دعوئے عمل

رشکِ غنچہ، رشکِ گل، رشکِ چمن بن جایئے
ہو سکے تو فصلِ گل کا بانکپن بن جایئے

گلستانِ زندگی میں نور بھرنے کے لئے
خونِ دل یوں دیجئے رنگِ چمن بن جایئے

وقف خود کو کیجئے قوم و وطن کے واسطے
قوم کی روحِ رواں، جانِ وطن بن جایئے

اہلِ حق کے حق میں رہئے بن کے بوئے یاسمن
سینۂ باطل میں کانٹے کی چبھن بن جایئے

لشکرِ کفار جب آمادۂ یلغار ہو
غازئ شمشیر زن کا بانکپن بن جایئے

نعرۂ حق کیجئے پہلے فضاؤں میں بلند
شوق سے پھر زینتِ دار و رسن بن جایئے

ان بتانِ وقت کے سجدے گزارے ہیں بہت
وقت کو پہچانئے، اب بت شکن بن جایئے

محفلِ احباب میں رہئے ہمیشہ خندہ زن
نرغۂ اعدا اگر ہو، تیغ زن بن جایئے

حق پرستوں کی صفوں میں خود کو رکھئے پیش پیش
اور ہمت سے حریفِ اہرمن بن جایئے

محفلِ جاناں میں چلئے باندھ کر سر سے کفن
جان اپنی دے کے جانِ انجمن بن جایئے

کوہِ غم کی کیا حقیقت اہلِ دل کے سامنے
ہمتِ مرداں سے اٹھئے، کوہکن بن جایئے

صورتِ بیگانہ یوں رہنے سے آخر فائدہ؟
آج خود ہی کیوں نہ صدرِ انجمن بن جایئے

آپ کو حافظ اگر لیلائے مقصد سے ہے پیار
قیس بنئے، قیس کے دل کی لگن بن جایئے

اطہر نقوی

اُف یہ خونیں حادثہ

آہ از دُنیا نہاں شد آفتابِ نُورِ دیں / وا دریغا کُشتہ شد فیصل امیر المومنین
وہ زمیں پر سطوتِ اسلام کا نقشِ جمیل / وہ زمانے میں نشانِ عظمتِ دُنیا و دیں
آہ یہ ظلم و شقاوت، اُف یہ خونیں حادثہ / آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
اے حرم کے خادمِ قُدسی صفت اے شہریار / اشک افشاں ہے ترے غم میں حرم کی سرزمیں
تیرا ماتم کر رہے ہیں قُدس کے دیوار و بام / تھی جہاں بیتاب سجدے کے لئے تیری جبیں
ہائے اب دُنیا میں پائینگے کہاں تیرا مثیل / آہ اے سُلطانِ عادل اے اِمامُ المتقیں
اللہ اللہ عظمتِ کردار کی تیرے مثال / اپنے قاتل سے بھی نفرت کا کوئی جذبہ نہیں
اہلِ دل کے واسطے ہے مشعلِ راہِ وفا / تیرا کردار و عزیمت تیرا ایمان و یقیں
پختہ تدبیری کا تیری معترف عالم ہے آج / تجھ سے پائی ہے عرب نے عظمتِ دنیا و دیں
جنگِ رمضاں تیرے ایثار و تدبّر کی گواہ / تیل ہے تیری سیاست کی دلیلِ اوّلیں
اے خدا آگاہ رہبر تیری ہمّت کے طفیل / تھی جو رسوا کن ہزیمت بن گئی فتحِ مُبیں
یہ تری جہدِ مسلسل یہ تری سعیٔ بلیغ / اتحادِ عالمِ اسلام کی حبلُ المتیں
گھات میں تیری لگا تھا کب سے طاغوتی نظام / جس کے سدِّ راہ تھا تیرا وجودِ آہنیں
تجھ سے تازہ ہو گئی تھی دورِ فاروقی کی یاد / جرأت و تدبیر میں تو تھا عمرؓ کا جانشیں
بابِ فتنہ کھل گیا تھا عہدِ فاروقی کے بعد / مبتلائے آزمائش پھر نہ ملّت ہو کہیں
ملّتِ مظلوم کا حامی ہے تو ہی اے خدا / ہم کو فتنوں سے بچانا یا الٰہ العٰلمیں

مرتبہ - ضیاء مجاہد

نذرِ عقیدت — بارگاہِ حسینی میں

اگر وہ تمام آنسوؤں کو جمع کیے جائیں۔ جو ۶۱ھ سے لے کر اس وقت تک اس واقعہ جہاں سوز پر بہائے گئے ہیں۔ اگر وہ دردِ آہ و فغاں یکجا کیے جائیں جو ان تیرہ سو برسوں کی لاتعداد اسلامی نسلوں کی صداہائے ماتم کے ساتھ بلند ہوتے رہے ہیں۔ اگر درد و کرب کی وہ تمام چیخیں وہ تمام پکار۔ جوش و تپش کی بے قراریاں اکٹھا کی جاسکیں جو اس حادثہ کبریٰ کی یادیں لاکھوں کروڑ دل انسانوں کے اندر ہمیشہ پیدا ہوتی ہیں تو اے عزیزانِ ماتم شعار کون کہہ سکتا ہے کہ انسانوں کے خون فشانی ہائے حسرت کا نیا اٹلانٹک روئے زمین کے سطحِ ارض پر نہ بہہ جائے گا۔ درد آہ و فغاں کی نئی ہا بھٹیاں بھڑک نہ اٹھیں گی درد و الم کی چیخیں حسرت کی صدائیں۔ تڑپ کی بے چینیوں کے ہنگامہ خونیں سے تمام عالم ایک شور زار نالہ نہ بن جائے۔

(امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد)

امام ہمام علیہ السلام کی شہادت میں کیا تردد ہو سکتا ہے؟ یزید ان کے حق میں خلیفہ تھا نہ ان کا خروج اس کے خلاف ممنوع تھا۔ اور اگر وہ خلیفہ بھی تھا تو پھر بھی خروج ممنوع نہ تھا خروج بھی ممنوع نہ تھا تو عمل تو ممنوع نہ تھا۔ حاصل یہ کہ وجوہ ممانعت خروج تو موجود نہ تھیں اور موجبات جہاد موجود تھے حسن نیت امام میں کلام نہیں۔ پھر اگر وہ بھی شہید نہ تھے تو اور کون ہوگا۔

(حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی مؤسس دارالعلوم دیوبند)

سیدنا حسینؓ کی عزیمت و جرأت اور ہمت و شجاعتِ قلب کا سب سے بڑا ظہور اس واقعہ کربلا سے ہوا ہے کہ جس چیز کو وہ حق سمجھ چکے تھے اس پر جان دے دینی گوارہ کی مگر باطل کے آگے سر جھکانا گوارہ نہیں کیا۔ اور باوجود بے یاری و مددگاری کے یکہ و تنہا باطل کے مقابلہ میں آگئے اور شہادتِ عظمیٰ کے مقام پر جا پہنچے۔

(حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب، مدظلہ، مہتمم دارالعلوم دیوبند)

بلاؤں کی گھٹائیں جس قدر جھوم جھوم کر آتی تھیں حسینؓ کے چہرے کا رنگ اسی قدر سرخ ہوتا جاتا تھا۔ سب کچھ کھو کر بھی حسینؓ نے کچھ نہ کھویا تھا کیوں کہ ان کا دل ان کے بس میں تھا اور ان کا نفس ان کے اشاروں پر چل رہا تھا اور اپنی پوری توانائی کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف گامزن تھے۔

(ابو اسحٰق اسفرائینی)

حضرت حسینؓ ہی کا نمونہ ہے جو آج ایک مسلمان حکومت کے بگاڑ کے وقت مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے اگر اس نمونہ کو بھی بگاڑ دیا جائے تو نمونہ کہاں سے آئے گا۔ معاملہ رونے ہی نہیں کہ جگر گوشہ رسول کو قتل کر دیا گیا اور ہم نوحہ خوانی کے لئے بیٹھ جائیں بلکہ معاملہ نمونہ حاصل کرنا ہے اور وہ یہ کہ مسلمان حکومت بگڑ رہی ہے تو مسلمان کا کام تماشہ بین بن کر بیٹھنا نہیں ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ اصلاح کے لئے کھڑا ہو جائے۔ خواہ ابتلا ہی ہو اور خواہ نتیجہ کچھ بھی نکلے۔!

(مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

بیعتِ یزید نے آخر لمحہ تک حسینؓ کے نام پوچھے ہیں۔ ان کو ظلم سے بچنے کا موقع میسر تھا مگر ان کو اسلام کا جوہر دکھانا تھا جس کی چمک آج کی دنیا کو خیرہ کر رہی ہے مسلم اور غیر مسلم ہندوستان اور یورپ غرض دنیا بھر میں وہی نام جپ کر اور وہی کام کر کے کامیاب ہو رہا ہے وقتِ پیغمبر و سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس فضیلت کے اظہار کا موقع نہ دیا۔ اس لئے یہ بینا حسین ابن علیؓ نے کربلا کے میدان میں رکھ کر ایسا نمونہ پیش کر دیا جس کو دنیا ہمیشہ سر آنکھوں پر رکھے گی۔

(حضرت مصورِ غم علامہ راشد الخیری)

عاشورۂ محرم آگیا۔ آج ہی کے دن تقریباً چودہ صدیاں ہوئیں عراق میں دریائے فرات کے کنارے شجاع ابن شجاع حسین ابن علی مرتضیٰ علیہ السلام نے اپنے سے بیسوں بلکہ سینکڑوں گنی زیادہ فوج سے مردانہ وار مقابلہ کر کے دکھا دیا تھا کہ حق نے باطل کے مقابلہ میں قلت و کثرت کی پرواہ نہیں کی اور نہ انجام کا خوف دلوں میں دہشت پیدا کرتا ہے۔ ایک مسلمان بادشاہ نے خلافِ حق جبراً اپنی اطاعت کرانی چاہی۔ رسولؐ کے لختِ جگر نے جان دے دی لیکن ہاتھ نہ دیا سر دے دیا بات نہ جانے دی۔ جان ہار دی لیکن آخری سانس تک فاسق کو فاسق ہی کہتے رہے۔

(حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ)

آج مسلمانوں کی قوت ایمانی کا بھی امتحان ہے اور فراست کا بھی قوتِ فیصلہ کا بھی امتحان ہے اور زندگی کی صلاحیتوں کا بھی ہم کو ثابت کرنا ہے کہ ہم ایمان کے ساتھ زندہ رہنے کے اہل ہیں یا نہیں آج انسانی زندگی کے ہر موڑ پر پیش آنے والی صورتوں میں امام حسینؓ کا ایثار و قربانی حلِ مشکلات ثابت ہو سکتا ہے۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی)

سید کائنات فخرِ موجودات جناب محمد مصطفےٰ کے چھوٹے نواسے جناب امام حسینؓ شہیدِ میدان کربلا، ذبیحِ دشت نینوا نے جس سطوت و صولت اور جرأت و ہمت کے ساتھ شہادت کا نمونہ

کفن زیب تن فرمایا ہے اس کی نظیر پیش کرنے سے دنیا کی تاریخ عاجز ہے ۔

(علامہ سید اختر علی تلہری)

معرکہ کربلا ہر اس قوم کے لئے راہِ ہدایت ہے جو جبر و ظلم کا شکار ہوئی حسین ابن علی اور ان کے ساتھیوں نے اسلام کے لئے جو قربانیاں دیں اس کی مثال انسانیت کی ساری تاریخ میں نہیں ملتی ۔ اگر ہو تو زمیں اسلام پہ قائم رہیں تو حسنؑ اور حسینؑ جیسے بچے ان کی گود میں کھیلا کریں گے ۔

(افضل العلماء مولانا سید عبدالوہاب بخاری) ناظم دائرۃ المعارف عثمانیہ

حضرت امام کے ساتھی ایک ایک کر کے راہیٔ جنت ہوئے ۔ اب امام حسینؑ کی کی نہ تھی جس طرف بھی آپ کی تلوار چمکتی دشمنوں کے بادل چھٹے چلے جاتے ۔ آخر آپ نڈھال ہو کر زمین پر بیٹھ گئے اور بڑی دیر تک خاموش بیٹھے رہے ۔ مگر دشمنوں کو اس شیر پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی ۔ آپ کے خون سے اپنی قسمت پر شقاوت کی آخری مہر لگانے سے ہر شخص گریز کرتا تھا ۔

(قاضی زین العابدین میرٹھی رفیق ندوۃ المصنفین)

شروع سے یزید نے طے کر لیا تھا کہ بیعت نہ کرنے کی صورت میں امام حسینؑ کی زندگی کا خاتمہ ہونا چاہیئے جس کی تعمیل ولید نہ کر سکا اس سے معتوب ہوا اور ابن زیاد نے اس کی تعمیل کر دی اور اس لئے اس کے رسوخ اور اثر میں اس کے بعد اضافہ ہو گیا ۔

(سید العلماء الحاج مولانا السید علی نقوی النقوی)

حسینؑ رسول کے نواسے حسینؑ سیارہ کے لختِ جگر حسینؑ مولا علیؑ کے نور نظر حسینؑ جو محافظ دین حق تھے عزم کے پیر و دکار بن کر میدان میں آ گئے ۔ یزیدی بدکرداریوں کو للکارا مظلومیت کے ہاتھوں ستم ظالم کا پنجہ مروڑ دیا اور کردار کی ٹھوکروں سے بدکرداریوں کی قبر کھود ڈالی جن کے ہاتھوں باطل کو شکست فاش دی جو رہتی دنیا تک تاریخ کا زریں باب رہے گی ۔

مولانا سید شرافت حسین کاظمی ایم اے (ممتاز الافاضل)

۲۸ رجب ۶۰ھ کو مدینہ سے چلتے ہوئے حسینؑ نے اپنا مقصد بیان کیا تھا کہ تم میرا سر کاٹ سکتے ہو جھکا نہیں سکتے ۔ حسینؑ مقصد میں کامیاب ہو گئے ۔ حسین کا سر جھک نہ سکا ۔ یزید ناکام رہا ۔ شکست اسی کی ہوتی ہے ۔ جو مقصد میں کامیاب ہوتا ہے ۔

(الحاج مولانا سید رضا آغا مدظلہ)

اگر میدانِ کربلا میں امام حسینؑ ان قربانیوں کو اسلام کی حفاظت کے لئے پیش نہ کرتے تو اسلام بچ نہ سکتا تھا ۔ اسلام کی سانس اکھڑ چکی تھی ۔ ماتھے پہ موت کا پسینہ آچکا تھا نبض ڈوب چکی تھی ۔ ایک اسلام کی موت کا یقین ہو چلا تھا کہ اس اثنا میں حق کا فدائی رسول کا فرزند علیؑ کا جانشین سید الشہداء آگے بڑھا اور اسلام کے تن مردہ میں اپنی جان دے کر جان ڈال دی ۔

(مولانا سید محمد ضیاء الدین شمسی طہرانی) ایم اے ایل ایل بی علیگڑھ

ہندو اور بودھی صنمیات میں بعض تمثیلی قصے دیکھنے کو ملتے ہیں جہاں دیوی ، دیوتاؤں کے امتحان لئے گئے کبھی وہ ان امتحانوں میں کامیاب رہے ۔ انھیں بہتر درجے ملے اور کبھی ناکام رہے اپنے مدارج سے قرار دیئے گئے لیکن تاریخ میں اس سے کہیں شاندار مثال امام حسینؑ کی زندگی پیش کرتی ہے اس کا جواب کہیں اور نظر نہیں آتا ۔

(پروفیسر سید احتشام حسین صاحب مدظلہ)

حضرت حسینؑ اور ان کے ساتھی امت مسلمہ کو حق و صداقت عزم و استقلال اور ایثار و قربانی کا ہی سبق نہیں دے گئے بلکہ قیامت تک کے لئے یہ نظیر پیش کر گئے کہ نا انصاف حدود اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پامال کرنے والی خلق خدا کو اپنی ظالمانہ کارروائیوں کا نشانہ بنانے والی اور محرماتِ الٰہی کو روا کرنے والی حکومت کے خلاف آواز بلند کرنا مسلمان کا فریضہ ہے ۔

(شاہ معین الدین ندوی)

حضرت امام مظلوم حقیقی معنوں میں رہنمائے جمہور تھے ۔ انھیں کسی قیمت پر بھی یہ گوارا نہ تھا کہ جس ملک کو توحید رسالت کے لاکھوں فدائیان جانباز نے قائم کیا ہے وہ کسی ایک خاندان کی ذاتی میراث بن جائے ۔ آپ کے نزدیک وہی حکومت قابلِ قبول تھی جو عوام کی آزادرائے سے عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ عوام کے فائدے کے لئے قائم کی جائے ۔

(جناب سید اصغر مہدی رضوی)

تاریخ عالم نے آج تک قتل و خونریزی کے جتنے واقعات درج کئے ہیں اور حزن و ملال کی جتنی داستانیں اپنے اپنے سینوں میں محفوظ کی ہیں ان میں سے کسی کا بھی پایہ اتنا بلند نہیں جتنا کہ داستان کرب و بلا کا ہے ۔

(سید فضل الرحمٰن جعفری)

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

فکرمندی

فکرمندی ایک عام انسانی جذبہ ہے۔ اس کا احساس وقتاً فوقتاً سب ہی صحیح الدماغ لوگوں کو ہوتا ہے لیکن جب کسی شخص میں احساس فکر ضرورت سے زیادہ پیدا ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں وہ ABNORMAL کہلاتا ہے دراصل احساس فکر متضاد جذبات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جب ہم اپنے بیمار بچے کے لئے فکرمند نظر آتے ہیں تو ہم بیک وقت خوف اور امید کے جذبات سے مغلوب ہوتے ہیں۔ بچے کی موت یا تکلیف کا خوف اور اس کی صحت یابی اور آرام کی اُمید ہمارے دل میں انتشار پھیلا دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ سوائے فکر کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح مریضانہ فکرمندی بھی متضاد جذبات سے وجود میں آتی ہے۔ بہر نوع یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ کسی چیز کی تکلیف اور شدائد کی فضا میں پرورش پاتا ہے اُلجھا ہوا ڈر۔

مریضانہ فکرمند آدمی یا تو یہ بات جانتا ہی نہیں یا پوری طور پر جانتا ہے کہ وہ کس لئے فکرمند ہے۔ لیکن وہ یہ بات نہیں سمجھ سکتا کہ آخر وہ کس کے لئے فکرمند رہتا ہے۔ جب ہم جذبہ کے تجرباتی مرحلہ سے گذرتے ہیں تو ہمیں عام طور پر چند خاص جسمانی اذیت اور نااہلیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اگر کوئی شخص ظاہری طور پر دماغی فکرمندی میں مبتلا ہو یا داخلی انتشار کا شکار ہو تو اسے علاج کی ضرورت ہے۔ وہ اکثر ہی مغموم قنوطی اور کبھی کبھی مریض دکھائی دے گا لیکن اس کا علاج اسی وقت ہو سکتا ہے جب فکرمندی کی بنیادی وجہ معلوم ہو جائے یعنی ان متضاد جذبات کا علم ہو جائے جو منظم نہیں ہو پاتے۔ اگر اسکا ذہنی انتشار دور کر دیا جائے تو ایسی صورت میں مریض بغیر کسی دشواری کے زندگی کو سنوار لے گا اور میدان عمل میں بڑی حد تک تسلی بخش کام کرنے کے لائق ہو جائے گا۔ اکثر (ORIGINAL CONFLICT) کسی خاص حادثہ کا نتیجہ ہوتی ہے اور حادثات کا تسلسل آدمی کو مریضانہ فکرمندی کا مریض بنا دیتا ہے۔ مریض کی زندگی وبال جان ہو جاتی ہے وہ سماجی معاشی اور معاشرتی پابندیوں اور ذمہ داریوں کو نہیں سنبھال سکتا۔ اس پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ بے شک یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ بعض آدمی دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ مریضانہ فکر کے شکار نہیں ہوتے۔ اور وہ کسی نہ کسی طرح سماجی و معاشی ذمہ داریوں کا احساس کر کے اسے سرانجام دیتے ہیں مگر وہ مسلسل انتشار اور فکر کی وجہ سے (ABNORMAL) ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ حالت انھیں بالکل (UPSET) نہیں کرتی مگر فنی طور پر یہ لوگ ..... (NEUROTIC) کہلاتے ہیں۔

جوان آدمی کی زندگی کا بالکل ابتدائی حادثہ ہی مریضانہ فکرمندی کے کیس میں اہمیت رکھتا ہے لیکن عام شہریوں کے زیادہ تر (CASES) ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق انکے بچپن کے بنیادی حالات ماحول اور معاشرہ سے ہوتا ہے۔ بچپن کے ابتدائی زمانے کے حالات اس قسم کے معاملات میں بہت زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ والدین اور بچے کے نامساعد تعلقات اصولی طور پر جدوجہد کو پیدا کرتے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کیلئے ہمیں بالکل ابتدائی دماغی عمل (MENTAL PROCESS) اور ان (CONFLICT) پر غور کرنا چاہیے جو انسانی جبلت اور معاشرتی ضروریات کے مابین نبرد آزما ہوتی ہیں۔ اگر بچہ (EGOIST) ہے اور وہ براہ راست اپنے جبلی تقاضوں کی آسودگی اور تکمیل چاہتا ہے اُسکے ساتھ اُسے تحفظ کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے خصوصاً اُسے ایسے تحفظ کی ضرورت ہو گی جس میں پیار و محبت بھی شامل ہو۔ پیار و محبت کے حصول کے لئے اسے اپنے گرد و پیش کے لوگوں کا دست نگر ہونا پڑے گا۔ اگر اسے اس قسم کا تحفظ مل جاتا ہے تو وہ ٹھیک ایسا ہی کرے گا جیسا کہ اسکی ماں کہے گی۔ اگر وہ براہ راست اپنی جبلتوں کی آسودگی چاہتا ہے تو اکثر وہ ایسے کام کرتے ہوئے دیکھا جائے گا جسکی اجازت اس کی ماں نے نہیں دی ہو گی۔ یہاں (CONFLICT) شروع ہوتی ہے اور قابل لحاظ بھی۔ بچے کی زندگی میں یہ ایک ایسا مرحلہ ہوتا ہے جہاں سے وہ بغیر مریضانہ فکرمندی کے جوانی کی منزل کی طرف گامزن ہوتے ہیں۔ اور بعض بچے اسی مرحلے سے مریضانہ فکرمند اور قنوطی بنکے رہ جاتے ہیں۔

اگر کوئی بچہ ابتدائی عمر میں جسمانی تحفظ اور جذباتی سکون سے محفوظ ہوتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اپنے مستقبل میں متحمل اور مستقل مزاج ہو گا۔ اسکی روش استقلال اور تحمل کی علامت ہے اگر بچہ کو اس کی روش سے ہٹانے کی کوشش کی گئی تو یہ بات ایک زبردست مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہو گی۔ اگر اسمیں تحفظ کی یہ بنیاد ہی نہ ہو تو جلد ہی وہ ایک ایسا ذہنی وسیلہ حاصل کرے گا جو برائیوں اور مشکلات پر ہی غور کرنے کا عادی بنا سکتا ہے۔ یہ راستہ اُسے فکرمندی کی طرف لے جائے گا۔ ایکطرف اسے اسکول جانے کی فکر ستائے گی۔ دوسری طرف گھر کی محبت ستائے گی ایک طرف وہ دوستوں اور مہربانوں کی محبت کا متلاشی ہو گا۔ دوسری طرف والدین کی محبت کا۔ نتیجہ کے طور پر وہ دوسروں پر دارومدار رکھے گا اور اپنی صلاحیتوں کو کام میں نہیں لائے گا۔ جب وہ جنسی تقاضوں کو پورا کرنے کی عمر تک پہنچے گا، اُسے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ جنسی تعلقات کی تنظیم نہیں کر سکیگا۔ وہ اکثر فکرمند رہے گا۔ وہ کیا کرے کیا نہ کرے؟ وہ ٹھیک طور پر کوئی کام انجام دے سکتا ہے یا نہیں؟ وہ جو کچھ سوچتا ہے صحیح بھی ہو گا یا نہیں؟ وہ متضاد خیالات اور احساسات کا شکار ہو جائے گا۔ اور یہ کیفیت اُسے مریضانہ فکرمندی کی طرف لے جا سکتی ہے۔!

ہر وقت فکرمند رہنا بہرحال ایک مرض ہے اور جب تک یہ مرض ہے انسان ترقی نہیں کر سکتا۔

طبیات

متعدی امراض

امراض کی چھوت سے بچنا اور ان سے شفایاب ہو جانا دواؤں سے کہیں زیادہ جسمانی خلیوں کی قوت مقابلہ پر منحصر ہے اور یہ قوت صرف اسی وقت قائم رہ سکتی ہے جب کہ جسم کو زمانہ صحت میں بھی اور زمانہ علالت میں بھی صحیح تغذیہ حاصل ہو لیکن افسوس ہے کہ دوران علاج میں ہم غذاؤں کے ذریعہ سے مریض کی قوت مدافعت بڑھانے کے بجائے زیادہ کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ حملہ آور مرض کو دواؤں کی بمباری سے بھگا دیا جائے۔ حالانکہ دوائیں اگر استعمال کرائی جائیں تو ان کا مقصد صرف اتنا ہونا چاہیئے کہ جسمانی خلیوں کے وہ موانع دور ہو جائیں جن کی وجہ سے وہ اپنے اصل فعل تغذیہ کو پوری طرح انجام نہیں دے سکتے اس کے بعد قوت مدافعت بروئے کار آکر مرض کو خود ہی رفع کر دے گی۔ قدرت نے ہر چیز کو قوت مدافعت عطا کی ہے اور مخلوقات قدرت میں ہر مخلوق اپنی اسی قوت سے کام لے موجودہ طب میں نظریہ جراثیم کو بہت اہمیت حاصل ہے اور ہم جراثیم کی ہلاکت کے نئے نئے وسائل سوچنے کے لئے اپنا سارا نعدماغ صرف کرتے رہتے ہیں لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ طفیلئے (PARASITES) ان کیمیائی مرکبات کا مقابلہ کرنے کے لئے جو ان کے خلاف تیار کئے جائیں اپنی قوت کو بڑھانے کی قدرت رکھتے ہیں اور اس طرح امراض کی چھوت سے مکمل نجات حاصل کرنے کا سوال بہت کچھ غور طلب بن گیا ہے۔

ملیریا کا طفیلی کچھ عرصہ کے بعد کونین کے اثرات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے لگتا ہے سوزاک کے جراثیم بھی مخالف دواؤں کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی قوت مدافعت کو بڑھاتے ہیں ایسی حالت میں جب کہ ہمارے وہ دشمن جنھیں ہم دن رات تباہ کرنے کی فکر میں رہتے ہیں قوت مدافعت کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں حیف ہے کہ ہم اشرف المخلوقات ہو کر اس اہم ترین چیز کو نظر انداز کر دیں۔

علاج کا اصل مقصد حملہ مرض کے بعد جسم پر دواؤں کی مدد سے جوابی حملہ کرنا نہیں بلکہ یہ ہونا چاہیئے کہ جسم کے قدرتی مورچوں کو مستحکم تر بنا کر دشمن کا حملہ غیر ممکن بنا دیا جائے اور یہ مقصد صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ہم صحیح تغذیہ کی اہمیت کو خوب سمجھ لیں۔ غذا سے جسم کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور امراض کی چھوت کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کی قوت بڑھتی ہے اس حالت میں ہر طبیب کے لئے اساسی تغذیہ کی اہمیت کو سمجھنا بہت ضروری اور بیش قیمت ہے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اساسی تغذیہ کیا ہے جو مرض کی چھوت کو انسان سے دور رکھ سکے اور اپنے زوائد کے ساتھ قوت مقابلہ کو بڑھا سکے۔

دوران مرض میں تغذیہ

عام طور پر مریض کے لئے جو غذا تجویز کی جاتی ہے وہ اس کے مرض سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غذا کے ذریعہ سے طفیلیوں کو نہیں بلکہ خود مریض کو بیمار پڑنے کی سزا دی جا رہی ہے میں آج تک اس "طبی فلسفہ" کو نہ سمجھ سکا اور بار بار اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ بدنصیب مریض کے لئے کیا ایسی کوئی غذا تجویز نہیں کی جا سکتی جو مقابلتاً خوش گوار بھی ہو اور جس سے اس کا مرض بھی بڑھنے نہ پائے۔ ہمارے معالجین کا عام اصول یہ ہے کہ بخار کو بھوکا مارنا چاہیئے لیکن میرے خیال میں یہ طریقہ علاج بالکل خلاف عقل ہے کیوں کہ ہمارا جسم کسی بیماری کی چھوت کا کامیاب مقابلہ صرف اسی صورت سے کر سکتا ہے کہ اسے کافی غذا ملے اس میں کوئی شک نہیں بعض شدید مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب مریض کو مہلک پیچیدگیوں سے بچانے کے لئے اس کی غذا عارضی طور پر بند کر دی جاتی ہے اعضاء انہضام و اخراج کی بدنظمیوں کی صورت میں غذا کے چند اجزاء کا بند کر دیا جانا بھی ضروری ہو جاتا ہے لیکن ان ہنگامی پیچیدگیوں کے دور ہوتے ہی بغیر کسی تاخیر کے مریض کی معمولی غذا جاری کر دینی چاہیئے کیوں کہ یہ غذا بند رہنے سے انسجہ کے پروٹین صرف ہوتے ہیں اور قوت مدافعت بہت کمزور ہو جاتی ہے ٹائیفائڈ کے مریض افاقہ کے زمانہ میں جو ہڈیوں کی مالا نظر آتے ہیں اس موجودہ طریقہ علاج کو شرم و ندامت سے سر جھکا لینا چاہیئے۔ اس طرح جو لاغری پیدا کی جاتی ہے اس کا مقصد قوت قلب و عضلات امعاء کو کمزور کرنا ہوتا ہے تاکہ نزف و ثقب Perforation کو روکنے میں مدد ملے۔ ان مریضوں کو سفینۂ حیات کو ٹائیفائڈ کی متلاطم لہروں میں غرق ہونے سے بچایا ضرور گیا ہے مگر اس طرح کہ ان کے غدود اور انسجہ بالکل بے کار ہو چکے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ہمیں مناسب غذاؤں کے چپو سے ان کشتیوں کو ساحل صحت تک کھینے کا سلیقہ ہوتا تو مریض ہڈیوں کی مالا کبھی نہ بنتے۔

متعدی امراض کے سلسلہ میں اعلیٰ حراری (کلورک) غذا کے متعلق مزید تحقیقات کی بہت ضرورت ہے مقابلہ امراض کیلئے تغذیۂ انسجہ کی ضرورت: جس طرح بعض امراض میں مریض کی غذا کم یا بند کر دی جاتی ہے اسی طرح بعض حالات ایسے بھی ہیں جب مریض کو معمولی مقدار سے زیادہ غذا کھلانے کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً ذیابطیس جب کہ اس میں متعفن پیچیدگیوں کی صورت پیدا ہو جائے عفونت اس کے مقابلہ کے لئے شاید فاجوسی Phagocyte کی کوشش چاہتی ہے لیکن ساختیں اس وقت تک پوری طرح غذا کا قاعدہ قبول نہیں کر سکتیں جب تک کہ بعض

کے اخراج میں مدد ملتی رہے اور اس مقصد کے لیے مریض کو انسولین استعمال کرائی جاتی ہے جب اس طریقہ سے خلیاتی تحول کا سلسلہ دوبارہ قائم ہو جاتا ہے تو عفونت کو بغیر کسی خاص دشواری کے مغلوب کیا جا سکتا ہے اسی طریقہ علاج کا لُبِّ لباب خلیوں کے فعل کو از سرِ نو بحال کرنا ہے اور اس میں فاضی طاقت ترغیبی تغذیہ کا نتیجہ ہوتی ہے ذیابیطس کے مریضوں کو انسولین صرف اسی لئے استعمال کرائی جاتی ہے کہ عمل تحول بیدار ہو اور دفاعی قوت جو خون کی سمیت اور فاقہ کشی سے مغلوب ہو رہی تھی دوبارہ بروئے کار آ جائے بد قسمتی سے بعض اطبا اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور غلطی سے سمجھتے ہیں کہ ذیابیطس کے مریض کو خلیوں کے مؤثر تغذیہ سے نہیں بلکہ براہ راست انسولین کے استعمال سے فائدہ ہوا۔ پیشاب میں محض شکر کی مقدار کم ہو جانے سے مریض کو تسکین نہیں ہوتی بلکہ یہ صورت اس وقت ممکن ہوتی ہے جب مریض اس اساسی غذا کو جو جسم کی قوتِ مقابلہ بڑھانے کے لئے ضروری ہے آسانی سے ہضم کرنے لگے۔ میں اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مریض کو چاہے کتنی ہی تیز دوائیں کیوں نہ استعمال کرائی جائیں لیکن اس کا نظام جسمانی مرض کو اس وقت تک مغلوب نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے صحیح تغذیہ کا خیال نہ رکھا جائے ضرورت ہے کہ ماہرین طب اس اہم مسئلہ کی جانب فوری توجہ مبذول کریں۔

اساسی تغذیہ

اساسی تغذیہ سے میری مراد وہ تغذیہ ہے جس کی انسان کو چوبیس گھنٹے تک اپنے وزن کو اتلاف سے بچانے کے لئے ضرورت ہو۔ یہ غذا کی وہ اقل ترین مقدار ہے جو جسم کو زندہ رکھنے اور اسے خوردبینی جراثیم کے حملوں سے بچانے کے لئے ناگزیر ہے۔ زمانۂ مرض میں بھی جہاں تک ممکن ہو سکے یہ مقدار کم قائم رکھنی چاہئے اگر ہم بعض ناگزیر حالات کی بنا پر مریض کی اساسی غذا کم کرنے پر مجبور بھی ہو جائیں تو ہنگامی پیچیدگیاں رفع ہوتے ہی اسے فوراً جاری کر دینا چاہئے۔ اگر مریض کے صحیح تغذیہ کا خیال نہ رکھا جائے گا تو اسے کسی دوا سے کبھی فائدہ نہ ہوگا اور چونکہ وہ بھوکے رہنے کی حالت میں اپنی ساختوں کے ذرائع استعمال کرنے پر مجبور ہوگا اس لئے اس کی قوتِ مدافعت ضعیف ہوتی جائے گی اور مرض کی چھوت اسے با آسانی مغلوب کر لے گی۔

ہر شخص کے لئے اساسی غذا کا تعین صحیح طور پر کرنا چاہئے۔ اس کا اندازہ کلوریوں کی اصطلاح میں اقل ترین غذا کی اس انرجی کی قدر و قیمت سے کیا جاتا ہے جس کی انسان کو چوبیس گھنٹوں کے لئے ضرورت ہو اور جس کی وجہ سے اس کے طبعی وزن میں کوئی فرق نہ پڑنے پائے ایک نحیف الجثہ شخص کے مقابلہ میں بھاری جسم کے ایک آدمی کو قدرتی طور پر زیادہ غذا کی ضرورت ہوگی اسی طرح جو شخص کسی بیماری کے حملہ سے سوکھ گیا ہو اس کا موجودہ وزن طبعی وزن سے لازمی طور پر بہت کم ہوگا اس حالت میں اساسی تغذیہ کا تخمینہ کرتے وقت ہمیں حملۂ مرض سے پہلے کے صحیح وزن کو پیش نظر رکھنا چاہئے ایک شخص جس کا وزن حالت صحت میں ۱۲۵ پونڈ تھا ممکن ہے کہ بیماری سے گھل کر اسی یا نوے پونڈ وزن رہ گیا ہو۔ اس کے لئے اساسی غذا کا تخمینہ موجودہ اسی یا نوے پونڈ سے نہیں بلکہ اصلی وزن یعنی ۱۲۵ پونڈ سے کیا جائے گا اور اس کے دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ۱۵۰۰ - ۱۲ × ۱۲۵ کلوریوں کی ضرورت ہوگی (تجربات سے ایک پونڈ وزن کے لئے ۱۲ کلوریاں کافی ہوتی ہیں۔)

امراض میں تغذیہ مرض کے تین حالات ہیں۔

(۱) حادہ (ایکیوٹ) ۲۔ مزمن (کرونک) اور ۳۔ زمانۂ افاقہ۔

(۱) **امراضِ حادہ**: مثلاً بخار وغیرہ میں سمیتِ خون سے فعل استحالہ کچھ عرصہ کے لئے معطل یا مختل ہو جاتا ہے ہاضمہ انجذاب اور اخراج کے افعال بھی صحیح حالت پر قائم نہیں رہتے ہاضم رطوبتوں کی کمی، بیماری کی چھوت سے سمیت کی افزائش اور غیر منہضم شدہ اجزاءِ غذا کے سڑنے سے اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ معمولی غذا سے اعضائے انہضام میں کہیں التہابی کیفیت پیدا نہ ہو جائے ساتھ ہی چونکہ فعل اخراج بھی درست نہیں رہتا ہے، اس لیے مریض کی قوتِ مدافعت کو بڑھانے کے لئے اس قسم کی سیال غذائیں دی جائیں جو با آسانی جزو بدن ہو جائیں اور اعضائے ہاضمہ پر زیادہ بار نہ پڑے ایک یا دو پائنٹ پانی میں آٹھ اونس تک گلوکوز ایک سنترے کا رس ملا کر مریض کو دن بھر میں پلا دینا بہت مفید ہے۔ سمیاتِ خون کو بے اثر کرنے کے لئے ملکے مشروبات قلویہ پلانے چاہئیں۔ آش جو اور کونجی کا استعمال بھی فوائد سے خالی نہیں۔ بہت سے مریض شدید بخار کی حالت میں دودھ ہضم نہیں کر سکتے۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ دودھ کو سیال ہونے کے باوجود ٹھوس غذاؤں کی فہرست میں شامل سمجھا جائے۔ اگر مریض پر بے ہوشی طاری ہو اور وہ منہ سے غذا نہ کھا سکے تو اس کی قوتِ مدافعت کو برقرار رکھنے کے لئے مقعد یا کسی شریان کے ذریعہ سے گلوکوز کو مریض کے جسم میں داخل کرنا چاہئے۔

امراض حادہ میں اساسی تغذیہ کے باوجود مریض کسی نہ کسی قدر لاغر ضرور ہوتا ہے کیونکہ ہم نے بطور مثال جس مریض کا اصلی طبعی وزن ۱۲۵ پونڈ متصور کیا ہے اسے ڈیڑھ ہزار کلوریوں کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اگر اسے دن رات آٹھ اونس گلوکوز پلا دیا جائے تو صرف نو سو کلوریاں حاصل ہوں گی (ایک اونس گلوکوز کی انرجی ویلیو ۱۱۶ کلوریوں کے قریب ہوتی ہے) اور آش جو وغیرہ کے استعمال سے چند کلوریوں کا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا مریض کو غیر ضروری کمزوری سے بچانے کے لئے اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے کہ امراض کی شدت کم ہوتے ہی اس کی خوراک میں اضافہ کر دیا جائے۔

(۲) **امراضِ مزمن**: ان امراض میں غذا کا سوال بہت ہی احتیاط طلب ہے۔ اگر ہماری بے احتیاطی سے ہاضمہ انجذاب یا اخراج کے کسی عضو میں کوئی سخت نقصان پہنچ جائے تو اس کی تلافی تمام عمر نہیں ہو سکتی۔ ان میں غذا کا تعین علامات مرض کے پیش نظر کرنا چاہئے۔

(۳) **زمانۂ افاقہ**: اس زمانہ میں سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ جسم کے ضائع شدہ پروٹینوں کو پوری احتیاط سے از سرِ نو فراہم کیا جائے کیونکہ امراض حادہ میں اساسی غذا کی پوری پابندی کے باوجود جسم میں پروٹینوں کے ذخیرہ کی کافی مقدار تلف ہو جاتی ہے۔ زمانۂ افاقہ میں مریض کے لئے انڈے، مچھلی، دودھ اور گوشت کا استعمال زیادہ مفید ہے۔ کیونکہ ان کے پروٹین حیاتی اعتبار سے عمدہ اور مقابلتاً زود ہضم ہوتے ہیں اگر ایک شخص کو زمانہ صحت میں روزانہ ستر گرام پروٹینوں کی ضرورت ہوتی ہو تو زمانۂ افاقہ میں اسے اگر ہم تک پروٹینز دینے چاہئیں بشرطیکہ وہ آسانی سے ہضم کر سکے۔ اس کے لیے محض آشِ جو کا استعمال کافی نہیں ہے۔

جو لوگ حملۂ مرض کے رفع ہوتے ہی کام کاج شروع کر دیتے ہیں ان کے لئے بھی غذا کا سوال خاص طور پر غور طلب ہے، جو لوگ زیادہ تر بیٹھ کر کام کرتے ہیں ان کے لئے وزن طبعی کے اعتبار سے فی پونڈ سو کلوریاں کافی ہوتی ہیں۔ لیکن جو لوگ جسمانی مشقت کرتے ہوں ان کے لئے فی پونڈ

۔کلوریوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔

قیامِ صحت کے لئے معیاری غذا

اگر نظر غور سے دیکھا تو معلوم ہوگا کہ صحت کے خراب ہونے کا راز غذا کی بے احتیاطی کثرت یا قلت میں پوشیدہ ہے ۔ اگر کوئی شخص غذا ضرورت سے زیادہ کھاتے تو اعضاء کو اپنی قوت برداشت سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے ۔ قلتِ غذا کی صورت میں انسجہ نشو و نما سے محروم رہتے ہیں ۔ اس طرح جسم کی قوت مقابلہ کمزور ہو جاتی ہے ۔ مختلف امراض کے لئے حملہ کا دروازہ کھل جاتا ہے ہمیں یہ قاعدہ کلیہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ تغذیہ کی کثرت زہر ہے اور قلت بیماریوں کی جڑ ہے ۔ اس لئے صحت کے لئے علمائے عام جس طرح بیماری کی حالت میں پوری احتیاط کے ساتھ اساسی غذا کے انتخاب کی ضرورت ہے اسی طرح زمانہ صحت میں متعدی امراض کے حملوں سے بچنے کے لئے ہماری غذا متوازن ہونی چاہیئے ۔

میرے خیال میں صحت کو برقرار رکھنے کے لئے متوازن اور معیاری غذا وہ ہے جس میں پروٹینز، چربی، کاربوہائیڈریٹس، کیلشیم، لوہا اور فاس فورس وغیرہ معدنی نمکیات اور حیاتین اے، بی، سی، ڈی اور ای مناسب مقدار میں شامل ہوں ۔ جو غذا مندرجہ بالا اجزا میں کسی جزو سے محروم ہو اُسے معیاری نہیں کہا جاسکتا اور نہ یہ امید کی جاسکتی ہے کہ کوئی شخص اس قسم کی غیر مکمل غذا کھا کر اپنے جسم کو امراض کا حملہ روکنے کے قابل بنا سکے گا ۔ ضرورت ہے کہ ماہرین طب لکیر کے فقیر بنے رہنے کے بجائے اپنے پرانے نظریوں کو نئے تجربات کی کسوٹی پر پرکھیں ۔ علم تغذیہ کے نئے انکشافات نے تاریخ طب میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے اور دواؤں کے ذریعہ سے امراض کو دور کرنے کے پُرانے مسلک پر کاربند رہنے کے بجائے اس حقیقت پر غور کرنا بھی ہمارا فرض ہے کہ صحیح تغذیہ کے ذریعہ سے انسان کو حملۂ مرض سے کس طرح محفوظ رکھا جاسکتا ہے ۔

ذیل میں غذاؤں کے متعلق دو نقشے درج کئے جاتے ہیں جو ناظرین کے لئے مفید ہوں گے ۔ پہلا نقشہ متوازن غذا کا ہے جس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوگا کہ ایک ایسے شخص کی صحت کو برقرار رکھنے اور قوتِ مدافعت کو بڑھانے کے لئے جس کا وزن ۴۰ پونڈ ہو اور جو معتدل درجہ کا کام کرتا ہے ۔ غذا میں کن کن چیزوں کی کس مقدار میں ... ضرورت ہوگی ۔

دوسرے نقشے میں بیمار اور کمزور اشخاص کے لئے بعض غذاؤں کی حراری قدر و قیمت درج کی گئی ہے ۔

نقشہ نمبر ۱

اجزائے غذا	مقدار وزن یا یونٹ کے حساب سے
پروٹینز	۷۰ گرام
چربی	۵۰ گرام
کاربوہائیڈریٹس	۴۰۰ گرام
کیلشیم	۰.۷ گرام
فاس فورس	۱.۰ گرام
لوہا	۲۰ ملی گرام
وٹامن اے	
″ بی	
″ سی	
″ ڈی	
″ ای	

نقشہ نمبر ۲

نام غذا	کلورک ویلیو فی اونس	نام غذا	کلورک ویلیو فی اونس
گائے کا دودھ	تقریباً ۲۰	روٹی	۷۶
پرندوں کا گوشت	۴۵	مکھن	۲۲۰
دہی	۱۷	ناریل	۱۹۰
شکر	۱۱۶	سنترہ	۱۵
چاول	۱۰۵	جو کا آٹا	۱۰۲
اوٹ میل	۱۱۶	خشک مٹر	۱۰۳
ساگو	۹۶		
گیہوں کا آٹا	۱۰۵		
مکھن	۵۵		
انڈے	۴۸		
مچھلی	۳۰		

اوقافیات

قبرستان گڑھی برہمنان

پنجاب اینڈ ھریانہ ھائی کورٹ کا فیصلہ

عدالت عالیہ پنجاب وھریانہ ہائی کورٹ چنڈی گڑھ کا فیصلہ جو عدالت عالیہ نے بسلسلہ مسلم قبرستان موضع گڑھی برہمنان ضلع سونی پت دیا ہے۔ فیصلہ کا پورا متن انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ترجمہ اور کتابت کی اغلاط کی ذمہ داری ادارہ اوقاف پر نہیں ہوگی۔

مدیر

منجانب سول اپیل۔ ریگولر سیکنڈ اپیل نمبر ۳۴۶ سن ۱۹۶۵ء پنچایت دیہہ بذریعہ دگرام سبھا بذریعہ چیرمین گڑھی براہمن تحصیل سونی پت ضلع رہتک (مدعا علیہ) اپیلانٹ۔

۱۔ پنجاب وقف بورڈ انبالہ (مدعی)

۲۔ موہن لال ولد طوطا رام ہریجن مہاجر کالونی سونی پت ضلع رہتک۔ (مدعا علیہ) (ریسپونڈنٹ)

ریگولر سیکنڈ اپیل بناراضی حکم شری ڈی۔ آر سینی۔ سب جج بمع مزید اختیارات اپیل مورخہ ۱۱ جون ۱۹۶۵ء جس کی رو سے شری پرتپال سنگھ سب جج درجہ اول سونی پت مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۶۴ء کے فیصلے کو بدل کر اس دعوے میں مدعی کو ڈگری دی اور یہ مان کر کہ مدعی (ریسپونڈنٹ) نمبر ۱ کے خلاف یکطرفہ ڈگری ہوگی۔ اور پنچایت دیہہ کو حکم دیا کہ وہ دونوں عدالتوں کا خرچہ مدعی (اپیلانٹ) کو دے۔

نوعیت دعویٰ

دعوے دخل یابی اراضی جو کہ نقشہ میں سرخ رنگ سے دکھائی گئی ہے مندرجہ خسرہ نمبر ۲۴۷ کھاتہ نمبر ۲۶۴ کھیوٹ نمبر ۵۰۴ ر ۷۶۴ (من) واقع موضع گڑھی براہمن سونی پت۔

نوعیت اپیل

عدالت ماتحت اپیل کے حکم کو بدلنے کے لئے مورخہ ۲۸ جنوری ۱۹۶۹ء۔

حاضر

۱۔ آنریبل مسٹر جسٹس بلراج تلی۔

برائے اپیلانٹ۔ مسٹر جی۔ پی۔ جین ایڈووکیٹ بمعہ مسٹر ایس۔ پی جین ایڈووکیٹ۔

برائے ریسپونڈنٹسان۔ مسٹر ایم۔ ایس لبرہن ایڈووکیٹ برائے ریسپونڈنٹ نمبر ۱

فیصلہ

یہ فیصلہ ۹ ریگولر سیکنڈ اپیل ہائے نمبر ۳۴۲ تا ۳۵۱ سال ۱۹۶۵ء جن کے حالات ایک جیسے ہیں۔

اس کیس میں گاؤں گڑھی براہمن تحصیل سونی پت۔ ضلع رہتک کا جھگڑا ہے جس کا خسرہ نمبر ہے اور یہ ۱۰۔۱۹۰۹ء کی جمع بندی میں (۱۹۔ EXHT) میں غیر ممکن قبرستان دکھائی گئی ہے۔ اور جو کہ اب اسی گرام کے مزارعہ کے قبضے میں ہے۔ اس اندراج کو ۴۷۔۱۹۴۵ء کی جمع بندی میں بھی دہرایا گیا ہے۔ (۱۔ ت۔ ۱۹۵۰۔۵۱ء کی جمع بندی میں جو کہ (EXHT) ہے اس کو غیر ممکن قبرستان دکھایا گیا ہے۔ اس کو اہل اسلام کے قبضے میں دکھایا گیا ہے اور پنچایت دیہہ کو اس کا مالک بنایا گیا ہے۔ ۶۲۔۱۹۶۱ء کی جمع بندی میں بھی اس اندراج کو دہرایا گیا ہے یعنی جو کہ صفحہ ۱ سے صفحہ ۱۸ EXHT کے برابر ہے۔ اس خسرہ نمبر کا مالک ساری جمع بندی میں پنچایت دیہہ کو بنایا گیا ہے۔ دستاویز D2 اور D3 اور D1۔۱۹۵۹ اور ۴۶۔۱۹۴۵ء کی جمع بندی میں یہ زمین شاملات دیہہ حسب رسد رقبہ کھیوٹ دکھایا گیا ہے۔ ملکیت بدلنے کی وجہ شاملات دیہہ سے پنچایت دیہہ میں یہ ہے کہ گرام کامن لینڈز (ریگولیشن) ایکٹ ۱۹۵۴ء لاگو ہونے سے اس کے تحت جو شاملات زمین کسی گاؤں میں پڑی تھی اور اس ایکٹ کو ۹ جنوری ۱۹۵۴ء سے لاگو کیا گیا۔

پارلیمنٹ نے جو وقف ایکٹ نمبر ۲۹ آف ۱۹۵۴ء بنایا وہ ۲۱ مئی ۱۹۵۴ء سے لاگو کیا گیا۔ یہ ایکٹ اس وقت میں لاگو ہوتا ہے۔ جو کہ اس ایکٹ کے بننے سے پہلے یا بعد میں بنائے گئے ہوں۔ اس ایکٹ کی دفعہ (۱) ۳ میں وقف کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ وقف کے معنی کسی جائداد منقولہ یا غیر منقولہ کا ایسا وقف دوامی ہے۔ جیسے کہ اسلام کو ماننے والے کسی شخص نے قانون شریعت اسلامی کے مطابق دینی مذہبی یا خیراتی تسلیم کی گئی کسی غرض کے لئے کیا ہے۔ اور اس میں۔

۱۔ وقف بربنائے تصرف

۲۔ مشروط الخدمت اور

۳۔ وقف علی الاولاد اس حد تک جہاں تک کہ وہ جائیداد قانون شریعت اسلامی کے مطابق دینی مذہبی یا خیراتی کی گئی کسی غرض کے لئے وقف کی گئی ہے شامل ہے۔

اس ایکٹ کی دفعہ ۹ کے تحت سرکار نے بورڈ بنانے کی اجازت دی ہے اور دفعہ ۱۵ میں بورڈ کے کاموں کے بارے میں لکھا ہوا ہے یعنی سارے وقفوں کی دیکھ بھال اور انتظام بورڈ کو

سنبھالا ہوا ہے۔ اور اُن کو یہ بھی کام دیا ہوا ہے کہ وہ کھوئی ہوئی وقف جائیداد کو تلاش کریں اور ان وقفوں کو برقرار رکھنے کے لئے عدالتوں میں مقدمے دائر کریں اور ان کی نگرانی کریں۔ اس ایکٹ میں یہ بھی درج ہے کہ بورڈ وقفوں کا سروے کرائے۔ اور اس بارے میں لسٹیں چھپواسئے تاکہ ان اوقات کے بارے میں جھگڑے ختم کرنے میں مدد ملے۔ اور ایک رجسٹر اوقاف رکھا جائے۔

پنجاب وقف بورڈ نے جو کہ اس ایکٹ کے تحت بنا ہوا ہے نو دعوے قبضے کے بارے میں جو کہ خسرہ نمبر ۲۴/۷ کی زمین کے قطعات تھے پنچایت دیہہ اور گرام سبھا کے خلاف کئے ہیں اور دوسرے نو آدمیوں کے خلاف ہیں جن کے قبضے میں زمین ہے۔ جن کا ذکر دعوے کے کئی مقدمات میں کیا گیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ خسرہ نمبر ۲۴/۷ وقف جائیداد ہے اور وقف بورڈ کو اس کا قبضہ دلایا جائے۔ ان مقدمات میں پیروی صرف پنچایت دیہہ اور گرام سبھا کی تھی۔ ہر ایک کیس میں یہ سمجھا گیا تھا کہ جھگڑے والی زمین پنجاب دیہات کا من لینڈ۔ ریگولیشن ایکٹ مجریہ ۱۹۵۴ء کے تحت گرام پنچایت کی ہے اور مدعی اس کا قبضہ نہیں لے سکتے اور یہ مقدمہ میعاد سے باہر ہے۔ اور اس لئے بورڈ کے سکریٹری کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اس بارے میں عدالت میں مقدمہ دائر کر سکے۔ کیوں کہ کیسوں میں ایک ہی جیسے حالات پائے جاتے ہیں۔ اور جو کچھ ان کیسوں میں فیصلہ کیا جاتا ہے وہ سب حالات اکٹھے کر دیئے گئے تھے۔ اور سارے کیسوں کا فیصلہ ایک ہی فیصلہ میں کیا گیا تھا۔ اور یہ فیصلہ بذریعہ نچلی عدالت کیا گیا تھا۔

پارٹیوں کی بحث سننے کے بعد مندرجہ ذیل تنقیحات برآمد کی گئیں۔

۱۔ مدعی ان مقدمات میں زمین کا مالک ہے۔
۲۔ کیا یہ مقدمات میعاد کے اندر دائر کئے گئے ہیں۔
۳۔ کیا ان پر ایکٹ نمبر ۱/۴ ۱۹۵ء کا اثر پڑتا ہے۔
۴۔ کیا جو شخص دعوی دائر کر رہا ہے ایسا کرنے کے لئے اس کو مدعی نے حق دے دیا ہے۔
۵۔ فائدہ۔

تنقیح نمبر ۱ اور نمبر ۲ کا فیصلہ مدعی کے خلاف ہو چکا ہے۔

تنقیح نمبر ۳ کا فیصلہ پنچایت دیہہ کے حق میں ہوا تھا جس میں کہ یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ زمین پنچایت دیہہ کی ہے۔

چوں کہ نمبر ۴ کے بارے میں کوئی زور نہیں دیا گیا تھا اس لئے عدالت نے ان مقدموں کو ۲۶ نومبر ۱۹۶۴ء کو خارج کر دیا تھا اس کورٹ کی ڈگری کے خلاف مدعی نے سینئر سب جج رہتک کی عدالت میں اپیل دائر کی جو کہ ۱۱ جون ۱۹۶۵ء کو منظور کر دی گئی تھیں۔ اس عدالت نے یہ مان لیا کہ جھگڑے والی زمین وقف جائیداد ہیں۔ اور یہ مقدمات میعاد کے اندر دائر کئے گئے تھے۔

تنقیح نمبر ۳ کے بارے میں ماتحت عدالت نے یہ سمجھا تھا کہ پہلی عدالت کا فیصلہ غلط تھا اور یہ فیصلہ دیا کہ یہ وقف جائیداد ہیں اس لئے ان کے اوپر گرام پنچایت کا کوئی حق نہیں ہے باوجود اس کے کہ مال کے ریکارڈ میں اس زمین کو شاملات دیہہ لکھا گیا ہے مگر یہ اس کی اصل ملکیت نہیں ہے پنچایت ایکٹ نمبر ۱ ۱۹۵۳ء کے مطابق ان کیسوں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ تنقیح نمبر ۴ کے بارے میں جو فیصلہ ٹرائل کورٹ کے ذریعے دیا گیا تھا اس کو اپیلیٹ کورٹ میں چیلنج نہیں کیا گیا تھا۔ عدالت ماتحت کے فیصلے سے ناراض ہو کر پنچایت دیہہ اور گرام سبھا نے موجودہ اپیلیں اس عدالت میں دائر کی ہیں۔

پہلی تنقیح دیکھنے والی ہے کہ یہ زمین وقف جائیداد ہے یا نہیں۔ جیسا کہ وقف ایکٹ ۱۹۵۴ء کی دفعہ ۲۹ میں لکھا ہے میں نے اس ایکٹ میں جو وقف کے بارے میں درج ہے دیکھ لیا ہے اس کے مطابق یہ وقف اُس آدمی کے ذریعہ دیا جا سکتا ہے جو کہ اسلام مذہب رکھتا ہو اور کسی اور بیسے بھی مگر قانون ساز وقف ترمیمی ایکٹ ۳۰ آف ۱۹۶۹ء اس ایکٹ میں دفعہ c-۶۶ لکھی ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہے۔

اس ایکٹ میں کسی قسم کی وضاحت نہ ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص جو کہ مسلمان نہ ہو اور وہ کسی مسجد۔ عیدگاہ۔ امام باڑہ یا درگاہ کی امداد کے لئے کوئی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد دیتا ہے یا دان کرتا ہے وقف ہے۔

خانقاہ یا مقبرہ

مسلم قبرستان۔
چولٹری یا مسافر خانہ۔

اس قسم کی پراپرٹیوں کو وقف پراپرٹی تصور کیا جائے گا۔ اور ان کو اسی طریقے سے سمجھا جائے گا یا مانا جائے گا جس طریقے سے یہ وقف میں آتی ہیں۔

مقدمات میں یہ ثبوت نہیں ہوا ہے کہ جائیداد یں ایسے شخص نے دی ہیں جو کہ اسلام مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ ۱۰-۱۹۰۹ء اور ۴۶-۱۹۴۵ء کی جمع بندی میں اس زمین کو شاملات دیہہ بتایا گیا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ گاؤں کے مالکوں نے اس زمین کو قبرستان کے استعمال کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ ان کو وقف کیا گیا کہیں سے ثبوت نہیں ہوا ہے۔ لیکن قابل کونسل برائے مدعی نے بتایا کہ اس کا وقف ہونا ۱۰-۱۹۰۹ء اور ۴۶-۱۹۴۵ء سے سمجھ لیا جائے کیوں کہ یہ اس طریقے سے استعمال میں آ رہی ہے۔ زیادہ دیر پا استعمال اصلیت کا سوال ہے اس پر وکالت ہوگی اور گواہ اس کو ثبوت کریں گے۔ مدعی نے کبھی بھی وقف کی روح سے دعوے نہیں کئے جو کچھ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ خسرہ نمبر ۲۴/۷ جو کہ ۵ بیگھہ اور ۷ بسوا ہے اور خسرہ نمبر ۲۴/۷، واقع گڑھی براہمن سونی پت غیر ممکن قبرستان ہوتے ہوئے وقف کی جائیداد ہے۔ جیسا کہ جمع بندی ۶۲-۱۹۶۱ سالہ میں ہے دکھایا گیا ہے۔ اور مدعی کے قبضے میں تھی۔ اور مدعا علیہ نمبر ۱ نے ۲۰ اگست ۱۹۶۲ کو خسرہ نمبر ۲۴/۷ کی زمین پر قبضہ کر لیا۔ اور خالی کرنے سے انکار کر دیا۔ صرف ۶۲-۱۹۶۱ء کی جمع بندی کی رو سے قبضہ کا حق مانگا گیا ہے۔ جس میں اس زمین کو غیر ممکن قبرستان دکھایا گیا ہے اور جس کو اہل اسلام کے قبضے میں دکھایا گیا ہے۔ یہ اندراج صحیح نہیں ہے جیسا کہ دکھایا گیا ہے۔ مدعی کو یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ اس کورٹ میں بطور ایک یوزر کے اس کو وقف پراپرٹی پلیڈ کرے۔ سوچنا یہ ہے کہ جو اندراج ۶۲-۱۹۶۱ء کی جمع بندی میں خسرہ نمبر ۲۴/۷ کا جو اندراج ہے کیا اُس کی رو سے اس کو وقف جائیداد مانا جا سکتا ہے۔

یہ گاؤں شروع سے ہی ہندوؤں کا گاؤں ہے جس میں تقسیم سے پہلے تھوڑے سے مسلمان تھے اور اب کوئی نہیں ہے مدعی کے گواہوں نے یہ مان لیا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے اس قبرستان میں کوئی مردہ نہیں دفنایا گیا ہے۔ وہ شخص جو کہ مقدمات میں مدعا علیہ تھے گرام پنچایت اور گرام سبھا کے ساتھ انھوں نے مختلف پلاٹس کا قبضہ لے کر اپنے مکانات

بنالئے جب کہ اس گاؤں میں کوئی مسلمان نہیں رہتا ہے تو یہ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ جمع بندی میں اس خسرہ کو اہل اسلام کے قبضہ میں دکھانا ٹھیک ہے۔ موجودہ حالات میں یہ اندراج درست نہیں مانا جاسکتا۔ موقع پر کوئی قبر نہیں ہے اور مکانات بنا لئے گئے ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اندراج غیر ممکن قبرستان کا حالات کے مطابق ہے۔ اس کا ثبوت ہے کہ پنچایت نے اُن اشخاص پر دعوے کئے جنہوں نے اس خسرہ میں اپنے مکانات بنا لئے تھے۔ ڈگریاں پنچایت کو مل گئیں تھیں اور خالی کرانے کا حکم صادر ہو گئے تھے۔ کسی گواہ سے یہ ثبوت نہیں ہوا کہ یہ قبرستان وقف کیا گیا تھا اور نہ ہی کوئی گواہی ایسی ہوتی ہے جس میں یہ پایا گیا ہو کہ یہ زمین بطور قبرستان کے استعمال ہوتی رہی ہے نہ ہی کوئی مردہ یہاں دفنایا گیا اور نہ ہی کوئی قبر وہاں موجود رہی ہے۔

مدعی نے متھر داس ریٹائرڈ ڈی۔ آر۔ اے سونی پت عمر ۶۶ سال بطور گواہ پیش کیا جس نے خسرہ نمبر ۲۴۴ کا پتہ کیا اور ہر ایک کیس کے لئے اس کا نقشہ تیار کیا (P.W.8 + P.4) اس نقشہ میں اس نے موقع کے شخص کو قبضہ دار دکھایا اور کہا کہ پہلے یہ جگہ بطور قبرستان کے استعمال کی جاتی رہی ہے۔ جرح میں اس نے قبول کیا کہ اس جگہ کو اس نے ریونیو ریکارڈ کی وجہ سے قبرستان بتایا اور اس نے خود قبرستان نہیں دیکھا ہے۔ دوسرا گواہ مدعی نے محمد ابراہیم عمر ۷۰ سال (P.W.2) جو کہ لوہار کا کام کرتا ہے سونی پت کے رہنے والا ہے کو پیش کیا۔ اس نے کہا کہ اس جگہ کو بطور قبرستان استعمال ہوتے ہوئے دیکھا اس زمین میں اس نے قبریں دیکھیں اور کچھ ایک میں وہ خود بھی شامل ہوا ہے۔ جرح میں وہ متنازعہ خسرہ نمبر کا رقبہ نہ بتا سکا اور اس نے کہا کہ وہ سونی پت کا رہنے والا ہے اور گڑھی برہمن کا نہیں اور وہ اس دیہات میں مالک نہیں تھا۔ اور اس کو اس بات کا کوئی علم نہیں ہے کہ یہ جگہ آیا اہل اسلام کی ہے یا شاملات دیہہ ہے P.W.3 محمد عیسیٰ اپینٹ کلکٹر گواہ مدعی نے کہا کہ وہ پہلی دفعہ ۱۹۶۲ء میں سونی پت میں آیا اور تب سے اس جگہ میں کوئی مردہ نہیں دفنایا گیا ہے اس نے اس جگہ کو غیر ممکن قبرستان بنایا جیسا کہ ریونیو ریکارڈ میں دکھایا ہے اور کہا کہ وہاں قبروں کے نشانات بھی تھے۔

مدعا علیہ نے رام عمر ۔ سال نمبردار گڑھی براہمناں (P.W.18) کو بطور گواہ پیش کیا جس نے کہا کہ اس جگہ کی پنچایت مالک تھی اور اس کو بطور قبرستان کے استعمال کرنے کے لئے کبھی نہیں چھوڑا گیا اور نہ ہی اس زمین میں کوئی مردہ دفنایا گیا ہے جرح میں اس نے کہا کہ اس بات کا علم نہیں ہے کہ اس جگہ کا اندراج ریونیو ریکارڈ میں بطور قبرستان کے کیا گیا ہے اور پنچایت نے D.O.5 کو درخواست دی ہے کہ اُن مکانات کو گرا دیا جائے جو کہ اس زمین پر بنا لئے گئے ہیں۔ لیکن اس کو تاریخ کا پتہ نہیں ہے کہ پنچایت نے کب ایسی درخواست دی ہے۔ اس نے آگے کہا کہ پہلے مسلمان بھی گڑھی پنچایت میں مالک تھے۔ P.W.2 جگ بیجہ۔ عمر ۴۰ سال۔ گڑھی براہمناں کا زمیندار نے کہا کہ وہ اس گاؤں کا سرپنچ تھا اور متنازعہ زمین کی پنچایت مالک تھی۔ اس زمین کے کچھ حصے میں دوسرے مدعا علیان نے قبضہ کر لیا اور گرام پنچایت نے ان کے خلاف S.D.O سونی پت کی عدالت میں درخواست دی کہ ان کے قبضے ہٹا دیئے جائیں اور ایسا حکم جاری ہو گیا تھا۔ ان حکم کی تعمیل پینڈنگ پڑی ہے۔ پہلے یہ زمین شاملات دیہہ کا ایک حصہ تھا اور شاملات کے قبضے میں تھا۔ یہ زمین کبھی بھی کسی مسلم نے وقف میں نہیں دی ہے کبھی بھی اس زمین میں کوئی مردہ نہیں دفنایا گیا ہے اس پراپرٹی کا کبھی کوئی وقف مالک نہیں بنا ہے اور ریونیو ریکارڈ میں اس کا اندراج قبرستان مسلمان پٹواری کی وجہ سے کیا گیا ہے جرح میں اس نے کہا کہ پہلی دفعہ اس کو ..... اپریل ۱۹۶۴ء میں اس اندراج کا پتہ لگا اور انہوں نے درستی کے لئے کوئی درخواست نہیں دی۔ اس کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ قبرستان کا اندراج ریونیو ریکارڈ میں کب کیا گیا۔ اس کو اس بات کا علم ہے کہ مسلمان پٹواری یہاں لگاتے گئے مگر اُن کے ناموں کا اس کو پتہ نہیں ہے D.W.4 بھین سنگھ عمر ۵۰ سال نمبردار گڑھی براہمناں نے کہا کہ متنازعہ زمین شاملات دیہہ ہے اور شاملات دیہہ کے قبضہ میں ہے اور پنچایت کے قبضہ میں آتی ہے یہ جگہ بطور قبرستان کبھی استعمال نہیں کی گئی۔ اور کوئی مردہ یہاں نہیں دفنایا گیا۔ جمع بندی کے اندراج کو درست تسلیم کر لیا جاتا لیکن اس کیس میں ۱۹۶۰۔۶۱ء کی جمع بندی کو درست تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ پرانے اندراج کو دہرایا گیا ہے جب ۱۹۴۷ء سے اس موقع میں کوئی مسلمان نہیں ہے اور متنازعہ جگہ کو کبھی بھی بطور قبرستان استعمال نہیں کیا گیا گرام پنچایت کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اس جگہ پر قبضہ کیا اور گرام پنچایت نے بذات خود اس کا قبضہ لینے کے لئے درخواست دی جب کہ پنچایت کے قبضہ میں یہ جگہ آگئی تھی۔ دوسری جمع بندی جو کہ ان تفصیلات میں پیش کی گئیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ یہ جگہ کسی مسلم نے وقف کی ہے اور یہ بھی نہیں دکھایا گیا کہ کبھی کوئی متولی اس پراپرٹی کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کیا ہوا اور اس زمین میں مردہ دفنانے کا اندراج درست کرتا ہو۔ صرف ایک گواہ کا یہ کہنا کہ یہ جگہ قبرستان کے لئے وقف کی گئی ہے کافی نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہنا کہ یہاں مردے دفنائے جاتے تھے اور یہ جگہ قبرستان تھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے مانا کہ وہ بذات خود اس گاؤں میں مالک نہیں ہے اور نہ ہی وہاں رہتا ہے۔ اور یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ کنجڑ رائب کے اندراج کو اہل اسلام میں کس طرح سے اور کیوں تبدیل کر دیا ہے جب کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اس گاؤں میں کوئی مسلمان نہ رہا اور یہ جگہ بطور قبرستان کے استعمال نہیں ہوتی۔

قابل کونسل پنجاب وقف بورڈ نے بحث میں کہا کہ وقف کی تشریح میں ایسے وقف آجاتے ہیں جو مسلسل استعمال کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔ ۱۹۰۹-۱۰ء کی جمع بندی میں اس کو یہ جگہ قبرستان کہا گیا ہے۔ اس لئے اس کو وقف تسلیم کرنا درست ہے اور یہ ثبوت کرنا ضروری نہیں ہے کہ اس جگہ کو قبرستان کے لئے کسی نے وقف کیا ہو۔ اپنی دلیلوں کی مضبوطی میں اس نے بہت سے فیصلوں کا حوالہ دیا جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ چھکو بنام گھیبل اے۔ آئی۔ آر۔ ۱۹۵۱ء لاہور ۱۵۔ یہ فیصلہ مندرجہ ذیل ہوا جب زمین کے ایک پلاٹ کو تکیہ بیان کیا جاتا ہے۔ اور بہت سال اس جگہ کو مسلمانوں نے مردے دفنانے کے لئے استعمال کیا وہاں خاندان کے ممبر ہیں یا نہیں۔ یہ سمجھا گیا کہ وہ استعمال کی وجہ سے وقف ہے۔ ایک سیمٹری اور قبرستان کی جگہ عام جگہ ہوتی ہیں لیکن ان کو فروخت نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس کو جدا جدا کیا جاسکتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ جگہیں بھی جو دفن کے ساتھ وقف نہیں ہوتی ہیں لیکن قبریں موجود ہیں وہ جگہیں بھی پنچایتی یا عوامی تصور کی جاتی ہیں اس وجہ سے ان کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آگے چل کر یہ بتایا گیا کہ جن جگہوں میں یا جن پلاٹوں میں ایک یا دو مردوں کو دفنایا گیا ہے صرف قبرستان مانا گیا ہے یعنی اُسی جگہ کو جہاں ایک یا دو دفنایا گیا ہو قبرستان مانا گیا لیکن سارے کے سارے پلاٹ کو بطور یا قبرستان نہیں مانا گیا بلکہ عوامی جگہ مانا گیا ہے۔

ایک اور دوسری جگہ دکھایا گیا ہے۔

کہ مسلمان قانون میں یہ ہے کہ اگر کسی جگہ ایک دفعہ مردہ دفنایا گیا ہو اس کو ہمیشہ کے

لیے قبرستان مانا جاتا ہے جب تک اس کو ناقابل استعمال قرار نہ دیا جائے۔ اس کیس کے حالات اس کیس سے بالکل مختلف ہیں اور دوسری طرح کے ہیں۔ ان سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ بہت مدت سے اس زمین میں مردے دفنائے گئے ہیں اور پلاٹ (زمین) تکیہ تھا۔ اور ۱۹۰۵ء میں مولانا شاہ کو اس تکیے میں مردے دفنانے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ اس تکیے کو کسی نے وقف کیا ہے لیکن کیونکہ یہ تکیہ تھا اس لئے ایسا مان لیا گیا تھا۔ اس کیس میں ایسے ثبوت نہیں دیئے گئے ہیں۔ اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا کہ وہاں کتنی قبریں ہیں۔ یہ مانا جا چکا ہے کہ یہ زمین ۱۹۲۰ء سے بطور قبرستان استعمال نہیں کی گئی ہے کہ تب سے وہاں کوئی مسلمان نہیں ہے۔ اور اس قبرستان کو اہل اسلام کے رکھنے کے لئے کوئی ضرورت نہیں ہے۔

نور محمد و دیگران بنام بلبھ داس اور دیگران۔ اے۔ آئی۔ آر۔ ۱۹۳۱ء

اودھ ۲۹۵۔ یہ مندرجہ ذیل طریقہ سے ہوا

اگر کسی بھی زمین کے لگاتار پلاٹ جس کو خسرہ میں قبرستان دکھایا گیا ہے قبریں ہیں سارے کے سارے کو قبرستان ہی مانا جائے گا۔ آگے چل کر یہ کہا گیا کہ پبلک قبرستان میں اور وقف کئے گئے قبرستان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ زمین کے حصے کا کوئی بھی پلاٹ اگر بطور قبرستان کے استعمال کیا جا رہا ہے تو یہ قبرستان بن جاتا ہے اور ساری زمین وقف پراپرٹی بن جاتی ہے اس فیصلے کے خلاف پریوی کونسل میں اپیل دائر کیا گیا تھا جو کہ اس طرح سے ہے۔

بلبھ داس و دیگران بنام نور محمد و دیگران۔ اے۔ آئی۔ آر ۱۹۳۶ء پی سی ۸۳

جج صاحبان نے فرمایا۔

اگر ایک مالک اپنے صحن میں ایک یا دو مردے دفنانے کی اجازت دے دیتا ہے تو اس صحن کو قبرستان نہیں کہا جا سکتا ہے۔ مدعی کو یہ ثابت کرنے کے لئے کہ کیس میں جو زمین کے پلاٹ میں قبرستان ہے اس بات کے گواہ پیش کرنے ہوں گے کہ اس زمین میں کتنے مردے دفنائے گئے ہیں۔ کیونکہ خسرہ ۱۹۴۸ء کے بارے میں کوئی ریکارڈ نہیں ہے اس لئے ایسے گواہوں کی اشد ضرورت ہے۔ مدعا علیہ اس پوزیشن میں نہیں ہے۔ جو ۱۹۶۸ء کے خسرہ میں قبرستان کا اندراج ہے اس کو اس نقشے کے ساتھ دیکھنا پڑے گا جس میں یہ درج ہے کہ پلاٹ نمبر ۸۰ سارے کا سارا ہی قبرستان ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے سوائے جمع بندی کے کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے جس سے یہ پتہ چلے کہ مان لیا جائے کہ واقعی میں یہ زمین بطور قبرستان کے استعمال کی گئی مسلمان کی طرف سے اور جو گواہی اس سلسلے میں دی گئی ہے کہ یہ زمین بطور قبرستان کے استعمال کی گئی وہ گواہ اس گاؤں کا باشندہ نہیں ہے اور وہ یہ بھی نہیں بتا سکا کہ وہاں پر کتنی قبریں ہیں۔ اس لئے یہ درست ہے کہ اس خسرہ کو پلاٹس میں بانٹ دیا گیا جہاں مکانات تعمیر کئے گئے ہیں اگر وہاں قبریں ہوتیں تو میرے خیال میں وہاں مکانات بنانے کی کوئی جرأت نہ کرتا جو بھی گواہ پیش کئے ہیں وہ ان مقدمات میں پوری طرح سے یہ نہیں کہہ سکے کہ یہاں مردے دفنائے کتنے دفنائے۔

مہر دین و دیگران بنام حاکم علی۔ اے۔ آئی۔ آر ۱۹۳۵ء۔ لاہور ۹۱۲

یہ مندرجہ ذیل طریقے سے ہے۔

یہ اچھی طرح سے واضح ہے کہ بتانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ کسی نے دان میں دیا ہو بلکہ اگر اس کو عرصہ دراز سے بطور وقف کے استعمال کیا جا رہا ہے اور مالکان کا ارادہ اس کو وقف کرنے کا تھا تو اس زمین یا پلاٹ کو وقف مان لینا ضروری ہے اس کیس میں لمبے اور بے دخل استعمال کرنے والے ثابت ہو چکے ہیں۔ زمین کو غیر ممکن تکیہ اور قبرستان بتایا گیا ہے جو کہ اہل اسلام کے قبضے میں تھا اور شاملات دیہہ نہیں کہا گیا حالانکہ ساتھ والے پلاٹ کا اندراج اس طرح سے ہے موجودہ کیس میں زمین کو مرجگہ شاملات دیہہ بتایا گیا ہے اور اہل اسلام کے قبضے میں ۱۹۵۷،۵۸ء تک نہیں دکھایا لیکن سونی پت کے کنجر قوم کے قبضہ میں دکھایا گیا ہے۔

اروڑ سنگھ و دیگران بنام بارر دین و دیگران

اے۔ آئی۔ آر ۱۹۴۰ء لاہور ۱۱۹ جس میں اس کو وقف مانا گیا۔ عدالت نے یہ معلومات کیں کہ متنازعہ زمین کو بطور قبرستان استعمال کیا گیا جیسا کہ ریونیو ریکارڈ میں اندراج ہے اس لئے اس کو قبرستان مانا جاتا ہے اور وقف کیا جاتا ہے اور اس کو صرف اس لئے وقف نہ ماننا کہ یہ حال میں بطور قبرستان استعمال نہیں ہوتا ہے درست نہیں ہے۔ اور یہ صاف ہے کہ کوئی بھی جائیداد وقف کی ہوئی ہندو اور مسلمان قانون کے مطابق ناجائز قرار دی جا سکتی ہے۔

موجودہ کیس میں یہ ثابت نہیں ہوا ہے کہ اس پلاٹ کو بطور مسلمانوں کے قبرستان کے استعمال کیا گیا ہے۔ صرف اس کا اندراج بطور قبرستان ــــــــ ریونیو ریکارڈ میں کافی ثبوت نہیں ہے کہ یہ قبرستان ہے جیسا کہ ایکٹ کی دفعہ (۱) ۵ میں بتایا گیا ہے کہ کسی بھی ہندو سے دان کی گئی زمین وقف نہیں بن سکتی ہے صرف مسلمانوں کے دان دینے سے ہی وقف بن سکتا ہے

دو قمی شاہ و دیگران بنام عبدالغفار خان۔ اے۔ آئی۔ آر ۱۹۵۸ء ناگپور

اس فیصلہ میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ کوئی بھی ایسی جائیداد خدا کے نام پر وقف کی جا سکتی ہے جس کو وقف کرنے سے خدا کی خلق کو فائدہ ہوتا ہے اور اس طریقے سے وقف کی جا سکتی ہے کہ اس وقف سے جو فائدہ ہو اس کو خدا کی خلق کی بھلائی کے لئے استعمال کیا جائے ــــ اور کہ۔

عام طور پر یہ ضروری نہیں ہے کہ وہی شخص جائز وقف اسلام بنا سکتا ہے جس کو جائز بخشش دینے کا اختیار ہو۔ اور وقف کے آئین بنانے کے لئے یہ شرط نہیں ہے۔ ہر ایک مذہب و ملت کا انسان وقف بنا سکتا ہے لیکن ایسا کرنے کا مطلب یہی ہونا چاہیئے کہ وقف کرنے سے یا بنانے سے اسلام کی ذات کو فائدہ پہنچے گا۔

ایکٹ میں تشریح کے مطابق یعنی جو وقف کی تشریح دی ہے اس کے مطابق یہ نقطہ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ آگے کہا گیا کہ۔

ایک سیمیٹری یا قبرستان ایک عوام کی جگہ ہوتی ہے اور کسی کی پرائیویٹ جگہ نہیں ہوتی ہے آیا ایک جگہ مقبرہ ہے یا قبرستان ہے یہ مردہ دفنانے کی تعداد پر منحصر ہے کہ کتنے مردے وہاں دفنائے

گئے ہیں اور وقف صحیح طور سے کیا گیا ہو اس پر منحصر ہے اور قابل اعتبار گواہیاں پیش کئے جائیں۔
متنازعہ زمین میں یہ نہیں بتایا گیا کہ کتنے مردے یہاں دفنائے گئے ہیں اور نہ ہی کوئی ایسی گواہی ہوتی ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ اس زمین کو وقف کیا گیا ہے۔

کھاتے و دیگران بنام مرزا حسین بیگ

اے۔ آئی۔ آر ۱۹۶۲ء اڑیسہ ۹۵ جو کہ اس طرح ہے
عام طور پر وہی جائیداد وقف مانی جاتی ہے جس کو وقف کیا گیا ہو۔ مگر اگر کوئی جگہ کافی عرصہ سے یا نامعلوم عرصے سے مذہبی مطلب کے لئے استعمال کی جا رہی ہے تب یہ پراپرٹی استعمال کرنے کی وجہ سے وقف بن جاتی ہے۔ چاہے وقف کرنے کی کوئی شہادت ہے یا نہیں۔ اور جب عرصہ دراز ہو گیا ہو اس وقف کو بنے ہوئے۔ استعمال کرنے والا ہی یہ گواہی دے سکتا ہے کہ آیا پراپرٹی وقف ہے یا نہیں۔ جہاں کوئی گواہ ایسا نہ ہو جس سے یہ پتہ لگ سکے کہ یہ وقف کب ہوا تھا۔
وقف استعمال کرنے والے کی گواہی سے بن سکتا ہے۔ اگر زمین کو نامعلوم عرصے سے مذہبی مطلب کے لئے استعمال کیا گیا ہو۔ جیسا کہ مسجد۔ زمین وقف بنی ہوتی ہے حالانکہ وقف کرنے کی کوئی گواہی نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی ملکیت خدا میں ہے یعنی اس کا مالک خدا ہے جو کہ پہنچایا جا سکتا ہے اسی طرح سے پبلک زمین کا بھی ہونا ضروری ہے۔ موجودہ کیس میں نہ ہی ایسی گواہی ہے کہ اس زمین کو وقف کیا گیا ہے اور نہ ہی یہ کہا گیا ہے کہ اس کو نامعلوم وقت سے بطور قبرستان استعمال کیا جا رہا ہے صرف جمع بندی ہی کا ایک اندراج ہے جو کہ میری خیال میں کافی نہیں ہے۔

محمد شاہ فاشو دین انصاری و دیگران

اے۔ آئی۔ آر ۱۹۵۶ء۔ ایس سی۔ ۱۵ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ ایک قانونی دائرہ کی لحاظ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ایک پراپرٹی کو وقف کرنے پر ہی وقف مانا جاتا ہے لیکن اگر کسی زمین کو نامعلوم عرصہ سے برائے مذہبی مطلب استعمال کیا جا رہا ہے تو اس کو بھی وقف مانا جاتا ہے۔ چاہے اس کے وقف کرنے کا کوئی ثبوت ہے یا نہیں اس کیس میں یہ ثابت نہیں ہوا ہے کہ اس زمین کو معلوم وقت سے بطور قبرستان استعمال کیا جا رہا ہے معلوم کا مطلب ہو چہ وہ گذرا ہوا وقت نہیں لیکن تھوڑا سا پچھلا گذرا ہوا وقت۔ ۵۰ سال کے وقت کو نامعلوم وقت نہیں کہا جا سکتا ہے۔
قابل کونسل نے برائے اپیلنٹ جواب میں مندرجہ ذیل فیصلے سنائے۔

جیون سنگھ و دیگران۔ بنام کرم دین و دیگران

اے۔ آئی۔ آر ۱۹۲۷ء لاہور ۶۶۴ جس میں یہ کہا گیا کہ کوئی بھی کہنے سے کسی دوسرے کی زمین میں مردہ دفنانے کا حق حاصل نہیں کر سکتا ہے جس کا کہ قانونی طور پر پتہ نہ ہو۔

کرن سنگھ بنام نبی بخش و دیگران

اے۔ آئی۔ آر۔ ۱۹۳۲ لاہور ۲۵۶ جس میں مندرجہ ذیل فیصلہ ٹھہرایا گیا۔
کسی دوسرے کی زمین میں مردہ دفنانے کا حق قانون کی رو سے غیر مناسب ہے اور یہ کہنے سننے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا اور جہاں پارٹی حق رکھتی ہو۔ کچھ کیسوں میں قیمت سے منظوری دی جاتی ہے مگر ایسا کرنے سے یہ حق نہیں بن جاتا ہے اور نہ ہی طویل استعمال سے ایسا ہو سکتا ہے
نچلی عدالتوں میں یہ باتیں الاٹ نہیں کی جا سکتیں وہ دوسری اپیل دائر کرنے کے لئے لہذا نیا اپیل دائر کیا جائے۔

کے۔ روشن دین و دیگران بنام ایچ محمد شریف۔ و دیگران

اے۔ آئی۔ آر ۱۹۵۶ء لاہور ۸۰۷ جس میں مندرجہ ذیل فیصلہ سنایا گیا۔ ایک جگہ کہ جہاں مردے دفنائے گئے ہوں بنا اس گواہی کے وقف مانا جا سکتا ہے کہ اس کو وقف کیا گیا ہے اگر استعمال متواتر کئے جانے کی گواہی ہے مگر استعمال کئے جانے والے گواہ کو پختہ طور سے ایسا ثبوت کرنا ہوگا کہ اس جگہ میں متواتر مردے دفنائے جاتے رہے ہیں۔ اور گواہ کو یہ بھی پتہ ہونا چاہئے کہ وقف کیا ہوتا ہے اور کس طرح کیا جاتا ہے۔ جہاں گواہ یہ ثبوت نہ کر سکے کہ اس جگہ میں کافی سالوں سے مردے دفنائے جا رہے ہیں ایسی گواہی کو عام استعمال کی گواہی نہیں کہا جا سکتا۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے یہ زمین ۱۹۴۷ء سے بطور قبرستان کے استعمال نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ وقف پراپرٹی ہے صرف اس لئے کہ اس میں کچھ مردے دفنائے گئے ہیں اور وہ بھی باعتبار گواہی نہیں ہے۔

صغر حسین بنام میاں محمد غیاث الدین و دیگران

اے۔ آئی۔ آر۔ ۱۹۵۷ء لاہور ۵۵۲ جس میں یہ مانا گیا تھا کہ
کسی بھی پراپرٹی کو وقف ہوا نہیں مانا جاتا جب تک مالک اس کو قانونی طور پر وقف نہ کر دے چاہے مالک کا یہ ارادہ بھی ہو کہ وہ اپنی جائیداد کو وقف کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بوجہ استعمال بھی ایک وقف بن سکتا ہے لیکن استعمال کرنے والے کو یہ ثبوت کرنا ہوگا کہ مالک کا ارادہ اس جائیداد کو وقف کرنے کا تھا۔ اگر اس قسم کا ارادہ مالک کا استعمال کرنے والا ثبوت نہیں کر سکتا ہے تو اکیلا استعمال کرنے والا اس جائیداد کو اپنے پرائیویٹ طور پہ وقف پراپرٹی نہیں کہہ سکتا۔
اس کیس میں کوئی ایسی گواہی نہیں ہے جس میں کسی بھی شخص کا ارادہ وقف کرنے کا ثبوت کیا گیا ہو۔ اور صرف جمع بندی میں اندراج ہونا بغیر ثبوت استعمال کے یہ ثابت نہیں کرتا ہے کہ خسرہ نمبر ۲۴۷ کی زمین وقف پراپرٹی ہے اور اس کا مالک پنجاب وقف بورڈ ہے۔
مقدمات میعاد سے بھی باہر ہیں۔ جیسا کہ مدعی بورڈ کے لئے یہ مان لیا گیا ہے کہ ۱۲ سال کے اندر کسی وقت بھی یہ زمین بورڈ کے قبضہ میں نہیں رہی ہے۔ مقدمات دائر کرنے سے پہلے اگر خلاف اس کے وقف پراپرٹی مان بھی لی جائے جس کے فل بنچ ہائی کورٹ لاہور نے مسجد عرف مسجد شہید گنج و دیگیان بنام شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی امرتسر اے۔ آئی۔ آر ۱۹۳۸ء لاہور ۳۶۹ (ہینڈ لوٹ بی)
ایڈورس قبضہ لینے کا حق کسی مسلمان کو نہیں ہے اور نہ ہی ہندو لاگو ہے۔ اگر برٹش انڈیا کے وقت میں قانون کی حد کو اگر ادھر ادھر کیا جاتا تھا اور اس کو دینی طور پر لاگو کرنے کے لئے ایسا کیا جاتا تھا تو یہ ناممکن تھا اور کچہریوں کو ایسا ہی ماننا پڑتا تھا۔ باقی صفحہ ۲۹ پر

سکریٹری سنٹرل وقف کونسل نئی دہلی

سنٹرل وقف کونسل کی کارروائیاں

سنٹرل وقف کونسل کی تیرھویں میٹنگ بتاریخ ۲۴ اپریل ۱۹۷۴ء زیر صدارت جناب فخرالدین علی احمد صاحب (مرکزی وزیر خوراک و زراعت نیز چیرمین سنٹرل وقف کونسل) منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں مندرجہ ذیل اہم فیصلے کئے گئے جن پر کارروائی بھی کی جاچکی ہے۔

(۱) میٹنگ میں یہ طے پایا کہ بھرت پور۔ الور اور ہریانہ میں واقع آثار قدیمہ کی مساجد کے بارے میں چیرمین صاحب سنٹرل وقف کونسل بذات خود خط وکتابت کریں۔

(۲) میٹنگ میں یہ بھی طے پایا کہ اسٹینڈنگ کمیٹی کی ہر میٹنگ میں نائب وزیر داخلہ و اوقاف جناب ایف ایچ محسن صاحب ضرور شرکت فرمائیں۔

(۳) میٹنگ میں یہ بھی طے پایا کہ بیرون اسکالرشپ دیئے جانے کی اسکیم کو ختم کر دیا جائے۔

(۴) میٹنگ میں یہ بھی طے پایا کہ منسٹر انچارج وقف اور اسٹیٹ وقف بورڈ سے یہ درخواست کی جائے کہ وہ سروے کا کام جتنی جلدی ممکن ہوسکے مکمل کرلیں۔

(۵) میٹنگ میں یہ بھی طے پایا کہ مسجدوں اور مندروں کو بجلی اور پانی کے ٹیکسوں سے مستثنیٰ قرار دیا جانا چاہیئے۔

(۶) میٹنگ میں یہ بھی طے پایا کہ اسٹیٹ گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ وہ ایسے اداروں سے جن کی آمدنی پانچ ہزار روپے یا اس سے زیادہ ہو آڈٹ کرنے کی فیس نہ لے۔

(۷) میٹنگ میں یہ بھی طے پایا کہ سنٹرل وقف کونسل ایکٹ ۱۹۵۴ء میں ایک قرارداد کا اضافہ کر دیا جانا چاہیئے جس کی رو سے ان اوقاف کی زمینوں کو واگزار کرلینا چاہیئے جو ترقیاتی منصوبوں کے لئے موضوع ہوں۔

(۸) میٹنگ میں یہ بھی طے پایا کہ ان متولیوں کے خلاف اپنے فرائض میں کوتاہی برتتے ہیں سخت اقدام کرنے چاہئیں۔

(۹) سنٹرل وقف کونسل کی "ریلیف کمیٹی" کی تشکیل از سرنو کی گئی جن کے ممبران مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) جناب ایف ایچ محسن صاحب (نائب وزیر داخلہ و اوقاف) چیرمین
(۲) محمد یونس سلیم صاحب — ممبر
(۳) مفتی عتیق الرحمن صاحب — ″

چوں کہ جناب محمد یونس سلیم صاحب نے کمیٹی ہذا کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا ہے لہذا سنٹرل وقف کونسل کے چیرمین صاحب نے ان کی جگہ ڈاکٹر سید محمد صاحب کو نامزد فرمایا ہے۔

سنٹرل وقف کونسل کی اپنی بلڈنگ کی تعمیر کے سلسلہ میں سنٹرل وقف کونسل کے سکریٹری جناب حسن الدین احمد صاحب نے دلی وقف بورڈ کے چیرمین جناب ایس ایم ایچ برنی صاحب اور جوائنٹ سکریٹری صاحب منسٹر آف ہیلتھ ریلیف سے بتاریخ ۱۴ جون ۱۹۷۴ء ایک تفصیلی ملاقات کی جس میں جناب حسن الدین صاحب۔ او۔ ایس۔ ڈی وقف اور سکریٹری دلی وقف بورڈ میجر حسین صاحب کی موجودگی میں تفصیل سے گفتگو ہوئی۔ بات چیت کے بعد یہ طے پایا کہ برنی صاحب مسجد بابو العمر واقع چترگپت روڈ سے ملحقہ جو کونسل کی بلڈنگ کے لئے نہایت مناسب ہے موقع پر جاکر بذات خود معائنہ فرمائیں اور ریلیف ڈیولپمنٹ کے حکام کو ایک خط لکھیں کہ اس مسجد کو محکمہ آثار قدیمہ سے سنٹرل وقف کونسل کے حق میں واگزار کر دیا جائے۔

کمیٹی برائے ترقی شہری املاک کی دوسری میٹنگ بتاریخ ۱۹ اگست ۱۹۷۴ء زیر صدارت عالی جناب ایف ایچ محسن صاحب نائب وزیر داخلہ و اوقاف منعقد ہوئی۔

کمیٹی نے کافی غور وخوض کے بعد سال ۷۵-۱۹۷۴ء کے لئے جو پانچ لاکھ روپے اوقافی املاک کی ترقی کے لئے منظور کئے ان کو دوبارہ حسب ذیل اوقافی املاک کی ترقی کے لئے دیئے جانے تجویز کئے۔

۱۔ سرائے مسجد وقف۔ وجے واڑہ		ایک لاکھ روپے
۲۔ تروویلی اسکیم۔	طامل ناڈو	ایک لاکھ روپے
۳۔ خواجہ بازار اسکیم۔	گلبرگہ	ایک لاکھ روپے
۴۔ کیرالہ وقف بورڈ اسکیم برائے تعمیر بلڈنگ بمقام ارناکلم۔		ایک لاکھ روپے
۵۔ ریز روفنڈ		ایک لاکھ روپے
	میزان	پانچ لاکھ روپے

پانچ لاکھ روپے کا چیک سنٹرل وقف کونسل کے دفتر میں موصول ہوگیا ہے جو اسٹیٹ بینک آف انڈیا میں کونسل کے حساب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ محولہ وقف املاک سے متعلقہ ریاستی وقف بورڈس اور متولی صاحبان کو منظوری رقم قرضہ سے مطلع کر دیا گیا ہے۔

ایک مقامی ڈیولپمنٹ کمیٹی مشتمل ایک متولی۔ ریاستی وقف بورڈ کا ایک نمائندہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایک انجینئر اور ایک مقامی ذی اثر شخص جو اسکیم روبہ عمل لانے میں دلچسپی رکھتا ہو تشکیل کئے

جانے کے سلسلہ میں ریزولوشن منظور کیا جائے بینیجنگ ٹرسٹی اور متولی صاحبان سے تحت ... ریزولوشن مقامی ڈیولپمنٹ کمیٹی تشکیل کرنے کے سلسلہ میں استدعا کی گئی ہے ۔

یہ قرارداد بھی منظور کی گئی کہ چودھری طیب حسین خاں صاحب (ایم ۔ پی) سے درخواست کی جائے کہ وہ ایک ماڈل ڈرافٹ بائلز جو سنٹرل وقف کونسل وصول کنندہ رقوم سے تکمیل کرائے گی وکیل کی مدد سے تیار کریں اور ان شرائط کا مسودہ بھی تیار کریں جس کی رو سے رقوم قرضہ دلائے گی اور ان کی واپسی عمل میں آئے گی ۔ اس ریزولوشن کے تحت طیب موصوف نے وکیل کی مدد سے دونوں ماڈل ڈرافٹ تیار کرانے میں خود چیرمین صاحب سنٹرل وقف کونسل کی خدمت میں برائے منظوری پیش کی ہیں ۔

ڈاکٹر ایم ۔ اے خسرو صاحب نے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ ایک پروفارما تیار کر کے دیں گے جس کی بنا پر فراہم کیا جاسکتا ہے تاکہ اسکیم کی افادی قیمت کا اندازہ لگایا جاسکے ۔ اس ریزولوشن کے تحت ڈاکٹر خسرو صاحب سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ مطلوبہ پروفارما تیار کر دیں ۔

دوسری میٹنگ میں پاس شدہ ریزولوشن کے تحت رقوم متعلقہ وقف بورڈس کو ضروری تکمیلات کے بعد ادا کر دی جائیں گی ۔

جملہ ریاستی وقف بورڈس سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ برائے سال ۱۹۷۵-۷۶ء ترقیاتی اسکیموں کو بروئے کار لانے کے لئے اپنی اپنی تجاویز بھیجیں ۔

تحت سنٹرل وقف کونسل رولس ۱۹۶۵ء سنٹرل وقف کونسل کی ایک میٹنگ ماہ ستمبر یا اکتوبر میں منعقد ہونا چاہئے ۔ جملہ ممبران سنٹرل وقف کونسل ۔ ریاستی وزرا انچارج وقف اور چیرمین صاحبان ریاستی وقف بورڈس سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ سنٹرل وقف کونسل کی چودھویں میٹنگ کے لئے اپنی اپنی تجاویز بھیجیں ۔ اب تک صرف جسٹس بشیر احمد سعید صاحب ممبر سنٹرل وقف کونسل اور بہار سنی وقف بورڈ ۔ بہار شیعہ وقف بورڈ ۔ اڑیسہ وقف بورڈ ۔ کچھ وقف بورڈ اور کمشنر ویسٹ بنگال کی جانب سے تجاویز موصول ہوتی ہیں ۔ جو بھی تجاویز موصول ہوئی ہیں وہ اہم نہیں ہیں ۔ ان میں زیادہ تر تجاویز ایسی ہیں جو وقف انکوائری کمیٹی کے زیر غور ہیں یا ان تجاویز کا اعادہ ہیں جو سنٹرل وقف کونسل کی تیرھویں میٹنگ میں پیش ہو چکی ہیں ۔ بقیہ جملہ ریاستی وقف بورڈس کو یاد دہانی کرائی جا رہی ہے کہ اپنی اپنی تجاویز دس نومبر تک بھیج دیں اُن کی تجاویز کے موصول ہونے کے بعد یہ طے کیا جاسکے گا کہ سنٹرل وقف کونسل کی میٹنگ بلائی جائے یا نہیں ۔

سنٹرل وقف کونسل کی مالی حالت ۳۰ ستمبر ۱۹۷۴ء تک مندرجہ ذیل ہے ۔

فکس ڈیپازٹ	۲۰۰۰۰۰-۰۰ لاکھ روپے
کرنٹ اکاونٹ	۵۰۸۲۵۱-۱۵ لاکھ روپے
لون اور پیشگی دی گئی رقوم	۲۰۵۰۰-۰۰ ہزار روپے
ممکن الحصول رقوم	۷۲۹۷۹۶-۱۵ روپے

بہار اسٹیٹ سنی وقف بورڈ

ترقیاتی منصوبے

بہار صوباتی مجلس اوقاف کی مالی حالت بہتر نہ ہونے کی وجہ سے ترقیاتی اسکیموں اور طالب علموں کو وظائف دیئے جانے کے لئے کوئی رقم مخصوص نہ کی جاسکی

کنٹری بیوشن

زیر نظر مدت کے دوران کل ۲۸۶۰۲-۰۱ روپے موصول ہوئے ہیں اس سلسلہ میں اگر ارکان حکام کی طرف سے کسی بھی قسم کا تعاون نہیں پیش کیا گیا ہے ۔

میٹنگس

اس عرصہ میں کل تین میٹنگس منعقد ہوئیں اور موجودہ نئے اوقاف کا رجسٹریشن عمل میں آیا جس کے لئے متولی بھی مقرر کر دیتے گئے ہیں ۔ بورڈ کی بنائی ہوئی مقامی اوقاف کمیٹیاں جب کبھی بھی ضرورت پڑتی ہے اپنے علاقہ کی وقف معلومات بہم پہنچاتی ہیں ۔

بقایا کنٹری بیوشن کی وصول یابی

زیر نظر مدت کے دوران ۲۴۶۲۰-۳۲ روپے وصول ہوئے ہیں ۔

سروے چونکہ صوبائی حکومت نے وقف کمشنر کا تقرر نہیں کیا تھا اس لئے سروے کا کام کچھ بھی نہیں ہو سکا ۔

وقف بورڈ کی املاک پر ناجائز قبضہ کرنے والوں پر مالی سال ۷۴-۱۹۷۳ء کے دوران میں دو مقدمہ درج کرائے گئے تھے جن کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا ہے ۔

مدھیہ پردیش وقف بورڈ

زیر نظر مدت کے دوران ترقیاتی منصوبوں کے لئے فنڈ میں روپے کی کمی کی بدولت کوئی فنڈ مخصوص نہیں کیا گیا ۔

متولیوں سے سالانہ کنٹری بیوشن کی وصول یابی میں اطمینان بخش پیش رفت ہوتی جس کی حقیقت گذشتہ تین سال کے دوران ہونے والی وصولیابی کی مندرجہ ذیل شرح سے بخوبی واضح ہو جائے گی ۔

۱۹۷۱-۷۲ء	۷۵۵۲۵ روپے
۱۹۷۲-۷۳ء	۷۴۸۱۸ روپے
۱۹۷۳-۷۴ء	۱.۹۹۸۵ روپے

نوٹ ۔ مندرجہ بالا اعداد و شمار میں پچھلے سالوں کے بقایاجات بھی شامل ہیں زیر نظر مدت میں وصول ہونے والی (۱۰۹۹۸۵ روپے) رقوم میں شعبہ داؤدی بوہرا اوقاف پر ۳۱-۳-۱۹۷۲ء تک واجب الادا رقوم میں سے ادا کی گئی پچاس ہزار روپے کی وہ رقم بھی شامل ہے جو ہز ہائنس ڈاکٹر سیدنا صاحب

لے ادا کی ہے۔

متولی عام طور سے سالانہ کنٹری بیوشن ادا نہیں کرتے ان کے خلاف سرٹیفکیٹ جاری کئے جاتے ہیں اور چونکہ تحصیل داران ملنے میں فوری کارروائی نہیں کرتے اس لئے وصول یابی میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ زیر نظر مدت کے دوران ہونے والی آمدنی کی تفصیل ماہ بہ ماہ مندرجہ ذیل ہے۔

اپریل ۱۹۷۴ء	۲۱۶۹۶-۰۰ روپے
مئی ۱۹۷۴ء	۷۰۷۹-۰۰ روپے
جون 〃 〃	۷۳۸۴-۰۰ روپے
جولائی 〃 〃	۳۴۱۱-۰۰ روپے
اگست 〃 〃	۲۷۲۰۱-۰۰ روپے
ستمبر 〃 〃	۱۰۰۱۲-۰۰ روپے
میزان	۷۶۸۳۴-۰۰ 〃

زیر نظر مدت کے دوران کل دو میٹنگس منعقد ہوئی ہیں جن میں مندرجہ ذیل اہم فیصلے کئے گئے۔

(الف) کمیٹی نے تین ہزار روپے کی رقم ان چھ مساجد کی مرمت کے لئے منظور کی جو شکستہ حالت میں ہیں اور جن کی مرمت کی فوری ضرورت ہے۔ ایک طالب علم کو دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کی حصولی ۱۶۰ روپے کا وظیفہ دیا جانا بھی منظور کیا۔

(ب) کھرہا کا دن کی مسجد پر ۴ر اگست ۱۹۷۴ء کو فائرنگ کے سلسلے میں وقف بورڈ کے فیلڈ انسپکٹر کو موقع پر جا کر معائنہ کرنے اور اس کی رپورٹ پیش کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا لہٰذا انسپکٹر نے اپنی رپورٹ کمیٹی کے سامنے پیش کر دی ہے۔ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ حکومت مدھیہ پردیش کی توجہ اس واقعہ کی طرف مبذول کرائی جائے۔

زیر نظر مدت کے دوران کل ۲۱ متولیوں کو یا تو ہٹایا گیا یا وہ انتقال کر گئے اور ان کی جگہوں پر ۲۲ نئے متولیوں کو مقرر کرنے کے علاوہ ۱۶ نئے رجسٹر شدہ اوقاف کے لئے بھی متولی مقرر کئے گئے ہیں۔

وقف جائدادوں کی بحالی کے لئے کوئی نیا مقدمہ عدالت میں دائر نہیں کیا گیا ہے۔ پہلے سے دائر شدہ مقدمات کا فیصلہ ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ گورنمنٹ کے زیر تصرف اوقاف کی کسی بھی جائیداد کو واگذار نہیں کیا گیا۔

زیر نظر مدت کے دوران حکومت نے بورڈ کی ترقی یا اس کے فائدے کے لئے کوئی بھی قدم نہیں اٹھایا ہے۔

یوپی سنی سنٹرل بورڈ آف وقفس لکھنؤ

ترقیاتی و تعمیری اقدامات

بورڈ کے بجٹ کی مدات صرف میں دفعہ ۲۷ یوپی وقف ایکٹ ۱۹۶۰ء کی پابندی کرتے ہوئے نئی عمارات وقف کی تعمیر یا بوسیدہ عمارات کی مرمت کا نمبر دفعہ مذکور کی مدات الفنتاہ سے عہدہ برآ ہونے کے بعد آتا ہے۔ ایسی صورت میں مقدم امور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد مشکل ہی سے کوئی معتد بہ رقم پس انداز ہوتی ہے جس سے تعمیری منصوبوں کو پورا کیا جا سکے۔ پھر بھی اشد ضرورتوں میں سب بورڈ نے بہ قدر گنجائش اس طرف بھی توجہ کی ہے۔ مسجد اور مسجد گورنمنٹ ہاؤس لکھنؤ اس کی دو مثالیں ہیں۔ بالعموم متولیان اپنی اوقاف کی عمارات کی درستی کا انتظام و دیکھ بھال خود کرتے رہتے ہیں۔ بورڈ صرف ان چند اوقاف کی نگہداشت خود کرتا ہے جو زیر دفعہ ۴۸ وقف ایکٹ مدت مقررہ کے لئے بورڈ کے براہ راست زیر انتظام ہیں۔ اسی قسم کا ایک وقف درگاہ بہرائچ ہے۔ یہ درگاہ بورڈ کے براہ راست زیر انتظام ہے بورڈ نے درگاہ کے فنڈ سے اس کے نظام آب رسانی کو درست کرنے کے لئے ایک ٹیوب ویل کا انتظام کیا۔ جس کے اخراجات تقریباً بارہ ہزار روپے ہوتے۔ بورڈ کے فنڈ میں مرمت و تعمیرات کے لئے کسی رقم کو مخصوص کرنے کا التزام نہیں ہے۔ عمارت مسافر خانہ محمد یوسف لکھنؤ ایک عرصے سے نامکمل حالت میں چلی آ رہی تھی۔ متولی وقف مذکور جو بانی وقف فرزند ارجمند ہیں وقف نامہ متعلقہ کی اس شرط کے غلط مفہوم سے کہ تا تکمیل مسافر خانہ کا افتتاح نہ ہوگا۔ اس کے جاری کرنے میں پس و پیش کر رہے تھے لہٰذا بورڈ نے انھیں اس بارہ ہدایت جاری کی کہ مسافر خانہ مذکور کو ضروری تعمیر کے بعد جاری کر دیں۔ متولی نے ۱۵ر دسمبر ۱۹۷۴ء تک تعمیل کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

تعلیمی امداد

حسب سابق اگست و ستمبر ۱۹۷۴ء میں ضرورت مند طلبا، مدارس و لائبریریوں کو ایک مخصوص فنڈ سے امداد دی گئی۔ اس مد میں ۸ ہزار روپے تقسیم کئے گئے۔ اس کے علاوہ مدرسہ نسواں چوک، لکھنؤ کی عمارت کی مرمت کے لئے پانچ سو روپے منظور کئے گئے۔ دارالمصنفین... اعظم گڑھ کے موقر جریدہ معارف کی مالی پریشانیوں کے پیش نظر دو ہزار روپے کی امداد دی گئی۔ مولانا عبدالغفور صاحب طالب علم کو جامعہ ازہر مصر کے لئے سفر خرچ مبلغ تین ہزار روپے دیئے گئے ایک طالب علم کو ایک ہزار روپے دیئے گئے۔

وصول یابی چندہ و تعاون حکام مال

وصولی چندہ کی رفتار میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ درخواست وصولی ذریعہ کلکٹر جاری کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

جلسہ ہائے بورڈ

۱۹۶۹ء سے جیسا اس سے قبل کی رپورٹوں میں لکھا جا چکا ہے بورڈ کارفرما نہیں ہے۔ حالیہ نئے بورڈ کے خلاف بھی رٹ فائل ہو گئی اور عدالت العالیہ ہائی کورٹ نے تشکیل و نشست بورڈ کے خلاف حکم امتناعی جاری کر دیا ہے۔ لہٰذا بورڈ کے انعقاد یا نشست کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

تقرر متولیان

دوران مدت زیر رپورٹ ۹۲ متولیان کا تقرر عمل میں آیا اور ۱۵ متولیان کے خلاف

مدنی کا ۵۰ فیصدی بڑی مشکل سے وصول ہوتا ہے اس لئے حکومت بہار اتر پردیش سے استدعا کی گئی
ہی کہ مال گذاری اور لوکل سیس کے ساتھ وقف فنڈ کا مطالبہ بھی ذریعہ تلاطمیان وصول کرایا
ائے جس پر اخراجات وصول ادا کئے جائیں گے۔ لیکن یہ تحریک مسترد کردی گئی کہ قانون وقف کی
سی دفعہ میں مطالبہ سال جاریہ کی وصولی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ ادارہ جات زیر
نگرانی بورڈ سے مطالبہ وقف فنڈ و حق انتظام تا بحد ۸۰ فیصد وصول ہو جاتا ہے۔ ۲۰ فیصد وصولی
ں لئے نہیں ہوتی کہ ان ادارہ جات اراضیات انعامی جو حکومت کی نگرانی میں ہیں اور جن کی
رنی حکومت کرتی ہے۔ لاوفی داران سے رقم بروقت وصول نہیں ہوتی۔ اس خصوص میں بھی
بمنت سے نمائندگی کی گئی ہے۔

ــــے فارم

تاحال جی فارم رقمی ...۔ ۲۰،۴۰۶ روپے جاری ہوچکے ہیں ان کے مقابلہ میں صرف
۵۰ روپے کی وصولی عمل میں آئی ہے۔

ف) ششماہی زیر رپورٹ میں بورڈ کے دو جلسے ہوئے ان جلسوں میں ۲۵ ہزار سے ز
آمدنی کے ۳۱ اداروں کے موازنہ جات کی منظوری دی گئی۔

ب) ۲۰ ادارہ جات کی شہری جائداد کو طویل المدت نزول پر دینے کی تجویز ہوئی۔

ج) چار جدید ادارہ جات کے اندراج کی منظوری دی گئی۔

د) ضلع کمیٹی اورنگ آباد۔ تعلقہ قندھار شریف کے علاوہ اداروں کی انتظامی کمیٹیوں
کی منظوری دی گئی۔

ہ) علاوہ ازیں بورڈ نے ایجوکیشنل اسکالرشپ ٹرسٹ ابتدائی طور پر پانچ ہزار کی رقم
سے قائم کیا ہے۔ اس ٹرسٹ کے تحت فنی تعلیم پانے والے جو ڈگری یا ڈپلومہ کورس
کی تکمیل کر رہے ہوں ان کو سالانہ وظائف دینا طے کیا گیا ہے۔

و) علاوہ ازیں مختلف ادارہ جات اوقافی سے ان کی آمدنی پر مناسب رقم کا تعین کر کے
اب موازنہ تعلیمی و رفاہی رقمی ...۔ ۲۳۷۶۱ روپے منظور کیا گیا جس میں سے مبلغ
بیس ہزار روپے تعلیم پر اور مبلغ ...۔ ۳۷۶۱ روپے رفاہی اغراض کے لئے رکھے
گئے ہیں جن کو اضلاع مرٹھواڑہ کے تعلیمی اداروں پر صرف کیا جا رہا ہے۔ رفاہی
اغراض کے لئے جو رقم مختص کی گئی ہے۔ وہ نادار بیوگان کی امداد بے معاش مطلبر
کی تعمیر و ترمیم پر صرف کیا جانا طے کیا گیا ہے۔

ـف کا سروے

اضلاع مرٹھواڑہ کے اوقاف کا سروے مکمل ہوچکا ہے۔ رپورٹ گورنمنٹ گزٹ
پر طبع ہے۔ اضلاع اورنگ آباد بیٹر کی طباعت ہوچکی ہے۔ باقی اضلاع کی رپورٹ
عنقریب ہے۔

قبضہ ہائے ناجائز کے تحت بورڈ نے ۳۹۰ مقدمات دائر کئے گئے تھے جن کے
تاحال ۱۳۸ مقدمات فیصل ہوچکے ہیں ان میں سے ۸۲ بحق بورڈ فیصل ہوتے۔
رڈ کے خلاف ہوئے۔ ۸ مقدمات میں صلح کی گئی۔ ۴ مقدمات قانونی فروگذاشت

کی وجہ واپس لئے گئے ہیں باقی ۲۵۹ ہنوز مختلف عدالتوں میں زیر دوران ہیں۔

حکومت اور لوکل باڈیز کے موقوفہ جائداد پر ناجائز قبضوں کی ایک فہرست جس میں
ادارہ جات کی تعداد ۱۰۸ بتائی گئی تھی ایک عرصہ قبل حکومت کے پاس روانہ کی گئی ہے لیکن
تاحال حکومت نے اس خصوص میں کسی ادارہ کی نسبت کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا۔

حکومت مہاراشٹر کی خدمت میں اوقافی جائدادوں رینٹ کنٹرول ایکٹ اور
پبلک ایکٹ کے اثر سے مستثنیٰ قرار دینے کی تحریک کی گئی ہے۔ جس پر حکومت نے تاحال کوئی
فیصلہ نہیں کیا۔

قاضی ایکٹ نشان ۱۲ بابت سنہ ۱۸۸۰ء میں ضروری ترمیم کے لئے تحریک کی گئی ہے۔ جو
حکومت کے زیر غور ہے۔

حکومت نے ذریعہ مراسلہ کے ذریعہ جناب عبدالحفیظ صاحب ڈی۔ سی کلکٹر
آفس اورنگ آباد کو حکومت کی جانب سے ایک مشیر کی حیثیت سے مقرر کیا ہے۔ اور ہدایت
دی گئی ہے کہ بورڈ کے ہر جلسہ میں موصوف کو طلب کیا جایا کرے۔ چنانچہ موصوف کو ہر جلسہ میں
طلب کیا جاتا ہے۔ موصوف کے مفید مشوروں سے بورڈ استفادہ کر رہا ہے۔

بہار اسٹیٹ شیعہ وقف بورڈ

وقف بورڈ کے مالی سال ۷۵-۱۹۷۴ء کے بجٹ میں تعمیری کام سے متعلق کوئی مد
نہیں رکھی گئی لیکن وقف بورڈ نے دو ترقیاتی اسکیموں (۱) شاہی سنی مسجد (پتھر کی مسجد) کی
جائداد اور (۲) حاجی فرحت حسین اور راحالت حسین کی وقف جائیدادوں۔ واقع پٹنہ کی تعمیر
اور اس میں ترمیم کرنے کی اجازت دے دی ہے۔

شاہی سنگی مسجد کی رہائشی اراضی پر ایک دوکان کی تعمیر پر پانچ ہزار روپے کی لاگت
آئی ہے اور اس کو ساٹھ روپے ماہوار پر اٹھا دیا گیا ہے۔ مزید دکانوں کے بنوانے کا پروگرام
بورڈ کے زیر غور ہے۔

حاجی فرحت حسین اور راحالت حسین کی وقف جائدادوں کی تعمیر اور ان میں ترمیم پر
چالیس ہزار روپے صرف کئے ہیں۔ یہ رقم ایک پرانا گودام اور اس سے ملحقہ اراضی کو فروخت
کرنے سے حاصل ہوں گے۔

وقف بورڈ نور جہاں بیگم کی جائیدادوں واقع پٹنہ پر غیر قانونی طور پر قبضہ کر لی گئی جگہوں
کو عدالت کے ذریعہ خالی کرانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ یہ جائیدادیں اب وقف بورڈ کے
زیر انتظام ہیں۔ بورڈ نے ان جائیدادوں کے انتظام کے لئے ایک ایڈمنسٹریٹیو کمیٹی قائم
کر دی ہے۔

دس دوکانوں کی تعمیر (گراؤنڈ فلور پر) سے متعلق ایک ترقیاتی اسکیم تیار کی گئی ہے
ان دوکانوں کی تعمیر پر ۶۶ ہزار روپے صرف ہوں گے۔ اس پلان کا نقشہ اسٹیٹ گورنمنٹ
کو بتاریخ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۴ء بھیج دیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ درخواست کی ہے کہ اس کا نقشہ
سینٹرل وقف کونسل کو بھی بھیج دیا جائے تاکہ کونسل سے ...۔ ۵۰۰۰ روپے کی رقم بطور قرض
حاصل کی جاسکے۔

مغری بیگم کی وقف جائیداد جو مظفر پور میں واقع ہے کہ کچھ حصہ کو بذریعہ متولی فروخت کر دیا گیا ہے۔ یہ فروخت بحکم وقف بورڈ عمل میں آتی ہے۔ اس جائداد کی باقی ماندہ زمین پر دور ہائشی کوارٹروں کی تعمیر کروا کران کو کرائے پر اٹھا دیا گیا ہے اس طرح وقف اراضی کی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے۔

بورڈ کو متولیوں پر واجب الادا رقوم ۱۰۱۹۲۶-۷۲ روپے میں سے ۳۶۲۴۰۰ روپے وصول ہوئے ہیں۔ وقف بورڈ محکمہ قانون کا شکر گذار ہے کہ اس نے ان متولیوں سے جو وقف بورڈ کا کنٹری بیوشن ادا نہیں کرتے ہیں اس کی ادائگی کرانے کے لئے بورڈ کو تعاون بہم پہنچایا ہے۔

زیر نظر مدت کے دوران کل چار میٹنگس منعقد ہوئیں جس میں مندرجہ ذیل اہم فیصلے کئے گئے۔

۱۔ بورڈ نے فیصلہ کیا کہ ان متولیوں کے خلاف جو بورڈ کا کنٹری بیوشن ادا نہیں کرتے ہیں سخت اور قانونی قدم اٹھانے چاہئیں۔

۲۔ بورڈ نے ان متولیوں کے خلاف جو رقوم کی ادائگی میں کوتاہی برتتے ہیں یا بالکل ادا نہیں کرتے۔ مقدمات دائر کرنے کے لئے پانچ ہزار روپے کا قرضہ امام بندی بیگم کی وقف جائداد کے فنڈ میں سے لیا ہے۔ اسٹیٹ نے اس کام کے لئے دس ہزار روپے کا قرضہ لینا منظور کیا تھا۔

۳۔ ایڈمنسٹریٹو مشکلات پر قابو پانے کے لئے اسٹیٹ گورنمنٹ نے ...... روپے کا مزید قرضہ دینا منظور کیا تھا جو ابھی تک بورڈ کو وصول نہیں ہوا ہے۔

وقف بورڈ نے اسٹیٹ گورنمنٹ سے درخواست کی ہے کہ وہ اہم اہم جائدادوں کے حسابات کو چیک کرانے کے لئے بہار کے اکاؤنٹنٹ جنرل کو لکھیں کہ وہ اس کام میں گورنمنٹ کے آڈیٹرس کو تعاون بہم پہنچائیں۔

حسن امام وقف کی جائدادوں (وقف علی الاولاد) کے متولیوں نے جو استغاثہ وقف بورڈ کے خلاف اوقافی جائدادوں کے اختیارات کو چیلنج کرنے کے سلسلہ میں دائر کیا تھا ہائی کورٹ نے اس کا فیصلہ وقف بورڈ کے خلاف صادر کر دیا۔

وقف بورڈ نے سنٹرل وقف کونسل ۱۹۵۴ء کی دفعہ ۳(۱) (ا) میں ترمیم کئے جانے کے سلسلہ میں کوشش کی اور وہ ایک آرڈیننس نافذ کرانے میں کامیاب ہو گیا ہے جس میں وقف کی تعریف کو مناسب طریقہ سے ترمیم کر کے وقف علی الاولاد کے معیار کو دیگر اوقاف کے معیار کے مطابق بنایا گیا۔

تقرر متولیان

کسی نئے متولی کا تقرر نہیں کیا گیا ہے۔ ایک اہم ایڈمنسٹریٹو کمیٹی بنائی گئی ہے جو پٹنہ میں واقع نورجہاں بیگم کی وقف جائیدادوں کی دیکھ بھال بہتر طریقہ سے کرے گی۔

وقف بورڈ نے دو اہم کمیٹیاں تشکیل کی ہیں۔ ۱۔ فائنانس کمیٹی (۲) ڈیولپمنٹ کمیٹی یہ کمیٹیاں وقف بورڈ کے بجٹ بنانے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرنے کے علاوہ ایسی ترقیاتی اسکیمیں بھی تیار کرتی ہے جس سے وقف جائیدادوں کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔

غیر قانونی طور پر قبضہ کر لی گئی وقف املاک کی بازیابی کے لئے وقف بورڈ نے مقدمہ دائر کئے تھے جن کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔

اسٹیٹ گورنمنٹ نے سنٹرل وقف ایکٹ ۱۹۵۴ء کی دفعہ ۳۶ بی کے تحت قانون بنائے ہیں جن سے وقف املاک کی بازیابی میں آسانی ہوتی

یوپی شیعہ سنٹرل بورڈ آف وقفس

ترقیاتی منصوبے

لکھنؤ میں واقع میاں محمد داراب علی خانصاحب کی وقف زمین جو بورڈ کے زیر انتظام ہے تعمیرات کا کام جاری ہے۔ ان دوکانوں کی تعمیرات پر ... ۱۶۰۰۰ روپے خرچ ہوں گے۔ امید ہے کہ یہ کام ختم مارچ ۱۹۷۵ء تک مکمل ہو جائے گا۔

کنٹری بیوشن

متولیوں نے عام طور پر بورڈ کا کنٹری بیوشن ادا کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان کو بر وقت اور متواتر یاد دہانیاں کرائی گئیں تھیں جس کے نتیجہ میں انھوں نے مالی سال ۷۵-۱۹۷۴ء کے پہلے شش ماہی میں ۲۲۸۹۹-۴۳ روپے ادا کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ریونیو حکام سے کسی قسم کی مدد نہیں لینی پڑی۔ ۲-۴۳ روپے کی مزید رقم بصورت کو پینگا چارجز۔ ریکارڈس کا معائنہ کرنے کی فیس اور یوپی وقف بورڈ ایکٹ ۱۹۴۴ء کی دفعہ ۴۲ کے تحت موصول ہونے والی درخواستوں کی فیس موصول ہوتی ہے۔

بورڈ کی میٹنگس

جیسا کہ اس سے پہلے رپورٹ میں تحریر کیا جا چکا ہے۔ شیعہ مرکزی وقف بورڈ کام نہیں کر رہا ہے اور نہ ہی نیا بورڈ تشکیل ہوا ہے بلکہ گورنمنٹ کے مقرر کردہ کنٹرولر شری امتیاز حسین سابق ایم۔ ایل۔ اے ابھی تک فرائض بورڈ انجام دے رہے ہیں ایسی صورت میں بورڈ کی کوئی میٹنگ کے منعقد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تقرر متولیان

یکم اپریل سے ۳۰ ستمبر ۱۹۷۴ء کے عرصہ میں بارہ نئے اوقاف وقف بورڈ میں رجسٹر کرائے گئے ہیں۔ ان بارہ اوقاف میں سے ۸ وقفس کے لئے نئے متولیوں کا تقرر کر دیا گیا ہے۔ جب کہ ان میں سے دو کے لئے مینیجنگ کمیٹی بنا دی گئی ہے۔ باقی ماندہ وقف جائیدادوں کے لئے متولیوں کی میعاد ماہ ستمبر ۱۹۷۴ء تک بڑھا دی گئی ہے۔ مندرجہ ذیل دو وقف جائیدادوں کا انتظام وقف بورڈ نے براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

۱۔ وقف آل انڈیا شیعہ یتیم خانہ کا ئنظ۔ مین روڈ۔ لکھنؤ

۲۔ وقف نواب سہنشاہ بیگم۔ وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ۔

متولیوں پر بقایا رقوم کی ادائیگی

زیر نظر مدت کے دوران گورنمنٹ کی کلکشن ایجنٹ مشینری سے متولیوں پر بقایا رقوم (کنٹری بیوشن) کی ادائیگی کا سلسلہ میں مدد حاصل کرنے کی ضرورت اس لئے پیش نہیں آئی کیونکہ متولیوں پر واجب الادا رقوم بہت ہی قلیل تھیں۔ اور امید تھی کہ یہ رقوم خط و کتابت کے ذریعہ ہی سے حاصل ہو جائیں گی۔

جیسا کہ مندرجہ بالا پیراگراف ۴ میں بتایا جا چکا ہے بارہ نئے اوقاف کا رجسٹریشن عمل میں آیا ہے۔ وقف بورڈ کے انسپکٹر کی پہلے ہی سے دوسرے کاموں میں مشغولیت کی بناء پر سروے کے کام میں پیش رفت نہیں ہو سکی۔ مظفر پور میں واقع وقف جائیدادوں کے لئے بورڈ کی تشکیل کردہ سب کمیٹی اپنے فرائض منصبی خوش اسلوبی سے انجام دے رہی ہے۔

ناجائز طور پر قبضہ کر لی گئی وقف جائیدادوں کی بازیابی کے لئے جو مقدمات دائر کئے گئے تھے ان کا ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔

جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کنکس انگلش ہسپتال ویلزنانی شاہی شفاخانہ واقع لکھنؤ (۲) کربلائے نرہی واقع لکھنؤ (۳) سرائے حسن رضا خان چوک واقع فیض آباد کی وقف جائیدادیں ابھی تک اسٹیٹ گورنمنٹ کے قبضہ میں ہیں۔ ان جائیدادوں کو وقف بورڈ کے زیر انتظام لئے جانے کے سلسلہ میں خط و کتابت جاری ہے ابھی تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے کنکس پور ہاؤس واقع لکھنؤ کی ایک دوسری مثال زیر نظر ہے۔

یو پی وقف (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۷۱ء کی دفعہ ۵۷ اے اور ۱۱۹ کے تحت وقف بورڈ کے فیصلوں کے خلاف سول جج کی عدالت (ضلع لکھنؤ) میں جو اپیلیں دائر کی گئی تھیں ان میں سے صرف ایک کا فیصلہ بورڈ کے خلاف ہوا ہے۔ باقی چار کا فیصلہ ابھی نہیں ہوا ہے اس طرح سے ایک اپیل جو منصف کی عدالت (ساؤتھ لکھنؤ) میں کی گئی تھی اور ایک استغاثہ جوالہ آباد ہائی کورٹ (لکھنؤ بنچ لکھنؤ) میں دائر کیا گیا تھا۔ کا فیصلہ ابھی نہیں ہوا ہے۔

زیر نظر مدت کے دوران شیخ فیاض حسین کی اراضی نمبر ۱۹/۱ کے ٹکڑے واقع چوہٹا لال خاں۔ وارانسی کو لیز پر دے دیا گیا ہے۔

وقف بورڈ نے زیر نظر مدت کے دوران کسی بھی وقف اراضی کو فروخت نہیں کیا ہے مظفر پور کی وقف جائیدادوں کے لئے وقف بورڈ نے جو ایک سب کمیٹی بنائی تھی وہ اپنا کام صحیح طور پر انجام دے رہی ہے۔ اس کمیٹی نے چھپی ہوئی وقف زمینوں کی دریافت اور کھوئی ہوئی وقف املاک کا پتہ لگایا ہے۔ وقف بورڈ نے ایسی زمینوں کا وقف بورڈ میں رجسٹریشن کروانے اور کھوئی ہوئی زمینوں کی بازیافت کے لئے کارروائی شروع کر دی ہے بورڈ کا ارادہ اس طرح کی کمیٹیاں دوسرے ضلعوں میں بھی بنانے کا ہے۔

میرٹھ میں واقع "وقف منصبیہ" کی نگرانی کے لئے وقف بورڈ نے ایک کمیٹی بنائی تھی یہ کمیٹی اس کو تفویض کردہ فرائض کو خوش اسلوبی سے انجام دے رہی ہے۔

سالانہ رپورٹ جامعہ ملیہ اسلامیہ

محترم امیر جامعہ۔ عزت مآب فخرالدین علی احمد صاحب

معزز خواتین وحضرات۔ ساتھیو اور عزیزو!

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا جلسۂ تقسیم اسناد اس سال پھر چند ماہ کی تاخیر سے منعقد ہو رہا ہے لیکن یہ تاخیر ہم نے بخوشی اس لئے گوارہ کی کہ ہماری دلی خواہش تھی کہ آنجناب اس بار ہمارے تعلیمی گھر میں تشریف لاکر ہمیں نوازیں۔ ہم بے انتہا ممنون ہیں کہ آپ نے انتہائی مصروفیت کے باوجود ہماری درخواست کو قبول کیا اور خطبہ دینے کی زحمت گوارا کی۔

جناب والا!

ہمارے درمیان اس وقت آپ کی موجودگی نہ صرف ہمت افزائی کا باعث ہے بلکہ جامعہ کے لئے ایک نیک فال بھی ہے۔ ہرچند آپ کا اس ادارے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رہا ہے لیکن آپ نے در پردہ اس کی ہمیشہ مدد کی ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ اس سے آپ کا ایک ربط پنہاں ضرور رہا ہے۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ آپ کو مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب سے کس قدر ارادت اور عقیدت رہی ہے اور جامعہ ملیہ اسی باکمال شخصیت کا ایک اعجاز مسیحائی یوں ہے کہ جامعہ کے لئے آپ کے دل میں ایک نرم گوشہ ہمیشہ موجود رہا، اور آپ کے دوران وزارت میں جامعہ کی مشکلات کے سلسلہ میں جب جب ہم نے آپ سے رجوع کیا آپ کو اس کی مدد پر آمادہ پایا۔ آپ کی کشش کا فن کرم اگر اسی طرح قائم رہی تو کیا عجب منزل مقصود تک پہونچنے کے لئے یہ بھی ایک جادۂ رہ بن جائے۔!

جناب والا! اپنی سیاسی زندگی میں آپ کو بہت سے تعلیمی ادارے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا لیکن آج جس ادارے میں آپ رونق افروز ہیں اس کے فسانے اور زمانے دونوں عجیب وغریب رہے ہیں۔ قومی زندگی کے ایک زبردست بحران میں اس نے ایک سیاسی ہنگامہ پر جنم لیا۔ اس کے بعد اس نے زمانہ کے کئی نشیب وفراز دیکھے۔ آہ وفغاں کے کئی مقامات سے گذرا لیکن اس نے اپنے مقاصد کا سودا کبھی نہیں کیا۔ تعلیمی کام ہو کہ تعمیری، سماجی خدمت ہو کہ اصلاحی اس نے اپنی نظر ادھر ادھر کو کبھی نہیں چھوڑا اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جامعہ محض ایک تعلیمی ادارہ نہیں۔ یہ ہماری قومی زندگی کی ایک تحریک اور تاریخ ہے۔ جس کے تعلیمی مقاصد اس کے سماجی مقاصد سے ہمیشہ پیوستہ رہے ہیں۔

اور۔ جامعہ کا یہ رول ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ سیاسی آزادی مل جانے کے بعد بھی غلط سمجھتے ہیں وہ لوگ جو ایسا نہیں سمجھتے۔ یہ ضرور ہے کہ فراغت نے ہماری ارادت کو گو نہ کمزور کر دیا ہے۔ سیاست بعض اوقات خدمت کو ملوث کر دیتی ہے۔ فراست نے اس جنون کی حد بندی کر دی ہے جس نے اس ادارے کو جنم دیا تھا۔ روز بروز اس تعلیمی نگر کی پیچیدگیاں بڑھتی جارہی ہیں۔ جیساکہ آپ کے علم میں ہے ہمارے کیمپس پر اغیار کی دست درازی ہے۔ ہماری بستی میں کئی گندی بستیاں آبسی ہیں۔ ہمارے تعلیمی پروگراموں پر نوکر شاہی کا آنکس ہے۔ سیاست کے غبار میں ہمارے مقاصد دھندلا گئے ہیں لیکن تاہم مایوس نہیں اس لئے کہ آپ ہم سے مایوس نہیں۔ ہمارا یہ عزیز وطن ہم سے مایوس نہیں۔

عام رپورٹ

جامعہ کا تعلیمی سال ۷۴-۱۹۷۳ء مقابلتاً پرسکون رہا اور خوشی کی بات ہے کہ طلبہ و دیگر کارکنان جامعہ کے مسائل باہمی گفتگو کے ذریعے خوش اسلوبی کے ساتھ طے کیے جاتے رہے اس میں شبہ نہیں کہ بڑھتی ہوئی اقتصادی الجھنوں اور گرتی ہوئی اخلاقی قدروں نے تعلیمی اداروں کی زندگی میں ہر جگہ ایک ہیجان سا پیدا کر رکھا ہے۔ جامعہ کا بحیثیت تعلیمی ادارے کے ان حالات سے غیر متاثر رہنا ایک ناممکن امر ہے۔ تاہم ابھی تک اس ادارے کے کارکنان اور طلبہ میں ایسے افراد موجود ہیں جو ذاتیات وسیاسیات سے بالاتر ہو کر ادارہ کے مفاد کو پیش نظر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال ہمارا اپنی زمینوں کے تحفظ کے لیے متفقہ طور پر سینہ سپر ہو جانا ہے۔ ہمیں اس بات پر مسرت ہے کہ جناب والا کی خصوصی توجہ اور موجودہ لیفٹننٹ گورنر کی ذاتی دلچسپی کی وجہ زمینوں سے متعلق ہمارے مسائل حل ہوتے جارہے ہیں۔ ہمیں امید ہے آپ حضرات کی عنایات سے ہم جامعہ نگر کو ایک صحیح معنوں میں تعلیمی بستی بنانے میں کامیاب ہوں گے اور اس طرح ہمارے بزرگوں کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا جو انھیں شہر سے کشاں کشاں اس شاداب ویرانے کی جانب لایا تھا۔

جامعہ کے مختلف تعلیمی اداروں میں امسال داخلوں کی کیفیت مندرجہ ذیل رہی۔

۱۔ جامعہ کالج	۵۱۲	۴۔ شعبہ سول [انڈر رورل انجینئرنگ	119
۲۔ ٹیچرز "	۲۸۵	۵۔ ہائر سکنڈری اسکول	199
۳۔ اسکول آف سوشل ورک	۷۶	۶۔ مڈل اسکول	۵۸۴

۷۔ نرسری اسکول ۵۹ ۸۔ بالک ماتا سنٹرز ۲۶۷

تعداد ۹۹۲ تعداد ۱۲۰۹

مجموعی تعداد ۔ ۲۲۶

جامعہ کالج

۷۴ ۔ ۱۹۷۳ء کے تعلیمی سال کے دوران جامعہ کالج میں حسب ذیل مستقل نئے تقررات عمل میں آئے ۔

۱۔ جناب ڈاکٹر قاضی محمد احمد صاحب ریڈر شعبہ جغرافیہ
۲۔ جناب انوار احمد صدیقی صاحب ۔ ریڈر شعبہ انگریزی
۳۔ جناب سید محمد راشد صاحب ۔ لکچرار شعبہ جغرافیہ
۴۔ جناب رضیاالوحیدری صاحب لکچرار اسلامیات

جامعہ کالج کے مختلف شعبوں کے اساتذہ نے اپنی علمی سرگرمیات جاری رکھیں ۔ بی ۔ آر ۔ گرور صاحب نے بنگلہ دیش ہسٹری کانگریس اور انٹرنیشنل سیمنار بابا فرید کے اجلاس میں جامعہ کی نمائندگی کی ۔ انڈین ہسٹری کانگریس کے اجلاس میں جامعہ کی جانب سے بی ۔ آر گرور صاحب ۔ رفاقت علی صاحب ۔ اور مجیب اشرف صاحب نے شرکت کی اور مقالے پڑھے ۔ شعبہ تاریخ کی دعوت پر جاپانی پروفیسر جناب آنا صاحب اور پروفیسر مرا صاحب نے توسیعی خطبات دیئے ۔

ڈاکٹر تنویر علوی صاحب ۔ سابق صدر شعبۂ اردو نے اصول تحقیق پر مضامین شائع کئے اور محمد ذاکر صاحب اور ڈاکٹر عنوان چشتی صاحب نے مختلف رسائل میں اردو زبان اور ادب کے موضوعات پر مضامین لکھے ۔

شعبہ معاشیات نے نارتھ انڈیا اکنامکس ایسوسی ایشن کی درخواست پر ایسوسی ایشن کی سالانہ کانفرنس منعقد کرنے کی ذمہ داری لی ۔ کانفرنس کے دو روزہ اجلاس کا انعقاد یو ۔ جی سی کی مالی اعانت سے مارچ ۱۹۷۴ء میں ہوا جس کا افتتاح سابق وزیر منصوبہ بندی جناب ڈی ۔ پی دھر صاحب نے کیا ۔

ڈاکٹر یا جد حسین لیکچرار شعبہ جغرافیہ نے جامعہ ملیہ کی جانب سے سائنس کانگریس میں شرکت کی اور کونسل آف جیوگرافرز کی مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے ۔ ڈاکٹر زاہد حسین زیدی صاحب نے جامعہ کے نمائندے کی حیثیت سے آل انڈیا برٹش سرانسٹی ٹیوٹ آف فزکس منعقدہ علی گڑھ میں شرکت کی اور انڈین جرنل آف پیور اور اپلائیڈ فزکس میں ریسرچ پیپر شائع کئے ۔

گزشتہ سال ناسازگار حالات کی وجہ سے انجمن اتحاد کے الیکشن نہ ہوسکے تھے ۔ امسال یہ الیکشن بڑے اچھے ماحول میں ہوئے اور مختلف مضامین کی ایسوسی ایشنوں کا قیام عمل میں آیا ۔ اکنامکس ایسوسی ایشن نے پروفیسر بی آر شیناۓ کے توسیعی لیکچر کرائے اسی طرح پولیٹیکل سائنس ایسوسی ایشن اور جیوگرافی ایسوسی ایشن کے تحت علی الترتیب پروفیسر رشید الدین خاں اور پروفیسر مونس رضا کے لیکچر ہوئے ۔ سائنس کے شعبہ جات فزکس اور کیمسٹری کی انجمنوں کے زیر اہتمام جناب اے ۔ پی ۔ جین اور پروفیسر دی ۔ را ماکرشنا صاحب کی تقریریں ہوئیں میتھیمیٹکس ایسوسی ایشن کے تحت پروفیسر بھٹناگر اور پروفیسر شانتی نراین نے مختلف موضوعات پر خطبات دیئے ۔

ٹیچرز کالج

ٹیچرز کالج کی مشاورتی کمیٹی کے منظور کردہ پروگرام کے مطابق جنوری ۱۹۷۴ء میں "ابتدائی جماعتوں میں بیالوجی کی تدریس" سے متعلق ایک سہ روزہ "ورک شاپ" کا انعقاد عمل میں آیا ۔

ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب نے Association of Pre-school Education in dian کے سیمنار کی صدارت کی اور جون ۱۹۷۴ء میں ہفتہ بھر کے لئے جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک کے تعلیمی اداروں کو دیکھنے کی غرض سے سفر کیا "تعلیم فلسفہ اور سماج" کے عنوان سے ان کی اسی سال اردو میں ایک تصنیف بھی شائع ہوئی ۔

پروفیسر سریش چندر شکلا صاحب نے مختلف موقر رسائل میں علمی مضامین شائع کئے اور Regional Planning & National Development کے بین الاقوامی سیمنار منعقدہ میسور کے جلسے کی صدارت کی ۔

ڈاکٹر ستیہ پال روہیلا نے دو تحقیقی پروجیکٹ مکمل کرکے I.C.S.S.R اور U.G.C. کو پیش کئے ۔ ان کے علاوہ Educational challenges in Socialist India ایک تصنیف کی تکمیل بھی کی ۔

کالج کے طلبہ کی انجمن کی سرگرمیاں حسب سابق جاری رہیں جو کلچرل پروگرام تعلیمی سیر نمائش ڈرامے لیکچر اور مباحثوں پر مشتمل تھیں ۔ عزیز اختر صاحب ۔ صدر انجمن نے امسال اعلیٰ تعلیمی اداروں کا مہر و انعام حاصل کیا ۔

اسکول آف سوشل ورک

جامعہ اسکول آف سوشل ورک میں امسال طلبہ کی مجموعی تعداد ۷۶ رہی ۔ ایجنسی وزٹ کے پروگرام کے تحت سال اول و دوم کے طلبہ نے دہلی کے چودہ اداروں کے کاموں کو جا کر دیکھا گزشتہ سال کی طرح امسال بھی مہرولی کے قریب کے ایک گاؤں میں "اسٹوڈینٹس کمیونٹی کیمپ" کی تنظیم کی گئی ۔ جہاں فرشی اور میدانی کھیل ۔ قومی گیت اور دیہاتی گانے ۔ دستکاری نیچر اسٹڈی وغیرہ کے پروگرام مرتب کئے گئے ۔ اسکول کی نگرانی میں ریسرچ اسسٹنٹ نے اوکھلا اور اس کے قرب و جوار کی سماجی زندگی سے متعلق دو پروجیکٹ مکمل کئے نیشنل سروس اسکیم کے تحت کئی کیمپس کا انعقاد بھی عمل میں آیا ۔

سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ نے اس مرتبہ دس ماہ کی مدت کے ایک Training Course Job کا کام بھی اسکول کے سپرد کیا جس کے لئے ہندوستان کی ۱۴ ریاستوں سے ۴۵ طالبات گرام سیویکاؤں کی ٹریننگ کے لئے منتخب کی گئیں ۔

اسکول کے پرنسپل جناب شمس الرحمن محسنی صاحب نے امسال کئی سیمناروں میں شرکت کی اور مقالے پیش کئے ۔ ان کے سماجی مسائل پر دو مضمون بھی علمی رسائل میں شائع ہوئے ۔ ایچ ۔ وائی ۔ صدیقی صاحب نے "سوشل ورک اور ماڈرن ایجوکیشن" کے عنوان

پر ایک مقالہ شائع کیا ۔

شعبہ سول اینڈ رورل انجینرنگ

شعبہ سول اینڈ رورل انجینرنگ میں امسال طلبہ کی کل تعداد ۱۱۹ رہی ۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ اس ادارے کے فارغ التحصیل طلبہ ۔ اطلاعات کے مطابق ۔ بے روزگاری کا شکار نہیں ہوتے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب جامعہ خود اس کا امتحان لینے اور ڈپلوما دینے کا انتظام کرے تاکہ یہ شعبہ اس دوعملی کا شکار مزید نہ رہے جو بورڈ آف ٹیکنیکل ایجوکیشن کی شرکت کی وجہ سے فی الحال جاری ہے ۔

جامعہ مدارس

جامعہ میں اسکول کی تعلیم درسی وانتظامی نقطۂ نظر سے تین حصوں میں تقسیم ہے ۔ (۱) ثانوی (۲) ماڈل اور (۳) نرسری ۔ ثانوی اسکول میں طلبہ کی کل تعداد ۹۹ ا رہی ۔ امسال کامیاب طلبہ کا تناسب ۶۴ء ۹۶ رہا ۔ طلبہ نے حسب سابق اپنے تعلیمی وتفریحی مشاغل کو جاری رکھا اور مختلف کھیلوں میں اہتمام کے ساتھ حصہ لیا ۔

ہندی کلب مدرسہ ثانوی نے امسال "اردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ کے لئے ہندی کی تدریس" کے مسائل پر ایک مفید اور دلچسپ سمینار منعقد کیا جس میں شیخ الجامعہ کے علاوہ کئی ماہر لسانیات اور اساتذہ ہندی نے حصہ لیا ۔ جناب جے پال سنگھ ترنگ نے ہندی اور بچوں کے ادب سے متعلق دو ورکشاپوں میں شرکت کی ۔ پرنسپل عبدالحق خاں صاحب ڈاکٹر خلیل الرحمن سیفی پریمی صاحب ۔ برکت علی فراق صاحب اور محمد یوسف صاحب اور روشن لال گپتا صاحب نے درسی کتابوں کے ترجموں اور تصنیف وتالیف کی اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا ۔

جامعہ ماڈل اسکول میں امسال ۱۴۱ نئے داخلے ہوئے ۔ طلبہ کی مجموعی تعداد ۵۸۴ رہی نتیجہ ۹۲ فی صد رہا ۔

مدرسہ ثانوی سے ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کو ابتدائی مدرسہ کے ساتھ ملا دیا گیا اور اسکول کا نام مدرسہ ابتدائی کے بجائے ماڈل اسکول قرار دیا گیا ۔ اسکول کی نئی تنظیم کے اس عمل میں مدرسہ ثانوی سے ۵ اساتذہ ماڈل اسکول منتقل کر دیئے گئے ۔

جامعہ نرسری اسکول میں اس سال ۳۲ داخلے ہوئے ۔ ۲۷ طلبہ پرانے تھے ۔ اس طرح کل تعداد ۵۹ رہی ۔ نرسری اسکول کی دونوں ٹیچروں نے lonIndian Asso ciati of Pre - School Educat .... کے ورک شاپ میں شرکت کی اور نرسری اسکولوں کی تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے جو پروگرام IAPE چلاتی ہے ۔ اس میں مدد کی ۔

ان اسکولوں کے علاوہ پرانے شہر میں بالک ماتا سنٹرز کے نام سے جامعہ تین مراکز میں نرسری ۔ تعلیم بالغان ۔ سلائی کڑھائی اور نیوٹریشن کے پروگرام چلا رہی ہے جن کی سرگرمیاں حسب سابق جاری ہیں ۔ ان مراکز میں بچوں کی مجموعی تعداد امسال ۳۶۰ رہی ۔

کتب خانہ

جامعہ کی مرکزی لائبریری اپنی نئی عمارت میں متفرق ذخائر کو منتقل کرنے کے بعد اب ایک علمی مرکز کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے ۔ اس سے استفادہ کی سہولتوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے ۔ فارسی مخطوطات کی فہرست زیر ترتیب ہے ۔ جس کی پہلی قسط ایران سے شائع ہونے والے مجلے "وحید" میں چھاپ دی گئی ہے ۔ اردو وعربی مخطوطات کی فہرستیں بھی زیر ترتیب ہیں ۔

شہاب الدین انصاری صاحب لائبریرین ترقی اردو بورڈ کی اردو انسائیکلوپیڈیا کے متعلقہ حصے کی مجلس ادارت کے رکن نامزد کیے گئے اور اسسٹنٹ لائبریرین وی کے ۔ نندہ صاحب نے انڈین لائبریری ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس منعقدہ حیدرآباد میں جامعہ ملیہ کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی ۔

خط کتابت کورس

خط کتابت اردو کورس جس کا کام پچھلے کئی برسوں سے جناب عبدالغفار مدہولی صاحب کی نگرانی میں چل رہا ہے ۔ کل ہند سطح پر ہر سال کئی ہزار غیر اردو دانوں کو اردو سکھانے کا کام خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہا ہے ۔ ہندی کے علاوہ اب اس کے تحت انگریزی کے ذریعہ اردو سکھانے کا تدریسی مواد بھی مرتب کر لیا گیا ہے اور اس غرض کے لئے ایک سہ لسانی لغت کا کام بھی زیر تصنیف ہے ۔

جامعہ ملیہ کی اردو خدمت کے نئے منصوبوں کی ڈگر اس خط کتابت کورس پر قائم کرنے کا خیال ہے ۔ چونکہ ہمارے تعلیمی کمیشن کی رپورٹ میں "غیر رسمی تعلیم" پر بہت زور دیا گیا ہے اور خط کتابت کورس اس کا سب سے کامیاب تجربہ ہے ۔ اس لئے جامعہ ملیہ کے پانچویں پنج سالہ پلان میں کالج سطح کے خط کتابت کورس کا منصوبہ شامل کر دیا گیا ہے تاکہ یہ ادارہ اردو کے حق سے کسی حد تک سبکدوش ہو سکے ۔

حضرات !

بعض غیر ضروری تفصیلات کا تذکرہ کر کے میں نے آپکی خاصی سمع خراشی کی ہے "یہ کہوں نہ کہوں" کی ردیف میں میں ساری غزل کہہ گیا ہوں لیکن جامعہ کی اس غزل میں آپ کو اس صنف سخن کا سارا تنوع ملے گا ۔ آپ بیتی اور جگ بیتی ملے گی شکر وشکایت ملیں گے اور سب سے بڑھ کر ہماری امیدوں اور آرزؤں کی داستان ملے گی اور مقطع کی یہ سخن گسترانہ بات بھی ۔

ہمیں بھی اُن سے امید اور انھیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو

کتابیں

انجمن

تقطیع ۱۸ × ۲۲ ضخامت صفحات ۲۱۲
قیمت ۱۵ ر روپے
پتہ ۔ ولا اکیڈیمی ۔ عزیز باغ سلطان پورہ ۔ حیدرآباد (اے پی)

جناب حسن الدین احمد صاحب کی شخصیت علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں آپ کے مضامین اور علمی مقالے سرمایۂ علم و ادب میں بیش بہا اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں ابھی حال ہی میں اردو الفاظ شماری کی ترتیب پر جو تحقیقی کام آپ نے انجام دیا ہے وہ اپنی نوعیت کا پہلا کارنامہ ہے جس پر اتر پردیش اردو اکیڈیمی نے آپ کو خصوصی ایوارڈ بھی عطا ہے "اردو الفاظ شماری" کی رسم اجراء ملک کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے دست مبارک سے ہوئی تھی۔

انجمن حسن الدین احمد صاحب کے سوانحی خاکوں کا ایک دلآویز مجموعہ ہے جسے ولا اکیڈیمی نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

خاکوں کے لئے جن شخصیتوں کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں صوفی، دانشور، رہنما، علما، فضلا، ادیب، صحافی، فن کار اور اہل کار کی شخصیتیں شامل ہیں اکثر کسی نہ کسی طرح سے دکن سے وابستگی رکھتی ہیں۔

مختصر خاکوں میں شخصیتوں کے مختلف پہلوؤں کو اس انداز سے نمایاں کرنا کہ قاری کے ذہن میں ان کی زندگی کے مختلف خد و خال پوری طرح سے اجاگر ہو جائیں بہت مشکل اور نازک کام ہے حسن الدین احمد صاحب ان مقامات سے اتنی فنکارانہ مہارت کے ساتھ گذرے ہیں کہ ان کے ان خاکوں میں نہ صرف شخصیتوں کا مکمل عکس سمو اٹھا ہے بلکہ خود ان کی اپنی شخصیت بھی ابھر آئی ہے جو بڑی وضعدار، متین اور جاذب نظر ہے۔

اردو میں سوانحی خاکے بہت کم لکھے گئے ہیں ولا اکیڈیمی کی یہ پیش کش اس کمی کو پورا کرنے کی جانب ایک بہترین قدم ہے کتابت و طباعت میں وہ خاص اہتمام ملحوظ نہیں رکھا جا سکا ہے جس کا یہ موضوع متقاضی ہے لیکن پھر بھی زبان دل چسپ انداز بیان اور اپنی تاریخی حیثیت کے لحاظ سے یہ مجموعہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

رفیق احمد تلفی

مہارانی

مصنف دیوان جرمن داس ۔ راکیش بھان داس
صفحات ۱۹۲
قیمت ۴ ر روپے
ناشر ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ ۔ جی ٹی روڈ شاہدرہ دہلی نمبر ۳۲

کتاب مہارانی "مہاراجہ" کے ممتاز مصنف دیوان جرمن داس کی تصنیف ہے ۔ جو کتاب "مہاراجہ" کی طرح مقبول عام کتاب ہے۔

جو لوگ دیوان صاحب کی مہاراجہ پڑھ چکے ہیں وہ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ مہارانی کس قدر دلچسپ اور عریاں انداز کی کتاب ہو گی ۔ کتاب کے مصنف کا کتاب کی ترتیب سے جا ہے کچھ مقصد ہو لیکن ایک بات قطعی طور پر عیاں ہے ۔ کہ دولت کی فراوانی کس طرح انسانوں کو ہوس پرستی، نفس پرستی، عیاشی، اور بدکرداری کی طرف لے جاتی ہے شہنشاہوں، راجوں، مہاراجوں، نوابوں، رئیسوں، زمینداروں کی عیاشی کے بے شمار قصے کہانیاں مشہور ہیں۔ مہارانی بھی اسی قسم کے واقعات سے بھر پور کتاب ہے اس کتاب کو آپ ذہنی عیاشی کے حصول کے لئے کم درس عبرت کے لئے زیادہ پڑھیئے ۔ یہ کتاب ہندوستان کے ریاستی دور کے شاہی معاشرہ کی تاریخ ہے ۔ کتاب کی ترتیب اور انداز بیان عمدہ ہے طباعت بھی مناسب ہے ۔

پُراسرار قاتل

مصنف کرنل رنجیت
صفحات ۲۳۲
قیمت ۴ ر روپے
ناشر ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ ۔ جی ٹی روڈ شاہدرہ دہلی ۳۲

ناولوں میں ایک قسم سراغرسانی یا جاسوسی ناولوں کی ہے جنھیں ایک بہت بڑا طبقہ پسند کرتا ہے ۔ ایسے جاسوسی ناول جو بیک وقت رومانی اور جاسوسی ہوں بہت زیادہ پسند کئے جاتے ہیں ۔ اور یہ دماغی تفریح کا شاندار ذریعہ ہیں ۔

زیر نظر کتاب بھی ایک عمدہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی، اور چونکا دینے والی جاسوسی کہانی ہے ۔ جس میں رومان بھی ہے اور ادب بھی ۔

اگر آپ ادب میں افادیت کے قائل نہ ہوں۔ اور ذہنی تفریح بھی چاہتے ہوں تو یہ کتاب مطالعہ کر سکتے ہیں۔

آئینے اکیلے ہیں

مصنف کرشن چندر

صفحات ۱۶۸

قیمت ۳/روپے

شائع کردہ ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ جی ٹی روڈ شاہدرہ دہلی

کرشن چندر ملک کے ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ آپ کا نام افسانہ کی دنیا میں تو چھاپ کرتا ہی ہے ناول کی دنیا میں بھی آپ بلند رہا ہے۔

زیر نظر کتاب آپ کا انتہائی دلچسپ ناول ہے جس میں حسین جذبات کی پُر درد کہانی دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی کہانی ہے۔ کتابت طباعت عمدہ ہے۔

نازک خیالیاں

مصنف کنہیا لال کپور

صفحات ۱۵۲

قیمت ۲/روپے ۵۰ پیسے

شائع کردہ ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ شاہدرہ دہلی

"نازک خیالیاں" ہندوستان کے ممتاز ادیب شاعر اور مزاحیہ نگار جناب کنہیا لال کپور کی تازہ تصنیف ہے۔

آپ فرماتے ہیں۔

حکومت غربت ختم کرنے کے لئے کیا اقدامات کر رہی ہے۔ حکومت نے ہر وزیر کو ہدایت کی ہے۔ کہ وہ اپنی تقریر میں غربت کو جلد از جلد ختم کر دینے کا وعدہ کرے۔ چاہے عوام اس کی تقریر سننے کے بعد سراج لکھنوی کا یہ شعر پڑھنے پر کیوں نہ مجبور ہو جائیں۔

وہی لحہ وہی تیور قسم ہے تیرے وعدوں کی
ذرا بھی شک نہیں ہوتا کہ یہ جھوٹی تسلی ہے

ناز و انداز

مصنف پرکاش پنڈت

صفحات ۱۲۸

قیمت ۲/روپے

شائع کردہ ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ شاہدرہ دہلی

ناز و انداز ایک شعری مجموعہ ہے۔ جسے جناب پرکاش پنڈت نے نازو انداز کے انداز میں ترتیب دیا ہے۔

کتاب کے اشعار میں تمام حسین نزاکتوں پر اشعار موجود ہیں۔

شائقین کے لئے ایک عمدہ مجموعہ ہے۔ کتابت طباعت دیدہ زیب ہے۔

شاخ گل (مجموعۂ کلام)

از کالیداس گپتا رضا

صفحات ۱۳۶

سائز $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ کاغذ سفید عمدہ

کتابت و طباعت دیدہ زیب

قیمت مجلد مع خوش نما گرد پوش ۸/روپے

پتہ ۔ صبح امید بلاسس روڈ بمبئی نمبر ۸

یہ مجموعہ کلام ۲۶ نظموں، ۴۲ غزلوں اور ۲۶ رباعیات پر مشتمل ہے پہلی نظم "فتح و شکست"، رگھوپار کے پہلے مثال کے تبلیسوں سوکت کو اردو شعر کا جامہ پہنانے کی کامیاب ترین کوشش ہے۔ دوسری نظم "ترک دنیا کیوں؟" رہبانیت پر ایک کراری چوٹ ہے جس کا مرکزی خیال یانیشوری سے لیا گیا ہے۔ تیسری نظم "بھگوان بدھ کا تیاگ" جس میں ایک ماہر مصور کی طرح اس واقعہ کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ امرت منتھن ہندو دیو مالائی کہانی ہے جس کو اردو اشعار کے سانچہ میں ڈھال کر دو آتشہ کر دیا گیا ہے یہ اپنے رنگ کی کامیاب نظم ہے اور بلاشبہ اردو شاعری میں ایک لائق قدر اضافہ ہے۔ اس کے بعد کی چار نظمیں قدیم مدبروں کے ادب کی عکاسی کرتی ہیں "مہاتما گاندھی ایک بھکاری" "جشن جاگ اٹھا لہو کا لالہ زار" "شعور گلشن" اور "دیوار" یہ چھ نظمیں فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں ان کے علاوہ باقی دس نظمیں مختلف موضوعات پر ہیں نظموں کی زبان بامحاورہ اور موضوع کے مطابق ہے فارسی آمیز اور ہندی آمیز دونوں اسالیب کا استعمال ہے لیکن برمحل۔

غزلوں میں جدت و تنوع ہے۔ دلچسپی اور سوز و گداز ہے تراکیب کی پختگی۔ الفاظ کی بندش، محاورات کا برمحل استعمال، تشبیہات و استعارات کا فطری انداز لائق ستائش ہے۔

رباعیات بہتر ہیں لیکن کے پایہ کی نہیں۔ مجموعی حیثیت سے یہ مجموعہ اردو کے شعری ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت ہے۔

(مرغوب امین کاظمی)

"انسانی حقوق کیا ہیں"

مصنف مورس کرانسٹن

مترجم جلیس عابدی

سائز $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$

صفحات ۲۵۶

کتابت و طباعت عمدہ

مجلد مع گرد پوش قیمت سات روپے

قیمت غیر مجلد چار روپے

پتہ ۔ نیشنل اکاڈمی ۔ ۹۔ انصاری مارکیٹ، دریا گنج دہلی

یہ کتاب انسانی حقوق پر ایک جامع، مکمل اور مدلل تصنیف ہے، نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے۔

اس کتاب میں انسانی حقوق کی تعریف و تشریح، ان کے اقسام و مدارج اور ان سے متعلق مفکرین کی آراء اور ان پر بیباکانہ تنقید و تبصرہ ہے ....

باقی صفحہ ۲۱ پر

جناب خواجہ احمد عباس

حالی جس نے سب کو یکجا کر دیا

ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز ہریانہ قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے پورے ستائیس برس کے بعد حالی کو پھر یاد کیا ہے۔

پانی پت میں ایک ہائی اسکول تھا۔ حالی مسلم ہائی اسکول۔ جو میرا بھی اسکول تھا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جب پانی پت کے مسلمانوں کو ..... مسلمان ہونے کی پاداش میں پاکستان جانے کی سزا ملی اور وہ (سوائے میرے اپنے خاندان کے جو بمبئی آگیا) پاکستان ٹرین میں بھر کر بھیج دیئے گئے تو حالی مسلم ہائی اسکول آریہ ہائی اسکول بن گیا۔

مجھے آریہ اسکول سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اسکول تو بہرحال اسکول ہوتا ہے مسلم اسکول نہ رہا آریہ اسکول ہو گیا تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن حالی کا نام اس میں سے نکال دیا گیا اس کا افسوس ضرور ہوتا ہے۔ اگر یہ حالی آریہ سماج اسکول" کہلاتا تو زیادہ مناسب ہوتا کم سے کم ایک نشانی تو پانی پت میں حالی کے نام کی باقی رہ جاتی۔

لیکن اس کمی کو ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز ہریانہ اور ڈپٹی کمشنر کرنال سکھدیو پرشاد جی نے پورا کیا ہے جنہوں نے پچھلے سال ایک حالی میموریل پارک کا افتتاح کیا تھا۔ ایک حالی لائبریری کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس سال ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا اور اب ایک کتاب مولانا حالی کی یاد میں شائع کی ہے۔

ڈاکٹر نورالحسن صاحب نے اپنے پیغام میں کیا خوب کہا ہے کہ "مولانا حالی کا نام اردو ادب میں ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جائے گا کیوں کہ انھوں نے ہمارے ادب کو نئی قدروں سے روشناس کرایا اور فرسودہ خیالات و نظریات ترک کرنے کی ترغیب دی۔ انھوں نے روایت سے کلیتاً انکار نہیں کیا، لیکن روایت سے انحراف کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا۔"

مولانا حالی کا محبوب موضوع تھا حب الوطنی اور قومی ایکتا۔ اسی لحاظ سے ان کی روح کو یہ جان کر اطمینان ہوگا کہ گرمکھ سنگھ مسافر نے "حالی اور غزل کی شاعری" پر لکھا ہے اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے "حالی کا دور" پر اور برہم ناتھ دت نے "حالی ایک عظیم انسان" پر اور ڈاکٹر عابد حسین نے "حالی۔ مجدد ادب" پر اور خواجہ غلام السیدین مرحوم نے "محسن قوم۔ حالی" پر اور صالحہ عابد حسین نے "حالی ایک بڑا انسان" پیارا راگاندھی نے ایک پیغام بھیجا ہے۔ کے۔ ایل۔ پوسوال نے حالی کا تعارف کر دیا ہے ڈاکٹر گیان چند نے "حالی۔ ایک نثر نگار" پر مقالہ لکھا ہے اور آئی۔ کے۔ گجرال نے "حالی" بحیثیت ایک ادبی مجاہد" پر لکھا ہے یعنی مولانا حالی کی ذات اور انکی یاد نے ہندو، مسلمان، سکھ کو یکجا کر دیا ہے یہی اصلی یادگار ہے مولانا حالی کی۔ اسکول اور کالج اور لائبریری سے بڑھ کر۔

الور میں میواتی زبان و ادب پر سیمینار

۵ رجنوری ۱۹۷۵ء کو الور راجستھان کے سوچنا کیندر میں ایک شاندار سیمینار منعقد ہوا جس کی صدارت چودھری حسین خاں ایم پی نے فرمائی سیمینار کا انعقاد راجستھان ساہتیہ اکیڈیمی کی جانب سے کیا گیا تھا جس کا اہتمام راجستھان ساہتیہ اکیڈیمی کی ایگزیکیٹو کے رکن، میواتی کے ادیب و شاعر جناب سنو خاں میواتی نے کیا تھا۔

سیمینار میں لیڈران، ادیب، شاعر، پروفیسر، لیکچرار اور طلبا شریک تھے۔ سیمینار کی افتتاحی تقریر جناب چودھری مہندر سنگھ شاستری ایڈوکیٹ نے کی۔ جناب مہابیر شرما جو میواتی زبان و ادب پر ریسرچ کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کر چکے ہیں، نے شاندار مقالہ پیش کیا۔

حکیم اجمل خاں صاحب نے میواتی زبان و ادب پر تحقیقاتی کام، اور اسکے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی، اور بتایا کہ میواتی ادب کس قدر مفید ہے اور اسے کس انداز سے ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ میواتی زبان کی اصل و نسل کے بارے میں بھی بعض حقائق پر روشنی ڈالی۔ چودھری طیب حسین صاحب نے اس سیمینار کے انعقاد پر بھاری مسرت کا اظہار کیا۔ آپ نے میواتی زبان و ادب پر کام کرنے والوں کی خدمات کو سراہا۔ انھیں مبارکباد دی اور تعاون کا یقین دلایا۔ سیمینار میں مرکزی وزارت نشریات و اطلاعات سے مانگ کی گئی کہ وہ الور میں ریڈیو سٹیشن قائم کرے۔ تاکہ لا اجتماعی بالخصوص میواتی زبان و ادب کی نشر و اشاعت کا موقع فراہم ہو سکے پروگرام میں میواتی ادب کے شاعر میراثی، اور دوسرے لوگوں نے بھی شرکت کی۔ بعد ازاں میو بورڈنگ الور میں مسلمانان الور کا اجتماع ہوا۔ جسے چودھری طیب حسین خاں ایم پی اور حکیم اجمل خاں چودھری رحمت خاں، سنو خاں، اور دوسرے لیڈران نے خطاب کیا۔ میو مسلمانوں کو دینی و دنیاوی تعلیم کے حصول کیلئے خصوصیت سے توجہ دلائی گئی۔ انھیں یہ بتایا کہ وہ اپنے دل سے احساس کمتری اور خوف کو نکال دیں۔ وہ قوم و ملک کی ترقی میں بھرپور دلچسپی لیں۔ میو بورڈنگ الور میں ایک شاندار جامع مسجد بھی زیر تعمیر ہے۔

گورونانک یونیورسٹی امرتسر میں ممبران پنجاب وقف بورڈ کی آمد

امرتسر جناب حکیم اجمل خاں جناب مولانا خلیل الرحمان صاحب و جناب غلام صابر صاحب ممبران پنجاب وقف بورڈ نے گورونانک یونیورسٹی امرتسر کے مختلف شعبہ جات خصوصاً لائبریری کا معائنہ کیا اس موقعہ پر رجسٹرار گورونانک یونیورسٹی سے بھی ملاقات کی۔ اور قرآن کریم کے "پنجابی ترجمہ" کے سلسلہ کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت کی۔ رجسٹرار صاحب نے تعاون کا یقین دلایا۔ اپنے ملاقات کے دوران یہ بھی بتایا کہ اردو کا مستقبل دن بدن تاریک ہوتا جارہا ہے جس پر اہل علم کو توجہ دینے کی ضرورت ہے یونیورسٹی کی لائبریری میں مذہبی کتابیں کافی جمع کی گئی ہیں جنہیں اردو اسلامیات کی بیشتر کتابیں موجود ہیں۔ انچارج لائبریری نے بتایا کہ وہ اسلامیات پر باقی کتابیں جمع کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھیں مفید مشورے دیئے گئے تاکہ یونیورسٹی کے شعبہ مذہبیات میں اسلامی کتب جمع کی جاسکیں۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا پروگرام

مکرمی السلام علیکم ۔!!

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر اہتمام جو کل ہند کانفرنس مارچ ۱۹۷۵ء میں منعقد ہونے والی ہے اس کا اہم مقصد یہ ہے کہ مسلمانان ہند کی تعلیمی اور ثقافتی زندگی کا جائزہ لے اور یہ معلوم کرے کہ ملک کے دستور نے اس ضمن میں جو تحفظات مسلم اقلیت کو عطا کئے ہیں ان کا فائدہ عملاً مسلمانوں کو پہونچ رہا ہے یا نہیں اس لئے آپ سے یہ درخواست ہے کہ اپنے صوبے کے مسلم تعلیمی حالات کا ایک جائزہ مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل کانفرنس کے اجلاس میں پیش کرنے کے لئے ارسال فرمائیں ۔ آپ کی یہ خدمت انشاء اللہ تعلیم کے اعلیٰ مقصد کے حصول میں ایک اہم رول ادا کرے گی۔

والسلام

نفیس احمد کاظمی نائب صدر و دیگر اراکین مجلس استقبالیہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس دفتر ۲۷ رکان پور روڈ الہ آباد (یوپی)

ریاستی تعلیمی جائزہ :

۱ ۔ ابتدائی تعلیم

(۱) آپ کے صوبے میں مسلمان بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے کیا انتظامات ہیں ۔

(۲) کیا بچے عام طور پر سرکاری پرائمری مدرسوں میں جاتے ہیں ۔ ؟

(۳) کیا کوئی ایسا غیر سرکاری نظام قائم کیا گیا ہے جو ان بچوں میں جو سرکاری اسکولوں میں جاتے ہیں دینی مزاج کی تربیت دے سکیں ۔ ؟

(۴) کیا سرکاری اسکولوں کا نصاب ایسا اسکولر ہے جو آپ کے دینی مزاج سے ٹکراتے بغیر اپنایا جاسکتا ہے ۔ ؟

(۵) مسلم بچوں کی مادری زبان عام طور پر کیا ہے ۔ ؟

(۶) کیا ان کی مادری زبان کے تحفظ کے لئے ریاستی سرکار نے معقول انتظام کر دیا ہے اور آپ لوگ اس انتظام سے مطمئن ہیں ۔ ؟

(۷) اگر نہیں کیا ہے تو ان حالات سے نپٹنے کے لئے آپ نے کوئی نظم قائم کیا ہے ؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو اس کی تفصیل عنایت فرمائیں ۔

(۸) پرائمری درجات میں اردو میڈیم کی کیا سہولتیں .... موجود ہیں ۔ ؟

۲ ۔ خالص دینی تعلیم و مدارس

(۱) آپ کے صوبے میں خالص مسلم دینی مدارس کی صورت حال کیا ہے ۔ ؟

(۲) ایسے مدرسوں کی جو خالص دینی تعلیم دے رہے ہیں تعداد کیا ہے ۔ ؟

(۳) ایسے مدرسے جہاں دینی تعلیم کے ساتھ جنرل تعلیم کا نظام بھی چل رہا ہے کتنے ہوں گے ۔ ؟

(۴) جنرل تعلیم کا نظام کس درجہ تک محدود ہے ۔ ؟

(۵) اعلیٰ دینی تعلیم کس درجے تک ہے ۔ ؟

(۶) کیا کوئی ایسا مرکزی نظام امتحان موجود ہے جو دینی تعلیم کے لحاظ سے اعلیٰ اور معیاری امتحانات تصور کیا جاسکتا ہے ۔ ؟

(۷) اگر کوئی ایسا امتحان موجود نہیں ہے تو کیا آپ کا صوبہ ایسا امتحانی نظام قائم کرنے پر غور کرنے کے لئے تیار ہے ۔ ؟

(۸) کیا آپ ضروری سمجھتے ہیں کہ دینی مدارس میں سائنس کی تعلیم کا اجرا کیا جائے اور ان درجات میں طالب علموں کا ایک ایسا طبقہ تیار کیا جائے جو سائنسی معلومات کو اسلام کی روشنی میں پیش کر سکے ۔

۳ ۔ ہائر سیکنڈری درجات

(۱) ہائر سیکنڈری درجے کے کتنے مدارس آپ کے صوبہ میں اس وقت موجود ہیں ۔ ؟

(۲) کیا ان مدارس میں اسلامی مزاج مسلم کلچر اور مادری زبان کے تحفظ کے لئے خاص اہتمام کیا جاتا ہے ۔ ؟

(۳) اگر نہیں تو اب اس طرح کا انتظام عمل میں لانے کے سلسلہ میں آپ کیا دشواریاں محسوس کرتے ہیں ۔ ؟

(واضح ہو کہ دستور ہند نے ان تحفظات کے لئے خاص رعایتیں اقلیتوں کو عطا کی ہیں)

(۴) کیا ان اداروں کو سرکاری گرانٹ ملتی ہے ۔ ؟

(۵) اگر ملتی ہے تو گرانٹ کس حد تک ملتی ہے ۔ ؟

(۶) گرانٹ کے تعین کرنے کا کیا طریقہ ہے ۔ ؟

(۷) کیا گرانٹ کے تعین میں سرکار فیاضی سے کام لیتا ہے یا عملی رکاوٹیں ہیں ۔ ؟ اگر ہیں تو تفصیل عنایت فرمائیں ۔

(۸) کیا نئے مسلم مدارس کھولنے کی کافی سہولتیں موجود ہیں ۔؟

(۹) اگر نہیں ہیں تو ان دشواریوں کو واضح فرمائیں جو اس راستے میں حائل ہیں ۔؟

(۱۰) کیا مسلم آبادی کی مادری زبان عام طور پر اردو ہے ۔؟

(۱۱) اگر ہے تو اردو میڈیم اسکولوں کا کیا انتظام ہے ۔؟

(۱۲) اس نظام میں اگر کمزوریاں اور دشواریاں ہوں تو انہیں واضح فرمائیں ۔؟

۴۔ ڈگری درجات

ڈگری درجات میں مسلم اقلیت کے لئے کیا دشواریاں ہیں ۔؟

(۹) مسلم ڈگری کالجوں کے کھولنے کے بارے میں

(ب) موجودہ کالجوں میں مسلم اقلیتی مفاد کی ترویج کے بارے میں ۔

(ج) جنرل کالجوں کے داخلہ کے بارے میں ۔

(د) سائنس کی اعلیٰ تعلیم اور داخلوں کے بارے میں

(ہ) پوسٹ گریجویٹ درجات میں داخلوں کے بارے میں ۔

۵۔ دیگر تعلیمی مسائل

(۱) دیگر مسائل تعلیمی جو آپ کے صوبے سے متعلق ہوں (الگ کاغذ پر)

(۲) مسلم تعلیمی نظام سے دلچسپی رکھنے والوں کے نام اور پتے (الگ کاغذ پر)

(۳) مسلم تعلیمی اداروں کے پرنسپلوں (ذمہ) منتظمین کے نام اور پتے (الگ کاغذ پر)

(۴) آپ کے صوبہ میں محکمہ تعلیمات میں مسلم اقلیتوں کے حقوق کس حد تک محفوظ ہیں ۔؟؟

(الف) ملازمتوں میں مسلمانوں کا کیا تناسب ہے ؟

(ب) گزیٹڈ ملازمتوں میں

(ج) نان گزیٹڈ ملازمتوں میں

(د) نچلی سطح کی ملازمتوں میں

نوٹ (۱) براہ کرم ان نکات کا جواب مجلس استقبالیہ کے پتہ پر یکم مارچ ۱۹۷۵ء تک ضرور روانہ فرمائیں ۔

(۲) جن سوالات کا جواب متعلقہ خانہ میں نہ آسکے اس کا جواب الگ کاغذ پر تحریر فرمائیں ۔

مقالہ نگار حضرات سے گزارش

"اوقاف"، میگزین ایک اسلامی میگزین ہے ۔ جس کے لئے معیاری علمی مقالات درکار ہیں ۔ مقالہ و مضامین نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اپنی تخلیقات اوقاف کو بھیجیں اور حسب ذیل امور کا لحاظ رکھیں ۔

... مضامین یا نظم علمی، تاریخی، اصلاحی، ادبی ہونے چاہئیں ۔ اختلافی مضامین سے احتراز کیا جائے ۔

۱... اوقاف کے انتظام اور انکے استعمال سے متعلق مضامین، اطلاعات، پالیسی اور پروگرام خاص طور پر شریک اشاعت ہوں گے ۔

۲... مضامین صاف اور کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوئے ہوں ۔

۳... جو مضامین اوقاف کے معیار کے مطابق نہیں ہوں گے، شریک اشاعت نہیں کئے جائیں گے ۔

۴... مختلف وقف بورڈوں، سنٹرل وقف کونسل اور اسلامی تقریبات سے متعلق تصاویر بھی شائع کی جائیں گی ۔ ان تصاویر کے ساتھ مختصر رپورٹ آنی ضروری ہے ۔

(ادارہ)

بنگال وقف ایکٹ میں تبدیلی کی جارہی ہے

مغربی بنگال کے وقف املاک کے انتظامیہ کی بہتری کی کوشش

کلکتہ گزٹ غیر معمولی میں ایک ترمیمی بل کی اشاعت کے بموجب ریاستی حکومت موجودہ بنگال وقف ایکٹ میں ترمیم کا ارادہ رکھتی ہے تاکہ ریاست میں وقف املاک کا انتظامیہ بہتر بنایا جاسکے۔ اور اس کی کارکردگی موثر بنانے کے موجودہ دشواریوں پر قابو پاکر ضرورتیں پوری کی جائیں۔

بنگال وقف ایکٹ کی مجوزہ تبدیلیاں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ایکٹ کی دفعہ ۶ کی چھٹی شرح میں ایک نیا نکتہ شامل کیا جارہا ہے جس کے تحت متولی اس کو مقرر کیا جائے گا جو ہندوستان کا شہری ہو اور ریاستی حکومت کے مسلمہ قواعد اور ضوابط پر دیگر یا قتوں میں پورا اترتا ہوگا۔

۲۔ ایکٹ کی دفعہ ۴۴ میں اس لئے ترمیم کی جارہی ہے کہ کسی شخص کو ایک عارضی متولی بنایا جاسکے جس کی نامزدگی اس صورت میں متولی کرے جو ہندوستان کا شہری نہ ہونے کے باعث اپنے فرائض انجام نہ دے سکتا ہو۔

۳۔ ایکٹ کی دفعہ ۴۱ میں ترمیم کی جارہی ہے تاکہ وقف بورڈ ایک سے زائد متولی کا تقرر کرسکے۔

۴۔ ایکٹ کی دفعہ ۵۳ میں ترمیم کی جارہی ہے تاکہ قابل انتقال وقف املاک کا تبادلہ خواہ وہ لیز کی صورت میں ہو یا کرایہ داری کے کیسوں میں متولی کو بورڈ آف وقف کی منظوری مل سکے۔

۵۔ ایکٹ کی نئی دفعہ ۵۳ اے شامل کی جارہی ہے تاکہ لیز یا کرایہ کے ذریعہ قابل انتقال وقف املاک کی منتقلی کے بعض کیسوں کی وقف بورڈ چھان بین کراسکے لیز بلکہ بورڈ کو شبہ ہو کہ منتقلی جائز اور قابل اعتماد نہیں ہے۔

۶۔ ایکٹ کی دفعہ ۶۴ اے میں ترمیم کی جارہی ہے تاکہ دفعہ ۵۳ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جو املاک بے قاعدگی اور غلط طریقے سے منتقل کی گئی ہے اس کی بازیابی کے لئے وقف بورڈ مدت مقرر کرسکے۔ اب ناجائز منتقل کی تاریخ سے ۱۲ سال کے عرصہ کے بجائے بازیابی بورڈ کے علم میں آنے کی تاریخ سے ۱۲ سالہ مدت ہوگی۔

۷۔ ایکٹ کی ۵۸ میں ترمیم کی جارہی ہے تاکہ وقف بورڈ کسی متولی کو ہٹا سکے بشرطیکہ

(الف) وہ ہندوستان کا شہری نہ رہ جائے۔

(ب) غیر قانونی طور پر وقف املاک کی منتقلی کی ہو۔

(ج) دھاندلی کی ہو یا وقف املاک کا باقاعدہ استعمال نہ کیا ہو۔

گوہاٹی میں حاجیوں کے لئے مسافر خانہ

آسام سے ہر سال کم وبیش ایک ہزار حاجی گوہاٹی ہوکر حج کے لئے آتے جاتے ہیں اس لئے ان حضرات کے قیام و طعام وغیرہ کی سہولتوں کے پیش نظر یہاں حاجیوں کے لئے ایک مسافر خانہ کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جارہی تھی۔ خوش قسمتی سے گورنمنٹ کی اعانت و امداد اور بعض اداروں کی اس میں شرکت کے باعث آسام حج کمیٹی کو جس کے صدر خود وزیر قانون ہیں اس مقصد کے لئے ایک نہایت عمدہ اور موزوں جگہ پر تین بیگہ زمین مل گئی، اس کے بعد فوراً حج کمیٹی نے ایک نہایت شاندار اور وسیع عمارت کا جس پر کم وبیش چودہ لاکھ روپے خرچ ہوں گے، نقشہ تیار کرلیا اور فراہمی سرمایہ کا کام شروع کردیا۔

یہی وہ حاجی مسافر خانہ ہے جس کا سنگ بنیاد ۲ فروری کو ۱۰ بجے دن کے ایک نہایت عظیم الشان اجتماع میں قرآن مجید کی تلاوت کے بعد صدر جمہوریہ نے رکھا اور اس کے بعد ایک مختصر تقریر میں عمارت کی تکمیل کے لئے دعا کی۔

نتائج امتحانات

بابا فرید میموریل اسکول پٹیالہ

سال ۷۵-۱۹۷۴

نام جماعت	تعداد	پاس وفعل
جماعت ہشتم	۳	پاس
״ ہفتم	۴	״
״ ششم	۱۴	״
״ پنجم	۱۲	״
״ چہارم	۱۹	״
״ سوم	۱۳	״
״ دوم	۱۵	״
״ اول	۲۱	״

پرنسپل ——— فرید میموریل اسکول پٹیالہ

جامع مسجد دہلی کے نظم و نسق سے متعلق جناب شفیع قریشی کا ثالثی فیصلہ

جناب محمد شفیع قریشی صاحب کے پرسنل اسسٹنٹ نے حسب ذیل بیان بغرض اشاعت روانہ کیا ہے۔

جامع مسجد دہلی کے معاملات میں دہلی وقف بورڈ اور جناب سید عبداللہ بخاری نے مجھے ثالث مقرر کیا۔ ۱۷ فروری ۱۹۷۵ء سے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد میں نے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کیا۔ مختلف مکتب فکر کے اکابروں سے تبادلہ خیال کیا۔ وقف بورڈ کے اراکین سے ملاقاتیں کیں اور جناب سید عبداللہ سے متعدد بار گفت و شنید کی۔ اور تمام حالات کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیا۔ اس سلسلہ میں کسی ایک فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنے کے لئے میں نے ۱۸ اپریل ۱۹۷۵ء کو اپنی کوٹھی پر وقف بورڈ کے چیرمین جناب مظفر حسین برنی اور جناب سید عبداللہ بخاری کو مدعو کیا اور ان کے ساتھ تفصیل سے تمام پہلوؤں پر تبادلہ خیال کیا اور اب میں ایک ثالث کی حیثیت سے کچھ نتائج پر پہنچا ہوں اور اپنے تاثرات، سفارشات اور تجاویز کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ شاہ جہاں کی تعمیر کردہ اس عظیم الشان تاریخی یادگار کی اپنی کچھ روایات رہی ہیں۔ مسلمانوں کی زندگی میں اس کا ایک مخصوص مقام ہے۔ یہ مسجد فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے اور ہندوستان کی سرزمین پر مسلم کلچر کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ یہ ہماری تہذیبی زندگی کی خوب صورت علامت ہے۔ جامع مسجد کی مذہبی اہمیت کے علاوہ تاریخی، تہذیبی اور فنی اہمیت بھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ روایات بھی وابستہ رہی ہیں۔ انہیں میں سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس کی امامت ایک خاندان کی وراثت رہی ہے۔ شاہ جہاں کے دور ہی میں یہ روایت قائم ہو گئی تھی اور تب سے اس پر عمل ہو رہا ہے۔ اسلام مسجد کی امامت کے معاملہ میں خاندانی وراثت کے اصول کو تسلیم نہیں کرتا ہے۔ امام بننے کا حق صرف اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جو اسلام کی متعین کردہ شرائط پر پورا اترتا ہو اور جس کو عامۃ المسلمین کا اعتماد بھی حاصل ہو۔ اسلام کے مطابق امامت ایک جمہوری ادارہ ہے۔ ایک امام کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ وہ دین کا عالم، متقی، پرہیزگار اور ثقہ ہو بلکہ اس کے علم اور زہد و تقویٰ پر مسلمانوں کو اعتماد بھی ہو۔ جب تک وہ تمام شرطوں کو پورا کرتا ہے وہ امام رہ سکتا ہے۔ امامت باپ سے بیٹے کو منتقل نہیں ہو سکتی۔ دلی کی فتح پوری مسجد کی امامت کے تنازعہ میں بھی دلی ہائیکورٹ نے مسجد کی امامت کو خاندانی وراثت تسلیم نہیں کیا ہے تاہم جامع مسجد کے معاملہ میں صورتحال ذرا سی مختلف ہے۔ اسلام نے تہذیبی و سماجی روایات کا احترام بھی سکھایا ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ روایتی ڈھانچہ، اسلام کے بنیادی اصولوں سے نہ ٹکراتے اور اس کے منتشر ہونے سے نقض امن کا خطرہ پیدا ہوتا ہو اور مسلمانوں کے ملی و معاشرتی شیرازہ پر ضرب ہوتی ہو، اس کو تسلیم کرنا ہی بہتر و افضل ہے۔ دلی کی جامع مسجد کے معاملہ میں بھی تاریخی روایات کا احترام ضروری ہے۔ چوں کہ پچھلے چند سالوں میں مسجد کے مسئلہ نے ایک نازک صورت حال اختیار کر لی ہے، اور یہ جھگڑا دلی کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں رخنہ و انتشار کا باعث بنا ہے اس لئے امامت کے معاملہ میں اس کے تاریخی روایتی ڈھانچہ کو برقرار رکھنا ضروری ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کے ملی و معاشرتی شیرازہ کی حفاظت کے لئے بھی ایسا کرنا ضروری ہے۔ جامع مسجد کی امامت کے خاندانی و روایتی کردار کو قائم رکھنے کی وقف بورڈ نے بھی توثیق، تصدیق کی ہے اور جناب مولوی حافظ سید حمید بخاری کو امام تسلیم کیا ہے۔ ۱۹۵۴ء کا وقف ایکٹ بھی وقف بورڈ کو جامع مسجد کا امام مقرر کرنے کا اختیار دیتا ہے۔ اس تاریخی پس منظر، وقف بورڈ کی توثیق، مسلمانوں کے جذبات اور پچھلے دو سالوں کے حالات و واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ جامع مسجد کے نظم و نسق میں کچھ تبدیلیاں کی جائیں۔ ایک ثالث کی حیثیت سے میں تمام حالات کا غیر جانبدارانہ اور منصفانہ جائزہ لینے کے بعد جامع مسجد دہلی سے متعلق مندرجہ ذیل انتظامی ڈھانچہ کی سفارش کرتا ہوں۔

۱۔ موجودہ نائب امام جناب سید عبداللہ بخاری کو جامع مسجد کا باقاعدہ امام تسلیم کیا جائے اور وقف بورڈ فوراً اس کی تصدیق کرے۔

۲۔ جناب سید عبداللہ بخاری کے صاحبزادے سید احمد بخاری کو نائب امام تسلیم کیا جائے اور وقف بورڈ فوراً اس کی تصدیق کرے۔

۳۔ جامع مسجد کے دوسرے جملہ ملازمین کی تنخواہوں میں مناسب اضافہ کیا جائے گا جس کا فیصلہ امام جامع مسجد اور وقف بورڈ کے چیرمین مل کر کریں گے جامع مسجد کے ان ملازمین کو موسم سرما میں ایک بار گرم وردی اور موسم گرما میں دو بار ٹھنڈی وردی بھی دی جائے گی۔

۴۔ جامع مسجد ایک کمیٹی کے انتظام میں رہے جس کا نام "جامع مسجد کمیٹی" ہوگا۔ یہ کمیٹی نو ممبروں پر مشتمل ہوگی۔ ثالث، جامع مسجد کمیٹی کی تشکیل، وقف بورڈ اور امام جامع مسجد اور نائب امام بالترتیب چیرمین اور ممبر ہوا کریں گے۔

۵۔ یہ کمیٹی جامع مسجد کی آمدنی و خرچ کا حساب رکھے گی اور دلی وقف بورڈ اس کے حسابات کی جانچ پڑتال کرے گا مسجد کے اندرونی انتظام کی ذمہ داری بھی اس کمیٹی پر ہوگی۔

۶۔ جامع مسجد کو سیاسی یا ذاتی اغراض و مقاصد کے لئے استعمال نہیں کیا جائے گا۔ مسجد کی امامت ایک مقدس منصب ہے۔ امام موصوف اس کے تقدس کو سیاست کی گندگی سے آلودہ نہیں ہونے دیں گے۔

۷۔ جناب مولوی حافظ سید حمید بخاری قطعی طور پر امامت کے منصب سے سبکدوش ہو جائیں گے اور ان کو ماہانہ پیشکش تاحیات دی جائے گی (جس کا تعین زیر غور ہے)

۸۔ میرا یہ ثالثی فیصلہ، امام جامع مسجد سید عبداللہ بخاری اور چیرمین دلی وقف بورڈ نے تسلیم کیا ہے اور اپنے دستخط ثبت کئے ہیں۔

کاتب: عبدالصبور خاں گونڈوی

31% سے زیادہ سُود حاصِل کیجئے !

انڈین اورسیز بنک کی بے مثل اسکیم کے تحت مبلغ ۔/6000 روپے مندرجہ ذیل ماہ کے لئے جمع کرانے پر آپ 10.34% سے 31.81% تک سُود حاصِل کر سکتے ہیں

تعدادِ ماہ :-
37 ، 62 ، 73 ، 85 ، 95 ، 109
121 ، 133 ، 145 ، 157 ، 169 ، 181
193 ، 205 ، 217 ، 229 یا 241

مزید تفصیلات کے لئے انڈین اورسیز بنک کی قریبی شاخ سے رجوع کیجئے ۔

دی پنجاب اینڈ سندھ بینک لمیٹڈ
کی
کثیر المقاصد ڈیپازٹ سکیمیں
ماسٹر پلان آف سیونگز
کلپ ورکش ڈیپازٹ سکیم
جمع کروائیں | عرصہ | رقم واجب الوصول
10,000/- | 25 سال | 1,20,569/- روپے
10,000/- | 20 سال | 73,280/- روپے
10,000/- | 15 سال | 44,539/- روپے
10,000/- | 10 سال | 27,070/- روپے
10,000/- | 61 ماہ | 16,590/- روپے
سیونگز وِدا سے سمائیل
جمع کروائیں | عرصہ | رقم واجب الوصول
1,000/- | 25 سال | 12,057.00 روپے
1,000/- | 20 سال | 7,328.00 روپے
1,000/- | 15 سال | 4,454.00 روپے
1,000/- | 10 سال | 2,708.00 روپے
1,000/- | 7 سال | 2,008.00 روپے
1,000/- | 61 ماہ | 1,659.00 روپے
وِندھ ڈیپازٹ سکیم
جمع کروائیں | عرصہ | رقم واجب الوصول
13647/- | 20 سال | ایک لاکھ روپے
22453/- | 15 سال | ایک لاکھ روپے
36941/- | 10 سال | ایک لاکھ روپے
سُکھی پریوار ڈیپازٹ سکیم
جمع کروائیں | عرصہ | رقم واجب الوصول
8294/- | 25 سال | ایک لاکھ روپے
10235/- | 20 سال | 75,000/- روپے
11226/- | 15 سال | 50,000/- روپے
9235/- | 10 سال | 25,000/- روپے
بھاگیہ شالی ڈیپازٹ سکیم
جمع کروائیں | عرصہ | رقم واجب الوصول
5000/- | 25 سال | 60,284/- روپے
5000/- | 20 سال | 36,640/- روپے
5000/- | 15 سال | 22,269/- روپے
5000/- | 10 سال | 13,535/- روپے
5000/- | 61 ماہ | 8,295/- روپے
آپ کی ہر طرح سے امداد کرنے کیلئے سارے بھارت میں ہماری 277 برانچیں ہیں
دی پنجاب اینڈ سندھ بینک لمیٹڈ
رجسٹرڈ آفس - ہال بازار، امرتسر
سنٹرل اینڈ ایڈمنسٹریٹو آفس :- H - بلاک کناٹ سرکس نیو دہلی 110001
چیئرمین :- اندرجیت سنگھ

آنریبل جنرل شاہنواز خاں وزیر اوقاف حکومت ہند، پنجاب وقف بورڈ انبالہ میں
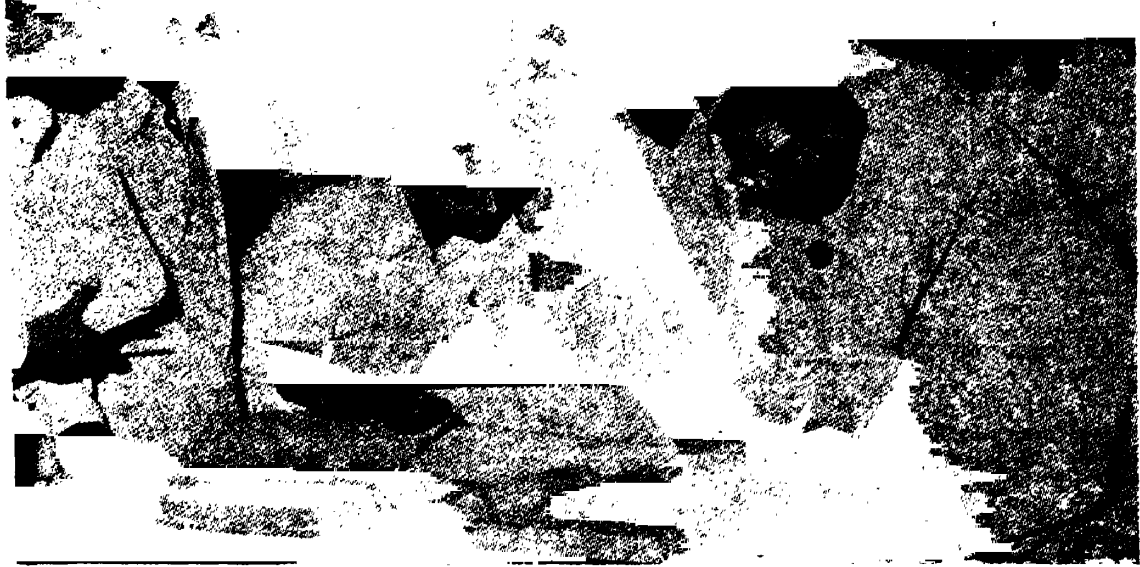
دفتر وقف بورڈ میں وزیر اوقاف ہند، "وقف دائرا کاؤنٹ" کی کتاب کا ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ تصویر میں، وزیر صاحب کے علاوہ، جناب حسن الدین احمد او۔ ایس۔ ڈی۔ وقف حکومت ہند، جناب طیب حسین خاں چیئرمین پنجاب وقف بورڈ، محترمہ ساجدہ بیگم و میاں غلام صابر، ممبران بورڈ، جناب غضنفر علی خاں سکریٹری بورڈ دکھائی دے رہے ہیں

جناب طیب حسین خاں چیئرمین بورڈ، جنرل شاہنواز خاں وزیر اوقاف ہند کو پنجاب کامن لینڈ ایکٹ کی وہ دفعات ملاحظہ کرا رہے ہیں، جن کی تاویل کر کے پنچایتوں نے وقف جائدادوں پر ناجائز قبضہ کرنا شروع کر دیا ہے ممتاز لیڈر شری دیو راج آنند سابق وزیر ہریانہ بھی تشریف فرما ہیں۔

No. D. N. 26827/73 Phone 22

Board's Publication

The A Quarterly

50, Sardar Patel Marg, AMBALA (Cant)

3/No. 1, 2. April-June 1975
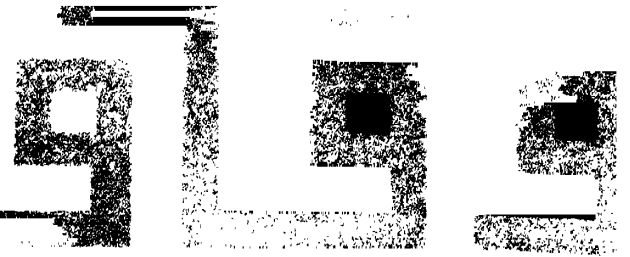
امداد گھر مسجد وجے واڑہ کی تقریب

جناب حسن الدین احمد او، ایس ڈی وقف حکومت ہند وجے واڑہ میں زیر تعمیر امداد گھر سرائے مسجد کی تکمیل کیلئے سنٹرل وقف کونسل کی جانب سے جناب جے وینگل راؤ وزیر اعلیٰ آندھرا پردیش کو تین لاکھ روپے کا چیک پیش کر رہے ہیں۔ مبارک تقریب میں جناب ابراہیم علی انصاری ریاستی وزیر اوقاف اور جناب آصف پاشا ریاستی وزیر قانون آندھرا پردیش بھی فروکش ہیں۔

امداد گھر (سرائے مسجد) وجے واڑہ

وجے واڑہ جیسے معروف ترین

اور کاروباری مقام پر مرکزی وقف کونسل اور ریاستی وقف بورڈ کے تعاون عمل سے سرائے مسجد وجے واڑہ سے متصل ایک سات منزلہ خوبصورت عمارت "امداد گھر" کی تعمیر عمل میں لائی جارہی ہے جس کا سنگ بنیاد ۴ جولائی ۷۵ء کو جناب شاہنواز خاں صاحب مرکزی وزیر اوقاف رکھیں گے۔ اس تقریب کی صدارت جناب جے وینگل راؤ چیف منسٹر آندھرا پردیش کریں گے۔ اس عمارت کی تعمیر پر (۱۸) لاکھ روپے کی لاگت آئے گی۔ مرکزی وقف کونسل نے آٹھ لاکھ روپے قرض منظور کیا ہے۔ مرکزی وقف کونسل نے یکم مارچ ۱۹۷۵ء کو ایک لاکھ روپے اجرا کر دیئے تھے۔ باقی تین لاکھ روپے کا چیک جناب سید رحمت علی صدرنشین ریاستی وقف بورڈ ۴ جولائی کو جناب شاہنواز خاں صاحب مرکزی وزیر اوقاف سے حاصل کریں گے۔ سرائے مسجد وجے واڑہ کا ایک قدیم ادارہ ہے۔ یہ مسجد ۱۸۲۱ء میں "مسجد سرائے سرکار نظام" کے نام سے موسوم تھی۔ ۱۹۴۸ء تک اس مسجد کے انتظامات حکومت حیدرآباد کی نامزد کردہ کمیٹی انجام دیا کرتی تھی لیکن اس کے بعد بعض افراد نے اس مسجد کے انتظام کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی جس کی وجہ سے مقامی مسلمانوں اور آندھرا مسلم ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے صدر جناب خواجہ محی الدین حسین اور سکریٹری جناب آصف پاشاہ صاحب ایڈوکیٹ نے اس مسئلہ کو عدالت سے رجوع کیا اور ایک کورٹ اسکیم منظور کی گئی جس کے بعد سے ایک کمیٹی اس مسجد کے انتظامات عمل میں لارہی ہے۔ ۱۹۷۳ء میں وقف بورڈ نے سرائے مسجد وجے واڑہ کے ڈیولپمنٹ کے لیے ایک اسکیم کو منظور کیا اور مرکزی وقف کونسل سے قرض کی درخواست کی گئی۔ اس وقت جناب فخرالدین علی احمد صاحب مرکزی وزیر اوقاف نے اس اسکیم کو کافی پسند کیا۔ اس کے بعد جناب شاہنواز خاں صاحب مرکزی وزیر اوقاف کی خصوصی توجہ اور ہمدردی کی وجہ سے مرکزی وقف کونسل نے اٹھارہ لاکھ روپے کی اس اسکیم کے لیے آٹھ لاکھ روپے قرض اجرا کرنا منظور کیا۔ اس سلسلہ میں جناب حسن الدین احمد صاحب آئی اے ایس آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی برائے وقف اور

جناب حسن الدین احمد او ایس ڈی وقف

جناب عبدالقیوم صاحب آئی اے ایس ریٹائرڈ سکریٹری مرکزی وقف کونسل نے متعدد مرتبہ وجے واڑہ کا دورہ کیا۔ امداد گھر کی سات منزلہ خوبصورت عمارت کا نقشہ ملک کے ممتاز جوان سال آرکیٹیکٹ خاں صاحب نے ہی نے تیار کیا ہے۔ اس عمارت میں بینکس، دکانیں، فلیٹس اور کانفرنس ہال تعمیر کیے جائیں گے۔ امداد گھر کے بورڈ آف ٹرسٹیز میں جناب سید احمد علی صاحب ایڈوکیٹ ورکنگ ٹرسٹی، جناب احمد سیٹھ، جناب محمد حمید اللہ، جناب عبدالرحمٰن صاحب ایڈوکیٹ اور ایس۔ اے ستار صاحب شامل ہیں۔ "امداد گھر" کی اس اسکیم کو روبہ عمل لانے کے لیے جناب کے۔ ایل۔ راؤ رکن پارلیمان اور جناب آصف پاشاہ ریاستی وزیر قانون کی شبانہ روز محنت ہمیشہ یادگار بنی رہے گی۔ ایک اندازہ کے مطابق "امداد گھر" سے سالانہ دو لاکھ روپے کی آمدنی ہوگی جناب آصف پاشاہ صاحب کے بیان کے مطابق اس آمدنی کو مستحق طلباء کی امداد، دینی تعلیم اور دیگر فلاحی کاموں پر خرچ کیا جائے گا۔ امداد گھر" (سرائے مسجد) کی تعمیری کمیٹی جناب ڈاکٹر کے۔ ایل۔ راؤ ایم۔ پی، جناب سید رحمت علی ڈپٹی اسپیکر و صدرنشین وقف بورڈ آندھرا پردیش اور جناب سید احمد علی ایڈوکیٹ کے علاوہ کلکٹر ضلع کرشنا اور جناب ایس۔ کے۔ ایس حسین سپرنٹنڈنگ انجینیر تعمیرات پر مشتمل ہے۔ تعمیری پروگرام کے مطابق سرائے مسجد کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے گا۔ امداد گھر کے تعمیری منصوبوں میں ریاستی وزیر اوقاف جناب محمد ابراہیم علی انصاری صاحب کی رہنمائی اور مشوروں کو بڑا دخل رہا ہے۔

۲ امداد گھر

جناب شاہنواز خاں
مرکزی وزیر زراعت و اوقاف حکومت ہند

جناب محمد ابراہیم علی انصاری
وزیر جنگلات و اوقاف حکومت آندھرا پردیش

جناب سید رحمت علی چیرمین وقف بورڈ

جناب آصف پاشاہ

زیر نظر تصویر میں مجوزہ عمارت

حضرت خواجہ غریب نواز ؒ کے پاکستانی زائرین جن کا استقبال ۱۱ جولائی کو اراکین پنجاب وقف بورڈ نے واگہ بارڈر پر کیا

پاکستانی زائرین چودھری طیب حسین خاں و مسٹر بھاٹیہ ممبران پارلیمنٹ اور افسرانِ ضلع

پنجاب وقف بورڈ نے پاکستانی زائرین کی تواضع آم، چائے، اور بریانی سے کی جس سے زائرین بہت محظوظ ہوئے۔

جناب اے ایم خسرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مذہبی خیراتی اداروں کے مطالعاتی دورے کے سلسلے میں (یو پی) آئے ہیں۔ ایم کیساتھ وقف بورڈ جناب

جناب اے ایم خسرو، چودھری طیب حسین خاں ایم پی چیرمین بورڈ، میاں غلام صابر ممبر بورڈ کے ساتھ تبادلۂ افکار فرما رہے ہیں۔

جناب وائس چانسلر صاحب نے بورڈ کے طریقِ کار کا معائنہ فرمایا آپ اوقاف کے سروے رجسٹر ملاحظہ فرما رہے ہیں۔
جناب چودھری طیب حسین خاں چیرمین، حکیم اجمل خاں مدیر اوقاف، غضنفر علی خاں سکریٹری دکھائی دے رہے ہیں۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ محبوب الٰہی کا ۶۶۹ واں سالانہ عرس ۳ مئی ۱۹۷۵ء کو عرس محل درگاہ شریف کی مجلس میں

پاکستانی زائرین کے لیڈر کنور محمد یٰسین خاں ایم پی اے، بابو جگجیون رام وزیر خوراک حکومتِ ہند، پیر ضامن نظامی سجادہ نشین اور معزز حاضرین

کنور محمد یٰسین خاں ایم پی اے، جنرل شاہنواز خاں وزیر اوقاف حکومتِ ہند، پیر ضامن نظامی سجادہ نشین، مفتی شریعت حکومت شام،
اور سید صولت حسین علی خاں سجادہ نشین درگاہ اجمیر شریف جلوہ افروز ہیں

مالیر کوٹلہ میں

جلوس عزا کا ایک منظر

درگاہ حاجی رتن بٹھنڈہ میں عرس کی تقریبات جناب مولانا خلیل الرحمان صاحب ممبر پنجاب وقف بورڈ نے افتتاح فرمایا۔

یکے از مطبوعات پنجاب وقف بورڈ

سہ ماہی اوقاف

مجلس ادارت

مدیر

حکیم احسن خاں

جلد ۳ | جولائی - ستمبر ۱۹۷۵ء | شمارہ ۳

اشتراکات

زر سالانہ ———— بارہ روپے
فی کاپی ———— تین روپے

سکریٹری پنجاب وقف بورڈ امیگزین، ۵۰ سردار پٹیل مارگ، اتیالہ کینٹ

محتویات

پرنٹر پبلشر اڈیٹر حکیم اجمل خاں نے پرنٹر پراتاب جناب حفظ بورڈ مطبوعہ کوہ نور پریس دہلی مقام اشاعت سے سوار ٹیلی مارک انبالہ کینٹ سے شائع کیا۔

مولانا عبدالسلام رحمانی

ایک آیت

"اپنی چال میں اعتدال اختیار کرو اور اپنی آواز ذرا پست رکھو، بے شک ساری آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی ہوتی ہے۔"

سورہ لقمان آیت ۱۹

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کچھ قیمتی نصیحتیں کی تھیں جن میں سے بعض اہم نصیحتیں
الیٰ نے قرآن میں بیان کر دی ہیں۔ تاکہ لوگ ایسے حکیم و دانا شخص کی ان قیمتی نصیحتوں
ائدہ اٹھائیں۔

حضرت لقمان کی شخصیت ایک حکیم و دانا کی حیثیت سے مشہور چلی آ رہی ہے اور آج بھی
ے لقمان حکیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے (حکیم کے معنی ہیں حکمت و دانائی والا) ان کی
ے اس بنا پر اور بھی زیادہ قابل توجہ ہیں کہ انھوں نے یہ نصیحت اپنے بیٹے کو کی تھی اور
تے ہے کہ آدمی دنیا میں سب سے بڑھ کر اگر کسی کے حق میں مخلص ہو سکتا ہے تو وہ اس کی
ولاد ہی ہے۔ ایک شخص دوسروں کو دھوکہ دے سکتا ہے۔ ان سے منافقانہ باتیں کر سکتا
یکن اپنی اولاد کو تو کوئی برے سے برا آدمی بھی فریب دینے کی کوشش کبھی نہیں کر سکتا
لیے لقمان جیسے حکیم و دانا کی نصیحت جو انھوں نے اپنی اولاد کو کی تھی اس لائق ہے
ے پر خاص توجہ دی جائے کیوں کہ وہ نصیحتیں نہایت ہی مخلصانہ اور قیمتی ہیں۔

مذکورہ آیت میں حضرت لقمان کی دو نصیحتیں ذکر کی گئی ہے پہلی نصیحت یہ ہے
اپنی چال میں اعتدال اختیار کرو، یعنی ایک سیدھے سادھے معقول و شریف آدمی کی
چال چلو جس میں نہ کوئی اینٹھ اور اکڑ ہو نہ ریاکارانہ زہد و انکسار۔

بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ نہ تیز چلو نہ آہستہ بلکہ میانہ روی اختیار
۔ لیکن جس سلسلہ بیان میں یہ نصیحت کی گئی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ
ے رفتار کی تیزیا سستی زیر بحث نہیں ہے۔ آہستہ چلنا یا تیز چلنا اپنے اندر کوئی اخلاقی
ے قبیح نہیں رکھتا اور نہ اس کے لیے کوئی ضابطہ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ آدمی کو جلدی
ے کام ہو تو تیز کیوں نہ چلے، اور اگر وہ محض تفریحاً چل رہا ہے تو آخر آہستہ چلنے میں
باحت ہے۔ میانہ روی کا اگر کوئی معیار ہو بھی تو ہر حالت میں ہر شخص کے لیے اسے
قاعدہ کلیہ کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ دراصل یہاں جو چیز مقصود ہے وہ نفس کی اس
تے کی اصلاح ہے جس کے اثر سے چال میں تبختر اور مسکینی کا ظہور ہوتا ہے۔
ی کا گھمنڈ اندر موجود ہو تو وہ لازماً ایک خاص طرز کی چال میں ڈھل کر ظاہر ہوتا ہے
بجسے دیکھ کر نہ صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی کسی گھمنڈ میں مبتلا ہے بلکہ چال کی شان

یہ تک بتا دیتی ہے کہ کس گھمنڈ میں مبتلا ہے دولت، اقتدار، حسن، علم، طاقت اور ایسی ہی
دوسری جتنی چیزیں بھی انسان کے اندر تکبر پیدا کرتی ہیں ان میں سے ہر ایک کا گھمنڈ اس
کی چال کا ایک مخصوص ٹائپ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس مسکینی کا ظہور بھی کسی نہ
کسی مذموم نفسی کیفیت کے اثر سے ہوتا ہے کبھی انسان کے نفس کا مخفی تکبر ایک نمائشی تواضع
اور دکھاوے کی درویشی و خدا رسیدگی کا روپ دھار لیتا ہے اور یہ چیز اس کی چال میں
نمایاں نظر آتی ہے اور کبھی انسان واقعی دنیا اور اس کے حالات سے شکست کھا کر اور اپنی
نگاہ میں آپ حقیر ہو کر مریل چال چلنے لگتا ہے۔ حضرت لقمان کی نصیحت کا منشا یہ ہے کہ اپنے
نفس کی ان کیفیات کو دور کرو اور ایک سیدھے سادھے معقول اور شریف کی سی چال چلو
جس میں نہ کوئی اینٹھ اور اکڑ ہو، نہ مریل پن، نہ ریاکارانہ زہد و انکسار۔

دوسری نصیحت یہ فرمائی کہ اپنی آواز ذرا پست رکھو بے شک گدھے کی آواز
بہت بُری ہوتی ہے۔ لیکن اس نصیحت کا منشا یہ نہیں ہے کہ آدمی ہمیشہ آہستہ بولے اور
کبھی زور سے بات نہ کرے۔ بلکہ گدھے کی آواز سے تشبیہ دے کر واضح کر دیا گیا ہے کہ
مقصود کس طرح کے لہجے اور کس طرح کی آواز میں بات کرنے سے روکنا ہے۔ لہجے اور آواز
کی ایک پستی و بلندی اور سختی و نرمی تو وہ ہوتی ہے جو فطری اور حقیقی ضروریات کے
لحاظ سے ہو۔ مثلاً قریب کے یا کم آدمیوں سے آپ مخاطب ہوں تو آہستہ بولیں گے
دور کے آدمی سے بولنا ہو یا بہت سے لوگوں سے خطاب کرنا ہو تو لامحالہ زور سے
ہی بولنا ہوگا۔ ایسا ہی فرق لہجوں میں بھی موقع و محل کے لحاظ سے ہوتا ہے تعریف
کا لہجہ مذمت کے لہجے سے اور اظہار خوشنودی کا لہجہ ناراضی کے لہجے سے مختلف ہونا
ہی چاہیے یہ چیز کسی درجہ میں بھی قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ نہ لقمان کی نصیحت
کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس فرق کو مٹا کر ہمیشہ ایک ہی طرح نرم آواز اور پست لہجے
میں بات کیا کرے۔ قابلِ اعتراض جو چیز ہے وہ تکبر کا اظہار کرنے اور دھونس جمانے
اور دوسرے کو ذلیل و مرعوب کرنے کے لیے گلا پھاڑنا اور گدھے کی سی آواز میں بولنا ہے۔

(استفادہ از تفہیم القرآن)

مولانا عبدالسلام رحمانی

ادب روایت

صحابیٔ رسول حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور جان کنی کا وقت آیا تو اُن کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور آپ کو علقمہ کی جانکنی کی خبر دی۔ آپ نے حضرت بلال حبشی و صہیب رومی و عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم کو بھیجا کہ اس حالت میں کلمہ پڑھنے کی تلقین کرو۔ جب یہ حضرات علقمہ کے پاس پہنچے اور کلمہ کی تلقین کی تو یہ دیکھ کر ان حضرات کو سخت حیرت ہوئی کہ علقمہ جیسے نیک و بزرگ صحابی کی زبان پر کلمہ کے الفاظ جاری نہیں ہو رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے دریافت فرمایا کہ ان کے ماں باپ زندہ ہیں؟ آپ کو بتایا گیا کہ صرف ماں زندہ ہے باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ آپ نے حضرت علقمہ کی ماں کو خبر پہنچائی کہ میں آپ سے ملنے کے لئے آنا چاہتا ہوں۔ بوڑھی ماں نے کہا حضور تکلیف نہ فرمائیں میں خود حاضر ہوتی ہوں۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد علقمہ کی ماں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچی۔ آپ نے فرمایا علقمہ کی ماں سچ سچ بتاؤ علقمہ کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا **یا رسول اللہ انہ کان کثیر الصلاۃ وکثیر الصیام وکثیر الصدقۃ وأما أنا ساخطۃ** وہ بڑا نمازی، بڑا روزہ دار اور بڑا خیرات کرنے والا ہے لیکن میں اس سے ناراض رہتی ہوں۔ فرمایا آپ کیوں ناراض رہتی ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ اے اللہ کے رسول وہ اپنی بیوی کو مجھ پر ترجیح دیتا تھا اور میری نافرمانی کرتا تھا۔ آپ نے فرمایا، اے علقمہ کی ماں آپ کی ناراضگی ہی کے سبب علقمہ کی زبان سے کلمہ ادا نہیں ہو رہا ہے اگر اسی حالت میں وفات ہو گئی تو اس کا خاتمہ ایمان پر نہ ہوگا۔ یہ کہہ کر آپ نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ جاؤ اور بہت سی لکڑیاں جمع کر کے اس میں آگ لگا دو، جب آگ خوب تیار ہو جائے تو علقمہ کو اس میں ڈال دو۔ علقمہ کی ماں نے کہا۔ اے اللہ کے رسول میں اسے برداشت نہیں کر سکتی کہ میرا بیٹا آگ میں ڈالا جائے۔ آپ نے فرمایا تیری ناراضگی کی وجہ سے خدا جس آگ میں اسے ڈالے گا وہ آگ اس سے کہیں زیادہ تیز ہوگی اگر تو چاہتی ہے کہ خدا اسے بخش دے تو تو راضی ہو جا۔ اور اس کی غلطیوں کو معاف کر دے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے علقمہ کو اس کی نماز، اس کا روزہ اور اس کے صدقات و خیرات کچھ نفع نہ دے سکیں گے جب تک تو اس پر ناراض رہے گی۔ یہ سن کر ماں نے علقمہ کو معاف کر دیا اور ان سے راضی ہو گئی۔ اس کے بعد کلمہ شہادت کی تلقین کی گئی تو علقمہ کی زبان کھل گئی اور کلمہ بلا تکلف جاری ہو گیا۔ آپ نے فرمایا علقمہ کی ماں کی ناراضگی کے سبب زبان بند تھی اور اس کی رضامندی سے علقمہ کی زبان کھل گئی۔

علقمہ جانکنی کی حالت میں تھے کچھ دیر بعد انکا انتقال ہو گیا۔ جب انکی تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی تو آپ نے صحابہ کے مجمع میں انکی قبر کے پاس یہ اعلان کیا۔ **من فضل زوجتہ علی أمہ فعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس أجمعین لا یقبل اللہ منہ صرفا ولا عدلا إلا أن یتوب ویحسن إلیہا ویطلب رضاہا**

جو شخص اپنی بیوی کو اپنی ماں پر ترجیح دے گا تو اس پر اللہ کی لعنت، فرشتوں کی لعنت اور تمام انسانوں کی لعنت ہوگی اور اللہ تعالیٰ اس کی نفل قبول کرے گا نہ فرض، مگر یہ کہ وہ توبہ کرے اور ماں کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور اس کی رضامندی کو پیشِ نظر رکھے (الزواجر للہیثمی جلد ثانی ص ۵ مطبوعہ مصر)

یہ روایت اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ ماں کا جو مقام ہے اور اس کے احسانات جس نوعیت کے ہیں اس کے مقابل میں بیوی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ مگر زمانے کی یہ بوالعجبیاں دیکھئے کہ وہی ماں جو بیٹے کو اس کے بچپن سے جوانی تک اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے اور بڑی تمناؤں اور مسرتوں کے ساتھ بیٹے کی شادی کرتی ہے۔ عام طور پر وہی بیٹے بیوی پا لینے کے بعد اسے جان سے بھی عزیز سمجھنے لگتے ہیں اور ماں کی مامتا بھول جاتے ہیں۔ انھیں ماں سے زیادہ بیوی کو خوش رکھنے کی فکر ہوتی ہے۔ ماں سے زیادہ بیوی کے آرام کا خیال رکھتے ہیں اور یہ کتنی بڑی گستاخی ہے کہ ماں جس کی اہمیت بیوی سے بدرجہا بدرجہا فزوں تر ہے بیٹے کی نظر میں بیوی سے کمتر ہو جاتی ہے۔ یہ انتہائی مذموم و بے تکی چیز ہے اور اللہ و رسول اس شخص پر لعنت بھیجتے ہیں جو ایسی بے تکی حرکت کا مرتکب ہوتا ہے۔

اس حدیث سے یہ بات بھی بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہے کہ جو چیز جس درجہ کی ہو اور جس اہمیت کی حامل ہو اس کو وہی درجہ اور وہی اہمیت دینی چاہئے اور ہر چیز کو اس کے واجبی مقام پر ہی رکھنا چاہئے ـــ "گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی"

وہ نہایت ہی ملعون و بدترین لوگ ہیں جو اہم و غیر اہم میں تمیز نہیں کرتے۔ جو اہم کو اہمیت نہیں دیتے اور غیر اہم کو خواہ مخواہ اہمیت دینے لگتے ہیں۔ آپ غور کیجئے اور اس اُمتِ مسلمہ کا جائزہ لیجئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ اس امت کی دینی و دنیوی دونوں لحاظ سے بربادی و تباہی و زوال کا اہم سبب یہی ہے کہ یہ امت جسے خدائی رہنمائی ملی تھی اس رہنمائی سے روگردانی کر کے الٹی بہکی بہکی چال کا نتیجہ یہ دیکھنا پڑا۔ در اصل بدترین حرکت نے اسے یہ دن دکھایا ہے کہ دینی اعتبار سے بھی یہ قوم بگاڑ کے آخری نقطہ پر پہونچ چکی ہے اور دنیاوی اعتبار سے بھی اس کی تباہی قابلِ عبرت ہو گئی ہے۔

سید مرغوب امین کاظمی

اوقاف

مفہوم، احکام، و مسائل

وقف کے معنی

کسی چیز کو معاوضہ لیئے بغیر اپنی ملکیت سے خارج کر کے خالص خداوند تعالٰے کی ملکیت قرار دے کر، اس کا فائدہ جس کو واقف چاہے پہنچاتا رہے، وقف کرنا کہلاتا ہے۔ یعنی جو چیز وقف کی جاتی ہے وہ واقف کی ملکیت سے خارج ہو جاتی ہے لیکن جس کو وقف کی گئی ہے اسں کی ملکیت نہ ہو کر خالص خداوند تعالٰے کی ملکیت قرار پاتی ہے۔

وقف دوامی ہمیشہ کے لیئے ہوتا ہے۔ اس کو باطل نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وقف کی ہوئی چیز کو نہ فروخت کیا جا سکتا ہے نہ ہبہ اور نہ ہی اس میں میراث جاری کی جا سکتی ہے۔

اگر واقف مسلمان ہے اور اس نے کسی کی حق تلفی نہ کر کے نام و نمود اور دنیوی اغراض ومقاصد کے حصول سے بے نیاز ہو کر، نیک نیتی کے ساتھ وقف کیا ہے تو اس کو ثواب ملے گا کیونکہ وقف ایک صدقہ جاریہ ہے جس کا ثواب واقف کو برابر ملتا رہتا ہے حضور اقدسؐ کا ارشاد ہے۔

"مرنے کے بعد انسان کے تمام عمل ختم ہو جاتے ہیں لیکن تین چیزوں کا ثواب اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے نامۂ اعمال میں درج ہوتا رہتا ہے۔۔۔۔

۱۔ صدقۂ جاریہ۔ ۲۔ علم اور ۳۔ نیک اولاد" (مسلم شریف)

وہی وقف سب سے زیادہ بہتر ہے جس کی مسلمانوں کو زیادہ ضرورت لاحق ہو۔ ذیل کی حدیث اس قول کی وضاحت کرتی ہے۔

"حضرت سعد بن عبادہؓ نے حضور اقدسؐ سے عرض کی کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے میں ایصالِ ثواب کی خاطر کچھ صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ کونسا صدقہ بہتر رہے گا؟ آپؐ نے فرمایا، "پانی" کیوں کہ عرب میں پانی کمیاب تھا اور لوگوں کو اسکی زیادہ ضرورت تھی چنانچہ حضرت سعدؓ نے حسب ارشادِ نبویؐ ایک کنواں کھدوا دیا اور کہہ دیا کہ یہ سعدؓ کی ماں کے لیئے ہے" (ابوداؤد و نسائی)

لہٰذا اس حدیثِ پاک کی رو سے ایک واقف کے لیئے لازم ہے کہ وہ مسلمانوں کی اہم ضروریات اور وقت کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وقف کرے۔ دورِ حاضر میں مسلمانوں کو اسلامی درسگاہوں اور دار المطالعہ کی سخت ضرورت ہے لہٰذا انھیں مقاصد کے لیئے وقف کرنا ہوگا۔ چوں کہ واقف سے بہتر وقف کا انتظام دوسرا شخص نہیں کر سکتا اس لیئے وقف کی صحت کے لیئے متولی کا مقرر کیا جانا لازمی نہیں ہے۔

وقف کے الفاظ

وقف کرنے کے لیئے خاص الفاظ مقرر ہیں مثلاً

"میری یہ جائداد صدقۂ موقوفہ ہے اس کی آمدنی ہمیشہ مساکین پر صرف ہوگی۔"

"میں نے اپنی اس جائداد کو اللہ تعالٰے کے لیئے وقف کر دیا۔"

"میں نے اپنی اس جائداد کو مسجد یا مدرسہ، فقراء یا فلاں نیک کام کے لیئے وقف کیا۔"

"میں نے اپنی اس جائداد کو اللہ کی راہ کے لیئے وقف کر دیا۔"

اسں طرح کے الفاظ زبان سے ادا کرنے پر ہی وقف صحیح ہوگا ورنہ نہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ "میری یہ جائداد صدقہ ہے یا میں نے اس کو غریبوں پر تصدق کیا" تو اس کے اس طرح کہنے سے وقف نہیں ہوگا کیونکہ یہ ایک طرح کی منت ہے اور اس شخص پر منت پوری کرنے کے لیئے اس زمین یا اس کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے اگر وہ صدقہ کر دیتا ہے تو بہتر ہے ورنہ اسکے مرنے کے بعد اس جائداد میں وراثت جاری ہوگی اور منت پوری نہ کرنے کا گناہ اس شخص پر ہوگا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ "میں نے اپنی اس جائداد کو فقراء کے لیئے کر دیا" تو اس سے دریافت کیا جائے گا کہ اس جملہ سے تیری کیا مراد ہے اگر وہ جواب میں "وقف" کہتا ہے تو وقف ہے "صدقہ" کہتا ہے تو صدقہ ہے یا اس کا کچھ ارادہ تھا ہی نہیں تو "نذر" ہے اگر وہ نذر پوری نہیں کرتا تو اس کے مرنے کے بعد اس جائداد میں وراثت جاری ہوگی ورثاء پر اسں کی منت کا پورا کرنا لازمی نہیں ہے۔

کسی شخص نے یہ وصیت کی کہ میری اس جائداد کی آمدنی ہمیشہ مساکین کو دی جائے یا جب تک فلاں شخص زندہ ہے اس کو اور اس کے مرنے کے بعد مساکین پر صرف کی جائے تو یہ صراحتاً وقف نہیں بلکہ ضرورتاً وقف ہے۔

کسی شخص نے کہا میں نے اپنے باغ کی پیداوار یا جائداد کی آمدنی وقف کی تو باغ یا جائداد ہی کو وقف سمجھا جائے گا۔

کسی شخص نے کہا کہ میرے مکان کے کرایہ میں سے اتنی رقم کا کھانا خرید کر ہر ماہ مساکین کو کھلا دیا جایا کرے تو وہ مکان وقف سمجھا جائے گا۔

کسی نے کہا میں نے اپنی یہ جائداد وقف کی اس کی آمدنی حج وغیرہ میں صرف کی جاتے تو وقف درست ہے اور اگر یہ کہا کہ یہ جائداد صدقہ ہے اس کو فروخت نہ کیا جائے تو وقف

نہیں صدقہ ہے اور اگر یہ کہا کہ صدقہ ہے اس کو نہ فروخت کیا جائے نہ ہبہ اور نہ اس میں سے میراث جاری کی جائے تو فقراء پر وقف ہے۔

وقف کے شرائط

۱۔ واقف عاقل، بالغ اور آزاد ہو۔ مجنون، نابالغ اور غلام کا وقف درست نہیں ــ واقف کے لئے مسلمان ہونا شرط نہیں، غیر مسلم کا وقف بھی درست ہے۔

۲۔ وہ کام جس کے لئے وقف کرتا ہے، واقف کے اعتقاد میں بھی اور درحقیقت میں بھی نیک کام ہو اگر اس کے برعکس ہے تو وقف درست نہیں ہوگا۔ بہ الفاظ دیگر کسی ایسے کام کے لئے وقف کیا گیا جو درحقیقت ناجائز ہے لیکن واقف کے اعتقاد میں وہ نیک کام ہے یا فی الواقع نیک کام ہے لیکن واقف کے اعتقاد میں غلط کام۔ ہم قران دونوں صورتوں میں وقف درست نہیں ہوگا مثلاً ایک یہودی یا عیسائی بیت المقدس کے لئے کوئی جائداد وقف کرتا ہے یا ایک غیر مسلم فقراء، مساکین، اہل ذمہ، مسلمانوں یا دیگر امور خیر کے لئے وقف کرتا ہے تو جائز ہے کیونکہ یہ کام اسلام اور دیگر تمام مذاہب کے نزدیک امور خیر ہیں۔ اس کے برعکس گرجا، مندر، مسجد، مرہیوں یا حج وغیرہ کے لئے وقف کرے تو ناجائز ہے کیونکہ گرجا، مندر اور مرہیوں پر وقف اسلامی اعتقادات کے اور مسجد، حج وغیرہ پر وقف دیگر مذاہب کے اعتقادات کے منافی ہے یہی وجہ ہے کہ ایک غیر مسلم کی بنائی ہوئی مسجد، مسجد نہیں اور ایک مسلمان کا بنایا ہوا بتخانہ، بتخانہ نہیں ہوگا۔ دونوں صورتوں میں وقف باطل ہے اور اس میں میراث جاری کی جائے گی۔

۳۔ وہ چیز جس کو وقف کرتا ہے، وقف کرتے وقت واقف کی ملکیت میں ہونا لازمی ہے اگر ایسا نہیں ہے تو وقف درست نہیں ہوگا مثلاً کوئی شخص کسی کی جائداد غصب کرکے وقف کردے خواہ بعد میں اس کا جائز مالک ہی ہو جائے یا کسی نے کسی دوسرے کے حق میں اپنی جائداد کی وصیت کی اور جس کے حق میں وصیت کی گئی ہے وہ، وصیت کرنے والے کی موت سے قبل ہی اس جائداد کو وقف کردے یا کسی نے جائداد خریدی اور بیچنے والے کو خیار شرط تھا لیکن خریدار نے اس کی پرواہ کئے بغیر وقف کردیا اور بعد میں بیچنے والے نے بھی خیار کو ساقط کردیا اور بیع کو جائز قرار دیدیا کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اپنی جائداد ہبہ کردے اور وہ شخص جس کو ہبہ کی گئی ہے قبضہ لینے سے پہلے ہی اس جائداد کو وقف کردے یا کوئی شخص بیع فاسد سے جائداد خرید کر قبضہ لینے سے قبل ہی اس کو وقف کردے تو ان تمام صورتوں میں وقف درست نہیں ہوگا یہی نہیں بلکہ کسی نے جائداد خرید کر وقف کردی ہے اور اس پر کسی دوسرے شخص نے ملکیت یا شفعہ کا دعویٰ کردیا ہے اور عدالت نے فیصلہ مدعی کے حق میں کردیا ہے تو وقف شکست ہو جائے گا۔ خواہ واقف نے اس کو مسجد ہی کیوں نہ بنایا ہو۔

۴۔ وقف کی درستی کے لئے ضروری ہے کہ واقف کو اس کی کم عقلی یا قرض کے بار کی وجہ سے اپنی جائداد میں تصرف کرنے کے حق سے محروم نہ کردیا گیا ہو مثلاً ایک بے وقوف آدمی اپنی جائداد وقف کردیتا ہے اور قاضی اس اندیشہ کے تحت کہ اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو یہ اپنی جائداد برباد کردے گا اس پر یہ پابندی عائد کردیتا ہے کہ اس شخص کو اپنی جائداد میں تصرف کرنے کے حق سے محروم کیا جاتا ہے تو ایسے شخص کا کیا ہوا وقف باطل ہو جائے گا۔ لیکن اگر وہ اس شرط کے ساتھ وقف کرتا ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں اس کی آمدنی میری ذات پر خرچ ہوگی اور میرے بعد امور خیر پر تو وقف درست ہو جائے گا۔

اگر کسی مریض پر اس قدر زیادہ قرض ہے کہ اس کی تمام جائداد اس قرض میں چلی جائے گی تو اس کا وقف بھی باطل ہو جائے گا کیونکہ قرض کی ادائیگی لازمی ہے وقف کرنا ضروری نہیں۔

۵۔ وقف کرتے وقت حصہ کا تعین لازمی ہے۔ مثلاً کسی شخص نے اپنی جائداد کا ایک حصہ وقف کیا اور وقف کرتے وقت یہ تعین نہیں کیا کہ وہ کتنا ہے اور بعد میں تعین کرتا ہے، یا تردید کرتا ہے کہ یہ زمین نہیں وہ زمین وقف کی ہے تو ان دونوں صورتوں میں وقف باطل ہو جائے گا کیونکہ وقف کی درستی کے لئے جائداد کا معلوم ہونا ضروری، حدود کا ذکر لازمی نہیں۔ اس کے برعکس ایک شخص نے کہا کہ اس مکان میں میرے جتنے سہام ہیں یا جس قدر حصہ ہے میں نے اس سب کو وقف کیا اور حقیقتاً اس شخص کو اس کا علم نہیں ہے کہ وہ کتنے سہام یا حصہ کا مالک ہے اس صورت میں وقف درست کیونکہ فی الحقیقت اس کا حصہ مقرر ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ "اس مکان میں میرا جس قدر حصہ ہے" اور وہ اتنا ہے "میں نے اس سب کو وقف کیا" تقسیم کرنے پر پتہ چلا کہ اس نے جس قدر حصہ بتایا ہے کہ وہ اس سے کم یا زیادہ ہے تو وہ شخص جس قدر حصہ کا مالک ہے اسی قدر جائداد وقف سمجھی جائے گی۔

اگر کوئی شخص ایسی جائداد وقف کرتا ہے جس پر درخت ہیں اور وہ درختوں کو وقف سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے تو وقف درست نہیں ہوگا۔

اسی طرح اگر موقوف علیہ مجہول ہے تو وقف درست نہیں ہوگا مثلاً کوئی شخص محض اتنا کہتا ہے کہ میں نے "اس کو اللہ کے لئے وقف موبد کیا یا اپنی قرابت والے پر یا فلاں شخص پر اور اس کے بعد مساکین پر وقف کیا" تو یہ وقف صحیح نہیں ہوگا کیونکہ یہاں پر موقوف علیہ مجہول ہے۔

۶۔ وقف کو شرط پر معلق نہیں کیا جاسکتا خواہ وہ شرط ایسی ہی کیوں نہ ہو جس کا ہونا یقینی ہو مثلاً اگر میں اس زمین کا مالک ہو جاؤں یا اگر میں چاہوں یا اگر فلاں شخص کہہ دے (اور وہ شخص کہہ دیتا ہے) یا اگر میں اس بیماری میں مرجاؤں تو میری یہ جائداد وقف ہے۔ تو اس طرح کی عائد کردہ جملہ شرائط کے پورا ہو جانے کے باوجود بھی وقف درست نہیں ہوگا لیکن اگر شرائط ایسی ہیں جو وقف کرتے وقت موجود ہیں تو تعین کو باطل اور وقف کو درست سمجھا جائے گا۔

۷۔ وقف کے لئے وصیت کرنا یا وکیل مقرر کرنا جائز ہے۔ مثلاً کسی شخص نے وصیت کی کہ اگر میں مرجاؤں یا اس مکان میں داخل ہوں تو تم اس کو وقف کردینا۔ اور وہ شخص جس سے کہا گیا ہے اس مکان کو وقف کردیتا ہے اور ورثاء بھی اس کو جائز قرار دیدیتے ہیں تو وقف درست ہو جائے گا۔ اگر ورثاء جائز قرار نہیں دیتے تو صرف تہائی حصہ وقف متصور ہوگا۔

۸۔ جائداد موقوفہ کو بیع کرکے ثمن کو صرف کر ڈالنے کی شرط نہ ہو اگر کوئی شخص یہ شرط لگاتا ہے کہ میں جائداد موقوفہ کو جس کو چاہوں ہبہ کردوں یا ضرورت پڑنے پر فروخت کردوں یا رہن رکھ دوں یا اسی طرح کی کوئی اور شرط لگاتا ہے جس سے وقف کا ابطال ہوتا ہو تو وقف باطل ہو جائے گا لیکن مسجد کے بارے میں اس طرح کی جملہ شرائط کو باطل اور وقف کو درست سمجھا جائے گا البتہ موقوفہ جائداد کو فروخت کرکے اس کے بدلہ میں دوسری جائداد خرید کر موقوفہ جائداد کے قائم مقام کی جاسکتی ہے لیکن مسجد اس سے مستثنیٰ ہے۔

۹۔ کیونکہ وقف دوامی ہوتا ہے اس لئے وقف میں ہمیشگی کا ذکر شرط نہیں مقررہ مدت کے لئے وقف نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ میری یہ جائداد ایک سال تک صدقہ

موقوفہ ہے تو اس کا یہ کہنا صدقہ کی وصیت سمجھی جائے گی اور اس جائداد کی آمدنی ہمیشہ فقرا میں خرچ کی جائے گی۔ اگر اس نے یہ کہا ہے کہ میری یہ جائداد فلاں شخص پر ایک سال کے لیے صدقہ موقوفہ ہے اور سال ختم ہونے کے بعد وقف باطل ہے تو اس جائداد کی آمدنی ایک سال تک اس شخص پر اور اس کے بعد مساکین پر صرف کی جائے گی اور اگر صرف اتنا کہا ہے کہ فلاں شخص پر ایک سال تک صدقہ موقوفہ ہے تو ایک سال تک اس کی آمدنی اس شخص پر صرف ہوگی اور اس کے بعد ورثا میں تقسیم کر دی جائے گی۔

۱۔ وقف ہر حالت میں ایسی جہت کے لئے ہونا لازمی ہے جس میں انقطاع نہ ہو مثلاً کسی نے اپنی جائداد اپنی اولاد پر وقف کی اور اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر یہ سلسلہ ختم ہو جائے تو آمدنی کا صرف "مساکین" یا "امور خیر" پر کیا جائے یا صرف اتنا کہا ہے کہ میں نے اسے وقف کیا اور موقوف علیہ کا تذکرہ نہیں کیا تو عرف عام میں ایسا وقف مصرف خیر کے لئے سمجھا جاتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں چونکہ وقف کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا بلکہ باقی رہتا ہے لہٰذا وقف درست ہے۔ چونکہ مسجد بھی ہمیشہ رہنے والی ہے اس لئے مسجد کے وقف میں بھی ایسی جہت ہے جو قطع نہیں ہوتی اور وقف کا سلسلہ باقی رہتا ہے۔

وقف کی درستی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ جائداد موقوفہ کے ساتھ غیر کے حق کا کوئی تعلق نہ ہو اگر تعلق ہے تب بھی وقف کی درستی پر کوئی اثر نہیں پڑتا مثلاً ایک زمین اجارہ پر ہے اور وقف کر دی گئی ہے تو وقف صحیح ہے اجارہ کی مدت ختم ہونے پر جائداد مصرف وقف میں آجائے گی۔

کسی نے موقوفہ مکان کو رہن رکھ دیا یا فروخت کر دیا اور مرتہن یا مشتری اس میں رہنے لگے اور اس کو بعد میں معلوم ہو جائے کہ یہ مکان موقوفہ ہے تو اسے اس مدت سکونت کا کرایہ دینا ہوگا۔

جائداد موقوفہ کو جن پر وہ وقف کی گئی ہے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ باہمی رضامندی سے وہ ایک سال کے لئے اس کے حصے متعین کر کے استعمال میں لا سکتے ہیں لیکن آئندہ سال ان کے لئے باہمی تبادلہ کرنا لازمی ہوگا۔

اشیائے موقوفہ

عموماً جائداد غیر منقولہ جیسے مکان، دوکان، زمین، کھیت اور باغ وغیرہ کو وقف کیا جاتا ہے لیکن ایسی منقولہ اشیاء بھی جو غیر منقول کے تابع ہوں تبعاً وقف کی جا سکتی ہیں مثلاً کھیت اور باغ کے ساتھ بیل، کھیتی اور باغبانی کے آلات نیز غلام وغیرہ۔ وقف کرتے وقت ان اشیاء کی تعداد اور ان کے نفقہ کا تذکرہ کر دینا ضروری ہے۔ اگر ان پر صرف سے متعلق کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے تو وقف کی آمدنی سے ہی ان پر صرف کیا جائے گا۔

غلام یا جانور ناکارہ ہو گئے ہیں اور واقف نے ان کی خوراک وغیرہ تا زیست دینے کی شرط عائد کر دی ہے تو اب بھی دی جائے گی اور اگر کارآمد ہونے کی حد تک کھلانے کی شرط ہے تو ان کو فروخت کر کے دوسرے لئے جائیں گے قیمت کی کمی بیشی کا اثر وقف کی آمدنی پر ہوگا۔ اسی طرح دیگر آلات بھی ناکارہ ہونے کی صورت میں فروخت کر کے نئے خرید لئے جائیں گے۔

گھوڑے اور اسلحہ کا وقف جائز ہے۔ دیگر منقولات مثلاً مردہ لے جانے کی چارپائی۔ جنازہ پوش۔ میت کے غسل کا تختہ۔ قرآن مجید۔ کتابیں دیگ۔ دری۔ قالین۔ شامیانے شادی و برات کے سامان، مدرسوں اور یتیم خانوں کے لئے سرمائی کپڑے وغیرہ تبعاً وقف کئے جا سکتے ہیں اور ان کا سلسلہ مذکورہ بالا طریقہ سے قائم رکھا جا سکتا ہے۔

بادشاہ اسلام بیت المال کی زمین مصالح عامہ پر وقف کر سکتا ہے اپنی ذات یا اولاد کے لئے نہیں۔

اجارہ پر یا عاریتاً لی ہوئی زمین پر مکان بنا کر وقف کرنا ناجائز ہے البتہ زمین جو اسی مقصد کے لئے اجارہ پر لی گئی ہے تو جائز ہے۔

وقف شدہ زمین پر اسی مقصد کے لئے جس کے لئے وہ زمین وقف ہے، مکان بنا کر وقف کر دینا جائز ہے۔ دوسرے کام کے لئے نہیں، ہاں محتکر زمین ہی دوسرے مقصد کے لئے بھی جائز ہے۔

زمین پر درخت لگا کر محض درختوں کو یا صرف زمین کو وقف کرنا جائز نہیں، دونوں کو وقف کرنا ہوگا۔ موقوفہ زمین پر درخت لگانے کا بھی وہی حکم ہے جو موقوفہ زمین میں مکان وغیرہ بنا کر وقف کرنے کا ہے۔

وقف کرتے وقت تیار زراعت، درختوں کے پھل، نرکل۔ سینٹھا بید۔ جھاڑ وغیرہ خود رو نباتات جو ہر سال کاٹی جاتی ہیں اس سال واقف کی ملکیت ہیں اور آئندہ سال سے وقف کی۔ جو چیزیں دو تین سال میں کاٹی جاتی ہیں وہ وقف کرتے ہی وقف کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہیں مثلاً بانس وغیرہ۔

اگر آراضی پر مکان بنا ہوا ہے تو آراضی مع مکان کے وقف ہو گی۔ تنہا آراضی یا مکان نہیں۔ اسی طرح اگر حمام وقف کیا ہے تو پانی گرم کرنے کی دیگ ٹنکیاں اور دیگر تمام سامان جو حمام سے متعلق ہے وقف میں شامل ہوگا۔ اسی طرح مکان و کھیت کا راستہ۔ نالیاں اور پرنالے وغیرہ وقف میں شامل ہوں گے۔

مشاع اور اس کا وقف

وہ مشترک چیز جس میں ایک سے زیادہ شریک ہوں اور ان کے حصوں میں امتیاز نہ کیا جا سکے مشاع کہلاتی ہے۔ مشاع دو قسم کا ہوتا ہے ایک وہ جو تقسیم کے بعد بھی نفع بخش رہے جیسے زمین و مکان، دوسرا وہ جو تقسیم کے بعد بیکار ہو جائے جیسے حمام و چکی وغیرہ۔ غیر قابل قسمت مشاع کا وقف بالاتفاق جائز ہے اور قابل قسمت مشاع کو بھی تقسیم سے پہلے وقف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مشاع کو مسجد یا قبرستان کے لئے وقف کرنا جائز نہیں خواہ وہ قابل قسمت ہو یا ناقابل قسمت کیونکہ مشاع میں مباح ہو سکتی ہے اور شریک باری باری سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مسجد یا قبرستان کے علاوہ وقف میں یہ گنجائش باقی رہتی ہے کہ جس نے وقف کیا ہے وہ اپنی باری کا کرایہ وقف کو دیدے اور مصرف خیر میں صرف کر دے لیکن مسجد یا قبرستان میں باریوں کی رہائش یا زراعت ممکن نہیں اس لئے مشاع کا وقف مسجد یا قبرستان کے لئے ناجائز ہے۔

وقف میں شرکت اور اسکی تقسیم

مشترکہ زمین میں ایک شریک نے اپنا حصہ وقف کر دیا تو اس کی تقسیم بھی وہی کرائے گا۔ اگر واقف کا انتقال ہو گیا ہے تو متولی۔

ایک شخص نے اپنی جائداد کا آدھا حصہ وقف کیا ہے تو اس کی تقسیم کے لئے وقف کی طرف سے قاضی مقرر ہوگا اور غیر وقف کی جانب سے یہ خود۔ یا پھر غیر موقوفہ جائداد کو فروخت کر کے یہ مشتری کے مقابلہ میں تقسیم کرائے گا۔

ایک جائداد کے دو مالک ہیں اور دونوں اپنے اپنے حصے وقف کر دیتے ہیں تو یہ دونوں آپس میں تقسیم کر کے اپنے اپنے متولی مقرر کر دیں گے۔

ایک شخص نے اپنی کل جائداد وقف کی اور اس پر کسی دوسرے شخص نے نصف کا دعویٰ کیا اور قاضی نے فیصلہ مدعی کے حق میں دے دیا تو باقی نصف جائداد وقف رہے گی اور واقف اس شخص سے مل کر تقسیم کرائے گا۔

ایک زمین دو آدمیوں میں مشترک ہے دونوں اپنے اپنے حصے ایک ہی یا علیحدہ علیحدہ مقاصد کے لئے وقف کر دیتے ہیں اور ایک ہی شخص کو یا الگ الگ اشخاص کو متولی مقرر کرتے ہیں یا ایک ہی آدمی اپنی زمین دو جدا جدا مقاصد کے لئے وقف کرتا ہے تو ان تمام صورتوں میں تقسیم واقف ہی کرائے گا۔

اگر ایک شخص نے اپنی کل زمین میں سے ہزار گز زمین وقف کی اور تقسیم کے بعد وہ زمین ہزار گز یا اس سے کم یا زائد نکلی تو ہزار گز یا کم ہے تو کل زمین موقوفہ ہے اور اگر ہزار گز سے زیادہ ہے تو جس قدر زیادہ ہوگی وہ غیر موقوفہ ہے۔

اگر مشترک زمین میں درخت بھی ہیں تو تقسیم اس طرح ہوگی کہ موقوفہ زمین میں بھی درخت آئیں۔

مشترک زمین ایک ایکڑ تھی، تقسیم کرتے وقت اس زمین کا اچھا ٹکڑا ملا لیکن وہ نصف ایکڑ سے کم ہے یا خراب ٹکڑا ملا جو زیادہ ہے تو تقسیم کی یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔

ایک شخص جو چند مکانات میں حصہ دار تھا وہ اپنے تمام حصے وقف کر دیتا ہے اور تقسیم کے وقت اس کو ان تمام حصوں کے بدلے میں ایک سالم مکان وقف کے لئے ملتا ہے تو یہ تقسیم جائز ہے۔

مشترک زمین وقف کی تقسیم اس طرح ہوتی ہے کہ ایک حصہ کے ساتھ کچھ روپیہ بھی ملتا ہے تو واقف روپے والا حصہ نہیں لے سکتا کیونکہ اس طرح وقف کی بیع لازم آتی ہے۔ لہٰذا وہ روپیہ دینے والا حصہ لے اور اس رقم کو وقف کی آمدنی سے وضع کر لے یہ جائز ہے۔

"مصارف اوقاف"

تعمیر و مرمت

جس مقصد کے لئے جو جائداد وقف کی گئی ہے، اس کی آمدنی اسی مقصد پر صرف کی جائے گی۔ لیکن وقف دوامی ہوتا ہے۔ اس کی بقا اور تحفظ بھی ناگزیر ہے۔ لہٰذا اس مقصد کی تکمیل کے لئے لازم ہے کہ اگر موقوفہ عمارت کی مرمت یا باغ و کھیت کی درستی یا مقدمہ کی پیروی ضروری ہو اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے بعد وقف کی آمدنی میں اتنی گنجائش نہ ہو کہ مستحقین کو دی جاسکے تو ان کو نظر انداز کر کے وقف کی آمدنی سب سے پہلے اس کی جائداد کے تحفظ یعنی مرمت وغیرہ پر صرف کی جائے گی خواہ واقف نے شرائط وقف میں اس کا ذکر کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ عمارت کو واقف کے زمانہ کی حالت پر برقرار رکھا جائے گا یعنی اسی کے مطابق سفیدی اور رنگ وغیرہ کرایا جائے گا۔ توسیع و تزئین عمارت کی خاطر مستحقین کی حق تلفی جائز نہیں ہے۔ اگر مرمت ضروری ہے اور متولی اس پر صرف نہ کر کے مستحقین پر صرف کر دیتا ہے تو اس کو اپنے پاس سے تاوان دینا ہوگا۔

وقف کی آمدنی اس کی عمارت کی درستی پر صرف ہو جانے کی وجہ سے کچھ عرصہ تک مستحقین کو نہیں مل سکی تو ان کا اس مدت کا حق ساقط ہو جائے گا اور وہ اس کا مطالبہ نہیں کر سکتے خواہ آئندہ چل کر وقف کو اتنی زیادہ آمدنی کیوں نہ ہو جائے کہ وہ اس سے مستحقین کو بقایا جات کی ادائیگی کر سکے۔

اگر واقف نے وقف نامہ میں یہ شرط بھی عائد کر دی ہے کہ اس کی آمدنی اوّل اسکی عمارت پر صرف کی جائے اور اس سے جو بچے وہ مستحقین پر۔ تو اس شرط کے تحت متولی پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ وقف کی سالانہ آمدنی میں سے ایک مقدار بھر رقم عمارت کی مرمت کے لئے محفوظ رکھے خواہ مرمت کی ضرورت ہو یا نہ ہو اور اگر یہ شرط نہیں ہے تو ضرورت سے قبل مرمت کے لئے رقم محفوظ نہیں کی جاسکتی۔

اگر شرائط وقف میں کسی خاص شخص کو خاص مدت تک وقف کی آمدنی دی جانے کی شرط ہے اور اس کے بعد فقرا نیز مرمت پر۔ عمارت مرمت طلب ہے اگر اس کی مرمت نہ کی گئی تو اس کو نقصان پہونچ جائے گا تو ایسی صورت میں آمدنی مرمت پر صرف کی جائے گی اور اگر عمارت کو شدید نقصان پہونچنے کا احتمال نہیں ہے تو اس شخص کو دے دی جائے گی۔

وقف کی آمدنی موجود ہے اور مسلم قیدیوں کی رہائی یا جہاد جیسے نیک کام پر صرف کرنے کی فوری ضرورت لاحق ہوتی ہے نیز عمارت کی مرمت بھی ضروری ہے تو اس صورت میں اگر آمدنی نہ ملنے تک عمارت کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو تو اس نیک کام پر ورنہ عمارت کی مرمت پر صرف کی جائے گی۔

ایک مکان اولاد پر وقف ہے تو جو شخص اس میں رہے گا وہی مرمت کرائے گا اگر وہ اس لائق نہیں ہے تو متولی کا فرض ہے کہ وہ اس مکان کو کرایہ پر اٹھا کر اس کی آمدنی سے مرمت کرا کر پھر اسی شخص کو واپس کر دے۔ وہ شخص بذات خود مکان کو کرایہ پر نہیں اٹھا سکتا۔

ایک مکان کی آمدنی ایک شخص پر وقف کی گئی ہے تو وہ اس مکان میں رہنے کا حقدار نہیں اور نہ اس کی مرمت کا ذمہ دار ہے بلکہ مکان کی آمدنی اولاً مکان کی مرمت پر اور بعد ؛ اس شخص پر صرف کی جائے گی۔ اگر اس نے سکونت اختیار کر لی ہے تو اس سے کرایہ نہیں لیا جائیگا کیونکہ آمدنی بالآخر اسی کو دینا ہے۔ اگر وہ اس لائق ہے تو مرمت خود کرائے گا ورنہ مکان کو کرایہ پر اٹھا کر اس کی آمدنی سے مرمت کرائی جائے گی۔ اگر کوئی دوسرا شخص بھی اس وقف میں شریک ہے تو پھر اس شخص سے جس نے رہائش اختیار کر رکھی ہے کرایہ لیا جائے گا اور دوسرے شخص کو آمدنی میں سے اس کا حصہ دیا جائے گا۔ اگر موقوف علیہ خود متولی ہے اور سکونت اختیار کئے ہوئے ہے تو وہ مرمت کرائے گا اگر نہیں کرتا تو قاضی کو اختیار ہے کہ وہ اس سے جبراً مرمت کرائے پھر بھی نہیں کرتا تو وہ دوسرا متولی مقرر کر کے اس سے مرمت کرا سکتا ہے۔

جو شخص وقف کی عمارت کو قصداً نقصان پہنچائے گا اسے تاوان دینا ہوگا۔

موقوفہ جائداد کا عملہ اور اس کا مصرف

وقف کی عمارت منہدم ہوگئی تھی، اس کی تعمیر و مرمت کی گئی ہے اور پہلے کا کچھ سامان بچ رہا ہے آئندہ مرمت کے لئے محفوظ بھی رکھا جاسکتا ہے اور سامان کو فروخت کر کے اس کی رقم کو تعمیر میں بھی صرف کیا جاسکتا ہے نیز اس بچے ہوئے سامان کو ضائع ہونے کے اندیشہ کی بنا پر فروخت کر کے اس کی رقم کو آئندہ کے لئے محفوظ بھی رکھا جاسکتا ہے لیکن یہ چیزیں یا انکی رقم مستحقین کو نہیں دی جاسکتی۔

کسی شخص نے موقوفہ مکان میں رہائش اختیار کی اور اس پر اپنا روپیہ صرف کیا۔ اگر یہ صرف ایسی چیزوں پر ہوا ہے جن کا مستقل وجود نہیں ہے مثلاً سفیدی یا رنگ وغیرہ تو اس کو یا اس کے وارثوں کو اس کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جائے گا۔ اور اگر مستقل وجود رکھنے والی چیزیں ہیں اور ان کے اٹھوانے میں عمارت کو کوئی نقصان نہ پہنچے تو ان کو اٹھوا دیا جائے گا ورنہ کرایہ منہا کر کے باقی رقم بطور معاوضہ نقد ادا کی جائے گی اور اس ادائیگی کے لئے مکان دوسرے شخص کو کرایہ پر دیدیا جائے گا۔

موقوفہ جائداد کے لئے قرضہ

عمارت کی مرمت یا کمیت بونے کے لئے وقف کے پاس روپیہ موجود نہیں ہے اور مکان کو کرایہ پر یا کمیت کو حکومت پر اٹھا کر بھی یہ ضرورت پوری نہیں کی جاسکتی تو اس مقصد کے لئے روپیہ یا جنس قرض لی جاسکتی ہے۔

اقسام وقف اور انکی آمدنی کے مصارف

وقف تین قسم کا ہوتا ہے۔

۱۔ فقراء و مساکین کے لئے۔ اس قسم کے وقف کی آمدنی فقراء و مساکین پر خیرات کیجاتی ہے

۲۔ وقف علی الاولاد۔ اس قسم کے وقف کی آمدنی اولاد در اولاد پر اور جب اس کا سلسلہ ختم ہو جائے تو فقراء و مساکین پر صرف کی جاتی ہے۔

۳۔ امیر و غریب دونوں کے لئے۔ اس قسم کے اوقاف سے دولت مند اور مفلس دونوں مستفید ہوتے ہیں مثلاً مساجد، خانقاہیں، مدارس، دار المطالعہ، مسافر خانے، شفا خانے اور قبرستان دونوں طبقوں کے لئے ہوتے ہیں لیکن شفا خانہ کے وقف میں اگر دولتمندوں کی تصریح نہیں کی گئی ہے تو مالدار لوگ اس میں اپنا علاج نہیں کرا سکتے۔ اگر عام لوگوں کے لئے وقف ہے تو امیر و غریب سب فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

صرف دولتمندوں پر وقف جائز نہیں البتہ اس صورت میں جائز ہے کہ ان کی تعداد معلوم ہو اور پھر ان کے بعد وہ وقف غرباء کے لئے ہو۔ اگر غریب اور دولتمند (قرابت داروں) دونوں کے لئے وقف ہے تو دولتمندوں کی تعداد کا تعین ناگزیر ہے ورنہ وقف صحیح نہیں ہوگا۔ فقراء و مساکین پر وقف جائز ہے خواہ انکی تعداد کا تعین ہو یا نہ ہو۔ اگر مسافروں پر وقف کیا گیا ہے تو اس کی آمدنی صرف غریب مسافروں پر صرف کی جائے گی۔

مصارف وقف میں شرط کی پابندی

جہاد، قیدیوں کی رہائی، مردوں کی تجہیز و تکفین، یتیم لڑکیوں کی شادی اور اسی طرح کے دیگر امور خیر پر وقف جائز ہے، اس طرح کے وقف کی آمدنی اسی کام پر صرف کیجائے گی جس کام کے لئے وہ وقف کیا گیا ہے مثلاً جائداد کی آمدنی یتیم لڑکیوں کی شادی کے لئے وقف ہے تو اسے اسی مد پر صرف کیا جائے گا مردوں کی تجہیز و تکفین پر خرچ کرنا ناجائز ہے۔

ایک جائداد ایک کام کے لئے وقف کی گئی ہے لیکن اس کی آمدنی کم ہے اور وہ مقصد اس سے پورا نہیں ہوتا۔ اسے یوں سمجھئے کہ ایک جائداد کی آمدنی ایک مسجد کے امام کی تنخواہ ادا کرنے کے لئے وقف کی گئی ہے لیکن اس کی آمدنی اس قدر کم ہے کہ اس پر کوئی امام نہیں رکھا جاسکتا تو کام کس طرح چلے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اگر اس شخص نے اس کے علاوہ اسی مسجد کے لئے کسی دوسرے کام مثلاً مرمت کے لئے دوسرا وقف کیا ہے اور اس کی آمدنی اتنی زیادہ ہے کہ اس مقصد کو پورا کرنے کے بعد بچ رہتی ہے تو اس فاضل آمدنی کو ملا کر امام کی تنخواہ دی جاسکتی ہے لیکن اگر اسی مسجد کے لئے دو الگ الگ آدمیوں نے وقف کئے ہیں یا ایک ہی شخص نے دو وقف کئے ہیں ایک مسجد کے لئے اور دوسرا مدرسہ کے لئے تو اس صورت میں ان دونوں اوقاف کی آمدنی ایک دوسرے پر صرف نہیں کی جاسکتی۔

ایک شخص نے دو مکان اپنی اولاد پر وقف کئے ایک ان کے رہنے کے لئے اور دوسرا اس لئے کہ اس کی آمدنی ان پر صرف کی جائے۔ تو ایک کو دوسرے پر صرف نہیں کر سکتے۔

اگر جائداد مصالح مسجد کے لئے وقف ہے تو اس کی آمدنی امام، موذن، جاروب کش، فراش، دربان، روشنی کرنے والے وضو کے لئے پانی گرم کرنے والے، پانی بھرنے والے کی تنخواہ و اجرت نیز لوٹے، چٹائی، جانماز، قندیل، تیل، رسی، ڈول وغیرہ پر صرف کی جائے گی اور یہ تمام اخراجات آمدنی کے موافق کئے جائیں گے۔ اگر آمدنی زیادہ ہے تو عملہ کی تنخواہوں میں اضافہ اور عمدہ و نفیس جانمازیں وغیرہ خریدنے کی اجازت ہے۔

اگر جائداد مدرسہ کے لئے وقف ہے تو اس کی آمدنی مدرسہ سے متعلق جملہ اخراجات مثلاً مدرسین و دیگر عملہ کی تنخواہوں طلباء کے لئے کتب، انکی رہائش، خوراک اور کپڑے نیز فرنیچر اور دیگر ضروری اشیاء کی خرید پر صرف کی جائے گی۔

عمارت کی درستی کے بعد وقف کی آمدنی اس کی آبادکاری پر صرف کی جائے گی مثلاً مسجد کے لئے امام اور مدرسہ کے لئے مدرسین وغیرہ کی تقرری اور پھر روشنی، پانی، صفائی اور فرش وغیرہ لیکن اگر وقف کی آمدنی خاص مصرف کے لئے متعین ہے تو عمارت کے بعد اسی مصرف میں لائی جائے گی مثلاً ایک وقف کی آمدنی مسجد میں روشنی کے لئے مخصوص کی گئی ہے اور مسجد میں مرمت کی ضرورت نہیں ہے تو اس آمدنی کو روشنی ہی پر صرف کیا جائے گا پانی یا فرش پر نہیں علیٰ ہذا القیاس ہر ایک وقف کا مصرف اس کی جہت کار کے مطابق ہوگا۔

تنخواہ، اجرت اور وظائف

متولی وقف کے کام کے لئے مزدوروں یا ملازموں کو واجبی اجرت یا تنخواہ سے زیادہ نہیں دے سکتا اگر وہ واجبی شرح سے چھٹا حصہ زیادہ ادا کر دیتا ہے تو اجرت یا تنخواہ کی تمام رقم اس کو اپنے پاس سے دینا ہوگی اور اگر معمولی زیادتی ہے تو وقف سے ادائیگی ہوگی۔

وقف سے امام کی تنخواہ مقرر ہے اور وہ ناکافی ہے لیکن اسی تنخواہ پر دوسرا امام مل سکتا ہے لیکن وہ علم و فضل میں اس سے کمتر ہے تو ایسی صورت میں امام کی تنخواہ میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک امام کی جگہ دوسرے امام کا تقرر کیا گیا اور سابقہ امام کو اپنے علم و فضل کی وجہ سے

زائد تنخواہ ملتی تھی تو اس دوسرے امام کو وہ اضافہ نہیں دیا جائے گا لیکن اگر اضافہ گرانی یا حاجت کی وجہ سے ہوا تھا تو اس دوسرے امام کو بھی دیا جائے گا۔

یہی احکامات دیگر ملازمین اوقاف اور وظائف یافتگان کے لئے ہیں۔ ضرورت اور گرانی کے باعث ان کی تنخواہوں میں اضافہ کرنا جائز اور مستحسن ہے۔

وظائف

اوقاف سے جو ماہانہ وظائف مقرر ہوتے ہیں یہ من وجہ اجرت ہے اور من وجہ صلہ۔ اجرت تو یوں ہے کہ امام یا موذن کی اگر اثنائے سال میں وفات ہو جائے تو اس نے جتنے دن کام کیا ہے اس کی تنخواہ ملے گی اور محض صلہ ہوتا تو نہ ملتی اور اگر پیشگی تنخواہ اس کو دی جا چکی ہے اور بعد میں انتقال ہو گیا یا معزول کر دیا گیا تو جو کچھ پہلے دیئے چکے ہیں وہ واپس نہیں ہوگا اور محض اجرت ہوتی تو واپس ہوتی۔

یتیم بچے، بیوہ عورتیں، طلباء، نابینا، معذور اور فقہ و حدیث سے شغل رکھنے والے اصحاب دولتمند بھی ہو سکتے ہیں اور مفلس و نادار بھی لہٰذا اوقاف سے امداد و وظائف جاری کرتے وقت اس امر کی بخوبی تصدیق کر لینی ضروری ہے کہ جس کو امداد دی جا رہی ہے وہ فی الواقع مفلس اور حاجتمند ہے یا نہیں کیونکہ محض یتیم، بیوہ، طالب علم یا معذور ہونا حاجتمندی کی دلیل نہیں ہے۔

ایسا نیا وظیفہ جو شرائط وقف میں نہیں ہے قاضی بھی مقرر نہیں کر سکتا چہ جائے کہ متولی۔ اگر غلطی سے نیا وظیفہ جاری کر دیا گیا ہے تو اس کا اجرا ناجائز ہے اور جس کو جاری کیا گیا ہے، اس کو اس وظیفہ کا لینا حرام ہے۔ البتہ قاضی اگر قاضی نہ ہو تو متولی تعلیقی وظیفہ (یعنی کسی وظیفہ یافتہ کے مرنے کے بعد اس کی جگہ دوسرے شخص کا وظیفہ) مقرر کر سکتا ہے

رخصت تعطیلات نیز غیر حاضری کے دنوں کی تنخواہ اور وظائف

ملازمین اوقاف کو ان تعطیلات کے دنوں کی جو مسلمانوں میں رائج ہیں، تنخواہ لینا جائز ہے ان کے علاوہ نہیں۔

اگر امام اپنے اعزاء کو ملاقات یا معیت و استراحت کی وجہ سے ایک ہفتہ یا اس سے کم دنوں تک امامت نہ کر سکا تو وہ ان دنوں کی تنخواہ کا حقدار ہے۔

ایک امام نے سال کے بیشتر حصہ میں امامت کے فرائض انجام دیئے اور کچھ عرصہ کے لئے اپنا قائم مقام مقرر کیا تھا اس امام کو پورے سال کی تنخواہ ملے گی اور قائم مقام کو امام اپنی جیب سے تنخواہ دے گا۔

امام یا موذن یا مدرس یا دیگر ملازمین اوقاف کی تنخواہ سالانہ یا ششماہی یا ماہانہ مقرر تھی دوران مدت معینہ اس کا انتقال ہو جاتا ہے تو جتنے دن اس نے کام کیا ہے اس کی تنخواہ اس کے وارثوں کو دی جائے گی خواہ اس کا انتقال وقف کی آمدنی آنے سے پہلے ہوا ہو۔

لیکن دوسرے وہ لوگ جن کو وظیفہ ملتا ہے اگر ان میں سے کسی کا انتقال وقف کی آمدنی موصول ہونے سے قبل ہو جائے تو وظیفہ نہیں دیا جائے گا۔

فقراء و مساکین پر جائداد وقف ہے، اس کی آمدنی موصول ہو گئی ہے اور ان کے نام رقم برآمد کر لی گئی ہے اور اس اثناء میں ان میں سے کسی کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کے نام کی برآمد شدہ رقم اس کے وارثوں کو دی جائے گی۔ اگر کوئی شخص کسی اور جگہ رہتا ہے اور اس کو وظیفہ کی رقم بھیجی گئی ہے لیکن اس رقم کے پہونچنے سے پہلے اس کا انتقال ہو جاتا ہے تو وہ رقم اس کے وارثوں کو دی جائے گی۔

اگر مدرس یا طالب علم فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے گیا ہے تو اس کی اس غیر حاضری کے سبب اس کو نہ معزول کیا جا سکتا اور نہ اس مدت کی تنخواہ یا وظیفہ روکا جا سکتا ہے۔

ایک طالب علم اسی وقت تک وظیفہ کا مستحق ہے جب تک وہ تعلیم میں مشغول ہے۔ اگر وہ بیکار رہے یا دوسرا کام کرتا ہے تو چاہے وہ مدرسہ ہی میں سکونت رکھتا ہو، وظیفہ نہیں لے سکتا لیکن اگر وہ پڑھنے کے لئے کتاب لکھنے میں مشغول ہے اس لئے پڑھنے نہیں آتا تو اس کو وظیفہ ملے گا۔ اگر مسافت سفر پر چلا گیا ہے یا مسافت سفر سے کم فاصلہ پر گیا ہے اور پندرہ دن گذار دیئے ہیں یا کھانے کے بندوبست کے علاوہ محض سیر و تفریح کے لئے سفر کیا تو وہ اس مدت کے وظیفہ کا مستحق نہیں ہے۔

شرائط اوقاف

واقف کو وقف میں ہر طرح کی شرطیں لگانے کا اختیار ہے، اس کی عاید کردہ ہر اس شرط کا اعتبار کیا جائے گا جو شریعت کے خلاف نہ ہو لیکن وقف میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جہاں واقف کی عاید کردہ شرط کی پابندی لازم نہیں ہوتی بلکہ اس کے خلاف کیا جائے گا۔ مثلاً یہ شرط کہ خواہ جائداد ناکارہ ہو جائے لیکن اس کا تبادلہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر جائداد آمدنی کے قابل نہ رہے تو اس شرط کے خلاف اس کا تبادلہ کیا جائے گا۔ یا یہ شرط کہ قاضی متولی کو معزول نہیں کر سکتا اور اس کو وقف میں مداخلت اور اس کی نگرانی کا اختیار نہیں ہے اگر متولی نااہل ہے تو اس شرط کے خلاف قاضی کو متولی کے معزول کرنے اور وقف میں مداخلت و نگرانی کرنے کا اختیار ہے۔ یا یہ شرط کہ وقف جائداد کو ایک سال سے زیادہ کرایہ پر نہ دیا جائے اور اس طرح دینے پر وقف کی آمدنی کم ہوتی ہے تو قاضی اس شرط کے خلاف اس جائداد کو طویل مدت کے لئے کرایہ پر دے سکتا ہے۔ متولی نہیں۔ یا یہ شرط کہ اس وقف کی آمدنی فلاں مسجد کے سائل کو دی جائے۔ متولی اس شرط کے خلاف دوسری مسجد کے سائل یا بیرون مسجد کے سائل کو دے سکتا ہے۔ یا یہ شرط کہ اس وقف کی آمدنی سے روزانہ اتنی مقدار میں فقراء کو گوشت روٹی دی جائے۔ متولی اس شرط کے خلاف اس کی قیمت کی رقم بھی دے سکتا ہے۔

ایک شخص نے اپنا مکان اس شرط کے ساتھ وقف کیا کہ اس کی آمدنی فلاں آدمی کو دی جائیگی اور وہی اس کی مرمت بھی کرائے گا تو وقف درست اور شرط باطل ہے کیونکہ وہ مرمت کا ذمہ دار نہیں بلکہ مرمت وقف کی آمدنی سے کرائی جائے گی۔

واقف کی یہ شرط کہ میں جب تک زندہ رہوں اس کی کل آمدنی یا اتنے حصہ کا میں مستحق ہوں اور میرے بعد فقراء یا اس کی آمدنی سے میرا قرض ادا کیا جائے اور اس کے بعد فقراء کو دی جائے یا یہ کہ جب تک میں زندہ ہوں اس کی آمدنی اپنی ذات پر صرف کروں گا میرے بعد میرا قرض ادا کیا جائے اور قرض کی ادائیگی کے بعد اس کی آمدنی فقراء پر صرف کی جائے۔ درست و جائز ہے۔

ایک شخص نے صرف اتنا کہا کہ اس شرط پر کہ جب تک میں زندہ ہوں اس کی آمدنی لوں گا میری یہ جائداد اللہ کے لئے صدقہ موقوفہ ہے۔ اگرچہ اس جملہ میں بظاہر نہ تابید ہے اور نہ فقراء کے لئے وقف کی شرط لیکن لفظ صدقہ موقوفہ میں یہ دونوں مفہوم پنہاں ہیں، لہٰذا وقف درست ہے۔

واقف نے یہ شرط لگائی کہ اس جائداد کی آمدنی میں خود کھاؤں گا اور اپنے دوست و احباب کو کھلاؤں گا اور اس سے جو بچے وہ فقراء کو دی جائے یا اپنی اولاد کے لئے نسلاً بعد نسل کی شرط لگائی۔ ایسی شرط کے ساتھ وقف جائز ہے۔

یہ شرط کہ اپنی ذات، اپنی اولاد اور خدام پر صرف کروں گا۔ وقف کا غلّہ آیا اور اسے فروخت کرکے اس نے رقم لے لی مگر خرچ کرنے سے پہلے مر گیا تو یہ رقم وقف کی نہیں وارثوں پر تقسیم ہوگی۔

یہ شرط لگائی کہ فلاں وارث کو وقف کی آمدنی سے بقدر کفایت دیا جائے گا تو جب تک وہ تنہا ہے تنہا کے لائق اور جب صاحب اولاد ہو جائے تو ان سب کے لائق دیا جائے گا کیونکہ ان سب کے مصارف کا بھی وہی ذمہ دار ہے۔

واقف نے یہ شرط عاید کی کہ میں جب اور جتنے داموں میں چاہوں اس جائداد کو فروخت کرکے اس کی رقم سے غلام خرید کر آزاد کر دوں یا اسی طرح کا کوئی اور نیک کام تو وقف باطل ہو جائے گا۔

واقف نے یہ شرط کی کہ اس کی آمدنی کے صرف کا مجھے اختیار ہے، جہاں چاہوں خرچ کروں تو اس کی یہ شرط جائز ہے۔

کسی نے اپنی اولاد پر جائداد وقف کی اور یہ شرط عاید کی کہ جو میرے عقیدہ پر رہے گا وہ اس کی آمدنی لے گا تو جو فرد اس کے عقیدہ پر نہ رہے گا وہ اس کی آمدنی کا حقدار نہیں ہے۔ اسی طرح یہ شرط کہ جس کو چاہوں خارج کر دوں یا جس کو چاہوں حصہ دوں تو وہ زیادہ حصہ بھی دے سکتا ہے اور اس کو شرط کے بموجب خارج کرنے کا اختیار بھی ہے لیکن خارج کرنے کے بعد داخل نہیں کر سکتا۔

وقف میں اگر دو شرطیں متعارض ہوں تو آخری شرط پر عمل ہوگا۔

وقف جائداد کا تبادلہ اور بیع

واقف نے موقوفہ جائداد کے تبادلہ کی یہ شرط لگائی کہ میں یا فلاں آدمی جب مناسب سمجھیں اس کو باہم بدل سکتے ہیں تو اس صورت میں یہ دوسری جائداد اس موقوفہ جائداد کے قائم مقام بھی ہو جائیگی اور وہ تمام شرطیں جو وقف نامہ میں درج ہیں اس پر بھی نافذ ہوں گی چاہے اس کا ذکر نہ کیا گیا ہو کہ دوسری جائداد پہلی جائداد کی قائم مقام ہوگی۔

اگر یہ شرط عاید کی گئی ہے کہ جب چاہیں تبادلہ کر لیا کریں تو بار بار تبادلہ بھی ہو سکتا ہے ورنہ صرف ایک بار۔

وقف نامہ میں محض تبادلہ کی شرط ہے تو وقفی جائداد کا تبادلہ کسی بھی جائداد سے خواہ وہ مکان ہو یا زمین کیا جا سکتا ہے۔ اگر مکان کا مکان سے زمین کا زمین سے یا مکان کا زمین سے اور زمین کا مکان سے تبادلہ کئے جانے کی شرط ہے اور ساتھ ہی مقام و جائداد کی بھی تعیین ہے تو تبادلہ شرط کے خلاف نہیں کیا جا سکتا۔

وقفی مکان کا دوسرے مکان سے تبادلہ اس وقت جائز ہے جب کہ دونوں مکان ایک ہی محلہ میں واقع ہوں یا جس مکان سے تبادلہ مقصود ہے وہ اس سے بہتر محلہ میں واقع ہو اور وہ مکان وقفی مکان سے بہتر ہو۔ خسارہ کا تبادلہ درست نہیں۔

تبادلہ کی شرط تھی واقف نے وکیل کے ذریعہ تبادلہ کرایا تو جائز ہے۔ مرتے وقت تبادلہ کی وصیت کی تو جس کو وصیت کی ہے وہ تبادلہ نہیں کر سکتا۔ اگر یہ شرط تھی کہ میں اور فلاں شخص باہم تبادلہ کریں گے تو واقف تنہا تبادلہ کر سکتا ہے لیکن وہ شخص تنہا تبادلہ نہیں کر سکتا۔

اگر یہ شرط ہے کہ اس وقف کا متولی تبادلہ کر سکتا ہے تو ہر وہ شخص جو اس وقف کا متولی ہوگا تبادلہ کر سکتا ہے۔ اگر یہ شرط ہے کہ فلاں شخص تبادلہ کر سکتا ہے تو اس شخص کو محض واقف کی زندگی میں تبادلہ کرنے کا حق ہے اگر یہ شرط ہے کہ اس کو میری موت کے بعد تبادلہ کا اختیار ہے تو واقف کی موت کے بعد بھی وہ شخص تبادلہ کر سکتا ہے۔

متولی کو تبادلہ کرنے کا اس وقت اختیار ہے جب کہ وقف نامہ میں اس کو تبادلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہو یا جائداد آمدنی کے لائق نہ رہی ہو لیکن واقف کے لئے وقف نامہ میں تبادلہ کا ذکر ضروری نہیں وہ ویسے ہی تبادلہ کر سکتا ہے۔

واقف نے وقف نامہ میں تبادلہ کا ذکر نہیں کیا یا عدم تبادلہ کی شرط کی مگر وقف سے اتنی بھی آمدنی نہیں ہے کہ اس کو جس مقصد کے لئے وقف کیا ہے وہ پورا ہو سکے تو ایسے وقف کا تبادلہ مندرجہ ذیل شرائط پر جائز ہے۔

۱۔ غبن فاحش کے ساتھ بیع نہ ہو۔ ۲۔ تبادلہ کرنے والا قاضی عالم باعمل ہو یعنی جس کے تصرفات کی نسبت عوام کو اطمینان ہو سکے۔ ۳۔ تبادلہ غیر منقول سے ہو روپیہ پیسہ سے نہ ہو۔ ۴۔ ایسے شخص سے تبادلہ نہ کیا جائے جس کی شہادت اس کے حق سے غیر مقبول ہو۔ ۵۔ ایسے شخص سے تبادلہ نہ کیا جائے جس کا اس پر دین ہو۔ ۶۔ دونوں جائدادیں ایک ہی محلہ میں واقع ہوں یا متبادل جائداد اور اس کا محلہ وقفی جائداد سے بہتر ہو تو اس کا تبادلہ کیا جا سکتا ہے۔

اگر ایسا وقف ہے جس کی آمدنی اس کے مصارف سے بچ رہتی ہے اور اس کے بدلہ میں ایسی جائداد مل رہی ہے جس کی آمدنی اس سے زیادہ ہے۔ اگر واقف نے تبادلہ کی شرط وقف نامہ میں نہیں کی ہے تو اس کا تبادلہ نہیں کر سکتے۔

موقوفہ جائداد کو فروخت کرکے متبادل جائداد خریدنا

یہ شرط کہ متولی موقوفہ جائداد کو فروخت کرکے اس رقم سے دوسری جائداد خرید سکتا ہے، جائز ہے، متولی کو ایک بار تبادلہ کا بھی حق حاصل ہے۔

موقوفہ جائداد فروخت کی مگر کسی وجہ سے بیع ختم ہو گئی تو دوبارہ بھی بیع کی جا سکتی ہے۔ اگر پھر اسی شخص نے خریدی ہے تو دوبارہ بیع نہیں کر سکتا مگر جب عموم کے ساتھ تبادلہ کا اختیار ہو تو دوبارہ بھی کر سکتا ہے۔

موقوفہ زمین فروخت کی اور اس رقم سے دوسری زمین خریدی لیکن جو زمین فروخت کی تھی اس میں کوئی نقص نکل آیا جس کی وجہ سے قاضی نے اس کو واپس کرنے کا حکم دے دیا تو وہ زمین بدستور وقف رہے گی اور دوسری زمین جو اس کے بدلہ میں خریدی گئی تھی وہ وقف نہ ہوگی۔ اگر قاضی نے حکم نہیں دیا تھا اس نے اپنی مرضی سے واپس کی تھی تو پہلی زمین اس کی ملکیت ہوگی اور دوسری زمین جو بدلہ میں خریدی تھی وقف کی زمین ہوگی۔

ثمن سے بیع کی اجازت تھی اور فروختگی اتنی کم قیمت پر عمل میں آئی جو عموماً نہیں ہوتی تو یہ بیع باطل ہے اگر قیمت واجبی ہے یا خفیف سی کم ہے تو درست ہے۔

موقوفہ جائداد نقد فروخت کی جس نے بیچی تھی اس کی وفات ہو گئی اور یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس نے روپیہ کا کیا کیا تو یہ رقم اس کے ترکہ سے وصول کی جائے گی۔ یا یہ معلوم ہوا کہ اس نے اس

رقم کو خورد برد کر دیا ہے تب بھی وصول کی جائے گی اور اگر اس نے قصداً اس رقم کو ضائع نہیں کیا ہے بلکہ ضائع ہو گئی ہے تو اس سے تاوان نہیں لیا جائے گا بلکہ وقف باطل ہو جائے گا۔

کسی نے وقف زمین غصب کر لی، زمین غاصب ہی کے قبضہ میں تھی کہ وہ بیابر د ہو گئی اور اس سے تاوان لے کر دوسری زمین خرید لی گئی تو یہ خریدی ہوئی زمین اس موقوفہ زمین کے قائم مقام ہو گی اور وہ تمام شرائط جو وقف نامہ میں ہیں اس پر بھی عاید ہوں گی۔

کسی نے وقف زمین غصب کر لی اور اس کے بدلہ میں روپیہ دینے کو تیار ہے اور متولی وقف ہونے کا ثبوت پیش نہیں کر سکتا تو غاصب سے روپیہ لے کر اس سے دوسری زمین خرید لی جائے گی اور خریدی ہوئی زمین پہلی زمین کی قائم مقام ہو گی۔

وقف نامہ میں تحریر کیا کہ اس کو نہ بیع کیا جائے اور نہ ہبہ اور آخر میں لکھا کہ متولی کو اختیار ہو گا کہ اسے بیچ کر دوسری زمین خرید کر اس کی جگہ وقف کر دے۔ اگرچہ وہ پہلے لکھ چکا ہے کہ بیع نہ کیا جائے مگر اس کی بیع جائز ہے کیونکہ آخری کلام اوّل کلام کا ناسخ یا موضح ہے اور اگر اس کے برعکس پہلے یہ لکھا کہ متولی کو بیع اور تبادلہ کا اختیار ہے مگر آخر میں لکھا کہ بیع نہ کی جائے تو اب بیع کرنا جائز نہیں۔

اگر واقف نے یہ شرط کی کہ جب تک میں زندہ ہوں متولی کو بیع و استبدال (تبادلہ) کا اختیار ہے تو متولی واقف کے مرنے کے بعد ایسا نہیں کر سکتا۔

وقف میں یہ شرط کہ اگر میں چاہوں تو اس کو فروخت کر کے دوسری زمین خرید لوں گا اور یہ لفظ نہیں کہے کہ خرید کر اس کی جگہ پر کر دوں گا۔ تب بھی یہ شرط جائز ہے کیوں کہ بیچ کر جو دوسری زمین خریدیں گے وہ پہلی کی قائم مقام ہو گی۔

"تولیّت"

جو شخص تولیت کی خود درخواست کرے اس کو متولی نہیں بنانا چاہئے۔ متولی ایسے شخص کو مقرر کیا جانا چاہئے جو عاقل و بالغ ہو، نیک اور دیانتدار ہو، وقف کے کام سے واقفیت رکھتا ہو اور اس انجام دینے کی پوری پوری قدرت رکھتا ہو۔ متولی کو اختیار ہے کہ وقف کا کام خود کرے یا اپنے نائب سے کرائے۔

واقف نے اپنے بعد اپنے بیٹے کو متولی مقرر کئے جانے کی وصیت کی۔ واقف کی وفات ہو گئی اور اس کا بیٹا ابھی نابالغ ہی ہے تو اس کی جگہ دوسرا شخص تولیت کے فرائض انجام دے گا اور جب لڑکا بالغ ہو جائے گا تو تولیت اس کے سپرد کر دی جائے گی۔ اگر واقف نے اپنی تمام اولاد کو متولی مقرر کیا ہے اور ان میں کوئی نابالغ بھی ہے تو اس کی جگہ کسی دوسرے کو قاضی متولی نامزد کر دے گا اور جب وہ بالغ ہو جائے گا تو تولیت اس کو دی جائے گی۔

عورت اور نابینا بھی متولی بنائے جا سکتے ہیں۔

اگر واقف نے یہ شرط عاید کی ہے کہ میری اولاد میں سے جو سب سے زیادہ نیک اور ہوشیار ہو اس کو متولی بنایا جائے تو شرط کے خلاف متولی نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر اولاد میں جو سب سے زیادہ بہتر تھا فاسق ہو گیا تو باقی میں جو سب سے بہتر ہوگا اگر وہ تولیت لینے سے انکار کر دے تو باقی میں سے جو سب سے بہتر ہو، اگر سب ہی اچھے ہیں تو سب سے بڑے کو خواہ وہ عورت ہی کیوں نہ ہو اس کو متولی بنایا جائے گا۔ اگر اس کی اولاد میں سب ہی نااہل ہوں تو قاضی اس وقت تک کے لئے جب ان میں سے کوئی اہل ہو دوسرے شخص کو متولی مقرر کرے گا۔

قاضی نے سب سے بہتر کو متولی مقرر کر دیا اور دوسرا اس کے بعد اس سے بھی زیادہ بہتر ثابت ہوا تو اب یہ متولی ہو گا۔ اگر اس کی اولاد میں نیکی کے لحاظ سے سب برابر ہوں تو ان میں سے وقف کے کام کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے سکتا ہو اسی کو متولی بنایا جائے گا۔ اگر ایک پرہیزگار ہیں اور دوسرا وقف کے کام میں بہتر ہے اور خائن نہیں ہے تو اس کو متولی بنایا جائے گا۔

واقف خود متولی ہے لیکن متولی کے اوصاف سے عاری ہے تو اس بات کا لحاظ کئے بغیر اس کو معزول کیا جا سکتا ہے کہ وہ واقف ہے۔ چاہے اس نے وقف نامہ میں یہ شرط تحریر کی ہو کہ مجھے اس کی تولیت سے قاضی یا بادشاہ اسلام بھی جدا نہیں کر سکتے اگر اس سے وہ امور سرزد ہوتے ہیں جن کی بناء پر متولی کو معزول کیا جاتا ہے مثلاً فسق و فجور اور خیانت وغیرہ تو اس کو معزول کیا جائے گا اور اس کی شرط کو باطل قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح وہ متولی یا وصی کے لئے شرط عاید کرتا ہے اگر ان سے خیانت سرزد ہوتی ہے تو شرط کے خلاف ان کو معزول کر دیا جائے گا۔

واقف نے جس شخص کو متولی مقرر کر دیا ہے اگر اس سے خیانت سرزد نہیں ہوتی تو قاضی اس کو معزول نہیں کر سکتا ہاں اگر قاضی کسی کو متولی بناتا ہے تو اس کو بلا کسی وجہ کے علیحدہ کر سکتا ہے۔

اگر متولی وقف کے کام سے عاجز ہو، خائن ہو، علانیہ شراب پیتا ہو، جوا کھیلتا ہو یا اور کوئی فسق کرتا ہو یا اسے کیمیا بنانے وغیرہ کا چسکا ہو تو اس کو معزول کر دینا واجب ہے اگر قاضی ایسا نہ کرے تو گنہگار ہے۔ ایسے شخص کو جس میں مذکورہ بالا عیب پائے جاتے ہوں متولی بنانا سخت گناہ ہے۔

واقف متولی کو مطلقاً جدا کر سکتا ہے لیکن اگر قاضی ایک متولی کو معزول کرتا ہے اور وفات پا جاتا ہے تو وہ شخص دوسرے قاضی سے اس امر کی درخواست کر سکتا ہے کہ مجھے بلاوجہ اور بے قصور علیحدہ کیا گیا ہے دوسرا قاضی اس کے معاملہ کی جانچ کرنے کے بعد اگر اس کو اس کا اہل سمجھے تو دوبارہ متولی مقرر کر سکتا ہے۔

واقف متولی کو معزول کر کے دوسرا متولی مقرر کر سکتا ہے اور خود بھی متولی بن سکتا ہے۔

اگر واقف نے کسی کو متولی مقرر نہیں کیا ہے تو قاضی مقرر کر سکتا ہے اور اس طرح قاضی کے مقرر کردہ متولی کو واقف علیحدہ نہیں کر سکتا اور نہ قاضی ہی بلاوجہ کوئی دوسرا متولی مقرر کرنے کا حق رکھتا ہے۔

وقف نامہ میں اگر تولیت کے متعلق کچھ نہیں ہے تو تولیت کا حق واقف کو ہے وہ جس کو چاہے متولی مقرر کر دے یا خود بن جائے۔

ایک وقف کے متعلق دو وقف نامے ملتے ہیں ایک میں ایک شخص کو اور دوسرے میں دوسرے شخص کو متولی مقرر کیا گیا ہے تو یہ دونوں اصحاب شرکت میں متولی کے فرائض انجام دیں گے خواہ دونوں وقف ناموں کی تاریخیں جدا جدا ہوں۔

واقف نے متولی مقرر نہیں کیا مرتے وقت ایک شخص کو وصی بنایا تو یہی شخص وصی ہو گا اور یہی متولی۔ اگر خاص طور پر وقف کے لئے وصی کیا ہے تو دیگر امور میں بھی یہی وصی ہو گا۔

ایک شخص نے دو جائدادیں وقف کیں اور ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ متولی مقرر کیا تو دونوں متولی مشترک کام نہیں کریں گے ہر ایک کا حلقہ کار جدا جدا ہو گا۔ اگر ایک شخص کو متولی اور دوسرے کو وصی بنایا ہے تو وصی تولیت میں شریک ہو گا۔

واقف نے کسی کو اپنی زندگی میں وقف کا کام سپرد کیا تو وہ اس کے مرنے کے بعد متولی نہ ہوگا ۔۔۔ رنے کے بعد اس کے متولی رہنے کی شرط ہے تو متولی رہے گا لیکن اس کے برعکس اگر قاضی نے کسی ۔۔۔ لی مقرر کیا ہے اور قاضی کی وفات ہو جاتی ہے تو اس کی موت کا اثر متولی پر نہ ہوگا وہ بدستور متولی ۔۔۔ ہے گا ۔

اگر دو یا دو سے زیادہ اشخاص کو متولی بنایا ہے تو وہ مجموعی رائے سے وقف کا کام کریں ۔۔۔ تہا کوئی شخص تصرف نہیں کر سکتا اگر کرتا ہے اور دیگر اصحاب اس کو جائز قرار دیدیتے ہیں تو جائز ۔۔۔ ورنہ نہیں ۔ ایسے موقع پر ایک دوسرے کو اپنا وکیل بنا سکتا ہے ۔

ایک وقف کے دو متولی تھے ان میں سے ایک نے مرتے وقت ایک جماعت کو متولی مقرر ۔۔۔ ریہ جماعت اس کے قائم مقام ہوگی اگر اس نے اپنے شریک متولی ہی کو اپنا قائم مقام مقرر کر دیا ۔۔۔ تو اب وہ تنہا ہی پورے وقف پر متصرف ہوگا ۔

واقف نے ایک شخص کو متولی مقرر کیا لیکن اس کو اپنے بعد متولی بنانے کا حق نہیں دیا تو اس ۔۔۔ کے بعد دوسرا متولی قاضی مقرر کرے گا ۔

واقف نے یہ شرط عاید کی کہ اس کا متولی زید ہوگا اور زید کے بعد بکر لیکن زید اپنے بعد عمر ۔۔۔ لی مقرر کرتا ہے تو ناجائز ہے، متولی بکر ہی ہوگا ۔ اسی طرح ایک واقف نے یہ شرط قائم کی کہ ۔۔۔ اولاد میں سے جو سب سے زیادہ نیک و صالح ہوگا وہ متولی ہوگا ۔ لیکن متولی اپنے داماد کو متولی ۔۔۔ ہے جو واقف کی اولاد سے نہیں ہے تو اس کی تولیت ناجائز ہے ۔ واقف کی اولاد میں ۔۔۔ و مستحق ہوگا متولی بنے گا ۔

دو شخصوں کو متولی مقرر کیا گیا ایک نے تولیت قبول کر لی اور دوسرے نے انکار کر دیا تو ۔۔۔ اس کی جگہ کسی تیسرے شخص کو یا پھر اسی پہلے شخص کو جس نے تولیت قبول کر لی ہے متولی ... ۔۔۔ شرکت) مقرر کر سکتا ہے ۔

ایک شخص نے کسی کو وصیت کی کہ اتنی جائداد خرید کر فلاں کام کے لئے وقف کر دے تو یہی ۔۔۔ اس وقف کا متولی ہوگا ۔ اس کے بعد اس نے دوسرا وقف کیا اور اس کا کوئی متولی مقرر نہیں کیا ۔۔۔ شخص اگر اس کو وصی بنایا ہے ۔ تو وہی ورنہ دوسرا شخص اس دوسرے وقف کا متولی ۔۔۔ ا ۔

واقف نے اپنی اولاد میں سے دو شخصوں کو متولی مقرر کیا ان میں سے ایک عورت ہے ۔۔۔ دوسرا مرد تو یہی دونوں متولی ہوں گے اگر اس نے تولیت مردوں کے لئے مخصوص کر دی ہے ۔۔۔ رت متولی نہیں ہوگی ۔

واقف زندہ ہے اور متولی مر گیا ہے تو دوسرا متولی واقف مقرر کرے گا اگر واقف بھی ۔۔۔ ا ہے اور وصی زندہ ہے تو متولی مقرر کرنے کا اختیار وصی کو ہے اگر نہ واقف زندہ ہے اور نہ ۔۔۔ تو قاضی اپنی رائے سے متولی مقرر کرے گا ۔

اگر واقف کے خاندان والے موجود ہیں اور اہلیت رکھتے ہیں تو تولیت انھیں کا حق ۔۔۔ اگر نا اہل ہیں تو دوسرے کو متولی بنایا جائے گا اور جب ان میں سے کوئی تولیت کا اہل ۔۔۔ ا تو تولیت اس کو منتقل کر دی جائے گی ۔ اگر خاندان والے اس خدمت کے انجام ۔۔۔ ے پر تیار نہیں ہیں اور دوسرے چند لوگ تیار ہوں تو قاضی وقف کے مفاد کا خیال رکھتے ۔۔۔ ے متولی مقرر کرے گا ۔ لیکن ایسا اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ واقف نے اپنے خاندان کے لئے تولیت خاص نہ کی ہو ۔ اگر خاص کر دی ہے اور اہل خاندان میں کوئی امین نہ ہو تب دوسرا شخص متولی بنایا جا سکتا ہے ۔

متولی کو اختیار ہے کہ وہ مرتے وقت دوسرے کے لئے تولیت کی وصیت کر جائے لیکن یہ دوسرا متولی تولیت کے وظیفہ کا اس وقت تک مقدار نہیں ہوگا جب تک قاضی اس کی درخواست پر غور کر کے اس کے کام کے لحاظ سے اس کا وظیفہ مقرر نہ کرے ۔ یہ ضروری نہیں کہ سابقہ متولی کو جو ملتا تھا وہی وظیفہ اس کو بھی ملے البتہ اگر واقف نے ہر ایک متولی کے لئے رقم مخصوص کر دی ہے تو پھر اس کو قاضی سے درخواست کرنے کی ضرورت نہیں ، وظیفہ اس کو بھی ملے گا اگر قاضی نے کسی کو متولی مقرر کیا ہے تو اس کو حق تولیت اس قدر نہیں ملے گا جتنا واقف کے مقرر کردہ متولی کو ملتا تھا ۔

متولی اپنی حیات و صحت میں اس وقت تک دوسرے کو اپنا قائم مقام نہیں کر سکتا جب تک اس کو جملہ اختیارات حاصل نہ ہوں ۔

ایک جائداد چند اشخاص معلوم پر وقف ہے تو یہ لوگ اپنی رائے سے متولی مقرر کر سکتے ہیں قاضی کی اجازت ضروری نہیں ۔

مسجد کا متولی فوت ہو گیا تو اہل محلہ دوسرا متولی مقرر کر سکتے ہیں اور اس مقرر کردہ متولی کے جملہ تصرفات جائز ہوں گے بشرطیکہ شریعت کے خلاف نہ ہوں ۔

ایک وقف کے دو متولی ہیں ایک کو ایک شہر کے اور دوسرے کو دوسرے شہر کے قاضی نے مقرر کیا ہے تو ہر ایک کو اس وقف میں تنہا تصرف کا حق حاصل ہے ۔ ایک شہر کا قاضی دوسرے شہر کے متولی کو بر بنائے مصلحت معزول بھی کر سکتا ہے ۔

وقف کے کسی جزو کو بیع یا رہن کرنا خیانت ہے اگر کوئی متولی ایسا کرتا ہے تو اس کو فوراً معزول کر دیا جائے وہ خود اپنے کو معزول نہیں کر سکتا واقف یا قاضی کرے گا ۔

قاضی کی اجازت سے متولی وقف کے مال کو اپنے مال میں ملا لے تو اس پر کوئی تاوان نہ ہوگا ۔

متولی نے وقفی جائداد کرایہ پر دی، اس کے بعد معزول ہو گیا اور اس کی جگہ دوسرا متولی مقرر ہوا تو اس نئے متولی کو اس کا کرایہ وصول کرنے کا حق ہے معزول شدہ کو نہیں ۔ اگر متولی نے وقف کے روپیہ سے کوئی جائداد خریدی اور پھر فروخت کر دی تو یہ متولی خریدار سے اس کا اقالہ کر سکتا ہے جبکہ فروختگی واجبی قیمت سے زیادہ پر عمل میں نہ آئی ہو اگر اس متولی کو معزول کر کے دوسرا متولی مقرر کیا گیا ہے تو یہ بھی اقالہ کر سکتا ہے ۔ موقوفہ باغ کے درخت پرانے ہو گئے ہیں تو باغ کو باقی رکھنے کے لئے متولی کا فرض ہے کہ نئے درخت لگوائے ۔

واقف نے متولی کے لئے حق تولیت جو کچھ مقرر کیا ہے اور وہ خدمت کے لحاظ سے کم ہے تو قاضی اس کی اجرت میں مناسب اضافہ کر سکتا ہے ۔

دیہاتوں میں عموماً لگان کے علاوہ بطور نذرانہ کچھ مقرر ہوتا ہے اگر وہ بلحاظ ظرف متولی کے لئے ہے تو جائز ہے اگر بطور رشوت ہے تو حرام اگر وہ آمدنی محاصل وقف کو پورا کرتی ہے تو وقف کی آمدنی ہے ۔ داکثر ایسا ہوتا ہے کہ زمین زیادہ قیمت پر اٹھ سکتی ہے لیکن کاشتکار اتنی قیمت نہ دے کر دوسری چیزوں سے اس کمی کو پورا کر دیتے ہیں اس طرح کی آمدنی ہوگی اگر قیمت پوری مل گئی ہے اور بطور رسم بلا اس مقصد کے کہ اس کے ساتھ محصولات میں رعایت برتی

جائے نذرا دیا جاتے تو وہ متولی کے لئے جائز ہے اگر رعایت مقصود نہ ہو تو رشوت ہے۔

متولی اگر اپنی اولاد یا باپ دادا کے ہاتھ وقف کی کوئی چیز فروخت کرتا ہے یا ان کو وقف کے کام کے لئے ملازم رکھتا ہے تو یہ سب ناجائز ہے۔

اگر واقف نے متولی کو اجازت دے رکھی ہے کہ وہ وقف کی آمدنی میں سے خود بھی کھا سکتا ہے اور اپنے دوست واحباب کو بھی کھلا سکتا ہے تو متولی ایسا کر سکتا ہے ورنہ نہیں۔

اگر واقف یا قاضی نے متولی کے لئے کچھ فیصدی مقرر کر دیا ہے تو متولی کل آمدنی کا اسی فیصدی کے حساب سے لے گا بچت کا نہیں۔

وقف کی آمدنی بڑھانے کے لئے متولی کو اختیار ہے کہ وہ وقف کی زمین پر گاؤں بسائے اگر زمین شہر سے ملحق ہے تو مکانات اور دوکانیں بنوائے اور کرایہ پر اٹھائے اگر مکانات وغیرہ کے کرایہ سے زراعت کے لئے زمین ٹھیکہ پر اٹھانے میں فائدہ ہو تو اس کو مکان گرانے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ شور یا بنجر زمین کو کاشت کے لئے بنانے کے لئے وقف کا روپیہ خرچ کر سکتا ہے۔

مسافر خانہ کی کوئی آمدنی نہیں ہے اور اس کے لئے ملازم رکھنے ضروری ہیں تو وہ اس کے چند کمرے کرایہ پر اٹھا کر اس کی آمدنی سے اس ضرورت کو پورا کر سکتا ہے۔ وقف کی عمارت جھک گئی ہے پڑوسیوں کو اس سے خطرہ لاحق ہو گیا ہے تو وہ اس کو درست کرنے کے لئے وقف کا روپیہ خرچ کر سکتا ہے اگر روپیہ نہیں ہے تو قرض لے سکتا ہے۔

متولی نے وقف کی زمین پر وقف کے لئے یا کچھ نیت کئے بغیر مکان بنوایا اور اس پر اپنا یا وقف کا روپیہ خرچ کیا تو ہر صورت میں مکان وقف کا ہو گا متولی اپنا لگایا ہوا روپیہ لے سکتا ہے۔ اسی طرح اگر مرمت پر اپنا روپیہ لگایا ہے تو وہ بھی لے سکتا ہے۔ وہ وقف کا روپیہ اپنے خرچ میں نہیں لے سکتا خواہ واپس ہی کیوں نہ کر دے اس سے تاوان لیا جائے گا۔

واقف یا متولی کی اجازت سے کرایہ دار نے وقف آراضی پر تعمیر کی تو وہ عمارت اس کی نہ ہو گی وہ اپنا لگایا ہوا روپیہ لینے کا حق دار ہے۔

موقوفہ جائداد خراب ہو رہی ہے متولی چاہتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ فروخت کر کے اس کو درست کرا دے تو وہ ایسا نہیں کر سکتا۔

موقوفہ عمارت کا وہ حصہ جو منہدم نہیں ہے فروخت کر دیا گیا اور خریدار اس کو منہدم کرانا چاہتا ہے یا وقف کا ثمر دار درخت فروخت کر دیا تو یہ بیع باطل ہے اگر خریدار نے مکان شکست کرا دیا یا درخت کٹوا لیا تو قاضی کا فرض ہے کہ وہ متولی کو فوراً معزول کرے کیونکہ وہ خائن ہے اور اس سے یا خریدار سے اس مکان یا درخت کا تاوان لے اگر بیچنے والے سے تاوان لے گا تو بیع نافذ ہو جائے گی اور خریدار سے لے گا تو باطل رہے گی۔

وقف کے پھل دار درخت بیچنا ناجائز ہیں، ان کو کاٹ کر فروخت کیا جا سکتا ہے اگر پھل دار درخت نہیں ہیں تو ان کو کاٹنے سے پہلے بھی بیچا جا سکتا ہے۔ اگر وقف آراضی میں بید، نرکل، جھاڑی اور بانس وغیرہ پیدا ہوتے ہوں جو کاٹنے کے بعد پھر اگ آتے ہیں ان کو برابر وقت بیچتے رہنا چاہئے کیونکہ یہ وقف کی آمدنی میں داخل ہیں۔

متولی کے لئے جو حق تولیت مقرر کیا گیا ہے وہ اس کو وقف کا کام انجام دیتے رہنے کے صلہ میں ملتا رہے گا اور وہ وہی کام انجام دے گا جو متولی عموماً کیا کرتے ہیں مثلاً موقوفہ جائداد کی دیکھ بھال، اس کی مرمت کرانا، کرایہ وغیرہ پر اٹھانا مستحقین کو ان کے وظائف ادا کرنا وغیرہ۔ متولی کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے فرائض نہایت دیانتداری اور مستعدی کے ساتھ انجام دے۔ اس سے صرف انہیں کاموں سے متعلق باز پرس کی جا سکتی ہے جو متولی کیا کرتے ہیں اس سے خود ان کاموں کے کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا جن کو وہ مزدوروں یا کارندوں سے کرایا کرتا ہے اگر عورت متولی ہے تو وہ صرف وہی کام کرے گی جو عورتیں کیا کرتی ہیں۔ مردوں کے کرنے کے کام کا اس سے مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔

اگر متولی مزدوروں کے ساتھ مل کر وقف کا کام کرے تو وہ اس کی اجرت نہیں لے سکتا۔

اہل وقف نے متولی پر دعویٰ کیا کہ یہ کچھ کام نہیں کرتا لہٰذا اس کو حق تولیت نہ دیا جائے تو حاکم ایسے کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا جو متولی نہیں کیا کرتے۔

متولی اندھا، بہرا، گونگا ہے لیکن اس میں لوگوں سے وقف کا کام کرانے کی صلاحیت ہے تو وہ حق تولیت کا حق دار ہے۔

محض لوگوں کے کہنے سننے سے متولی کی تولیت اور حق تولیت اس وقت تک باطل نہیں کیا جا سکتا جب تک اس کی خیانت ثابت نہ ہو جائے۔ اس پر بھی اگر وہ تائب ہو جائے اور اس کے حالات درست ہو جائیں تو اس کو پھر تولیت اور حق تولیت دیا جائے گا۔

اگر قاضی مناسب سمجھتا ہے تو متولی کے ساتھ دوسرے شخص کو شامل کر کے دونوں کی شرکت سے وقف کا کام چلا سکتا ہے اور متولی کے حق تولیت میں سے یا اگر حق تولیت کم ہے تو وقف کی آمدنی میں سے اس شخص کو بھی کچھ دلا سکتا ہے۔ اگر متولی کی خیانت کے شبہ کے باعث دوسرے شخص کو شریک تولیت کیا ہے تو دونوں مل کر ورنہ متولی کو تنہا بھی تصرف کا مجاز ہے۔

واقف متولی کا حق تولیت کچھ بھی مقرر کر سکتا ہے لیکن قاضی یا اور کوئی اجر مثل سے زیادہ مقرر نہیں کر سکتا۔

واقف نے کسی شخص کو وقف کے کام کے لئے مقرر کیا اور اس کے لئے رقم خاص کر دی تو وہ شخص خود ہی کام کر کے اس رقم کو وصول کر سکتا ہے کسی دوسرے شخص سے کام لینے یا اس کو اپنی جگہ مقرر کرنے کا اسے اختیار نہیں ہے اگر واقف نے اجازت دے دی ہے تو کر سکتا ہے۔

متولی کو وقف کے کام کے لئے ملازم رکھنے ان کو برخاست کرنے ان کی جگہ دوسرے ملازم رکھنے نیز ملازموں کی تنخواہیں دینے کا حق حاصل ہے۔

اگر متولی ایک سال تک جنون کی حالت میں رہے تو اس کو برخاست کر دیا جائے گا۔ اچھا ہونے اور کام کے لائق ہونے پر اسے پھر سے تولیت دی جا سکتی ہے۔

واقف نے متولی کے لئے یہ شرط کی کہ میں نے اس کا جو وظیفہ مقرر کیا ہے اگر قاضی اس کو معزول بھی کر دے تو اس کا وظیفہ معزولی کے بعد بھی اس کو ملتا رہے گا یا اس کے بعد اس کی اولاد کو نسلاً بعد نسل بھی دیا جاتا رہے گا تو اس شرط کی پابندی کی جائے گی۔

واقف کے فوت ہو جانے پر قاضی نے وقف کے کام کے لئے ایک کارندہ مقرر کر دیا اور آمدنی کا دسواں حصہ اس کے لئے مقرر کر دیا اس وقف میں ایک چکی ہے جو مستقل کرایہ پر اٹھی ہے اور اس کا کرایہ اہل وقف خود حاصل کر لیتے ہیں یعنی کارندہ کی ضرورت نہیں ہے تو کارندہ کو آمدنی کا دسواں حصہ نہیں دیا جائے گا بہ الفاظ دیگر قاضی کی یہ تقرری کالعدم قرار دی جائے گی۔

ایک متولی نے عرصۂ دراز تک وقف کا کام نہیں کیا اور قاضی کو اس کی اطلاع بھی نہیں
رہ اسں کو معزول کر کے کسی دوسرے کو متولی بنا دیتا۔ تو یہ متولی اب بھی متولی ہے بغیر
ل کئے معزول نہ ہوگا۔

...ن مریض

ایسا شخص جو مرضِ موت میں مبتلا ہو اگر اس کا کوئی وارث نہیں ہے تو وہ اپنی کل
دو وقف کر سکتا ہے ورنہ تہائی اگر کل جائداد وقف کر دی اور وارثوں نے جائز قرار
دیا تو وقف صحیح ہے اگر وارثوں میں اختلاف ہے کچھ جائز قرار دیتے ہیں اور کچھ نہیں
ز قرار دینے والوں کے حصے وقف ہو جائیں گے اور انکار کرنے والوں کے نہیں۔

مریض نے وقف کیا لیکن اس کے وارثوں نے اسں کو جائز قرار نہیں دیا اسی بنا پر
نے اس میں سے ایک تہائی وقف اور دو تہائی غیر وقف قرار دے دیا لیکن اس
بعد پتہ چلا کہ واقف کی اور بھی جائداد ہے اور یہ وقف حقیقتاً تہائی کا تھا تو اس صورت
ر وارثوں کے پاس وہ دو تہائی جس کو قاضی نے غیر موقوفہ قرار دیا ہے وقف میں شامل
جائے گی اگر انھوں نے اس کو فروخت کر دیا ہے تو بیع جائز رہے گی اور اس کی قیمت
ن سے لے کر اور جائداد خرید کر وقف کر دی جائے گی۔

مریض نے اپنی کل جائداد وقف کر دی اس کی وارث صرف اس کی بیوی ہے اور
قف کو جائز قرار نہیں دیتی تو اس کا چھٹا حصہ غیر موقوفہ اور باقی پانچ حصے وقف کے ہونگے۔

ایک مریض پر اتنا ہی قرض ہے جتنے مالیت کی اس کی جائداد ہے تو وہ اس
نہیں کر سکتا اگر کرتا ہے تو وہ وقف باطل ہے۔ اس جائداد کو فروخت کر کے اس کے قرض
ائیگی کی جائے گی

راہن نے جائداد مرہونہ وقف کی اگر اس کے پاس اس قدر روپیہ یا دیگر جائداد ہے
سے پہلے قرض ادا کیا جائے گا اگر نہیں ہے تو وقف باطل ہے اسے فروخت کر کے قرض
ائیگی کی جائے۔

ایک مریض نے اپنی کل جائداد کا ایک تہائی حصہ وقف کیا لیکن اس کے مرنے سے
ہی جائداد تباہ ہو گئی یا اس کے مرنے کے بعد جب باقی جائداد کو تقسیم کیا گیا تو وارثوں کو
لا ایسی صورت میں باقی جائداد کا ایک تہائی حصہ وقف ہوگا اور دو تہائی وارثوں میں
ر دی جائے گی۔

ایک مریض نے ایسی زمین وقف کی جس میں پھل دار درخت ہیں اگر ان درختوں میں اس
نے سے پہلے پھل آئے تو یہ پھل وقف کے ہیں اگر جس روز وقف کیا تھا اس دن ان میں پھل
تھے تو یہ پھل وارثوں کے ہیں۔

کسی مریض نے کہا کہ میں وقف کا متولی ہوں اور اس کا اس قدر روپیہ میں نے اپنے اوپر
لیا ہے لہٰذا یہ رقم میرے مال میں سے دی جائے اگر وارث اس کے قول کی تصدیق کر دیں
دولت میں سے اور اگر تکذیب کریں نیز قسم کھالیں تو کل دولت کا تہائی حصہ وقف کو
ائے گا۔

تندرست نے وقف کر کے متولی کے سپرد کر دیا لیکن اس کی آمدنی کا صرف اپنے اختیار
میں رکھا۔ مرتے وقت وصیت کی کہ اتنا روپیہ فلاں کو اور اس قدر فلاں کو دینا یا جو جیسا مناسب
سمجھو کرنا۔ اسی واقف کا لڑکا تنگ دست ہے تو اوروں کی بہ نسبت اس کو دینا بہتر ہے۔

اگر واقف کو مرنے کی شرط پر معلق رکھا تو یہ وقف نہیں بلکہ وصیت ہے لہٰذا مرنے سے پہلے
وہ اسں میں رجوع بھی کر سکتا ہے۔ جو ایک تہائی میں جاری ہوگی۔

قبروں کا وقف

قبروں کے لئے زمین وقف کرنا جائز ہے۔ وقف کرتے ہی زمین واقف کی ملکیت سے
خارج ہو جاتے گی خواہ اس میں مردہ دفن کیا گیا ہو یا نہیں اور چاہے اس نے اپنا قبضہ اٹھایا
ہو یا نہیں۔

قبرستان کے لئے زمین وقف کی گئی اس میں درخت یا عمارت ہے تو یہ وارثوں کے
ہوں گے وقف کے نہیں۔

قبرستان میں قبرستان سے متعلق سامان رکھنے یا چوکیدار کے رہنے کے لئے مکان بنایا گیا
اگر قبرستان وسیع ہے اور مکان قبروں پر نہیں بنایا گیا ہے تو کوئی حرج نہیں لیکن جب قبرستان
میں وسعت نہ رہے اور مردوں کے دفن کی ضرورت ہو تو یہ مکان اٹھا دیا جائے گا۔

وقف زمین میں غریب اور مالدار دونوں اپنے مردے دفن کر سکتے ہیں۔

قبرستان کے لئے ایسی زمین خریدی گئی جو پہلے کافروں کا قبرستان تھی لیکن اب اس
کا نہ کوئی نشان ہے اور نہ ہڈیاں باقی ہیں تو اس کو مسلمانوں کا قبرستان بنایا جا سکتا ہے اگر
نشانات یا ہڈیاں موجود ہیں تو جب تک ان کو دور نہیں کیا جائے گا قبرستان نہیں بنا سکتے۔

مسلمانوں کا قبرستان ہے جس میں نہ قبروں کے نشانات ہیں نہ ہڈیوں کا پتہ۔ تب بھی
اس کو نہ کھیت بنایا جا سکتا ہے اور نہ مکانات (یہ فعل قطعی ناجائز ہوگا۔) بلکہ قبرستان کے
تمام آداب بجا لائیں گے۔

قبرستان میں کسی نے اپنے لئے قبر کھدوا رکھی ہے اگر قبرستان میں گنجائش ہے تو دوسرے
کو اپنا مردہ اس میں دفن نہ کرنا چاہئے، اگر جگہ نہیں ہے تو اس قبر میں مردہ کو دفن کر سکتے ہیں۔

کسی کی زمین میں بلا اجازت مردہ کو دفن کر دیا تو مالک کو اختیار حاصل ہے کہ وہ مردہ کو
نکلوا دے یا اس قبر پر ہل چلا کر کھیتی کرے۔

آراضی وقف اور درخت

قبرستان میں کسی نے درخت لگوائے تو ان درختوں کا مالک وہی شخص ہوگا۔ اگر درخت
خودرو ہیں یا معلوم نہیں کس نے لگائے ہیں تو قبرستان کی ملکیت ہیں ان کو فروخت کر کے رقم
قبرستان کی درستی پر صرف کی جائے گی۔

وقف کی زمین کرایہ پر لے کر درخت لگائے تو یہ درخت لگانے والے کے اور اس
کے بعد اس کے وارثوں کے ہیں۔ اجارہ ختم ہونے پر اس کو اپنے درخت نکلوانے ہوں گے۔

وقف کے مکان میں درخت ہے تو اس کو فروخت کر کے اس کی رقم کو مکان کی مرمت
پر صرف کرنا جائز نہیں، مرمت کرایہ سے ہوگی۔

وقف کے مکان میں پھل دار درخت ہیں، واقف یا لگانے والے کی نیت نہیں معلوم

توکرایہ دار کو ان کے پھل کھانا جائز نہیں ۔

وقفی درخت کا کچھ حصہ خشک ہو گیا ہے کچھ باقی ہے تو خشک کو اس مقصد پر صرف کریں گے جس مقصد کے لئے یہ جائداد وقف ہے ۔

مسافر خانہ میں پھل دار درخت ہیں اور واقف یا لگانے والے کی نیت معلوم نہ ہو تو مسافر ایسے پھل جن کی قیمت نہیں ہوتی کھا سکتے ہیں اگر قیمتی پھل ہیں تو احتیاط یہی ہے کہ نہ کھاتے جائیں ۔

سڑک پر اس لیئے درخت لگائے گئے کہ راہ گیران سے فائدہ اٹھائیں تو ہر غریب و امیر ان کے پھل کھا سکتا ہے اسی طرح جنگل، راستہ اور سبیل کا پانی، جنازہ کی چارپائی اور قرآن پاک کا استعمال ہر امیر و غریب کر سکتا ہے ۔

کسی نے مسجد میں درخت لگایا تو یہ درخت اس کا نہیں مسجد کا ہوگا اس کے برعکس موقوفہ زمین میں کسی نے درخت لگایا خواہ وہ نگراں ہو یا کرایہ دار یا خود واقف اور جا ہے اس پر وقف کا پیسہ صرف ہوا ہو یا لگانے والے کا ذاتی پیسہ ہو اگر اس نے وقف کے لئے لگایا ہے تو درخت وقف کا ہے ورنہ لگانے والے کا اگر درخت کاٹ لیا گیا ہو اور اس کی جڑ سے پھر درخت نکل آیا ہو تو یہ بھی اسی کی ملکیت ہے ۔

مسجد میں پھل دار درخت لگائے تو ان کے پھل نہ مصلی کھا سکتے ہیں اور نہ لگانے والا کیوں کہ درخت مسجد کی ملکیت ہے اس کے پھلوں کو فروخت کر کے مسجد پر صرف کیا جائے گا۔

کنوئیں کا پانی ہر ایک خود بھی پی سکتا ہے اور جانوروں کو بھی پلا سکتا ہے سبیل کے پانی سے وضو کرنا اور وضو کے لئے وقف پانی کو پینا جائز نہیں ۔

قبرستان میں شکستہ مکان تھا کسی نے اپنے روپیہ سے اس کی مرمت کرائی تو وہ شخص صرف عمارت کا مالک ہوگا زمین کا نہیں ۔

حاجیوں کے ٹھہرنے کے لئے مکان وقف کیا تو اس میں صرف حاجی ہی قیام کر سکتے ہیں دوسرا نہیں حج کا زمانہ ختم ہونے کے بعد اس کو کرایہ پر اٹھا دیا جائے گا اور اس رقم سے اس کی مرمت نیز باقی رقم مساکین پر خرچ کی جائے گی ۔

راستہ کے لیئے زمین وقف کی اور سڑک بنوادی یا پل بنوا کر وقف کر دیا تو یہ وقف صحیح ہے ورثہ دعویٰ نہیں کر سکتے ۔

مسجد

کسی مکان کی مسجد جیسی عمارت بنا دینے سے مسجد نہیں بن جاتی ۔ مسجد کے لئے ضروری ہے کہ بنانے والے سے کوئی ایسی بات یا فعل سرزد ہو جس سے اس عمارت کا مسجد ہونا ثابت ہوتا ہے ۔

مسجد بنا کر عام مسلمانوں کو جماعت سے نماز پڑھنے کی اجازت دے دی تو مسجد ہو گئی خواہ اس جماعت میں دو شخص ہی کیوں نہ ہوں لیکن جماعت اذان اور اقامت کے ساتھ ہونا شرط ہے اگر تنہا ایک ہی شخص نے اذان و اقامت سے نماز پڑھی (اس طرح نماز پڑھنا جماعت کے قائم مقام ہے) تب بھی مسجد ہو جائے گی لیکن اگر بانی مسجد اس طرح تنہا نماز ادا کرے گا تو نہیں ہوگی کیوں کہ وہ تنہا عامۃ المسلمین کا قائم مقام نہیں ہو سکتا جماعت سے نماز کی قید محض اس لئے ہے کہ اس پر عام مسلمانوں کا قبضہ ہو جاتے ۔ ورنہ صرف کہہ دینے سے ہی مسجد ہو جاتی ہے ۔

کسی شخص نے اپنے مکان کو مسجد قرار دے دیا اور اس کا راستہ علیحدہ کر کے لوگوں کو نماز پڑھنے کی اجازت دے دی تو یہ مکان مسجد ہو جائے گا ۔

مسجد ذاتی املاک سے قطعی جدا ہوتی ہے اگر کسی شخص نے مسجد کے نیچے یا اوپر اپنی ذاتی دوکانیں یا رہائشی مکان بنا لیتے ہیں تو یہ مسجد نہیں بلکہ اس شخص کی ملکیت ہے جس کو اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے گا ۔ البتہ مسجد کے اوپر یا نیچے دوکانیں یا مکانات اس لئے بنوائے گئے ہیں کہ ان کی آمدنی مسجد پر صرف ہو یا مسجد کا سامان رکھنے کے لئے اس کے نیچے تہ خانہ وغیرہ بنوایا گیا ہے تو جائز ہے ۔ لیکن اس طرح کی جملہ تعمیرات اگر مسجد بننے سے پہلے ایک پلان کے تحت کی گئی ہیں تو ٹھیک ہے اگر پہلے سے ارادہ نہیں تھا اور مسجد تعمیر کر لی گئی تو اس کے بعد اس کے اوپر یا نیچے اس کی کوئی عمارت نہیں بنائی جا سکتی یعنی ایک مسجد کو منہدم کر کے یا منہدم شدہ مسجد کی از سرنو تعمیر کرانا چاہیں اور پہلے اس کے نیچے دوکانیں وغیرہ نہ تھیں اور اب جدید تعمیر میں دوکانیں وغیرہ بنوانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے کیوں کہ یہ تو پہلے ہی سے مسجد ہے اب دوکانیں یا مکان بنانے کا مطلب یہ ہوگا کہ مسجد کو دوکانوں اور مکان میں تبدیل کیا جائے جو حرام ہے ۔

مسجد کے لئے عمارت لازمی نہیں خالی زمین بھی مسجد ہے ۔ اگر کسی شخص نے اپنی زمین پر ہمیشہ کے لئے لوگوں سے نماز پڑھنے کو کہہ دیا ہے تو یہ زمین مسجد ہو جائے گی ۔ اگر ہمیشہ کا لفظ ادا نہیں کیا لیکن اس کی نیت مسجد کی ہے تب بھی مسجد ہو جائے گی ۔ اگر اس کی نیت اس کو مسجد بنانے کی نہیں ہے اور نہ اس نے زبان ہی سے مسجد بنانے کا اقرار کیا ہے محض نماز پڑھنے کی اجازت دے دی ہے یا ایک دن یا مہینہ بھر یا سال بھر نماز پڑھنے کو کہا ہے تو یہ مسجد نہیں ہوگی بدستور اس کی میراث ہے اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء میں تقسیم ہوگی ۔

ایک مکان مسجد کے نام وقف ہے متولی اس کو مسجد بنا دیتا ہے اور لوگ اس میں چند سال تک نماز بھی ادا کرتے ہیں تب بھی یہ مکان مسجد نہیں ہے اس کو کرایہ پر اٹھایا جا سکتا ہے کیونکہ متولی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ وقف کے مکان کو مسجد بنا سکے ۔

ایک مریض نے اپنے مکان کو مسجد قرار دیا اگر وہ مکان تہائی کے اندر ہے تو مسجد ہے یا تہائی سے زیادہ ہے اور ورثاء نے اجازت دیدی ہے تب بھی مسجد ہے اگر وارثوں نے اجازت نہیں دی تو یہ پورا مکان میراث ہے مسجد نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں وارث بھی حقدار ہیں اور مسجد حقوق العباد سے جدا ہوتی ہے ۔ اس لئے ایک شخص نے زمین خرید کر مسجد بنوائی لیکن فروخت کرنے والے کے علاوہ اس زمین میں اور کوئی حصہ دار بھی نکل آیا اور وہ فروخت کرنے کے حق میں نہیں ہے تو مسجد نہیں رہے گی ۔ اگر کسی نے وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میرا تہائی مکان مسجد بنا دیا جائے تو اس مکان کی تقسیم کر کے اس کے تہائی حصہ کو مسجد قرار دیں گے ۔

اگر اہل محلہ یہ چاہتے ہیں کہ مسجد کو توڑ کر اس کی از سرنو تعمیر کریں، تو کر سکتے ہیں لیکن وہ روپیہ اپنا لگائیں گے مسجد کا روپیہ نہیں لگا سکتے ۔ محلہ کے علاوہ دوسرے لوگ ایسا نہیں کر سکتے ۔ اپنے روپیہ سے اہل محلہ مسجد کو وسیع کرا سکتے ہیں اس میں حوض، کنواں اور ضرورت کی

بجز تعمیرات بھی کرا سکتے ہیں مسجد کی تزئین بھی کرا سکتے ہیں۔ بانی مسجد یا اس کے ورثاء کو انہیں روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر بانی مسجد اپنے روپے سے مسجد میں کوئی اضافہ کرانا چاہتا ہے تو اہل محلہ کی بہ نسبت اس کا حق پہلا ہے۔ حوض، کنواں یا دیگر تعمیرات کرانے کے لئے یہ شرط ہے کہ مسجد کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور پہلے جتنی آراضی میں مسجد تھی اس آراضی کے علاوہ رقبہ پر یہ تعمیریں ہونی چاہئیں۔

اہل محلہ کو مسجد کا دروازہ دوسری جانب تبدیل کرنے کا حق ہے اگر اس معاملہ میں اختلاف رائے ہو تو کثرت رائے اور اچھے لوگوں کی بات پر عمل کرنا چاہئے۔

واقف یا بانی مسجد اس وقت جب کہ مسجد کی تعمیر مکمل ہو چکی ہو مسجد کی چھت یا دیوار پر امام کے لئے کمرہ بنانا چاہتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ مسجد بنانے سے پہلے میری نیت تھی تب بھی وہ بالاخانہ نہیں بنا سکتا چہ جائے کہ دوسرے لوگ۔ اگر اس طرح کی کوئی عمارت بنادی گئی ہے تو ناجائز ہے اس کو گرا دینا واجب ہے۔

مسجد کو ضرورت ہے اس مقصد کے لئے اس کا کوئی حصہ کرایہ پر دینا حرام ہے اسی طرح مسجد کو بطور رہائش گاہ استعمال کرنا یا اس کے کسی جز کو حجرہ وغیرہ میں شامل کرنا بھی ناجائز ہے۔

نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے مسجد تنگ ہو گئی ہے اس کے متصل کسی شخص کا مکان ہے یا زمین تو اس کو خرید کر مسجد میں اضافہ کر لیا جائے اگر وہ شخص اپنا مکان یا زمین فروخت کرنے پر آمادہ نہ ہو تو اس کو واجبی قیمت دے کر جبراً قبضہ کر لینا جائز ہے۔ اسی طرح اگر مسجد سے متصل وقفی مکان یا زمین ہے خواہ وہ اس مسجد کے نام ہو یا کسی دوسرے مقصد کے لئے اس کو بھی مسجد کی وسعت کے لئے شامل کرنا جائز ہے۔ اسی طرح اگر مسجد کے برابر وسیع راستہ ہے اور اس کا کچھ جز مسجد میں شامل کر لینے سے لوگوں کا حرج نہ ہوتا ہو اور راستہ تنگ نہ ہوتا ہو تو شامل کر سکتے ہیں۔

مسجد تنگ ہے ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ مسجد کو میں لے لوں اور اس کے بدلے میں وسیع اور بہترین زمین یا مکان دیدوں تو اس طرح کا تبادلہ جائز نہیں کیونکہ مسجد کا تبادلہ کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔

مسجد بنا کر بانی مسجد نے یہ شرط عاید کی کہ مجھے اختیار ہے کہ اس کو مسجد رکھوں یا نہ رکھوں تو یہ شرط باطل ہے مسجد کے ابطال کا اس کو حق نہیں ہے وہ مسجد ہو گئی۔ اسی طرح مسجد کو اپنے یا اہل محلہ کے لئے مخصوص نہیں کیا جا سکتا اس میں دوسرے لوگ بھی نماز پڑھ سکتے ہیں۔

مسجد ویران ہو گئی ہے جب بھی وہ مسجد ہے، قیامت تک مسجد رہے گی اس کو منہدم کر کے اس کے ملبہ کو اپنے استعمال میں لانا یا اس کو کسی عمارت میں تبدیل کرنا جائز نہیں۔

مسجد ویران ہے وہاں لوگ نہیں رہے تو اس کا سامان دوسری مسجد کو منتقل کر دینا چاہئے اگر ایسی مسجد منہدم ہو گئی ہے اور اندیشہ ہے کہ اس کا ملبہ لوگ اٹھا کر لے جائیں گے تو اس کو بھی دوسری مسجد میں منتقل کر دینا چاہئے۔

مسجد کی چٹائیاں اور جانمازیں وغیرہ بیکار ہو گئی ہیں تو جس شخص نے دی تھیں اسی کو اختیار ہے کہ وہ ان کا جو چاہے کرے۔ موسم سرما میں مسجد میں پیال یا کیسر ڈلوائی، جاڑا ختم ہو گیا تو جس شخص نے ڈلوائی تھی اسے اختیار ہے کہ وہ اس کا جو چاہے کرے اگر باہر پھنکوا دی گئی ہے تو ہر شخص کو اس کے استعمال کا حق ہے مسجد میں بچھی ہوئی پیال وغیرہ کو سقایہ میں جلانا جائز نہیں۔

سقایہ کی آگ گھر پر لے جانا، اس سے چلم بھرنا ناجائز ہے لیکن جو شخص پانی بھرواتا اور گرم کراتا ہے اگر وہ اجازت دے دے تو جائز ہے بشرطیکہ اس نے روپیہ اپنا صرف کیا ہو اگر مسجد کا روپیہ صرف کیا جا رہا ہے تو وہ اجازت نہیں دے سکتا۔

مسجد کا سامان مثلاً لوٹا، چٹائی وغیرہ دوسرے کاموں میں استعمال نہیں کر سکتے اسی لئے مسجد کے لوٹے میں پانی بھر کر گھر میں لانا مسجد کی چٹائی اپنے گھر یا کسی اور جگہ بچھانا، مسجد کے ڈول اور رسی سے اپنے لئے پانی بھر کر لے جانا یا مسجد کی کوئی اور چیز بے محل استعمال کرنا سب ناجائز ہیں۔

مسجد میں روشنی کے لئے تیل یا موم بتی دی اگر بچ رہی تو دوسرے دن کے لئے رکھ چھوڑیں اگر کسی خاص دن کے لئے دی گئی تھیں تو جو بچ رہی ہیں مالک کو واپس کر دی جائیں امام یا موذن یا اور کسی کو استعمال کرنا جائز نہیں ہاں اگر وہاں کی رسم ہو تو امام و موذن لے سکتا ہے۔

کسی شخص نے اپنی جائداد نیک کاموں کے لئے وقف کی تو اس کی آمدنی میں سے مسجد میں روشنی کی جا سکتی ہے لیکن صرف ضرورت کے لائق تزئین کی خاطر نہیں۔

کسی شخص نے اپنی جائداد اس شرط پر وقف کی کہ اس کی آمدنی مسجد کی مرمت اور فقراء پر صرف کی جائے۔ آمدنی موجود ہے اور مسجد کو مرمت کی ضرورت نہیں ہے اگر آئندہ آمدنی تک یہ خیال ہو کہ مسجد کو مرمت کی ضرورت لاحق ہو گی تو یہ رقم فقراء کو دی جا سکتی ہے آئندہ رقم مرمت پر صرف کر دیں گے۔

مسجد شکستہ ہو گئی ہے اور اس کی آمدنی اس قدر موجود ہے کہ اس کی از سر نو تعمیر کی جا سکے تو اس رقم کو اس مد پر صرف کرنا جائز ہے۔

متولی نے مسجد کے اوقاف کی آمدنی سے مکان خریدا اور امام یا موذن کو رہائش کے لئے دیدیا اگر ان کو معلوم ہے تو اس مکان میں رہنا مکروہ و ممنوع ہے۔ اسی طرح جو مکان محض اس لئے وقف کیا گیا ہے کہ اس کی آمدنی مسجد پر صرف کی جائے گی اس میں امام یا موذن کا بلا کرایہ رہنا ناجائز ہے۔

متولی نے مسجد کی آمدنی سے مسجد کے چٹائی۔ جانماز یا تیل وغیرہ خریدا اگر واقف نے اس کو اجازت دیدی ہے تو جائز ہے یا سابق متولی ایسا کرتا تھا تب بھی جائز ہے اور اگر اس کو یہ معلوم ہے کہ یہ آمدنی مسجد کی عمارت پر صرف کے لئے ہے تو اس کی یہ خریداری مطلقاً حرام و ناجائز ہے۔

مسجد کی تعمیر کے بعد کچھ سامان بچ رہا تو یہ سامان آئندہ کے لئے رکھ لیا جائے گا اس کو فروخت کر کے روشنی یا چٹائیوں وغیرہ پر صرف نہیں کیا جا سکتا۔

مسجد کے لئے چندہ اکٹھا کیا اور اس میں سے کچھ رقم واپسی کی نیت کر کے اپنے خرچ میں لے آیا تب بھی اس کا یہ فعل ناجائز ہے اگر اس کو یہ معلوم ہے کہ یہ رقم فلاں نے دی ہے تو اس کو تاوان دے یا اس سے اجازت لے کر مسجد میں تاوان دے اگر معلوم نہیں کہ یہ رقم کس نے دی ہے تو قاضی کے حکم سے مسجد میں تاوان دے۔ اگر اس نے خود اس تاوان کو مسجد میں صرف کر دیا ہے تو امید ہے کہ اس کے وبال سے بچ رہے گا۔

مسجد کے لئے کوئی جائداد خرید لی گئی ہے لیکن ابھی مسجد نہیں بنائی گئی ہے لیکن اس کی جگہ تجویز کر لی ہے تو وقف جائز ہے جب تک مسجد بنے اس جائداد کی آمدنی فقراء

تقسیم کی جائے گی اور مسجد بننے کے بعد مسجد پر صرف ہوگی ۔

مسجد کے لئے کوئی جانماز یا قرآن مجید یا لالٹین وغیرہ ہبہ کیا تو یہ ہبہ اس وقت تک تمام نہ ہوگا ۔ جب تک متولی کو قبضہ نہ دلا دیا جائے ۔

امام، موذن، جاروب کش وغیرہ کو متولی مسجد کے وقف سے اتنی تنخواہ پر ملازم رکھ سکتا ہے جو واجبی ہو اگر زیادہ دیتا ہے تو اس کو تاوان ادا کرنا ہوگا اگر ملازمین مسجد کو معلوم ہے تو ان کو اس بڑھی ہوئی تنخواہ کا لینا حرام ہے ۔

اگر مسجد کا متولی ان پڑھ ہے اور اس نے حساب کتاب کے لئے کسی کو ملازم رکھ لیا ہے تو اس کی تنخواہ وہ اپنی جیب سے دے گا نہ کہ وقف سے ۔

اگر متولی کو اجازت ہے تو وہ مسجد کی آمدنی سے مکان، دوکان، باغ وغیرہ خرید کر مسجد کی آمدنی میں اضافہ کر سکتا ہے اور ضرورت پڑنے پر فروخت کر سکتا ہے ۔

مسجد کے اوقاف کا کوئی متولی نہیں اہل محلہ میں سے ایک شخص اس کی دیکھ بھال کرتا اور اس کی آمدنی مسجد پر صرف کرتا ہے تو دیانۃً اس پر تاوان نہیں ۔ اگر متولی موجود ہے تو اہل محلہ مسجد کے اوقاف میں تصرف نہیں کر سکتے ۔

مسجد کے اوقاف فروخت کر کے اس کی تعمیر و مرمت پر صرف کرنا جائز نہیں اگر مسجد کے اوقاف کی آمدنی سے کوئی جائداد خریدی ہو تو اس کو فروخت کیا جا سکتا ہے ۔

مسجد کے نام ایک زمین وقف تھی وہ ناکارہ ہوگئی ۔ ایک شخص کے مفاد عامہ کے پیش نظر اس کا تالاب بنوا دیا تو اس تالاب میں نہانا دھونا جائز نہیں ۔

مسلمان کسی حادثہ کا شکار ہو گئے اور روپیہ کی سخت ضرورت ہے مسجد کے اوقاف کی آمدنی موجود ہے تو اس آمدنی کو بطور قرض لیا جا سکتا ہے ۔

امام و موذن مقرر کرنے میں بانی مسجد یا اس کی اولاد کا پہلا حق ہے اگر اہل محلہ نے امام و موذن مقرر کر لیا ہے اور وہ بانی مسجد کے امام یا موذن سے بہتر ہے تو محلہ والوں کا امام ہی مقرر کیا جائے گا ۔

اپنی ذات یا اولاد پر وقف

کسی جائداد کو اپنی ذات پر اور اس کے بعد کسی اور شخص اور پھر فقراء پر وقف کرنا درست ہے اس طرح اپنی اولاد یا نسل پر بھی وقف کرنا جائز ہے ۔

کسی جائداد کو اولاد پر اور اس کے بعد فقراء پر وقف کیا گیا تو جو اولاد آمدنی کے وقت وجود ہے چاہے وہ وقف کے وقت موجود نہ تھی اس کو بھی حصہ دیا جائے گا اور جو وقف کے وقت موجود تھی اور اب مر چکی ہے اس کا حصہ ختم ہو جائے گا ۔

وقف کے وقت اولاد نہیں تھی، وقف اس شرط پر کیا گیا کہ جو اولاد پیدا ہوگی وہ اس کی آمدنی کی حقدار ہوگی یہ وقف صحیح ہے ۔ اس طرح کے وقف کی آمدنی اس وقت تک فقراء کو دی جائے گی جب تک اولاد پیدا نہ ہو جب اولاد پیدا ہوگی تو آمدنی اس کو دی جائے گی ۔

اولاد پر وقف کیا تھا اس میں لڑکے، لڑکیاں اور خنثی سب شامل ہوں گے اگر محض لڑکوں پر وقف ہے تو لڑکیاں اور خنثی شریک نہ ہوں گے اگر لڑکیوں پر وقف ہے تو لڑکے اور خنثی داخل نہ ہوں گے اسی طرح اگر لڑکے اور لڑکیوں پر وقف کیا گیا ہے تو خنثی بھی حقدار ہوں گے کیونکہ حقیقۃً وہ یا لڑکا ہے یا لڑکی ۔

ایک جائداد اس اولاد پر اور نسلاً بعد نسل اس کی اولاد پر وقف کی گئی جو موجود تو جو اولاد وقف کرنے کے بعد پیدا ہوگی وہ اور اس کی اولاد اس وقف میں حق دار ہے ۔

ایک جائداد اولاد پر وقف کی گئی تو اس کی آمدنی اسی اولاد کو ملے گی جو معروف ہو اگر صرف واقف ہی اس کے نسب کی تصدیق کرتا ہو تو وہ اولاد حق دار نہیں ہے ۔ مثلاً شخص نے اپنی جائداد اپنی اولاد پر وقف کی اور وقف کی آمدنی آنے کے چھ ماہ سے کم میں کنیز سے بچہ پیدا ہوا اور اس نے کہا کہ یہ میرا بچہ ہے تو نسب ثابت ہو جائے گا مگر وقف کی آمدنی سے اسے کچھ نہ ملے گا اور اگر منکوحہ یا ام ولد سے چھ مہینہ سے کم میں بچہ پیدا ہوا تو بچہ اپنے حصہ کا حقدار ہوگا اور اگر چھ مہینہ یا زیادہ میں پیدا ہوا ہے تو حقدار نہیں ہے

نابالغ اولاد پر وقف کیا گیا تو وہ اولاد مراد ہے جو وقف کے وقت نابالغ تھی خواہ آمدنی کے وقت وہ بالغ ہو گئی ہو ۔ نابینا اور کانی اولاد پر وقف کیا گیا تو وہ اولاد مراد لی جائے گی جو وقف کرتے وقت اندھی یا کانی تھی اگر آمدنی کے وقت کوئی اندھا یا کانا ہو گیا ہے تو وہ آمدنی کا حقدار نہیں ہوگا ۔ اسی طرح اس اولاد پر وقف کیا جو یہاں سکونت رکھتی ہو اور وقف کے وقت وہ یہاں موجود نہ تھی آمدنی کے وقت یہاں سکونت پذیر ہے تو حصہ کی حق دار ہے ۔

ایک شخص نے اپنی جائداد اپنی اولاد پر اس شرط کے ساتھ وقف کی کہ جو یہاں سے چلا جائے گا اس کو حصہ نہیں دیا جائے گا تو جو جانے کے بعد واپس آجائے گا اس کو بھی حصہ نہیں دیا جائے گا ہاں اگر واپس آنے پر حصہ دیئے جانے کی بھی شرط ہو تو ضرور دیا جائے گا اسی یہ شرط کی ہے کہ میری اولاد میں جو لڑکی بیوہ ہو جائے اس کو دیا جائے تو جب تک بیوہ ہونے نکاح نہ کرے گی ملے گا اور نکاح کرنے پر نہیں ملے گا چاہے نکاح کے بعد اس کے شوہر نے طلاق دے دی ہو ۔ ہاں اگر دوبارہ بے شوہر ہونے پر دیئے جانے کی شرط ہو تو دیا جائے

اولاد ذکور اور ذکور کی اولاد پر وقف کیا تو اسی کے موافق تقسیم ہوگی اور اگر اولاد ذکور کی اولاد ذکور پر نسلاً بعد نسل وقف کیا ہے تو لڑکیوں کو کچھ نہیں ملے گا اور لڑکوں کا ختم ہونے پر فقراء حقدار ہیں ۔

حاجت مند اولاد پر وقف کیا گیا تو آمدنی کے وقت جو حاجتمند ہوگا وہی حقدار ہے خواہ وہ وقف کے وقت حاجتمند تھا لیکن اب مالدار ہے تو حقدار نہیں اور اگر وقف کے وقت مالدار تھا اور اب حاجتمند ہے تو حق دار ہے ۔

محتاج اولاد پر وقف تھا چند سال تک آمدنی تقسیم نہیں ہوئی اب محتاج دولت مند اور دولت مند محتاج ہو گئے تو تقسیم کے وقت جو محتاج ہے وہی حق دار ہے ۔

عالم اولاد پر وقف کیا تو غیر عالم حقدار نہیں خواہ وہ بچہ ہی کیوں نہ ہو جب وہ عالم ہو تب حق دار ہوگا اور اسی وقت سے اس کو حصہ ملے گا جب سے وہ عالم ہوا ہے ۔

اولاد پر وقف کیا مگر نسلاً بعد نسل کا تذکرہ نہیں کیا گیا تو محض صلبی اولاد مستحق ہوگی اس کے ختم ہوتے ہی اس کی اولاد مستحق نہ ہو کر فقراء حقدار ہوں گے ۔ اگر وقف کے وقت صلبی اولاد نہ ہو تو پوتا حقدار ہے نواسہ نہیں اگر پوتا بھی نہیں ہے پرپوتا اور پرپوتے کا لڑکا ہو تو وہ حق دار ہے ۔ اگر وقف کے بعد صلبی اولاد مر گئی تو پوتا حق دار نہ رہے گا صلبی اولاد حق دار ہوگی ۔

اولاد اور اولاد کی اولاد پر وقف کیا تو صرف دو پشت تک اولاد حق دار ہے پوتے اور بیٹی کی اولاد مستحق نہ ہوگی۔ اگر اولاد پھر اولاد کی اولاد پھر ان کی اولاد پر وقف کیا یعنی تین پشتیں ذکر کر دیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے نسلاً بعد نسل اور بطناً بعد بطن کہنا جب تک اولاد کا سلسلہ باقی رہے گا وہی حقدار ہے اور نسل ختم ہونے پر فقراء کا حصہ ہے۔

بیٹوں پر وقف کیا تو اگر وہ دو یا دو سے زیادہ ہیں تو وقف کی آمدنی سب پر مساوی تقسیم ہوگی اگر ایک بیٹا ہے تو نصف آمدنی اس کو اور نصف فقراء کو دی جائے گی اگر بیٹے اور بیٹے کی اولاد اور اس کی اولاد کی اولاد پر نسل بعد نسل وقف کیا ہے تو بیٹے کی جملہ اولاد ذکور و اناث پر برابر تقسیم ہوگا۔ اگر مردوں کو عورت سے دوگنا دیئے جانے کی شرط ہے تو اس کے موافق دیا جائے گا۔ پوتے اور پر پوتے دونوں کو برابر دیا جائے گا۔ اگر واقف نے بطن اعلیٰ بطن اسفل کی شرط عاید کر دی ہے تو پوتے کے ہوتے ہوئے پر پوتے کو نہیں دیا جا سکتا اگر پوتا ایک ہی ہے تو کل آمدنی کا وہی حقدار ہوگا اس کے مرنے کے بعد تمام پوتوں کی اولاد کو ملے گا اس پوتے کی اولاد کو بھی اور جو پوتے اس سے پہلے مر چکے ہیں ان کی اولادوں کو بھی اور اگر یہ کہہ دیا گیا ہے کہ بطن اعلیٰ میں جو مر جاتے اس کا حصہ اس کی اولاد کو دیا جائے تو جو پوتا موجود ہے اسے ملے گا اور جو مر گیا ہے اس کا حصہ اس کی اولاد کو . . ملے گا۔

وقف کی آمدنی آگئی ہے لیکن تقسیم نہیں ہوئی ہے اسی اثنا میں ایک حقدار کی موت واقع ہو جاتی ہے تو اس کا حصہ ساقط نہیں ہوگا بلکہ اس کے وارثوں کو دیا جائے گا۔

ایک شخص نے کہا میرے مرنے کے بعد میری یہ جائداد مساکین پر صدقہ ہے اور یہ زمین ایک تہائی کے اندر رہے تو مرنے کے بعد اس کی آمدنی اس کی اولاد کو نہیں دی جائے گی خواہ وہ محتاج اور فقیر ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر صحت میں وقف کیا اور ما بعد موت کی طرف مضاف نہ کرے پھر مر جائے اور اس کی اولاد میں ایک یا چند مسکین ہوں تو ان کو دینا بہ نسبت دوسرے مساکین کے افضل ہے مگر ہر ایک کو نصاب سے کم دیا جاتے۔

ایک شخص نے صحت میں فقراء پر وقف کیا اور واقف کے ورثہ بھی فقیر ہیں تو ان کو دینا بہتر ہے لیکن ان کے ساتھ دوسرے فقراء کو بھی دیا جائے یا کبھی ان کو اور کبھی دوسروں کو تاکہ عوام یہ نہ سمجھنے لگیں کہ انھیں پر وقف ہے۔

صحت میں جو وقف فقراء پر کیا گیا ہے اس کا مصرف اولاد کے بعد سب سے بہتر واقف کے رشتہ دار پھر آزاد کردہ غلام پھر پڑوسی پھر شہر کے دوست و احباب ہیں۔

ایک شخص نے اپنی جائداد اپنی اولاد پر اور اس کے بعد فقراء پر وقف کی اور اس کی چند اولادیں ہیں ان میں سے جو مر جائے گا اس کا حصہ باقی پر تقسیم ہو جائے گا جب سب مر جائیں تو فقراء کی ہوگی اور اگر اولاد کے ناموں کی تصریح کر دی گئی ہے تو جو مر جائے گا اس کا حصہ فقراء کو ملے گا باقی اولاد پر تقسیم نہیں ہوگا۔

ایک شخص نے اپنی اولاد پر مکان وقف کیا اور یہ شرط کی کہ یہ ان کی رہائش کے لئے ہے تو وہ کرایہ پر نہیں دیا جا سکتا خواہ اولاد میں ایک ہی شخص ہو اور مکان اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہو۔ یا اس کی اولادیں اتنے افراد ہیں کہ ان سب کی رہائش نہیں ہو سکتی جب بھی کرایہ پر نہیں دے سکتے باہمی رضامندی سے باری باری رہ سکتے ہیں اگر مکان بہت وسیع ہے تو مردوں کی عورتیں اور عورتوں کے شوہر بھی رہ سکتے ہیں اگر اتنے کمرے نہیں ہیں تو صرف وہی لوگ رہ سکتے ہیں جن پر وقف ہے یعنی اولاد ذکور کی بیویاں اور اولاد اناث کے شوہر نہیں رہ سکتے۔

اگر مکان موقوفہ تمام اولاد کے لئے ناکافی ہے کچھ اس میں اور کچھ اس کے علاوہ دوسری جگہ رہتے ہیں تو دوسری جگہ رہنے والے کرایہ کا مطالبہ نہیں کر سکتے اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم رہ چکے اب ہم رہیں گے ہاں وہ ان کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔

اولاد پر مکان وقف ہے ایک نے اس پر قبضہ کر رکھا ہے اور دوسروں کو نہیں آنے دیتا تو اس سے کرایہ لیا جائے گا کیونکہ وہ غاصب ہے۔

قرابت داروں پر وقف کیا یہ وقف صحیح ہے اس میں مرد عورت برابر کے حقدار ہیں کسی کو زیادہ حصہ نہیں دیا جائے گا۔ قرابت داروں میں واقف کی اولاد یا باپ دادا کا شمار نہ ہوگا یعنی وہ حق دار نہ ہوں گے۔

قرابت والوں پر وقف کیا، واقف کے چچا بھی ہیں اور ماموں بھی تو چچاؤں کو ملے گا ماموؤں کو نہیں اگر ایک چچا اور دو ماموں ہیں تو نصف چچا کو اور نصف دو ماموؤں کو بشرطیکہ لفظ قرابت والوں (جمع) استعمال کیا گیا ہو اگر قرابت والا (واحد) استعمال کیا گیا ہے تو صرف چچا حق دار ہے ماموں نہیں۔

اگر محتاج و فقیر قرابت داروں پر وقف کیا ہے تو انھیں کو حصہ دیا جاتے گا جو واقعی محتاج ہیں۔

مکان اس شرط پر وقف کیا کہ جب تک میری بیوہ نکاح نہ کرے اس میں رہ سکتی ہے واقف کے مرنے کے بعد اس نے دوسرا نکاح کر لیا تو وہ اس مکان میں رہنے کی حقدار نہیں، اگر پھر بیوہ ہو جائے تب بھی اس کو حق سکونت نہ ملے گا۔

محلہ کے محتاجوں اور دیگر مسلم فقراء پر وقف کیا گیا تو اس محلہ کے ہر ایک اس مسکین کو جو وقف کرتے وقت موجود تھے ایک ایک حصہ دیا جائے گا اور دوسرے مسکینوں کا ایک حصہ محلہ کا کوئی مسکین مر جائے تو اس کا حصہ دیگر مساکین پر تقسیم کیا جاتے گا اور یہ اسی وقت تک ہے جب تک وہ زندہ ہیں ان کے مرنے کے بعد محلہ غیر محلہ کے مساکین میں امتیاز نہ رکھا جاتے گا سب کو برابر حصہ دیا جاتے گا۔

پڑوس کے فقراء پر وقف کیا گیا تو وہ پڑوسی کہلائیں گے جو اس محلہ کی مسجد میں نماز ادا کرتے ہیں خواہ ان کا مکان واقف کے مکان سے متصل نہ ہو۔ جو اشخاص وقف کے وقت محلہ میں آباد تھے وہ اپنے مکان فروخت کر کے دوسری جگہ آباد ہو گئے تو وہ پڑوسی نہ کہلائیں گے بلکہ پڑوسی وہ ہوں گے جو یہاں آکر آباد ہو گئے ہیں ان میں جو مساکین ہوں ان کو حصہ دیا جاتے گا۔

پڑوسیوں پر وقف کیا اور خود واقف دوسرے شہر میں آباد ہو گیا اگر اس نے یہاں مکان بنا لیا ہے تو یہاں کے لوگ پڑوسی ہیں اور مستحق ہیں اگر مکان نہیں بنایا تو اسی جگہ کے لوگ مستحق ہوں گے۔

سادات کے لئے وقف کیا ایک سید صاحب یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے اگر انھوں نے اپنا مکان فروخت نہیں کیا ہے تو وظیفہ کے مستحق ہیں ورنہ نہیں۔

جن لوگوں پر وقف کیا انھوں نے انکار کر دیا تو وقف صحیح ہے اس کی آمدنی فقراء پر

تقسیم کی جائے گی۔ اگر بعض نے انکار کیا اور بعض نے اقرار اور واقف نے موقوف علیہ کو جس لفظ
سے ذکر کیا ہے اگر وہ لفظ باقی اشخاص کے لئے مستعمل ہوتا ہو تو کل آمدنی اقرار کرنے والوں پر
تقسیم کی جائے گی اگر مستعمل نہ ہوتا ہو تو انکار کرنے والوں کا حصہ فقراء کو دیا جائے گا مثلاً
کہا کہ فلاں کی اولاد پر وقف کیا اور اس کی اولاد میں سے کچھ نے انکار کر دیا ہے تو کل آمدنی
اقرار کرنے والے باقی اشخاص پر تقسیم کر دی جائے گی اور اگر زید و عمر پر وقف کیا اور زید نے
انکار کر دیا تو زید کے حصے کی آمدنی فقراء پر تقسیم کی جائے گی۔ اور کسی شخص کی اولاد پر وقف کیا
تھا لیکن سب نے انکار کر دیا اور آمدنی فقراء کو دے دی گئی دوسری آمدنی پر وہ راضی ہو جاتے
ہیں تو ان کو یہ آمدنی نہیں دی جائے گی ہاں اگر اس شخص کے کوئی اور لڑکا پیدا ہوا اور اس
نے اقرار کر لیا تو کل آمدنی کا وہی حقدار ہوگا۔

ایک شخص نے دوسرے شخص پر اپنی جائداد طبقاً بعد نسل وقف کی اس شخص نے کہا دیں
اپنے لئے قبول کرتا ہوں اور نہ اپنی نسل کے لئے تو اس کا انکار اپنے حق میں صحیح ہے نسل کے
حق میں درست نہیں۔

موقوف علیہ نے پہلے رد کر دیا پھر قبول کر لیا تو اس کو وقف واپس نہیں ملے گا اور جب ایک
سال قبول کر لیا تو پھر آگے چل کر انکار نہیں کر سکتا۔ اگر یہ کہا کہ ایک سال کا قبول نہیں کیا تو اس سال
کی آمدنی فقراء پر تقسیم کی جائے گی پھر اس کو ملے گی۔

واقف خود ہی متولی ہے وقف کی آمدنی اپنے قرابت داروں کو اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتا
ہے کسی کو کم اور کسی کو زیادہ، اس کی وفات ہو جاتی ہے اس نے دوسرے شخص کو متولی بنایا اور
یہ بیان نہیں کیا کہ وہ کس کو زیادہ دیتا تھا تو متولی ہر شخص کو برابر حصہ دے گا اور بقیہ زیادہ رقم
فقراء پر صرف کرے گا۔

وقف اور اجارہ

وقف جائداد کو اجارہ پر دینے کے لئے نہایت احتیاط اور دیانت داری کی ضرورت ہے

واقف یا متولی یا قاضی نے وقف آراضی یا مکان اجارہ پر دیا اور مدت اجارہ پوری
ہونے سے پہلے مر گیا یا معزول کر دیا گیا تو اجارہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا وہ بدستور باقی رہے گا۔

متولی نے نفع اراضی برائے کاشت چند سال کے لئے اجارہ پر دی اور مر گیا اس
کے بعد اجارہ دار کی بھی موت واقع ہو گئی اور اس کے وارثوں نے کاشت کر لی تو ان سے
نہ غلہ لیا جائے گا اور نہ لگان کیونکہ اجارہ دار کے مرنے کے باعث اجارہ فسخ ہو گیا ہے
اس کے وارثوں سے اس نقصان کا تاوان لیا جائے گا اور اس رقم کو مستحقین کو دینے
کی بجائے مصالح وقف پر صرف کیا جائے گا۔

وقف مکان کے کرایہ دار سے کرایہ کی رقم پیشگی وصول کر کے مستحقین کو دے دی گئی ابھی
مدت اجارہ باقی تھی کہ مستحقین میں سے کسی ایک کا انتقال ہو گیا تو اس تقسیم کو جائز قرار دیا
جائے گا۔ ایک زمین فقراء پر وقف ہے اس کا روپیہ کاشتکار نے کھا لیا متولی نے اس کاشتکار
سے کچھ کم پر مصالحت کر لی اگر کاشتکار غریب ہے تو یہ صلح جائز ہے ورنہ نہیں۔ اگر مخصوص
لوگوں پر وقف ہے تو چاہے کاشتکار غریب ہو یا دولتمند کم پر مصالحت جائز نہیں ہے۔
غرباء پر وقف مکان ایک غریب کو کم کرایہ پر دیا جا سکتا ہے اگر فقراء پر وقف نہیں ہے تو کم
کرایہ پر نہیں دیا جا سکتا۔

وقف جائداد کو اجر مثل (یعنی اس حیثیت کے مکان یا کھیت کا جو کرایہ اس جگہ پر
ہو) پر دیا جانا چاہئے اس سے کم پر دینا جائز نہیں مستحق بھی اس سے کم کرایہ پر نہیں لے
سکتا۔

وقف کی دوکان مناسب کرایہ پر اٹھائی گئی۔ دوسرا شخص اس سے زیادہ کرایہ
دینے کو تیار ہے تب بھی پہلے اجارہ کو توڑا نہیں جا سکتا۔

وقف کی زمین تین سال کے لئے اجارہ پر دی گئی ایک سال گذرنے کے بعد
کرایہ کا نرخ کم ہو گیا یا بہت سے لوگ اس کو لینے کے لئے خواہشمند ہو گئے اور کرایہ کا نرخ
بڑھ گیا تو دونوں صورتوں میں اجارہ فسخ نہیں کیا جا سکتا۔

اگر متولی نے وقف جائداد اجر مثل سے کم کرایہ پر دیدی ہے تو لینے والے کو اجر مثل
کے مطابق ہی کرایہ دینا ہوگا۔

ایک شخص کم کرایہ دیتا ہے اور دوسرا زیادہ لیکن زیادہ دینے والا نادہندہ ہے تو کم
کرایہ والے کو دینا چاہئے۔

متولی خود موقوفہ جائداد کو ٹھیکہ پر نہیں لے سکتا اور نہ اپنے بیٹے یا باپ دادا کو دے
سکتا ہے اگر قاضی اس کو دیدے یا وہ اجر مثل سے زیادہ کرایہ ادا کرے تو لے سکتا ہے
وقف زمین کسی نے کرایہ پر لے کر عمارت تعمیر کرائی، زمین کا کرایہ بڑھ گیا ہے۔ اگر کرایہ
دار زیادہ کرایہ دینے کو تیار ہے تو زمین اس کے پاس رہنے دی ورنہ اس سے کہا جائے
کہ وہ اپنا عملہ اٹھالے اور زمین خالی کر دے۔

موقوفہ مکان کو عاریتہً دینا یا بغیر کرایہ دینا جائز نہیں۔

وقف جائداد کو طویل مدت کے لئے کرایہ پر دینا جائز نہیں۔ مدت اجارہ تین سال
سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے۔

اگر واقف نے وقف نامہ میں کرایہ کی مدت معین کر دی ہے تو اس کی پابندی
کی جائے ورنہ مکان ایک سال کے لئے اور زمین تین سال کے لئے کرایہ پر اٹھانا چاہئے اگر
مصلحت اس اصول کی مقتضی نہ ہو تو اس امر میں وقت اور مصلحت کے تقاضوں کو پورا
کیا جائے۔

واقف نے ایک سال سے زیادہ کرایہ پر نہ دینے کی شرط عاید کی لیکن اس مدت
کے لئے کوئی شخص کرایہ پر لینے کو تیار نہیں تو متولی قاضی کی اجازت سے (واقف کی شرط کے
خلاف) زیادہ عرصہ کے لئے کرایہ پر دے سکتا ہے۔ اگر فائدہ کی صورت ہے تو قاضی کی
اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں۔

موقوفہ مکان میں تین سال کے لئے کرایہ پر دیا گیا تین آدمی اس کی آمدنی کے
مستحق ہیں۔ ایک سال گذرا تھا کہ ان میں سے ایک حقدار کی موت واقع ہو گئی۔ دوسرا
سال گذرنے پر دوسرا حقدار مر گیا تو پہلے سال کی آمدنی پہلے حقدار کے وارثوں اور دوسرے
و تیسرے شخص میں اور دوسرے سال کی آمدنی دوسرے حقدار کے وارثوں اور تیسرے
شخص میں مساوی تقسیم کی جائے گی اور تیسرے سال کی آمدنی صرف تیسرے آدمی کو ملے
موقوفہ مکان کو متولی نے فروخت کر دیا اور معزول ہو گیا دوسرے متولی نے خریدار

دعویٰ کر دیا اور بیع عدالت سے باطل قرار دے دی گئی تو خریدار کو اس مدت کا کرایہ ادا کرنا ہوگا۔

روپے کی بجائے اشیاء سے اجارہ کرنا بھی جائز ہے کیوں کہ اس کو فروخت کر کے اس کی رقم وقف کے مصرف میں لائی جا سکتی ہے۔

وقف کی جانب سے وقف آراضی کو متولی بھی کاشت کر سکتا ہے اس صورت میں مزدوروں کی اجرت وقف کی آمدنی سے دی جائے گی۔

وقف کا مکان کرایہ دار کو اس شرط پر دینا کہ وہ اس کی شکست و ریخت کا ذمہ دار ہے ناجائز ہے البتہ مرمت کے لیئے رقم مقرر کی جا سکتی ہے۔

ایک مکان ایک شخص پر وقف ہے اور وہ شخص اس کا متولی نہیں ہے تو وہ خود اس مکان کو کرایہ پر نہیں اٹھا سکتا۔

وقف جائداد واقف یا متولی نے کم کرایہ پر دیدی ہے اگر اس سے سہواً ایسا ہوا ہے تو درگذر کیا جائے گا اور قصداً کیا ہے تو متولی کو معزول اور واقف سے وقف جائداد کا انتظام لے لیا جائے گا اور کرایہ کی کمی کرایہ دار سے پوری کی جائے گی۔

وقف زمین اگر عشری ہے تو عشر کاشتکار سے اور خراجی ہے تو خراج وقف سے ادا کیا جائے گا۔

وقف جائداد پر خرچ کرنے کی ضرورت ہے لیکن وقف کا روپیہ نہیں ہے تو متولی قاضی کی اجازت سے قرض لے سکتا ہے نہ کہ خود۔ خراج کی رقم ادا کرنے کے لئے یا کاشت کے لئے بیج وغیرہ کی خریداری کے لئے روپیہ درکار ہے اور وقف کا روپیہ موجود نہیں ہے تب بھی قاضی کی اجازت سے قرض لیا جائے گا۔ اگر متولی نے خراج کے لیئے رقم محفوظ نہ کر کے مستحقین پر تقسیم کر دی ہے تو اس کو خراج کی رقم کے بقدر تاوان ادا کرنا ہوگا۔

ایک مکان فقراء پر وقف ہے ایک فقیر نے اس کو کرایہ پر لیا تو اس کے حصہ کی رقم اس کرایہ میں سے کم کر دینا جائز ہے۔

وقف کے مکان سے ملا ہوا دوسرے شخص کا مکان ہے اور درمیان کی دیوار اسی شخص کی ہے جو گر گئی ہے وہ دیوار بنانا ہے لیکن موقوفہ مکان کی حد میں۔ ایسی شکل میں متولی کا فرض ہے کہ وہ اس دیوار کو گر وا دے وہ قیمت دے کر اس دیوار کو وقف نہیں کر سکتا اگر کرتا ہے تو ناجائز ہے۔

وقف کی زمین میں درخت تھے جو فروخت کر دیئے گئے ابھی یہ درخت کاٹے نہیں گئے تھے کہ یہ زمین اسی خریدار کو ٹھیکہ پر دے دی گئی۔ اگر جڑ سمیت بیچے گئے ہیں تو ٹھیکہ جائز ہے اور اگر صرف اوپر اوپر سے بیچے گئے ہیں تو جائز نہیں۔

موقوفہ گاؤں کے کاشتکار بٹائی پر کاشت کرتے ہیں قاضی کی طرف سے حاکم آیا اور اس نے کسی کو لگان پر کھیت دیدیا فصل تیار ہونے پر متولی آیا اور اس نے حسب دستور بٹائی کرانی چاہی وہ لگان کے روپے نہیں لینا چاہتا تو جو متولی چاہتا ہے وہی ہوگا۔

کسی شخص نے وقف کی زمین غصب کر کے اس کو جوت کر درست کیا نہر یا کنواں کھودوا یا کھاد ڈلوائی تو غاصب سے زمین واپس کرنے پر اس کو کچھ بھی معاوضہ نہیں دیا جائے گا۔ اگر اس نے اس زمین پر مکان بنایا ہے یا درخت لگوائے ہیں اور ان کو دور کرنے میں زمین کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو مکان یا درخت علیحدہ کرا دیئے جائیں گے ورنہ ملبہ یا درختوں کی قیمت غاصب کو ادا کر دی جائے گی۔

وقف سے متعلق دعویٰ اور شہادت

کوئی شخص زمین یا مکان فروخت کرنے کے بعد یہ کہتا ہے کہ میں نے اس کو وقف کر دیا تھا اور اپنے دعویٰ کو صحیح ثابت کرنے کے لیئے گواہ پیش نہیں کرتا نیز مدعا علیہ سے حلف لینا چاہتا ہے تو اس کا دعویٰ تسلیم نہیں کیا جائے گا اور مدعا علیہ سے حلف نہیں لیا جائے گا۔ اگر وہ گواہوں کے ذریعہ وقف ثابت کر دے تو گواہی کو تسلیم کر کے اس کی بنیاد پر بیع کو باطل قرار دیا جائے گا اور خریدار سے اتنے عرصہ کا (جتنے دنوں تک اس کا قبضہ رہا ہے) کرایہ لیا جائے گا اور خریدار زر خرید وصول کرنے کے لئے اس جائداد کو اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکتا۔

وقف کے متعلق دعویٰ کے بغیر بھی شہادت قبول کر لی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ مدعی کے متناقض بیانات کے باوجود وقف میں شہادت تسلیم کر لی جاتی ہے کہ تناقض سے دعویٰ جاتا رہا اور شہادت بغیر دعویٰ ہوتی۔

اگرچہ اصل وقف میں دعویٰ کے بغیر بھی شہادت قبول ہو جاتی ہے لیکن کسی شخص کا کسی وقف سے متعلق حق ثابت کرنے کے لئے دعویٰ شرط ہے بغیر دعویٰ کے اس ضمن میں گواہی کوئی معنی نہیں رکھتی مثلاً کوئی شخص کسی وقف کی آمدنی کا حق دار ہے اور گواہوں سے اس کا حق دار ہونا ثابت ہو گیا ہے تو جب تک وہ دعویٰ نہ کرے گا اس کا حق فقراء پر تقسیم ہوتا رہے گا اور اس کو کچھ نہیں دیا جائے گا۔

کسی شخص نے کسی زمین کے متعلق کہا کہ یہ زمین فلاں شخص پر وقف ہے اور اب کہتا ہے کہ میرے اوپر وقف ہے چونکہ اس کے کلام میں تناقض ہے اس لئے اس کا دعویٰ قابل سماعت نہیں ہے۔

کسی شخص نے کسی جائداد کے متعلق یہ دعویٰ کیا کہ یہ وقف جائداد ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کیا کہ میں اس کی آمدنی کا حقدار ہوں تو اس کے یہ دعوے اس وقت تک قابل سماعت نہ ہوں گے جب تک وہ یہ دعویٰ نہ کرے کہ میں اس کا متولی ہوں۔ دعویٰ کی سماعت نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ فقط اس کے دعویٰ کی بنیاد پر قابض سے حلف نہیں لیا جائے گا اگر گواہ شہادت دیں تو انکی شہادت قابل قبول ہوگی۔

خریدار نے بیچنے والے پر دعویٰ کیا کہ جو جائداد تو نے میرے ہاتھ فروخت کی ہے وہ وقف جائداد ہے جس کے بیچنے کا تجھے اختیار نہ تھا۔ یہ دعویٰ قابل سماعت نہیں ہے کیونکہ یہ دعویٰ متولی کی جانب سے ہونا چاہیئے اگر متولی نہیں ہے تو قاضی مقدمہ کی پیروی کے لئے کسی کو متولی مقرر کرے۔ اگر وقف جائداد ثابت ہو گئی تو بیع باطل ہو جائے گی اور خریدار کو رقم واپس کر دی جائے گی۔

گواہ نے وقف کے ثبوت کے لئے گواہی دی تو اس کو یہ بیان کرنا ضروری نہیں کہ یہ جائداد کس نے وقف کی تھی اگر وہ اس سے لاعلمی بھی ظاہر کرے تب بھی اس کی شہادت معتبر ہو سکتی ہے۔

وقف میں شہادت علی الشہادۃ معتبر ہے۔ وقف ہونا مشہور ہے خواہ گواہ کے سامنے واقف نے وقف نہیں کیا وہ محض شہرت کی بنا پر گواہی دے رہا ہے اور قاضی کے سامنے

ـس امر کی وضاحت بھی کر رہا ہے کہ میری شہادت سماعی ہے جب بھی اس کی گواہی لائق اعتبار ہے

ایک شخص نے دوسرے شخص پر یہ دعویٰ کیا کہ اس کے قبضہ میں جو جائداد ہے وہ مجھ پر وقف ہے
ـکے قبضہ میں یہ جائداد ہے وہ اس کو اپنی ملکیت بتاتا ہے ۔ گواہوں کا بیان ہے کہ واقف
ـاس کو وقف کیا ہے نیز وقف کرتے وقت یہ جائداد اس کے قبضہ میں تھی ۔ گواہوں کا اس قدر
ـن وقف ثابت کرنے کے لئے ناکافی ہے جب تک وہ یہ بیان نہ دیں کہ واقف اس جائداد
ـالک بھی تھا ان کی شہادت بے معنی ہے ۔

ایک شخص نے گواہی دی کہ یہ جائداد مجھ پر یا میری اولاد پر یا میرے باپ دادا پر یا مجھ
اور فلاں شخص پر وقف ہے تو اس کی گواہی لائق اعتبار نہیں ۔ اگر دو گواہوں میں سے ایک کی
ـاہی یہ ہے کہ یہ جائداد زید پر وقف ہے اور دوسرا گواہی دیتا ہے کہ عمر پر وقف ہے ۔ چونکہ
ـس وقف کے متعلق دونوں گواہ متفق ہیں اس لئے اس جائداد کا وقف ہونا ثابت ہو گیا ۔
ـن موقوف علیہ کے بارے میں چونکہ اختلاف ہے اس لئے اس جائداد کی آمدنی زید و عمر کو
ـدے کر فقراء پر صرف کی جائے گی ۔

اگر ایک گواہ کہتا ہے کہ یہ کل زمین وقف ہے اور دوسرا نصف زمین وقف بتاتا ہے
شہادت کے اعتبار سے آدھی زمین ہی کا وقف ہونا ثابت ہوگا ۔

دو آدمیوں نے گواہی دی کہ فلاں جائداد پڑوس کے فقراء پر وقف ہے اور یہ دونوں
ـاہ انھیں فقراء میں سے ہیں یا یہ گواہی دی کہ فلاں مسجد کے محتاجوں پر وقف ہے اور یہ
ـاہ انھیں محتاجوں میں سے ہیں یا اہل مدرسہ نے مدرسہ کے وقف کے لئے گواہی دی یا
ـلی اور ایک دوسرے شخص نے گواہی دی کہ یہ جائداد فلاں مسجد پر وقف ہے تو ایسی تمام صورتوں
ـتعلقین کی گواہی لائق اعتبار ہوگی ۔

ایک شخص کے قبضہ میں ایک جائداد ہے جس پر کسی نے وقف ہونے کا دعویٰ کیا اور ثبوت
ـں ایک دستاویز بھی پیش کی جس پر گذشتہ قاضیوں کی تحریریں موجود ہیں یا جائداد مذکورہ کے
ـدوازہ پر وقف کا کتبہ کندہ ہے تب بھی محض دستاویز یا کتبہ کی بنا پر بغیر شہادت کے قاضی
ـقف کا حکم نہیں دے سکتا اگر قاضی کے دفتر میں اس دستاویز کی نقل گذشتہ قاضیوں کے دستخطوں
ـکے ساتھ موجود ہے تو عذر قابل قبول ہوگی ۔

گواہوں میں اختلاف ہے ایک کہتا ہے کہ مرنے کے بعد کے لئے وقف کیا دوسرا کہتا
ـہے وقف صحیح تمام ہے تو یہ گواہی رد کر دی جائے گی ۔ اگر ایک نے کہا صحت میں وقف کیا ہے
ـاور دوسرے نے کہا مرض الموت میں وقف کیا ہے ۔ چونکہ یہ اختلاف ثبوت وقف کے منافی
ـنہیں ہے اس لئے شہادت قابل قبول ہے ۔

ایک مکان ایک شخص کے قبضہ میں ہے ۔ دوسرے شخص نے گواہوں سے ثابت کیا
ـکہ یہ مکان اس پر وقف ہے اور مسجد کے متولی نے بھی گواہوں کے ذریعہ ثابت کیا کہ یہ مکان مسجد
ـپر وقف ہے اگر دونوں نے وقف کی تاریخوں کا بھی تذکرہ کیا ہے تو جس کی تاریخ قدیم ہوگی
ـفیصلہ اسکے حق میں کیا جائے گا ورنہ اس مکان کو دونوں پر مساوی تقسیم کر دیا جائے گا ۔

کسی جائداد کا وقف ہونا مشہور ہے لیکن اس کا مصرف معلوم نہیں تو یہ جائداد شہرت کی
بناء پر وقف قرار دی جائے گی اور اس کی آمدنی فقراء پر خرچ کی جائے گی ۔

ایک پرانا وقف ہے جس کے مصارف و شرائط کا علم نہیں تو اس میں بھی سماعی شہادت معتبر
ہوگی اگر زمانہ گذشتہ کا عمل درآمد معلوم ہو سکے یا سرکاری دفاتر سے شرائط و مصارف کا پتہ چل سکے
تو اسی کے مطابق عمل کیا جائے گا ۔

گواہوں نے یہ گواہی دی کہ فلاں شخص نے اپنی زمین وقف کی ہے اور اس کے حدود
کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن "ہم اس زمین کو پہچانتے ہیں" تو ان کی یہ گواہی اس لئے قابل قبول نہیں ہے کہ
ہو سکتا ہے کہ اس شخص کی اس زمین کے علاوہ کوئی اور زمین ہو جس کو اس نے وقف کیا ہے ۔
اگر گواہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے علم میں ہے کہ اس کی اس زمین کے علاوہ اور کوئی زمین نہیں ہے
تب بھی ان کی گواہی قابل قبول نہ ہوگی لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ واقف نے مطلق زمین
وقف کرنا، ذکر کیا ہو اور اگر ایسے الفاظ سے ذکر کیا ہے کہ گواہوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ فلاں زمین ہے
جس کے حدود یہ ہیں اور وہ قاضی کے سامنے حدود بھی بیان کریں تو شہادت مقبول ہوگی ۔

گواہوں نے بتایا کہ فلاں شخص نے اپنی فلاں زمین وقف کی ہے جس کے حدود یہ ہیں لیکن
ہم نہیں جانتے کہ وہ زمین کہاں ہے تو ان کی گواہی مانی جائے گی اور وقف ثابت ہو جائے گا ۔
لیکن مدعی کو گواہوں کے ذریعہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ زمین یہ ہے ۔

گواہ کہتے ہیں کہ وقف نے حدود بیان کر دیئے تھے لیکن ہمیں یاد نہیں رہے یا انھوں نے
دو حدیں بیان کر دیں اور دو نہ بتا سکے تو انکی شہادت نہیں مانی جائے گی اگر وہ تین حدیں بیان
کر دیں تو انکی گواہی مقبول ہوگی ۔

دو بھائی ہیں ایک کے پاس باپ کی تمام جائداد ہے اور دوسرے کے پاس کچھ نہیں ۔
جس کے قبضہ میں جائداد ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جائداد میرے اوپر وقف ہے اور دوسرا کہتا
ہے کہ باپ نے ہم دونوں پر وقف کی ہے ۔ گواہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے پاس بھی
نہیں ہیں تو دوسرے بھائی کا قول معتبر ہے جو یہ کہتا ہے کہ جائداد دونوں بھائیوں پر وقف ہے ۔

چند بھائیوں کے قبضہ میں ایک جائداد ہے جس کے متعلق وہ بالاتفاق کہتے ہیں کہ یہ
جائداد ہمارے والد نے وقف کی ہے لیکن ان میں سے ہر ایک اس کا مصرف الگ الگ بتاتا ہے
اس صورت میں قاضی کو یہ فیصلہ دینا ہوگا کہ "یہ جائداد وقف ہے جس بھائی نے جو مصرف بتایا ہے
اس کا حصہ اسی مصرف پر صرف ہوگا" ان بھائیوں میں سے کوئی نابالغ یا غیر حاضر ہے تو اس کے حصہ کا
فیصلہ جب تک وہ بالغ یا حاضر نہ ہو جائے نہیں کیا جائے گا ۔

ایک مکان پر ایک شخص کا قبضہ ہے ۔ اس پر کسی شخص نے دعویٰ کیا کہ یہ مکان معہ زمین میرا
ہے اور قابض کا قول ہے کہ یہ مکان فلاں مسجد پر وقف ہے لیکن مدعی گواہوں کے ذریعہ اس
کو اپنی ملکیت ثابت کرا دیتا ہے جس کی بنیاد پر قاضی فیصلہ دے کر اس کی ملکیت اپنے یہاں
رجسٹر میں درج کرا لیتا ہے ۔ کچھ عرصہ کے بعد مدعی اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ عمارت میری ہے اور زمین وقف
کی تو دعویٰ، قاضی کا فیصلہ اور اس کے یہاں کا یہ اندراج باطل قرار دیا جائے گا اور مکان معہ
زمین کے وقف قرار دیا جائے گا ۔

دو آدمیوں کے پاس دو جائدادیں ہیں ان میں سے ایک شخص موجود ہے اور دوسرا
موجود نہیں ہے ۔ جو شخص موجود ہے اس پر کسی نے دعویٰ کیا کہ یہ دونوں جائدادیں میرے دادا نے
اپنی اولاد پر نسلاً بعد نسل وقف کی ہیں اور وہ اپنے دعویٰ کو گواہوں سے صحیح ثابت کر دیتا ہے کہ
یہ دونوں جائدادیں ایک ساتھ وقف کی گئی ہیں اور دونوں کا مصرف ایک ہی ہے تو قاضی دونوں
جائدادوں کے وقف ہونے کا فیصلہ دے گا ۔ اگر گواہ ان کو دو وقف بتاتے ہیں تو جو شخص حاضر نہیں ہے

اس کے قبضہ والی جائداد کا فیصلہ اس کے آنے پر کیا جائے گا۔

مسجد سے متصل ایک دو منزلہ مکان ہے جس کی نچلی منزل میں گاہ بگاہ صف بندی کی جاتی ہے اہل محلہ اس کو مسجد کا مکان بتاتے ہیں اور مکین اس کو میراث کہتے ہیں تو انھیں کی بات لائق اعتبار ہے۔

ایک شخص کسی جائداد پر قابض ہے جس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ اس کو فلاں شخص نے فلاں مقصد کے لئے وقف کیا ہے لیکن واقف کے ورثاء کا قول ہے کہ یہ جائداد نسلاً بعد نسل وقف کی گئی ہے ہماری نسل ختم ہونے کے بعد یہ فقراء کی ہے۔ قاضی کے دفتر میں اس وقف سے متعلق ابھی کوئی تحریر موجود نہیں ہے جس سے اس وقف کے مصارف کا پتہ چل سکے تو وارثوں کا قول معتبر ہوگا۔

ایک شخص ایک جائداد پر قابض ہے۔ دوسرا شخص اس پر دعویٰ کرتا ہے کہ یہ جائداد میں نے مساکین پر وقف کی ہے۔ مدعا علیہ انکار کرتا ہے اور مدعی اقرار کے گواہ پیش کرتا ہے ان گواہوں کی گواہی مقبول ہے وقف ثابت ہو گیا لہٰذا قابض سے جائداد نکال لی جائے گی۔

ایک شخص نے اپنی زمین کو مسجد یا قبرستان یا مسافر خانہ بنایا، دوسرے شخص نے اس پر دعویٰ کیا کہ یہ زمین میری ہے۔ واقف موجود نہیں ہے بعض اہل مسجد کے مقابل میں فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ تو یہ فیصلہ سب کے مقابل متصور ہوگا۔ البتہ مسافر خانہ کا فیصلہ بانی یا اس کے نائب کی عدم موجودگی میں نہیں کیا جا سکتا۔

اگر اصل وقف ثابت ہو جائے تو وقف کا ایک مستحق دعویٰ میں تمام مستحقین کا قائم مقام ہو سکتا ہے جو فیصلہ اس کے مقابل ہوگا وہی سب پر نافذ کیا جائے گا۔

گواہوں نے شہادت دی کہ اس جائداد میں فلاں شخص کا جس قدر حصہ تھا یا اس کو جتنا ترکہ میں ملا تھا اس نے سب کا سب وقف کر دیا ہے لیکن ہم کو یہ معلوم نہیں کہ وہ کس قدر ہے گواہی مقبول ہے۔ اگر گواہوں نے واقف کے سامنے یہ بیان دیا ہے تو قاضی اس کو مجبور کرے گا کہ وہ جائداد موقوفہ کو بیان کرے۔ واقف جس قدر جائداد بتائے گا اسی قدر وقف متصور ہوگی۔

اہل مسجد یا اہل محلہ کی تلاوت کے لئے مسجد پر ”قرآن مجید“ وقف کیا گیا۔ اہل مسجد اس وقف کی گواہی دیتے ہیں تو انکی گواہی مقبول ہے۔

وقف نامہ اور دستاویزات

زمین وقف کی، وقف نامہ تحریر کیا اس پر گواہیاں کرائیں لیکن وقف نامہ میں حدود لکھنے میں غلطی ہو گئی۔ دو حدیں ٹھیک ہیں اور دو غلط جس پر غلطی ہوتی ہے اگر وہاں مذکورہ حدیں موجود ہیں لیکن اس زمین اور ان حدوں کے درمیان دوسرے شخص کی جائداد واقع ہے تب بھی وقف جائز ہے جس قدر زمین ہے اسی قدر وقف ہوگی۔ اگر اس طرف نزدیک و دور تک مذکورہ چیزوں کا وجود ہی نہیں ہے جن کا حدود میں ذکر کیا گیا ہے تو وقف صحیح نہیں۔ اگر جائداد اس قدر زیادہ مشہور ہے کہ اس کی حدیں بیان کرنا ضروری نہ ہوں تب ہی وقف درست ہے۔

جائداد وقف کی، وقف نامہ تحریر کرایا اور اس پر گواہیاں کرائیں لیکن واقف کہتا ہے کہ میں نے یہ جائداد اس شرط پر وقف کی تھی کہ مجھے اس کے فروخت کرنے کا بھی حق ہوگا۔ کاتب نے اس شرط کو تحریر نہیں کیا ہوگا اور مجھے نہیں معلوم کہ وقف نامہ میں کیا لکھا گیا ہے۔ اگر واقف وقف نامہ کی زبان جانتا ہے اور اس کو یہ وقف نامہ پڑھ کر سنایا گیا ہے اور اس نے تمام مضمون کا اقرار کیا ہے تو وقف صحیح ہے اور اس کا قول باطل ہے۔ اگر وہ وقف نامہ کی زبان سے ناواقف ہے اور گواہوں سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ اس کو وقف نامہ کا ترجمہ سنایا گیا ہے اور اس نے تمام مضمون کا اقرار کیا ہے تو واقف کا قول معتبر ہے اور وقف باطل ہے۔ اگر گواہ یہ ثابت کر دیں کہ اس کو ترجمہ سنایا گیا ہے اور اس نے تمام مضمون کا اقرار کر کے ہمیں گواہ بنایا ہے تو وقف صحیح ہے اور واقف جھوٹا ہے۔

ایک شخص ایک موضع کی زمین کے مختلف ٹکڑوں کا مالک ہے وہ ان سب ٹکڑوں کو وقف کرتا ہے اور کاتب سے بحالت مرض وقف نامہ تحریر کراتا ہے۔ کاتب چند ٹکڑوں کا اندراج بھول گیا لیکن اس نے وقف نامہ کا تمام مضمون مع ان ٹکڑوں کی تفصیل کے جن کا اندراج اس نے وقف نامہ میں کیا ہے واقف کو سنا دیتا ہے اور واقف چھوٹے ہوئے ٹکڑوں پر دھیان نہ دیتے ہوئے جملہ مضمون کا اقرار کر لیتا ہے تو ایسی شکل میں اگر واقف بحالت صحت پہلے کہہ چکا ہے کہ جو کچھ موضع میں میرا حصہ ہے میرا سب کو وقف کرنے کا ارادہ ہے تو تمام ٹکڑے وقف متصور ہونگے ورنہ نہیں۔

محلہ والوں نے ایک عورت سے کہا کہ تو اپنا مکان مسجد پر اس شرط کے ساتھ وقف کر دے کہ جب تجھے ضرورت ہو فروخت کر سکے عورت نے منظور کر لیا اور وقف نامہ تحریر کرا دیا لیکن اس میں یہ شرط نہیں لکھی۔ اگر اس کو وقف نامہ پڑھ کر سنایا گیا ہے اور وہ اس کی زبان بخوبی سمجھتی ہے اور اس نے سمجھ کر ہی اس کا اقرار کیا ہے تو وقف درست ہے ورنہ نہیں۔

تولیت نامہ یا وصیت نامہ میں اگر یہ تحریر نہیں کیا گیا ہے کہ متولی یا وصی کس کی جانب سے مقرر کیا گیا ہے تو یہ دستاویز ناکارہ ہے کیونکہ قاضی اور واقف کے مقرر کردہ متولی کے احکام الگ الگ ہوتے ہیں اور انھیں احکام پر متولی کا دائرہ کار منحصر ہوتا ہے لہٰذا یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ متولی کو کس نے مقرر کیا ہے۔ اگر قاضی نے مقرر کیا ہے تو قاضی کا نام تحریر کرنا ضروری نہیں واقف کا نام ضروری ہے۔

اشخاص معلومین پر ایک جائداد وقف ہے اس کے متولی نے یہ جائداد کسی کو کرایہ پر دی کرایہ نامہ میں کرایہ دار اور متولی کا نام تحریر کیا گیا لیکن واقف کا نہیں جب بھی کرایہ نامہ صحیح سمجھا جائے گا۔

اقرار وقف

ایک جائداد ایک شخص کے قبضہ میں ہے اس نے اس جائداد کے وقف ہونے کا اقرار کیا لیکن واقف اور مستحقین کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے اقرار پر یہ جائداد وقف قرار دی جائے گی اور اس کی آمدنی فقراء پر صرف کی جائے گی اور اس جائداد کا واقف نہ کو قرار دیں گے نہ کسی اور کو اگر گواہوں نے ثابت کر دیا کہ اقرار سے پہلے یہ جائداد اسی شخص کی تھی تو یہی شخص واقف اور متولی قرار پائے گا اور اس وقف کی آمدنی فقراء پر صرف کرے گا لیکن اس کو اپنے بعد دوسرے شخص کو متولی مقرر کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔

وقف کا اقرار کیا اور واقف کا نام بھی بتایا لیکن مستحقین کا ذکر نہیں کیا مثلاً اس نے یہ کہا کہ یہ جائداد میرے باپ نے وقف کی ہے، اس کا باپ مر چکا ہے اگر اس کا باپ مقروض ہے تو اس

شخص کا اقرار صحیح نہیں ہے جائداد دین میں بیع کر دی جائے گی۔ مگر اس کے باپ نے کوئی وصیت کی ہے تو تہائی میں وصیت نافذ ہوگی اس کے بعد جو کچھ بچے وہ وقف ہے اور اس کی آمدنی فقراء پر صرف کی جائے گی لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ اس شخص کے علاوہ اور کوئی وارث نہ ہو اگر دوسرا وارث بھی ہے اور وہ وقف سے انکار کرتا ہے تو وہ اپنا حصہ لے گا۔

ایک شخص ایک زمین پر قابض ہے جس کے بارے میں وہ یہ کہتا ہے کہ اس زمین کو فلاں شخص نے وقف کیا ہے۔ اگر وہ مشہور شخص ہے اور زندہ ہے تو اس سے دریافت کیا جائے گا اگر وہ اقرار کرتا ہے تو ان دونوں کی تصدیق سے یہ جائداد وقف قرار دی جائے گی۔ اگر وہ یہ کہتا ہے کہ یہ میری ملک ہے میں نے اس کو وقف نہیں کیا ہے تو دونوں کی تصدیق سے ملک ثابت ہوگی وقف ثابت نہ ہوا۔ اگر وہ شخص مر گیا ہے تو اس کے وارثوں سے معلوم کیا جائے گا اگر وہ سب اس کی تصدیق کرتے ہیں تو وقف ہے ورنہ ملک۔ اگر کچھ وقف کہتے ہیں اور کچھ ملک تو جو وقف بتاتے ہیں ان کے حصے وقف متصور ہوں گے اور انکار کرنے والوں کے حصے ان کو دیے جائیں گے۔

ایک زمین ایک شخص کے قبضہ میں ہے اس کے متعلق اس نے بتایا کہ یہ زمین فلاں فلاں اشخاص پر وقف ہے اس کے بعد دوسرے لوگوں پر وقف بتایا انھیں لوگوں میں کمی بیشی کی تو اس کی پہلی بات پر عمل کیا جائے گا۔ اگر یہ کہہ کہ "یہ زمین وقف ہے" اس نے سکوت کیا اور سکوت کے بعد بتایا کہ فلاں فلاں پر وقف ہے تو اس کی پچھلی بات بھی معتبر ہوگی اور جن جن لوگوں کے اس نے نام بتائے ہیں اس جائداد کی آمدنی ان کو دی جائے گی۔

ایک شخص نے اقرار کیا کہ یہ زمین مجھ پر اور میری اولاد نسل پر وقف ہے لیکن واقف کا ذکر نہیں کیا۔ تو اس کا اقرار لائق تسلیم ہے اسی کو اس جائداد کا متولی بنایا جائے گا۔ اس کے بعد اس شخص پر دوسرے آدمی نے دعویٰ کیا کہ "یہ مجھ پر وقف ہے" اور مقر اول نے اس کی تصدیق کر دی تو اس کی تصدیق کا اثر اس کے حصہ پر ہوگا اولاد و نسل کے حقوق پر نہیں۔

کسی شخص نے اقرار کیا کہ یہ زمین فلاں کام پر وقف ہے اس کے بعد کوئی دوسرا کام بتایا کہ اس پر وقف ہے تو پہلے جو کہا ہے وہی لائق اعتبار ہوگا۔

ایک شخص نے اس امر کا اقرار کیا کہ جو جائداد میرے قبضہ میں ہے وہ وقف ہے اس اقرار کے بعد اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اس کے وارث کے علم میں ہے کہ یہ اقرار غلط ہے اس بنا پر وہ عدم وقف کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا یہ دعویٰ مسموع نہیں ہے۔

ایک جائداد کے متعلق دو گواہوں نے گواہی دی کہ واقف نے اقرار کیا ہے کہ یہ جائداد زید اس کی اولاد اور نسل پر وقف ہے۔ دو شخصوں نے یہ گواہی دی کہ واقف نے اقرار کیا ہے کہ یہ جائداد عمر، اس کی اولاد اور نسل پر وقف ہے۔ اس صورت میں اگر یہ معلوم ہو کہ واقف کا پہلا اقرار کونسا ہے تو وہی صحیح ہے دوسرا باطل ہے اگر یہ معلوم نہ ہو سکے تو جائداد کی آمدنی دونوں فریقوں پر آدھی آدھی تقسیم کر دی جائے گی۔

ایک شخص نے اپنی جائداد زید، اس کی اولاد نسل پر اور اس کے بعد فقراء پر وقف کی لیکن زید کہتا ہے کہ یہ جائداد مجھ پر میری اولاد و نسل اور عمر پر وقف ہے اس صورت میں زید کی تصدیق کی بنا پر اس جائداد کی آمدنی پہلے زید اور اس کی اولاد پر تقسیم کی جائے گی اور زید کو جو حصہ ملا ہے اس میں سے نصف عمر کو دیا جائے گا زید کی اولاد کے حصوں میں عمر شریک نہ ہوگا اور عمر کو اس وقت تک ملے گا جب تک زید زندہ ہے اس کے مرنے کے بعد عمر کو کچھ نہیں ملے گا۔

ایک شخص ایک جائداد پر قابض ہے دوسرا شخص دعویٰ کرتا ہے کہ یہ جائداد میری ہے، قابض کہتا ہے کہ یہ جائداد فلاں شخص نے مساکین پر وقف کی ہے اور میرے قبضہ میں دیدی ہے تو اس اقرار سے یہ جائداد وقف قرار دیدی جائے گی لیکن مدعی کا دعویٰ اس پر بدستور رہے گا یہاں تک کہ مدعی کی خواہش پر مدعا علیہ سے حلف اٹھوایا جائے گا اگر وہ حلف اٹھانے سے انکار کرتا ہے تو قاضی اس سے مدعی کو جائداد کی قیمت دلائے گا اور جائداد وقف رہے گی

ایک شخص ایک مکان پر قابض ہے جس کے متعلق وہ یہ کہتا ہے کہ اس کو ایک مسلمان نے امور خیر پر وقف کیا ہے اور مجھے اس کا متولی بنایا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک شخص آکر کہتا ہے کہ یہ مکان میرا تھا میں نے اس کو ان امور پر وقف کیا تھا اور تیری نگرانی میں دیا تھا اور چاہتا ہے کہ مکان اپنے قبضہ میں کر لے۔ اگر قابض اس کے واقف ہونے کی تصدیق کر دے تو یہ شخص مکان پر قبضہ کر سکتا ہے۔

ایک شخص نے ایک جائداد وقف کر کے ایک شخص کی نگرانی میں دیدی، نگراں انکار کرتا ہے تو وہ غاصب ہے اس سے یہ جائداد نکالنی چاہیے اگر اس نے اس جائداد کو کوئی نقصان پہنچایا ہے تو اس کا تاوان لیا جائے۔

کسی نے وقف زمین غصب کر لی جس میں درخت بھی تھے غاصب زمین واپس کرتا ہے تو اس سے درختوں کی آمدنی بھی لی جائے گی۔ اگر اس نے خرچ کر لی ہے تو اس کو تاوان دینا ہوگا۔ غاصب سے زمین واپس لینے میں جو کچھ منافع یا تاوان لیا جائے گا وہ مستحقین پر تقسیم کرنا چاہیے بشرطیکہ وقف کو کچھ نقصان نہ پہنچا۔ اگر وقف کا نقصان ہوا ہے تو یہ رقم اس کی درستی میں صرف کی جائے گی۔

اس مضمون کے ماخذ

مندرجہ ذیل کتب کی مدد سے اس مضمون کو ترتیب دیا گیا ہے۔
عالمگیری۔ درمختار۔ ردالمحتار۔ خانیہ۔ بہار شریعت۔ فتح القدیر۔
بحرالرائق۔ جوہرہ۔ نیرہ۔ بدائع۔ ہدایہ۔ تنویر۔ بحر۔ خلاصہ۔

دیگر تعمیرات بھی کرا سکتے ہیں مسجد کی تزئین بھی کرا سکتے ہیں ۔ بانی مسجد یا اس کے ورثاء کو انھیں روکنے کا کوئی حق نہیں ہے ۔ اگر بانی مسجد اپنے روپے سے مسجد میں کوئی اضافہ کرانا چاہتا ہے تو اہل محلہ کی بہ نسبت اس کا حق پہلا ہے ۔ حوض، کنواں یا دیگر تعمیرات کرانے کے لئے یہ شرط ہے کہ مسجد کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور پہلے جتنی آراضی میں مسجد تھی اس آراضی کے علاوہ رقبہ پر یہ تعمیریں ہونی چاہئیں ۔

اہل محلہ کو مسجد کا دروازہ دوسری جانب تبدیل کرنے کا حق ہے اگر اس معاملہ میں اختلاف رائے ہو تو کثرت رائے اور اچھے لوگوں کی بات پر عمل کرنا چاہئے ۔

واقف یا بانی مسجد اس وقت جب کہ مسجد کی تعمیر مکمل ہو چکی ہو مسجد کی چھت یا دیوار پر امام کے لئے کمرہ بنانا چاہتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ مسجد بنانے سے پہلے میری نیت تھی تب بھی وہ بالا خانہ نہیں بنا سکتا چہ جائے کہ دوسرے لوگ ۔ اگر اس طرح کی کوئی عمارت بنا دی گئی ہے تو نا جائز ہے اس کو گرا دینا واجب ہے ۔

مسجد کو ضرورت ہے اس مقصد کے لئے اس کا کوئی حصہ کرایہ پر دینا حرام ہے اسی طرح مسجد کو بطور رہائش گاہ استعمال کرنا یا اس کے کسی جزو کو حجرہ وغیرہ میں شامل کرنا بھی ناجائز ہے ۔

نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے مسجد تنگ ہو گئی ہے اس کے متصل کسی شخص کا مکان ہے یا زمین تو اس کو خرید کر مسجد میں اضافہ کر لیا جائے اگر وہ شخص اپنا مکان یا زمین فروخت کرنے پر آمادہ نہ ہو تو اس کو واجبی قیمت دے کر جبراً قبضہ کر لینا جائز ہے ۔ اسی طرح اگر مسجد سے متصل وقفی مکان یا زمین ہے خواہ وہ اس مسجد کے نام ہو یا کسی دوسرے مقصد کے لئے اس کو بھی مسجد کی وسعت کے لئے شامل کرنا جائز ہے ۔ اسی طرح اگر مسجد کے برابر وسیع راستہ ہے اور اس کا کچھ جزو مسجد میں شامل کر لینے سے لوگوں کا حرج نہ ہوتا ہو اور راستہ تنگ نہ ہوتا ہو تو شامل کر سکتے ہیں ۔

مسجد تنگ ہے ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ مسجد کو میں لے لوں اور اس کے بدلہ میں وسیع اور بہترین زمین یا مکان دیدوں تو اس طرح کا تبادلہ جائز نہیں کیونکہ مسجد کا تبادلہ کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے ۔

مسجد بنا کر بانی مسجد نے یہ شرط عاید کی کہ مجھے اختیار ہے کہ اس کو مسجد رکھوں یا نہ رکھوں تو یہ شرط باطل ہے مسجد کے ابطال کا اس کو حق نہیں ہے وہ مسجد ہو گئی ۔ اسی طرح مسجد کو اپنے یا اہل محلہ کے لئے مخصوص نہیں کیا جا سکتا اس میں دوسرے لوگ بھی نماز پڑھ سکتے ہیں ۔

مسجد ویران ہو گئی ہے جب بھی وہ مسجد ہے، قیامت تک مسجد رہے گی اس کو منہدم کر کے اس کے عملہ کو اپنے استعمال میں لانا یا اس کو کسی عمارت میں تبدیل کرنا جائز نہیں ۔

مسجد ویران ہے وہاں لوگ نہیں رہے تو اس کا سامان دوسری مسجد کو منتقل کر دینا چاہئے اگر ایسی مسجد منہدم ہو گئی ہے اور اندیشہ ہے کہ اس کا عملہ لوگ اٹھا کر لے جائیں گے تو اس کو بھی دوسری مسجد میں منتقل کر دینا چاہئے ۔

مسجد کی چٹائیاں اور جانمازیں وغیرہ بیکار ہو گئی ہیں تو جس شخص نے دی تھیں اسی کو اختیار ہے کہ وہ ان کا جو چاہے کرے موسم سرما میں مسجد میں پیال یا کسیر ڈلوائی، جاڑا ختم ہو گیا تو جس شخص نے ڈلوائی تھی اسے اختیار ہے کہ وہ اس کا جو چاہے کرے اگر باہر پھنکوا دی گئی ہے تو ہر شخص کو اس کے استعمال کا حق ہے مسجد میں بچھی ہوئی پیال وغیرہ کو سقایہ میں جلانا جائز نہیں ۔

سقایہ کی آگ گھر پر لے جانا، اس سے چلم بھرنا ناجائز ہے لیکن جو شخص پانی بھرواتا اور گرم کراتا ہے اگر وہ اجازت دے دے تو جائز ہے بشرطیکہ اس نے روپیہ اپنا صرف کیا ہو اگر مسجد کا روپیہ صرف کیا جا رہا ہے تو وہ اجازت نہیں دے سکتا ۔

مسجد کا سامان مثلاً لوٹا، چٹائی وغیرہ دوسرے کاموں میں استعمال نہیں کر سکتے اسی لئے مسجد کے لوٹے میں پانی بھر کر گھر میں لانا مسجد کی چٹائی اپنے گھر یا کسی اور جگہ بچھانا، مسجد کے ڈول اور رسی سے اپنے لئے پانی بھر کر لے جانا یا مسجد کی کوئی اور چیز بے محل استعمال کرنا سب ناجائز ہیں ۔

مسجد میں روشنی کے لئے تیل یا موم بتی دی اگر بچ رہی تو دوسرے دن کے لئے رکھ چھوڑیں اگر کسی خاص دن کے لئے دی گئی تھیں تو جو بچ رہی ہیں مالک کو واپس کر دی جائیں امام یا موذن یا اور کسی کو استعمال کرنا جائز نہیں ہاں اگر وہاں کی رسم ہو تو امام و موذن لے سکتا ہے کسی شخص نے اپنی تہائی جائداد نیک کاموں کے لئے وقف کی تو اس کی آمدنی میں سے مسجد میں روشنی کی جا سکتی ہے لیکن صرف ضرورت کے لائق تزئین کی خاطر نہیں ۔

کسی شخص نے اپنی جائداد اس شرط پر وقف کی کہ اس کی آمدنی مسجد کی مرمت اور فقراء پر صرف کی جائے ۔ آمدنی موجود ہے اور مسجد کو مرمت کی ضرورت نہیں ہے اگر آئندہ آمدنی تک یہ خیال ہو کہ مسجد کو مرمت کی ضرورت لاحق ہو گی تو یہ رقم فقراء کو دی جا سکتی ہے آئندہ رقم مرمت پر صرف کر دیں گے ۔

مسجد شکستہ ہو گئی ہے اور اس کی آمدنی اس قدر موجود ہے کہ اس کی از سر نو تعمیر ہو سکے تو اس رقم کو اس مد پر صرف کرنا جائز ہے ۔

متولی نے مسجد کے اوقاف کی آمدنی سے مکان خریدا اور امام یا موذن کو رہائش کے لئے دیدیا اگر ان کو معلوم ہے تو اس مکان میں رہنا مکروہ و ممنوع ہے ۔ اسی طرح جو مکان محض اس لئے وقف کیا گیا ہے کہ اس کی آمدنی مسجد پر صرف کی جائے گی اس میں امام یا موذن کا بلا کرایہ رہنا ناجائز ہے ۔

متولی نے مسجد کی آمدنی سے مسجد کے چٹائی ۔ جانماز یا تیل وغیرہ خریدا اگر واقف نے اس کو اجازت دیدی ہے تو جائز ہے یا سابق متولی ایسا کرتا تھا تب بھی جائز ہے اور اگر اس کو یہ معلوم ہے کہ یہ آمدنی مسجد کی عمارت پر صرف کے لئے ہے تو اس کی یہ خریداری مطلقاً حرام و ناجائز ہے ۔

مسجد کی تعمیر کے بعد کچھ سامان بچ رہا تو یہ سامان آئندہ کے لئے رکھ لیا جائے گا اس کو فروخت کر کے روشنی یا چٹائیوں وغیرہ پر صرف نہیں کیا جا سکتا ۔

مسجد کے لئے چندہ اکٹھا کیا اور اس میں سے کچھ رقم واپسی کی نیت کر کے اپنے خرچ میں لے آیا تب بھی اس کا یہ فعل ناجائز ہے اگر اس کو یہ معلوم ہے کہ یہ رقم فلاں نے دی ہے تو اس کو تاوان دے یا اس سے اجازت لے کر مسجد میں تاوان دے اگر معلوم نہیں کہ یہ رقم کس نے دی ہے تو قاضی کے حکم سے مسجد میں تاوان دے ۔ اگر اس نے خود اس تاوان کو مسجد میں صرف کر دیا ہے تو امید ہے کہ اس کے وبال سے بچ رہے گا ۔

مسجد کے لئے کوئی جائداد خرید لی گئی ہے لیکن ابھی مسجد نہیں بنائی گئی ہے لیکن اس کی جگہ تجویز کر لی ہے تو وقف جائز ہے جب تک مسجد بنے اس جائداد کی آمدنی فقراء

پر تقسیم کی جائے گی اور مسجد بننے کے بعد مسجد پر صرف ہوگی۔

مسجد کے لئے کوئی جائداد یا رقم یا درخت وغیرہ ہبہ کیا تو یہ ہبہ اس وقت تک تمام نہ ہوگا۔ جب تک متولی کو قبضہ نہ دلا دیا جائے۔

امام، موذن، جاروب کش وغیرہ کو متولی مسجد کے وقف سے اتنی تنخواہ پر ملازم رکھ سکتا ہے جو واجبی ہو اگر زیادہ دیتا ہے تو اس کو تاوان ادا کرنا ہوگا اگر ملازمین مسجد کو معلوم ہے تو ان کو اس بڑھی ہوئی تنخواہ کا لینا حرام ہے۔

اگر مسجد کا متولی ان پڑھ ہے اور اس نے حساب کتاب کے لئے کسی کو ملازم رکھ لیا ہے تو اس کی تنخواہ وہ اپنی جیب سے دے گا نہ کہ وقف سے۔

اگر متولی کو اجازت ہے تو وہ مسجد کی آمدنی سے مکان، دوکان، باغ وغیرہ خرید کر مسجد کی آمدنی میں اضافہ کر سکتا ہے اور ضرورت پڑنے پر فروخت کر سکتا ہے۔

مسجد کے اوقاف کا کوئی متولی نہیں اہل محلہ میں سے ایک شخص اس کی دیکھ بھال کرتا اور اس کی آمدنی مسجد پر صرف کرتا ہے تو دیانتۃً اس پر تاوان نہیں۔ اگر متولی موجود ہے تو اہل محلہ مسجد کے اوقاف میں تصرف نہیں کر سکتے۔

مسجد کے اوقاف فروخت کر کے اس کی تعمیر و مرمت پر صرف کرنا جائز نہیں اگر مسجد کے اوقاف کی آمدنی سے کوئی جائداد خریدی ہو تو اس کو فروخت کیا جا سکتا ہے۔

مسجد کے نام ایک زمین وقف تھی وہ ناکارہ ہو گئی۔ ایک شخص نے مفاد عام کے پیش نظر اس کا تالاب بنوا دیا تو اس تالاب میں نہانا دھونا جائز نہیں۔

مسلمان کسی حادثہ کا شکار ہو گئے اور روپیہ کی سخت ضرورت ہے مسجد کے اوقاف کی آمدنی موجود ہے تو اس آمدنی کو بطور قرض لیا جا سکتا ہے۔

امام و موذن مقرر کرنے میں بانی مسجد یا اس کی اولاد کا پہلا حق ہے اگر اہل محلہ نے امام یا موذن مقرر کر لیا ہے اور وہ بانی مسجد کے امام یا موذن سے بہتر ہے تو محلہ والوں کا امام ہی مقرر کیا جائے گا۔

اپنی ذات یا اولاد پر وقف

کسی جائداد کو اپنی ذات پر اور اس کے بعد کسی اور شخص اور پھر فقراء پر وقف کرنا درست ہے اس طرح اپنی اولاد یا نسل پر بھی وقف کرنا جائز ہے۔

کسی جائداد کو اولاد پر اور اس کے بعد فقراء پر وقف کیا گیا تو جو اولاد آمدنی کے وقت موجود ہے چاہے وہ وقف کے وقت موجود نہ تھی اس کو بھی حصہ دیا جائے گا اور جو وقف کے وقت موجود تھی اور اب مر چکی ہے اس کا حصہ ختم ہو جائے گا۔

وقف کے وقت اولاد نہیں تھی، وقف اس شرط پر کیا گیا کہ جو اولاد پیدا ہوگی وہ اس کی آمدنی کی حقدار ہوگی یہ وقف صحیح ہے۔ اس طرح کے وقف کی آمدنی اس وقت تک فقراء کو دی جائے گی جب تک اولاد پیدا نہ ہو جب اولاد پیدا ہوگی تو آمدنی اس کو دی جائے گی۔

اولاد پر وقف کیا تو اس میں لڑکے، لڑکیاں اور خنثی سب شامل ہوں گے اگر محض لڑکوں پر وقف ہے تو لڑکیاں اور خنثی شریک نہ ہوں گے اگر لڑکیوں پر وقف ہے تو لڑکے اور خنثی داخل نہ ہوں گے اسی طرح اگر لڑکے اور لڑکیوں پر وقف کیا گیا ہے تو خنثی بھی حقدار ہوں گے کیونکہ حقیقتاً وہ یا لڑکا ہے یا لڑکی۔

ایک جائداد اس اولاد پر اور نسلاً بعد نسل اس کی اولاد پر وقف کی گئی جو موجود ہے تو جو اولاد وقف کرنے کے بعد پیدا ہوگی وہ اور اس کی اولاد اس وقف میں حق دار ہوگی۔

ایک جائداد اولاد پر وقف کی گئی تو اس کی آمدنی اسی اولاد کو ملے گی جو معروف النسب ہو اگر صرف واقف ہی اس کے نسب کی تصدیق کرتا ہو تو وہ اولاد حق دار نہیں ہے۔ مثلاً ایک شخص نے اپنی جائداد اپنی اولاد پر وقف کی اور وقف کی آمدنی آنے کے چھ ماہ سے کم میں اس کی کنیز سے بچہ پیدا ہوا اور اس نے کہا کہ یہ میرا بچہ ہے تو نسب ثابت ہو جائے گا مگر وقف کی آمدنی سے اسے کچھ نہ ملے گا اور اگر منکوحہ یا ام ولد سے چھ مہینہ سے کم میں بچہ پیدا ہوا تو یہ بچہ اپنے حصہ کا حقدار ہوگا اور اگر چھ مہینہ یا زیادہ میں پیدا ہوا ہے تو حقدار نہیں ہے۔

نابالغ اولاد پر وقف کیا گیا تو وہ اولاد مراد ہے جو وقف کے وقت نابالغ تھی خواہ آمدنی کے وقت وہ بالغ ہو گئی ہو۔ نابینا اور کانی اولاد پر وقف کیا گیا تو وہ اولاد مراد لی جائے گی جو وقف کرتے وقت اندھی یا کانی تھی اگر آمدنی کے وقت کوئی اندھا یا کانا ہو گیا ہے تو وہ آمدنی کا حقدار نہیں ہوگا۔ اسی طرح اس اولاد پر وقف کیا جو یہاں سکونت رکھتی ہو اور وقف کے وقت وہ یہاں موجود نہ تھی آمدنی کے وقت یہاں سکونت پذیر ہے تو حصہ کی حق دار ہے۔

ایک شخص نے اپنی جائداد اپنی اولاد پر اس شرط کے ساتھ وقف کی کہ جو یہاں سے چلا جائے گا اس کو حصہ نہیں دیا جائے گا تو جو جانے کے بعد واپس آجائے گا اس کو بھی حصہ نہیں دیا جائے گا ہاں اگر واپس آنے پر حصہ دیتے جانے کی بھی شرط ہو تو ضرور دیا جائے گا اسی طرح یہ شرط کی ہے کہ میری اولاد میں جو لڑکی بیوہ ہو جائے اس کو دیا جائے تو جب تک بیوہ ہونے پر نکاح نہ کرے گی ملے گا اور نکاح کرنے پر نہیں ملے گا چاہے نکاح کے بعد اس کے شوہر ثانی نے طلاق دے دی ہو۔ ہاں اگر دوبارہ بے شوہر ہونے پر دیئے جانے کی شرط ہو تو دیا جائے گا۔

اولاد ذکور اور ذکور کی اولاد پر وقف کیا تو اسی کے موافق تقسیم ہوگی اور اگر اولاد ذکور کی اولاد ذکور پر نسلاً بعد نسل وقف کیا ہے تو لڑکیوں کو کچھ نہیں ملے گا اور لڑکوں کا سلسلہ ختم ہونے پر فقراء حقدار ہیں۔

حاجت مند اولاد پر وقف کیا گیا تو آمدنی کے وقت جو حاجتمند ہوگا وہی حقدار ہے خواہ وہ وقف کے وقت حاجتمند تھا لیکن اب مالدار ہے تو حقدار نہیں اور اگر وقف کے وقت مالدار تھا اور اب حاجتمند ہے تو حق دار ہے۔

محتاج اولاد پر وقف تھا چند سال تک آمدنی تقسیم نہیں ہوتی اب محتاج دولت مند اور دولت مند محتاج ہو گئے تو تقسیم کے وقت جو محتاج ہے وہی حق دار ہے۔

عالم اولاد پر وقف کیا تو غیر عالم حقدار نہیں خواہ وہ بچہ ہی کیوں نہ ہو جب وہ عالم ہو جائے گا تب حق دار ہوگا اور اسی وقت سے اس کو حصہ ملے گا جب سے وہ عالم ہوا ہے۔

اولاد پر وقف کیا مگر نسلاً بعد نسل کا تذکرہ نہیں کیا گیا تو محض صلبی اولاد مستحق ہوگی اور اس کے ختم ہوتے ہی اس کی اولاد مستحق نہ ہو کر فقراء حقدار ہوں گے۔ اگر وقف کے وقت صلبی اولاد نہ ہو تو پوتا حقدار ہے نواسہ نہیں اگر پوتا بھی نہیں ہے پر پوتا اور پرپوتے کا لڑکا ہو تو وہ حق دار ہے۔ اگر وقف کے بعد صلبی اولاد ہو گئی تو پوتا حق دار نہ رہے گا صلبی اولاد حق دار ہو گی۔

اولاد اور اولاد کی اولاد پر وقف کیا تو صرف دو پشت تک اولاد حق دار ہے پوتے اور بیٹی کی اولاد مستحق نہ ہوگی۔ اگر اولاد پھر اولاد کی اولاد پھر ان کی اولاد پر وقف کیا یعنی تین پشتیں ذکر کر دیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے نسلاً بعد نسل اور بطناً بعد بطن کہنا جب تک اولاد کا سلسلہ باقی رہے گا وہی حقدار رہے اور نسل ختم ہونے پر فقراء کا حصہ ہے۔

بیٹوں پر وقف کیا تو اگر وہ ایک سے زیادہ ہیں تو وقف کی آمدنی سب پر مساوی تقسیم ہوگی اگر ایک بیٹا ہے تو نصف آمدنی اس کو اور نصف فقراء کو دی جائے گی اگر بیٹے اور بیٹے کی اولاد اور اس کی اولاد کی اولاد پر نسل بعد نسل وقف کیا ہے تو بیٹے کی جملہ اولاد ذکور و اناث پر برابر تقسیم ہوگا۔ اگر مردوں کو عورت سے دوگنا دیئے جانے کی شرط ہے تو اس کے موافق دیا جائے گا۔ پوتے اور پر پوتے دونوں کو برابر دیا جائے گا۔ اگر واقف نے بطن اعلیٰ بطن اسفل کی شرط عائد کر دی ہے تو پوتے کے ہوتے ہوئے پر پوتے کو نہیں دیا جا سکتا اگر پوتا ایک ہی ہے تو کل آمدنی کا وہی حقدار ہوگا اس کے مرنے کے بعد تمام پوتوں کی اولاد کو ملے گا اس پوتے کی اولاد کو بھی اور جو پوتے اس سے پہلے مر چکے ہیں ان کی اولادوں کو بھی اور اگر یہ کہہ دیا گیا ہے کہ بطن اعلیٰ میں جو مر جائے اس کا حصہ اس کی اولاد کو دیا جائے تو جو پوتا موجود ہے اسے ملے گا اور جو مر گیا ہے اس کا حصہ اس کی اولاد کو ملے گا۔

وقف کی آمدنی آگئی ہے لیکن تقسیم نہیں ہوئی ہے اسی اثناء میں ایک حقدار کی موت واقع ہو جاتی ہے تو اس کا حصہ ساقط نہیں ہوگا بلکہ اس کے وارثوں کو دیا جائے گا۔

ایک شخص نے کہا میرے مرنے کے بعد میری یہ جائداد مساکین پر صدقہ ہے اور یہ زمین ایک تہائی کے اندر رہے تو مرنے کے بعد اس کی آمدنی اس کی اولاد کو نہیں دی جائے گی خواہ وہ محتاج اور فقیر ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر صحت میں وقف کیا اور مابعد موت کی طرف مضاف نہ کرے پھر اگر اس کی اولاد میں ایک یا چند مسکین ہوں تو ان کو دینا بہ نسبت دوسرے مساکین کے افضل ہے مگر ہر ایک کو نصاب سے کم دیا جائے۔

ایک شخص نے صحت میں فقراء پر وقف کیا اور واقف کے ورثہ بھی فقیر ہیں تو ان کو دینا بہتر ہے لیکن ان کے ساتھ دوسرے فقراء کو بھی دیا جائے یا کبھی ان کو اور کبھی دوسروں کو تاکہ عوام یہ نہ سمجھنے لگیں کہ انہیں پر وقف ہے۔

صحت میں جو وقف فقراء پر کیا گیا ہے اس کا مصرف اولاد کے بعد سب سے بہتر واقف کے رشتہ دار پھر آزاد کردہ غلام پھر پڑوسی پھر شہر کے دوست و احباب ہیں۔

ایک شخص نے اپنی جائداد اپنی اولاد پر اور اس کے بعد فقراء پر وقف کی اور اس کی چند اولادیں ہیں ان میں سے جو مر جائے گا اس کا حصہ باقی پر تقسیم ہو جائے گا جب سب مر جائیں فقراء کی ہوگی اور اگر اولاد کے ناموں کی تصریح کر دی گئی ہے تو جو مر جائے گا اس کا حصہ فقراء کو ملے گا باقی اولاد پر تقسیم نہیں ہوگا۔

ایک شخص نے اپنی اولاد پر مکان وقف کیا اور یہ شرط کی کہ یہ ان کی رہائش کے لئے ہے تو وہ کرایہ پر نہیں دیا جا سکتا خواہ اولاد میں ایک ہی شخص ہو اور مکان اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہو۔ یا اس کی اولاد میں اتنے افراد ہیں کہ ان سب کی رہائش نہیں ہو سکتی جب بھی کرایہ پر نہیں دے سکتے باہمی رضامندی سے باری باری رہ سکتے ہیں اگر مکان بہت وسیع ہے تو مردوں کی عورتیں اور عورتوں کے شوہر بھی رہ سکتے ہیں اگر اتنے کمرے نہیں ہیں تو صرف وہی لوگ رہ سکتے ہیں جن پر وقف ہے یعنی اولاد ذکور کی بیویاں اور اولاد اناث کے شوہر نہیں رہ سکتے۔

اگر مکان موقوفہ تمام اولاد کے لئے ناکافی ہے کچھ اس میں اور کچھ اس کے علاوہ دوسری جگہ رہتے ہیں تو دوسری جگہ رہنے والے کرایہ کا مطالبہ نہیں کر سکتے اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم رہ چکے اب ہم رہیں گے ہاں وہ ان کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔

اولاد پر مکان وقف ہے ایک نے اس پر قبضہ کر رکھا ہے اور دوسروں کو نہیں آنے دیتا تو اس سے کرایہ لیا جائے گا کیونکہ وہ غاصب ہے۔

قرابت داروں پر وقف کیا یہ وقف صحیح ہے اس میں مرد عورت برابر کے حقدار ہیں کسی کو زیادہ حصہ نہیں دیا جائے گا۔ قرابت داروں میں واقف کی اولاد یا باپ دادا کا شمار نہ ہوگا یعنی وہ حق دار نہ ہوں گے۔

قرابت والوں پر وقف کیا، واقف کے چچا بھی ہیں اور ماموں بھی تو چچاؤں کو ملے گا ماموؤں کو نہیں اگر ایک چچا اور دو ماموں ہیں تو نصف چچا کو اور نصف دو ماموؤں کو بشرطیکہ لفظ قرابت والوں (جمع) استعمال کیا گیا ہو اگر قرابت والا (واحد) استعمال کیا گیا ہے تو صرف چچا حق دار ہے ماموں نہیں۔

اگر محتاج وغیر قرابت داروں پر وقف کیا ہے تو انھیں کو حصہ دیا جائے گا جو واقعی محتاج ہیں۔

مکان اس شرط پر وقف کیا کہ جب تک میری بیوہ نکاح نہ کرے اس میں رہ سکتی ہے واقف کے مرنے کے بعد اس نے دوسرا نکاح کر لیا تو وہ اس مکان میں رہنے کی حقدار نہیں، اگر پھر بیوہ ہو جائے تب بھی اس کو حق سکونت نہ ملے گا۔

محلہ کے محتاجوں اور دیگر مسلم فقراء پر وقف کیا گیا تو اس محلہ کے ہر ایک اس مسکین کو جو وقف کرنے کے وقت موجود تھے ایک ایک حصہ دیا جائے گا اور دوسرے مسکینوں کا ایک حصہ۔ محلہ کا کوئی مسکین مر جائے تو اس کا حصہ دیگر مساکین پر تقسیم کیا جائے گا اور یہ اسی وقت تک ہے جب تک وہ زندہ ہیں ان کے مرنے کے بعد محلہ و غیر محلہ کے مساکین میں امتیاز نہ رکھا جائے گا سب کو برابر حصہ دیا جائے گا۔

پڑوس کے فقراء پر وقف کیا گیا تو وہ پڑوسی کہلائیں گے جو اس محلہ کی مسجد میں نماز ادا کرتے ہیں خواہ ان کا مکان واقف کے مکان سے متصل نہ ہو۔ جو اشخاص وقف کے وقت محلہ میں آباد تھے وہ اپنے مکان فروخت کر کے دوسری جگہ آباد ہو گئے تو وہ پڑوسی نہ کہلائیں گے بلکہ پڑوسی وہ ہوں گے جو یہاں آکر آباد ہو گئے ہیں ان میں جو مساکین ہوں ان کو حصہ دیا جائے گا۔

پڑوسیوں پر وقف کیا اور خود واقف دوسرے شہر میں آباد ہو گیا اگر اس نے یہاں مکان بنا لیا ہے تو یہاں کے لوگ پڑوسی ہیں اور مستحق ہیں اگر مکان نہیں بنایا تو اسی جگہ کے لوگ مستحق ہوں گے۔

سادات کے لئے وقف کیا ایک سید صاحب یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے اگر انھوں نے اپنا مکان فروخت نہیں کیا ہے تو وظیفہ کے مستحق ہیں ورنہ نہیں۔

جن لوگوں پر وقف کیا انھوں نے انکار کر دیا تو وقف صحیح ہے اس کی آمدنی فقراء پر

تقسیم کی جائے گی۔ اگر بعض نے انکار کیا اور بعض نے اقرار اور واقف نے موقوف علیہ کو جس لفظ سے ذکر کیا ہے اگر وہ لفظ باقی اشخاص کے لئے مستقل ہوتا ہو تو کل آمدنی اقرار کرنے والوں پر تقسیم کی جائے گی اگر مستقل نہ ہوتا ہو تو انکار کرنے والوں کا حصہ فقراء کو دیا جائے گا مثلاً یہ کہا کہ فلاں کی اولاد پر وقف کیا اور اس کی اولاد میں سے کچھ نے انکار کر دیا ہے تو کل آمدنی اقرار کرنے والے باقی اشخاص پر تقسیم کر دی جائے گی اور اگر زید و عمر پر وقف کیا اور زید نے انکار کر دیا تو زید کے حصے کی آمدنی فقراء پر تقسیم کی جائے گی۔ اور کسی شخص کی اولاد پر وقف کیا تھا لیکن سب نے انکار کر دیا اور آمدنی فقراء کو دے دی گئی دوسری آمدنی پر وہ راضی ہو جاتے ہیں تو ان کو یہ آمدنی نہیں دی جائے گی ہاں اگر اس شخص کے کوئی اور لڑکا پیدا ہوا اور اس نے اقرار کر لیا تو کل آمدنی کا وہی حقدار ہوگا۔

ایک شخص نے دوسرے شخص پر اپنی جائداد نسلاً بعد نسل وقف کی اس شخص نے کہا دیں اپنے لئے قبول کرتا ہوں اور نہ اپنی نسل کے لئے تو اس کا انکار اپنے حق میں صحیح ہے نسل کے حق میں درست نہیں۔

موقوف علیہ نے پہلے رد کر دیا پھر قبول کر لیا تو اس کو وقف واپس نہیں ملے گا اور جب ایک سال قبول کر لیا تو پھر آگے چل کر انکار نہیں کر سکتا۔ اگر یہ کہا کہ ایک سال کا قبول نہیں کیا تو اس سال کی آمدنی فقراء پر تقسیم کی جائے گی پھر اس کو ملے گی۔

واقف خود ہی متولی ہے وقف کی آمدنی اپنے قرابت داروں کو اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتا ہے کسی کو کم اور کسی کو زیادہ، اس کی وفات ہو جاتی ہے اس نے دوسرے شخص کو متولی بنایا اور یہ بیان نہیں کیا کہ وہ کس کو زیادہ دیتا تھا تو متولی ہر شخص کو برابر حصہ دے گا اور بقیہ زیادہ رقم فقراء پر صرف کرے گا۔

وقف اور اجارہ

وقف جائداد کو اجارہ پر دینے کے لئے نہایت احتیاط اور دیانت داری کی ضرورت ہے۔

واقف یا متولی یا قاضی نے وقف آراضی یا مکان اجارہ پر دیا اور مدت اجارہ پوری ہونے سے پہلے مر گیا یا معزول کر دیا گیا تو اجارہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا وہ بدستور باقی رہے گا۔

متولی نے وقف آراضی برائے کاشت چند سال کے لئے اجارہ پر دی اور مر گیا اس کے بعد اجارہ دار کی بھی موت واقع ہو گئی اور اس کے وارثوں نے کاشت کر لی تو ان سے نہ لیا جائے گا اور نہ لگان کیونکہ اجارہ دار کے مرنے کے باعث اجارہ فسخ ہو گیا ہے اس کے وارثوں سے اس نقصان کا تاوان لیا جائے گا اور اس رقم کو مستحقین کو دینے کی بجائے مصالح وقف پر صرف کیا جائے گا۔

وقف مکان کے کرایہ دار سے کرایہ کی رقم پیشگی وصول کر کے مستحقین کو دے دی گئی ابھی مدت اجارہ باقی تھی کہ مستحقین میں سے کسی ایک کا انتقال ہو گیا تو اس تقسیم کو جائز قرار دیا جائے گا۔ ایک زمین فقراء پر وقف ہے اس کا روپیہ کاشتکار نے کھا لیا متولی نے اس کاشتکار سے کچھ کم پر مصالحت کر لی اگر کاشتکار غریب ہے تو یہ صلح جائز ہے ورنہ نہیں۔ اگر مخصوص لوگوں پر وقف ہے تو چاہے کاشتکار غریب ہو یا دولتمند، کم پر مصالحت جائز نہیں ہے۔ غرباء پر وقف مکان ایک غریب کو کم کرایہ پر دیا جا سکتا ہے اگر فقراء پر وقف نہیں ہے تو کم کرایہ پر نہیں دیا جا سکتا۔

وقف جائداد کو اجر مثل یعنی اس حیثیت کے مکان یا کھیت کا جو کرایہ اس جگہ پر ہو، پر دیا جانا چاہئے اس سے کم پر دینا جائز نہیں مستحق بھی اس سے کم کرایہ پر نہیں لے سکتا۔

وقف کی دکان واجبی کرایہ پر اٹھائی گئی۔ دوسرا شخص اس سے زیادہ کرایہ دینے کو تیار ہے تب بھی پہلے اجارہ کو توڑا نہیں جا سکتا۔

وقف کی زمین تین سال کے لئے اجارہ پر دی گئی ایک سال گذرنے کے بعد کرایہ کا نرخ کم ہو گیا یا بہت سے لوگ اس کو لینے کے لئے خواہشمند ہو گئے اور کرایہ کا نرخ بڑھ گیا تو دونوں صورتوں میں اجارہ فسخ نہیں کیا جا سکتا۔

اگر متولی نے وقف جائداد اجر مثل سے کم کرایہ پر دی ہے تو لینے والے کو اجر مثل کے مطابق ہی کرایہ دینا ہوگا۔

ایک شخص کم کرایہ دیتا ہے اور دوسرا زیادہ لیکن زیادہ دینے والا نادہندہ ہے تو کم کرایہ والے کو دینا چاہئے۔

متولی خود موقوفہ جائداد کو ٹھیکہ پر نہیں لے سکتا اور نہ اپنے بیٹے یا باپ یا دادا کو دے سکتا ہے اگر قاضی اس کو دیدے یا وہ اجر مثل سے زیادہ کرایہ ادا کرے تو لے سکتا ہے۔

وقف زمین کسی نے کرایہ پر لے کر عمارت تعمیر کرائی، زمین کا کرایہ بڑھ گیا ہے۔ اگر کرایہ دار زیادہ کرایہ دینے کو تیار ہے تو زمین اس کے پاس رہنے دی ورنہ اس سے کہا جائے کہ وہ اپنا عملہ اٹھالے اور زمین خالی کر دے۔

موقوفہ مکان کو عاریۃً دینا یا بغیر کرایہ دینا جائز نہیں۔

وقف جائداد کو طویل مدت کے لئے کرایہ پر دینا جائز نہیں۔ مدت اجارہ تین سال سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے۔

اگر واقف نے وقف نامہ میں کرایہ کی مدت معین کر دی ہے تو اس کی پابندی کی جائے ورنہ مکان ایک سال کے لئے اور زمین تین سال کے لئے کرایہ پر اٹھانا چاہئے اگر مصلحت اس اصول کی مقتضی نہ ہو تو اس امر میں وقت اور مصلحت کے تقاضوں کو پورا کیا جائے۔

واقف نے ایک سال سے زیادہ کرایہ پر نہ دینے کی شرط عاید کی لیکن اس مدت کے لئے کوئی شخص کرایہ پر لینے کو تیار نہیں تو متولی قاضی کی اجازت سے واقف کی شرط کے خلاف زیادہ عرصہ کے لئے کرایہ پر دے سکتا ہے۔ اگر فائدہ کی صورت ہے تو قاضی سے اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں۔

موقوفہ مکان میں تین سال کے لئے کرایہ پر دیا گیا تین آدمی اس کی آمدنی کے مستحق ہیں۔ ایک سال گذرا تھا کہ ان میں سے ایک حقدار کی موت واقع ہو گئی۔ دوسرا سال گذرنے پر دوسرا حقدار مر گیا تو پہلے سال کی آمدنی پہلے حقدار کے وارثوں اور دوسرے و تیسرے شخص میں اور دوسرے سال کی آمدنی دوسرے حقدار کے وارثوں اور تیسرے شخص میں مساوی تقسیم کی جائے گی اور تیسرے سال کی آمدنی صرف تیسرے آدمی کو ملے گی۔

موقوفہ مکان کو متولی نے فروخت کر دیا اور معزول ہو گیا دوسرے متولی نے خریدار پر

ڈھا دیا گیا اور بیع عدالت سے باطل قرار دے دی گئی تو خریدار کو اس مدت کا کرایہ ادا کرنا ہوگا۔ روپے کی بجائے اشیاء سے اجارہ کرنا بھی جائز ہے کیونکہ اس کو فروخت کر کے اس کی وقف کے مصرف میں لائی جا سکتی ہے۔

وقف کی جانب سے وقف اراضی کو متولی بھی کاشت کر سکتا ہے اس صورت میں مزدوروں کی اجرت وقف کی آمدنی سے دی جائے گی۔

وقف کا مکان کرایہ دار کو اس شرط پر دینا کہ وہ اس کی شکست و ریخت کا ذمہ دار ہے ناجائز ہے البتہ مرمت کے لئے رقم مقرر کی جا سکتی ہے۔

ایک مکان ایک شخص پر وقف ہے اور وہ شخص اس کا متولی نہیں ہے تو وہ خود اس مکان کو کرایہ پر نہیں اٹھا سکتا۔

وقف جائداد واقف یا متولی نے کم کرایہ پر دیدی ہے اگر اس سے سہواً ایسا ہوا ہے تو درگذر کیا جائے گا اور قصداً کیا ہے تو متولی کو معزول اور واقف سے وقف جائداد کا انتظام لے لیا جائے گا اور کرایہ کی کمی کرایہ دار سے پوری کی جائے گی۔

وقف زمین اگر عشری ہے تو عشر کاشتکار سے اور خراجی ہے تو خراج وقف سے ادا کیا جائے گا۔

وقف جائداد پر خرچ کرنے کی ضرورت ہے لیکن وقف کا روپیہ نہیں ہے تو متولی قاضی کی اجازت سے قرض لے سکتا ہے نہ کہ خود۔ خراج کی رقم ادا کرنے کے لئے یا کاشت کے لئے بیج وغیرہ کی خریداری کے لئے روپیہ درکار ہے اور وقف کا روپیہ موجود نہیں ہے تب بھی قاضی کی اجازت سے قرض لیا جائے گا۔ اگر متولی نے خراج کے لیے رقم محفوظ نہ کر کے مستحقین پر تقسیم کر دی ہے تو اس کو خراج کی رقم کے بقدر تاوان ادا کرنا ہوگا۔

ایک مکان فقراء پر وقف ہے ایک فقیر نے اس کو کرایہ پر لیا تو اس کے حصہ کی رقم اس کرایہ میں سے کم کر دینا جائز ہے۔

وقف کے مکان سے ملا ہوا دوسرے شخص کا مکان ہے اور درمیان کی دیوار اسی شخص کی ہے جو گر گئی ہے وہ دیوار بناتا ہے لیکن موقوفہ مکان کی حد میں۔ ایسی شکل میں متولی کا فرض ہے کہ وہ اس دیوار کو گرا دے وہ قیمت دے کر اس دیوار کو وقف نہیں کر سکتا اگر کرتا ہے تو ناجائز ہے۔

وقف کی زمین میں درخت تھے جو فروخت کر دیئے گئے ابھی یہ درخت کاٹے نہیں گئے تھے کہ یہ زمین اسی خریدار کو ٹھیکہ پر دے دی گئی۔ اگر جڑ سمیت بیچے گئے ہیں تو ٹھیکہ جائز ہے اور اگر صرف اوپر اوپر سے بیچے گئے ہیں تو جائز نہیں۔

موقوفہ گاؤں کے کاشتکار بٹائی پر کاشت کرتے ہیں قاضی کی طرف سے حاکم آیا اور اس نے کسی کو لگان پر کھیت دیدیا فصل تیار ہونے پر متولی آیا اور اس نے حسب دستور بٹائی کرانی چاہی وہ لگان کے روپے نہیں لینا چاہتا تو جو متولی چاہتا ہے وہی ہوگا۔

کسی شخص نے وقف کی زمین غصب کر کے اس کو جوت کر درست کیا، نہر یا کنواں کھودوایا یا کھاد ڈلوائی تو غاصب سے زمین واپس کرنے پر اس کو کچھ بھی معاوضہ نہیں دیا جائے گا۔ اگر اس نے اس زمین پر مکان بنایا ہے یا درخت لگوائے ہیں اور ان کو دور کرنے میں زمین کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو مکان یا درخت علیحدہ کرا دیئے جائیں گے ورنہ ملبہ یا درختوں کی قیمت غاصب کو ادا کر دی جائے گی۔

وقف سے متعلق دعویٰ اور شہادت

کوئی شخص زمین یا مکان فروخت کرنے کے بعد یہ کہتا ہے کہ میں نے اس کو وقف کر دیا تھا اور اپنے دعویٰ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے گواہ پیش نہیں کرتا نیز مدعا علیہ سے حلف لینا چاہتا ہے تو اس کا دعویٰ تسلیم نہیں کیا جائے گا اور مدعا علیہ سے حلف نہیں لیا جائے گا۔ اگر وہ گواہوں کے ذریعہ وقف ثابت کر دے تو گواہی کو تسلیم کر کے اس کی بنیاد پر بیع کو باطل قرار دیا جائے گا اور خریدار سے اتنے عرصہ کا (جتنے دنوں تک اس کا قبضہ رہا ہے) کرایہ لیا جائے گا اور خریدار زر خرید وصول کرنے کے لئے اس جائداد کو اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکتا۔

وقف کے متعلق دعویٰ کے بغیر بھی شہادت قبول کر لی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ مدعی کے متناقض بیانات کے باوجود وقف میں شہادت تسلیم کر لی جاتی ہے کہ تناقض سے دعویٰ جاتا رہا اور شہادت بغیر دعویٰ ہوئی۔

اگرچہ اصل وقف میں دعویٰ کے بغیر بھی شہادت قبول ہو جاتی ہے لیکن کسی شخص کا کسی وقف سے متعلق حق ثابت کرنے کے لئے دعویٰ شرط ہے بغیر دعویٰ کے اس ضمن میں گواہی کوئی معنی نہیں رکھتی مثلاً کوئی شخص کسی وقف کی آمدنی کا حق دار ہے اور گواہوں سے اس کا حق دار ہونا ثابت ہو گیا ہے تو جب تک وہ دعویٰ نہ کرے گا اس کا حق فقراء پر تقسیم ہوتا رہے گا اور اس کو کچھ نہیں دیا جائے گا۔

کسی شخص نے کسی زمین کے متعلق کہا کہ یہ زمین فلاں شخص پر وقف ہے اور اب کہتا ہے کہ میرے اوپر وقف ہے چونکہ اس کے کلام میں تناقض ہے اس لئے اس کا دعویٰ قابل سماعت نہیں ہے۔

کسی شخص نے کسی جائداد کے متعلق یہ دعویٰ کیا کہ یہ وقف جائداد ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کیا کہ میں اس کی آمدنی کا حقدار ہوں تو اس کے یہ دعوے اس وقت تک قابل سماعت نہ ہوں گے جب تک وہ یہ دعویٰ نہ کرے کہ میں اس کا متولی ہوں۔ دعویٰ کی سماعت نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ فقط اس کے دعویٰ کی بنیاد پر قابض سے حلف نہیں لیا جائے گا اگر گواہ شہادت دیں تو انکی شہادت قابل قبول ہوگی۔

خریدار نے بیچنے والے پر دعویٰ کیا کہ جو جائداد تو نے میرے ہاتھ فروخت کی ہے وہ وقف جائداد ہے جس کے بیچنے کا تجھے اختیار نہ تھا۔ یہ دعویٰ قابل سماعت نہیں ہے کیونکہ یہ دعویٰ متولی کی جانب سے ہونا چاہئے اگر متولی نہیں ہے تو قاضی مقدمہ کی پیروی کے لئے کسی کو متولی مقرر کرے۔ اگر وقف جائداد ثابت ہو گئی تو بیع باطل ہو جائے گی اور خریدار کو رقم واپس کر دی جائے گی۔

گواہ نے وقف کے ثبوت کے لئے گواہی دی تو اس کو یہ بیان کرنا ضروری نہیں کہ یہ جائداد کس نے وقف کی تھی اگر وہ اس سے لاعلمی بھی ظاہر کرے تب بھی اس کی شہادت معتبر ہو سکتی ہے۔

وقف میں شہادت علی الشہادۃ معتبر ہے۔ وقف ہونا مشہور ہے خواہ گواہ کے سامنے واقف نے وقف نہیں کیا وہ محض شہرت کی بناء پر گواہی دے رہا ہے اور قاضی کے سامنے

اس امر کی وضاحت بھی کر رہا ہے کہ میری شہادت سماعی ہے جب بھی اس کی گواہی لائق اعتبار ہے۔

ایک شخص نے دوسرے شخص پر یہ دعویٰ کیا کہ اس کے قبضہ میں جو جائداد ہے وہ مجھ پر وقف ہے جس کے قبضہ میں یہ جائداد ہے وہ اس کو اپنی ملکیت بتاتا ہے۔ گواہوں کا بیان ہے کہ واقف نے اس کو وقف کیا ہے نیز وقف کرتے وقت یہ جائداد اس کے قبضہ میں تھی۔ گواہوں کا اس قدر بیان وقف ثابت کرنے کے لئے ناکافی ہے جب تک وہ یہ بیان نہ دیں کہ واقف اس جائداد کا مالک بھی تھا ان کی شہادت بے معنی ہے۔

ایک شخص نے گواہی دی کہ یہ جائداد مجھ پر یا میری اولاد پر یا میرے باپ دادا پر یا مجھ پر اور فلاں شخص پر وقف ہے تو اس کی گواہی لائق اعتبار نہیں۔ اگر دو گواہوں میں سے ایک کی گواہی یہ ہے کہ یہ جائداد زید پر وقف ہے اور دوسرا گواہی دیتا ہے کہ عمر پر وقف ہے۔ چونکہ نفس وقف کے متعلق دونوں گواہ متفق ہیں اس لئے اس جائداد کا وقف ہونا ثابت ہو گیا۔ لیکن موقوف علیہ کے بارے میں چونکہ اختلاف ہے اس لئے اس جائداد کی آمدنی زید و عمر کو نہ دے کر فقراء پر صرف کی جائے گی۔

اگر ایک گواہ کہتا ہے کہ یہ کل زمین وقف ہے اور دوسرا نصف زمین وقف بتاتا ہے تو شہادت کے اعتبار سے آدھی زمین ہی کا وقف ہونا ثابت ہوگا۔

دو آدمیوں نے گواہی دی کہ فلاں جائداد پڑوس کے فقراء پر وقف ہے اور یہ دونوں گواہ انھیں فقراء میں سے ہیں یا یہ گواہی دی کہ فلاں مسجد کے محتاجوں پر وقف ہے اور یہ گواہ انھیں محتاجوں میں سے ہیں یا اہل مدرسہ نے مدرسہ کے وقف کے لئے گواہی دی یا متولی اور ایک دوسرے شخص نے گواہی دی کہ یہ جائداد فلاں مسجد پر وقف ہے تو ایسی تمام صورتوں میں متعلقین کی گواہی لائق اعتبار ہوگی۔

ایک شخص کے قبضہ میں ایک جائداد ہے جس پر کسی نے وقف ہونے کا دعویٰ کیا اور ثبوت میں ایک دستاویز بھی پیش کی جس پر گذشتہ قاضیوں کی تحریریں موجود تھیں یا جائداد مذکور کے دروازہ پر وقف کا کتبہ کندہ ہے تب بھی محض دستاویز یا کتبہ کی بنا پر بغیر شہادت کے قاضی وقف کا حکم نہیں دے سکتا اگر قاضی کے دفتر میں اس دستاویز کی نقل گذشتہ قاضیوں کے دستخطوں کے ساتھ موجود ہے تو ضرور قابلِ قبول ہوگی۔

گواہوں میں اختلاف ہے ایک کہتا ہے کہ مرنے کے بعد کے لئے وقف کیا دوسرا کہتا ہے وقف صحیح تمام ہے تو یہ گواہی رد کر دی جائے گی۔ اگر ایک نے کہا صحت میں وقف کیا ہے اور دوسرے نے کہا مرض الموت میں وقف کیا ہے۔ چونکہ یہ اختلاف ثبوت وقف کے منافی نہیں ہے اس لئے شہادت قابلِ قبول ہے۔

ایک مکان ایک شخص کے قبضہ میں ہے۔ دوسرے شخص نے گواہوں سے ثابت کیا کہ یہ مکان اس پر وقف ہے اور مسجد کے متولی نے بھی گواہوں کے ذریعہ ثابت کیا کہ یہ مکان مسجد پر وقف ہے اگر دونوں نے وقف کی تاریخوں کا بھی تذکرہ کیا ہے تو جس کی تاریخ قدیم ہوگی فیصلہ اسکے حق میں کیا جائے گا ورنہ اس مکان کو دونوں پر مساوی تقسیم کر دیا جائے گا۔

کسی جائداد کا وقف ہونا مشہور ہے لیکن اس کا مصرف معلوم نہیں تو یہ جائداد شہرت کی بنا پر وقف قرار دی جائے گی اور اس کی آمدنی فقراء پر خرچ کی جائے گی۔

ایک پرانا وقف ہے جس کے مصارف و شرائط کا علم نہیں تو اس میں بھی سماعی شہادت معتبر ہوگی اگر زمانہ گذشتہ کا عمل درآمد معلوم ہو سکے یا سرکاری دفاتر سے شرائط و مصارف کا پتہ چل سکے تو اسی کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

گواہوں نے یہ گواہی دی کہ فلاں شخص نے اپنی زمین وقف کی ہے اور اس کے حدود کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن ہم اس زمین کو پہچانتے ہیں تو ان کی یہ گواہی اس لئے قابلِ قبول نہیں ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص کی اس زمین کے علاوہ کوئی اور زمین ہو جس کو اس نے وقف کیا ہے۔ اگر گواہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے علم میں ہے کہ اس کی اس زمین کے علاوہ اور کوئی زمین نہیں ہے تب بھی ان کی گواہی قابل قبول نہ ہوگی لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ واقف نے مطلق زمین وقف کرنا ذکر کیا ہو اور اگر ایسے الفاظ سے ذکر کیا ہے کہ گواہوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ فلاں زمین ہے جس کے حدود یہ ہیں اور وہ قاضی کے سامنے حدود بھی بیان کریں تو شہادت مقبول ہوگی۔

گواہوں نے بتایا کہ فلاں شخص نے اپنی فلاں زمین وقف کی ہے جس کے حدود یہ ہیں لیکن ہم نہیں جانتے کہ وہ زمین کہاں ہے تو ان کی گواہی مانی جائے گی اور وقف ثابت ہو جائے گا۔ لیکن مدعی کو گواہوں کے ذریعہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ زمین یہ ہے۔

گواہ کہتے ہیں کہ وقف نے حدود بیان کر دیتے تھے لیکن ہمیں یاد نہیں رہے یا انھوں نے دو حدیں بیان کر دیں اور دو نہ بتا سکے تو انکی شہادت نہیں مانی جائے گی اگر وہ تین حدیں بیان کر دیں تو انکی گواہی مقبول ہوگی۔

دو بھائی ہیں ایک کے پاس باپ کی تمام جائداد ہے اور دوسرے کے پاس کچھ نہیں۔ جس کے قبضہ میں جائداد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جائداد میرے اوپر وقف ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ باپ نے ہم دونوں پر وقف کی ہے۔ گواہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے پاس بھی نہیں ہیں تو دوسرے بھائی کا قول معتبر ہے جو یہ کہتا ہے کہ جائداد دونوں بھائیوں پر وقف ہے۔

چند بھائیوں کے قبضہ میں ایک جائداد ہے جس کے متعلق وہ بالاتفاق کہتے ہیں کہ یہ جائداد ہمارے والد نے وقف کی ہے لیکن ان میں سے ہر ایک اس کا مصرف الگ الگ بتاتا ہے اس صورت میں قاضی کو یہ فیصلہ دینا ہوگا کہ "یہ جائداد وقف ہے جس بھائی نے جو مصرف بتایا ہے اس کا حصہ اسی مصرف پر صرف ہوگا"۔ ان بھائیوں میں سے کوئی نابالغ یا غیر حاضر ہے تو اس کے حصہ کا فیصلہ جب تک وہ بالغ یا حاضر نہ ہو جائے نہیں کیا جائے گا۔

ایک مکان پر ایک شخص کا قبضہ ہے۔ اس پر کسی شخص نے دعویٰ کیا کہ یہ مکان معہ زمین میرا ہے اور قابض کا قول ہے کہ یہ مکان فلاں مسجد پر وقف ہے لیکن مدعی گواہوں کے ذریعہ اس کو اپنی ملکیت ثابت کرا دیتا ہے جس کی بنیاد پر قاضی فیصلہ دے کر اس کی ملکیت اپنے یہاں ریکارڈ کرا لیتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد مدعی اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ عمارت میری ہے اور زمین وقف کی تو دعویٰ، قاضی کا فیصلہ اور اس کے یہاں کا یہ اندراج باطل قرار دیا جائے گا اور مکان معہ زمین کے وقف قرار دیا جائے گا۔

دو آدمیوں کے پاس دو جائدادیں ہیں ان میں سے ایک شخص موجود ہے اور دوسرا موجود نہیں ہے۔ جو شخص موجود ہے اس پر کسی نے دعویٰ کیا کہ یہ دونوں جائدادیں میرے دادا نے اپنی اولاد پر نسلاً بعد نسل وقف کی ہیں اور وہ اپنے دعویٰ کو گواہوں سے صحیح ثابت کر دیتا ہے کہ یہ دونوں جائدادیں ایک ساتھ وقف کی گئی ہیں اور دونوں کا مصرف ایک ہی ہے تو قاضی دونوں جائدادوں کے وقف ہونے کا فیصلہ دے گا۔ اگر گواہ ان کو دو وقف بتلاتے ہیں تو جو شخص حاضر نہیں ہے

اس کے قبضہ والی جائداد کا فیصلہ اس کے آنے پر کیا جائے گا۔

مسجد سے متصل ایک دو منزلہ مکان ہے جس کی نچلی منزل میں گاہ بگاہ صف بندی کی جاتی ہے اہل محلہ اس کو مسجد کا مکان بتاتے ہیں اور مکین اس کو میراث کہتے ہیں تو انھیں کی بات لائق اعتبار ہے۔

ایک شخص کسی جائداد پر قابض ہے جس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ اس کو فلاں شخص نے فلاں مقصد کے لئے وقف کیا ہے لیکن واقف کے ورثاء کا قول ہے کہ یہ جائداد نسلاً بعد نسل وقف کی گئی ہے ہماری نسل ختم ہونے کے بعد یہ قرار کی ہے۔ قاضی کے دفتر میں اس وقف سے متعلق ایسی کوئی تحریر موجود نہیں ہے جس سے اس وقف کے مصارف کا پتہ چل سکے تو وارثوں کا قول معتبر ہوگا۔

ایک شخص ایک جائداد پر قابض ہے۔ دوسرا شخص اس پر دعویٰ کرتا ہے کہ یہ جائداد میں نے مساکین پر وقف کی ہے۔ مدعا علیہ انکار کرتا ہے اور مدعی اقرار کے گواہ پیش کرتا ہے ان گواہوں کی گواہی مقبول ہے وقف ثابت ہوگیا لہٰذا قابض سے جائداد نکال لی جائے گی۔

ایک شخص نے اپنی زمین کو مسجد یا قبرستان یا مسافرخانہ بنایا، دوسرے شخص نے اس پر دعویٰ کیا کہ یہ زمین میری ہے۔ واقف موجود نہیں ہے بعض اہل مسجد کے مقابل میں فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ تو یہ فیصلہ سب کے مقابل متصور ہوگا۔ البتہ مسافر خانہ کا فیصلہ بانی یا اس کے نائب کی عدم موجودگی میں نہیں کیا جا سکتا۔

اگر اصل وقف ثابت ہو جائے تو وقف کا ایک مستحق دعویٰ میں تمام مستحقین کا قائم مقام ہو سکتا ہے جو فیصلہ اس کے مقابل ہوگا وہی سب پر نافذ کیا جائے گا۔

گواہوں نے شہادت دی کہ اس جائداد میں فلاں شخص کا جس قدر حصہ تھا یا اس کو جتنا ترکہ میں ملا تھا اس نے سب کا سب وقف کر دیا ہے لیکن ہم کو یہ معلوم نہیں کہ وہ کس قدر ہے گواہی مقبول ہے۔ اگر گواہوں نے واقف کے سامنے یہ بیان دیا ہے تو قاضی اس کو مجبور کرے گا کہ وہ جائداد موقوفہ کو بیان کرے۔ واقف جس قدر جائداد بتائے گا اسی قدر وقف متصور ہوگی۔

اہل مسجد یا اہل محلہ کی تلاوت کے لیے مسجد پر "قرآن مجید" وقف کیا گیا۔ اہل مسجد اس وقف کی گواہی دیتے ہیں تو انکی گواہی مقبول ہے۔

وقف نامہ اور دستاویزات

زمین وقف کی، وقف نامہ تحریر کیا اس پر گواہیاں کرائیں لیکن وقف نامہ میں حدود لکھنے میں غلطی ہوگئی۔ دو حدیں ٹھیک ہیں اور دو غلط جس پر غلطی ہوتی ہے اگر وہاں مذکورہ حدیں موجود ہیں لیکن اس زمین اور ان حدوں کے درمیان دوسرے شخص کی جائداد واقع ہے تب بھی وقف جائز ہے جس قدر زمین ہے اسی قدر وقف ہوگی۔ اگر اس طرف نزدیک و دور تک مذکورہ چیزوں کا وجود ہی نہیں ہے جن کا حدود میں ذکر کیا گیا ہے تو وقف صحیح نہیں۔ اگر جائداد اس قدر زیادہ مشہور ہے کہ اس کی حدیں بیان کرنا ضروری نہ ہوں تب ہی وقف درست ہے۔

جائداد وقف کی، وقف نامہ تحریر کیا اور اس پر گواہیاں کرائیں لیکن واقف کہتا ہے کہ میں نے یہ جائداد اس شرط پر وقف کی تھی کہ مجھے اس کے فروخت کرنے کا بھی حق ہوگا۔ کاتب نے اس شرط کو تحریر نہیں کیا ہوگا اور مجھے نہیں معلوم کہ وقف نامہ میں کیا لکھا گیا ہے۔ اگر واقف وقف نامہ کی زبان جانتا ہے اور اس کو یہ وقف نامہ پڑھ کر سنایا گیا ہے اور اس نے تمام مضمون کا اقرار کیا ہے تو وقف صحیح ہے اور اس کا قول باطل ہے۔ اگر وہ وقف نامہ کی زبان سے ناواقف ہے اور گواہوں سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ اس کو وقف نامہ کا ترجمہ سنایا گیا ہے اور اس نے تمام مضمون کا اقرار کیا ہے تو واقف کا قول معتبر ہے اور وقف باطل ہے۔ اگر گواہ یہ ثابت کر دیں کہ اس کو ترجمہ سنایا گیا ہے اور اس نے تمام مضمون کا اقرار کر کے ہمیں گواہ بنایا ہے تو وقف صحیح ہے اور واقف جھوٹا ہے۔

ایک شخص ایک موضع کی زمین کے مختلف ٹکڑوں کا مالک ہے وہ ان سب ٹکڑوں کو وقف کرتا ہے اور کاتب سے بحالت مرض وقف نامہ تحریر کراتا ہے۔ کاتب چند ٹکڑوں کا اندراج بھول گیا لیکن اس نے وقف نامہ کا تمام مضمون معہ ان ٹکڑوں کی تفصیل کے جن کا اندراج اس نے وقف نامہ میں کیا ہے واقف کو سنا دیتا ہے اور واقف چھوٹے ہوئے ٹکڑوں پر دھیان نہ دیتے ہوئے جملہ مضمون کا اقرار کر لیتا ہے تو ایسی شکل میں اگر واقف بحالت صحت پہلے کہہ چکا ہے کہ موضع میں جو کچھ میرا حصہ ہے میرا سب کو وقف کرنے کا ارادہ ہے تو تمام ٹکڑے وقف متصور ہوں گے ورنہ نہیں۔

محلہ والوں نے ایک عورت سے کہا کہ تو اپنا مکان مسجد پر اس شرط کے ساتھ وقف کر دے کہ جب تجھے ضرورت ہو فروخت کر سکے عورت نے منظور کر لیا اور وقف نامہ تحریر کرا دیا لیکن اس میں یہ شرط نہیں لکھی۔ اگر اس کو وقف نامہ پڑھ کر سنایا گیا ہے اور وہ اس کی زبان بخوبی سمجھتی ہے اور اس نے سمجھ کر ہی اس کا اقرار کیا ہے تو وقف درست ہے ورنہ نہیں۔

تولیت نامہ یا وصیت نامہ میں اگر یہ تحریر نہیں کیا گیا ہے کہ متولی یا وصی کس کی جانب سے مقرر کیا گیا ہے تو یہ دستاویز ناکارہ ہے کیونکہ قاضی اور واقف کے مقرر کردہ متولی کے احکام الگ الگ ہوتے ہیں اور انھیں احکام پر متولی کا دائرہ کار منحصر ہوتا ہے لہٰذا یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ متولی کو کس نے مقرر کیا ہے۔ اگر قاضی نے مقرر کیا ہے تو قاضی کا نام تحریر کرنا ضروری نہیں واقف کا نام ضروری ہے۔

اشخاص معلومین پر ایک جائداد وقف ہے اس کے متولی نے یہ جائداد کسی کو کرایہ پر دی کرایہ نامہ میں کرایہ دار اور متولی کا نام تحریر کیا گیا لیکن واقف کا نہیں جب بھی کرایہ نامہ صحیح سمجھا جائے گا۔

اقرارِ وقف

ایک جائداد ایک شخص کے قبضہ میں ہے اس نے اس جائداد کے وقف ہونے کا اقرار کیا لیکن واقف اور مستحقین کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے اقرار پر یہ جائداد وقف قرار دی جائے گی اور اس کی آمدنی فقراء پر صرف کی جائے گی اور اس جائداد کا واقف نہ کو قرار دیں گے کسی اور کو اگر گواہوں نے ثابت کر دیا کہ اقرار سے پہلے یہ جائداد اسی شخص کی تھی تو یہی شخص واقف اور متولی قرار پائے گا اور اس وقف کی آمدنی فقراء پر صرف کرے گا لیکن اس کو اپنے بعد دوسرے شخص کو متولی مقرر کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔

وقف کا اقرار کیا اور واقف کا نام بھی بتایا لیکن مستحقین کا ذکر نہیں کیا مثلاً اس نے یہ کہا کہ یہ جائداد میرے باپ نے وقف کی ہے، اس کا باپ مر چکا ہے اگر اس کا باپ مقروض ہے تو اس

شخص کا اقرار صحیح نہیں ہے جائداد دین میں بیع کر دی جائے گی۔ مگر اس کے باپ نے کوئی وصیت کی ہے تو تہائی میں وصیت نافذ ہوگی اس کے بعد جو کچھ بچے وہ وقف ہے اور اس کی آمدنی فقراء پر صرف کی جائے گی لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ اس شخص کے علاوہ اور کوئی وارث نہ ہو اگر دوسرا وارث بھی ہے اور وہ وقف سے انکار کرتا ہے تو وہ اپنا حصہ لے گا۔

ایک شخص ایک زمین پر قابض ہے جس کے بارے میں وہ یہ کہتا ہے کہ اس زمین کو فلاں شخص نے وقف کیا ہے۔ اگر وہ مشہور شخص ہے اور زندہ ہے تو اس سے دریافت کیا جائے گا اگر وہ اقرار کرتا ہے تو ان دونوں کی تصدیق سے یہ جائداد وقف قرار دی جائے گی۔ اگر وہ یہ کہتا ہے کہ یہ میری ملک ہے میں نے اس کو وقف نہیں کیا ہے تو دونوں کی تصدیق سے ملک ثابت ہوگی وقف ثابت نہ ہوا۔ اگر وہ شخص مر گیا ہے تو اس کے وارثوں سے معلوم کیا جائے گا اگر وہ سب اس کی تصدیق کرتے ہیں تو وقف ہے ورنہ ملک۔ اگر کچھ وقف کہتے ہیں اور کچھ ملک تو جو وقف بتاتے ہیں ان کے حصے وقف تصور ہوں گے اور انکار کرنے والوں کے حصے ان کو دیدیئے جائیں گے۔

ایک زمین ایک شخص کے قبضہ میں ہے اس کے متعلق اس نے بتایا کہ یہ زمین فلاں فلاں آدمیوں پر وقف ہے اس کے بعد دوسرے لوگوں پر وقف بتایا انھیں لوگوں میں کمی بیشی کی تو اس کی پہلی بات پر عمل کیا جائے گا۔ اگر یہ کہہ کر "یہ زمین وقف ہے" اس نے سکوت کیا اور سکوت کے بعد بتایا کہ فلاں فلاں پر وقف ہے تو اس کی پچھلی بات بھی معتبر ہوگی اور جن جن لوگوں کے اس نے نام بتائے ہیں اس جائداد کی آمدنی ان کو دیجائے گی۔

ایک شخص نے اقرار کیا کہ یہ زمین مجھ پر اور میری اولاد نسل پر وقف ہے لیکن واقف کا ذکر نہیں کیا۔ تو اس کا اقرار لائق تسلیم ہے اسی کو اس جائداد کا متولی بنایا جائے گا۔ اس کے بعد اس شخص پر دوسرے آدمی نے دعوی کیا کہ "یہ مجھ پر وقف ہے" اور مقر اول نے اس کی تصدیق کر دی تو اس کی تصدیق کا اثر اس کے حصہ پر ہوگا اولاد و نسل کے حقوق پر نہیں۔

کسی شخص نے اقرار کیا کہ یہ زمین فلاں کام پر وقف ہے اس کے بعد کوئی دوسرا کام بتایا کہ اس پر وقف ہے تو پہلے جو کہا ہے وہی لائق اعتبار ہوگا۔

ایک شخص نے اس امر کا اقرار کیا کہ جو جائداد میرے قبضہ میں ہے وہ وقف ہے اس اقرار کے بعد اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اس کے وارث کے علم میں ہے کہ یہ اقرار غلط ہے اس بنیاد پر وہ عدم وقف کا دعوی کرتا ہے تو اس کا یہ دعوی مسموع نہیں ہے۔

ایک جائداد کے متعلق دو گواہوں نے گواہی دی کہ واقف نے اقرار کیا ہے کہ یہ جائداد زید اس کی اولاد اور نسل پر وقف ہے۔ دو شخصوں نے یہ گواہی دی کہ واقف نے اقرار کیا ہے کہ یہ جائداد عمر، اس کی اولاد اور نسل پر وقف ہے۔ اس صورت میں اگر یہ معلوم ہو کہ واقف کا پہلا اقرار کونسا ہے تو وہی صحیح ہے دوسرا باطل ہے اگر یہ معلوم نہ ہو سکے تو جائداد کی آمدنی دونوں فریقوں پر آدھی آدھی تقسیم کر دی جائے گی۔

ایک شخص نے اپنی جائداد زید، اس کی اولاد و نسل پر اور اس کے بعد فقراء پر وقف کی لیکن زید کہتا ہے کہ یہ جائداد مجھ پر میری اولاد و نسل اور عمر پر وقف ہے اس صورت میں زید کی تصدیق کی بنا پر اس جائداد کی آمدنی پہلے زید اور اس کی اولاد پر تقسیم کی جائے گی اور زید کو جو حصہ ملا ہے اس میں سے نصف عمر کو دیا جائے گا زید کی اولاد کے حصوں میں عمر شریک نہ ہوگا اور عمر کو اس وقت تک ملے گا جب تک زید زندہ ہے اس کے مرنے کے بعد عمر کو کچھ نہیں ملے گا۔

ایک شخص ایک جائداد پر قابض ہے دوسرا شخص دعوی کرتا ہے کہ یہ جائداد میری ہے، قابض کہتا ہے کہ یہ جائداد فلاں شخص نے مساکین پر وقف کی ہے اور میرے قبضہ میں دیدی ہے تو اس اقرار سے یہ جائداد وقف قرار دیدی جائے گی لیکن مدعی کا دعوی اس پر بدستور رہے گا یہاں تک کہ مدعی کی خواہش پر مدعا علیہ سے حلف اٹھوایا جائے گا اگر وہ حلف اٹھانے سے انکار کرتا ہے تو قاضی اس سے مدعی کو جائداد کی قیمت دلائے گا اور جائداد وقف رہے گی۔

ایک شخص ایک مکان پر قابض ہے جس کے متعلق وہ یہ کہتا ہے کہ اس کو ایک مسلمان نے امور خیر پر وقف کیا ہے اور مجھے اس کا متولی بنایا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک شخص آکر کہتا ہے کہ یہ مکان میرا تھا میں نے اس کو ان امور پر وقف کیا تھا اور تیری نگرانی میں دیا تھا اور چاہتا ہے کہ مکان اپنے قبضہ میں کر لے۔ اگر قابض اس کے واقف ہونے کی تصدیق کر دے تو یہ شخص مکان پر قبضہ کر سکتا ہے۔

ایک شخص نے ایک جائداد وقف کر کے ایک شخص کی نگرانی میں دیدی، نگراں انکار کرتا ہے تو وہ غاصب ہے اس سے یہ جائداد نکالنی چاہیئے اگر اس نے اس جائداد کو کوئی نقصان پہنچایا ہے تو اس کا تاوان لیا جائے۔

کسی نے وقف زمین غصب کر لی جس میں درخت بھی تھے غاصب زمین واپس کرتا ہے تو اس سے درختوں کی آمدنی بھی لی جائے گی۔ اگر اس نے خرچ کر لی ہے تو اس کو تاوان دینا ہوگا غاصب سے زمین واپس لینے میں جو کچھ منافع یا تاوان لیا جائے گا مستحقین پر تقسیم کرنا چاہیئے بشرطیکہ وقف کو کچھ نقصان نہ پہنچا۔ اگر وقف کا نقصان ہوا ہے تو یہ رقم اس کی درستی میں صرف کی جائے گی۔

اس مضمون کے ماخذ

مندرجہ ذیل کتب کی مدد سے اس مضمون کو ترتیب دیا گیا ہے۔

عالمگیری ۔ درمختار ۔ ردالمحتار ۔ خانیہ ۔ بہار شریعت ۔ فتح القدیر ۔ بحر الرائق ۔ جوہرہ ۔ نیرہ ۔ بدائع ۔ ہدایہ ۔ تنویر ۔ بحر ۔ خلاصہ ۔

ایک غیر مطبوعہ مرثیہ

(۱)

آتا ہے کون شمعِ امامت لیے ہوئے
اپنی جلو میں فوجِ ہدایت لیے ہوئے
ہاتھوں میں جامِ سُرخِ شہادت لیے ہوئے
لب پر دعائے بخششِ اُمّت لیے ہوئے
پھیلی ہے بُو فضا میں شہِ مشرقین کی
آتی ہے کربلا میں سواری حسینؑ کی

(۲)

زہرا بھی ساتھ ہیں، حسنِ مجتبیٰ بھی ساتھ
جعفر بھی ساتھ ساتھ ہیں، مشکل کشا بھی ساتھ
حمزہ بھی ہیں، جنابِ رسولِ خدا بھی ساتھ
تنہا نہیں حسین کہ ہیں انبیاء بھی ساتھ
شورِ درود اٹھتا ہے سارے جہاں سے
برسا رہے ہیں پھول ملک آسمان سے

(۳)

گھوڑے پہ آگے آگے ہیں خود شاہ کربلا
ہیں گرد سب عزیز و رفیقان با وفا
ابرار و پاک بین و حق آگاہ و پارسا
پھیلی ہوئی ہے چہروں کی چاروں طرف ضیا
پوری بہار پر ہے گلستاں بتول کا
چھوٹا سا قافلہ ہے یہ آلِ رسول کا

(۴)

بر میں قبائیں، سر پہ عمامے بندھے ہوئے
تیغیں کمر میں پہلو میں خنجر لگے ہوئے
دانتوں میں ہونٹ رانوں میں گھوڑے دبے ہوئے
بازو بھرے بھرے ہوئے سینے تنے ہوئے
کمسن ہیں کچھ ضعیف ہیں، کچھ نوجوان ہیں
پیشانیوں پہ سجدۂ حق کے نشان ہیں

(۵)

ہمّت پہ، ولولوں پہ شجاعت کو ناز ہے
طاعت گزاریوں پہ عبادت کو ناز ہے
صورت پہ دستِ صانعِ قدرت کو ناز ہے
بازو میں زور وہ ہے کہ قوت کو ناز ہے
نقشے ہیں اک مصورِ زریں نگار کے
بکھرے ورق ہیں مصحفِ پروردگار کے

(۶)

اکبر ہیں اک شبیہِ رسالت مآب کی
ہیں روشنی نگاہِ پنجتن بوتراب کی
شرمندہ نورِ رخ سے کرن آفتاب کی
چہرے سے ٹپکی پڑتی ہے سرخی شباب کی
عارض کے گرد سبزۂ خط کی بہار ہے
روشن چراغِ عابدِ شب زندہ دار ہے

(۷)

قاسم میں آن بان امام حسن کی ہے
قوت کلائی میں شہِ خیبر شکن کی ہے
چہرے پہ آب و تاب رسولِ زمن کی ہے
زلفوں میں بُو بھری ہوئی مشکِ ختن کی ہے
عارض کے بوسے لیتا ہے نور آفتاب کا
چہرہ نہیں ہے پھول کھلا ہے گلاب کا

(۸)

بھائی امام پاک کا اک نوجوان ہے
تیور میں جس کے حیدرِ صفدر کی شان ہے
قبضے میں تیغ، دوش پہ ترچھی کمان ہے
رکھا ہوا زمیں پہ اک آسمان ہے

عاشق ہے ابنِ فاتحِ بدر و حنین کا
دل میں خدا کا نام ہے، لب پر حسین کا

(۹)

ہیں فوج میں حسین کے دو گلعذار بھی
کمسنی کے ساتھ ہیں یہ ہوشیار بھی
عابد بھی، متقی بھی ہیں، پرہیزگار بھی
غازی بھی، صف شکن بھی ہیں اور شہسوار بھی
ساتھ اپنے ان کو لائی ہے بیٹی بتول کی
اُس کے پسر ہیں جو ہے نواسی رسول کی

(۱۰)

ان کے سوا کچھ اور بھی بدر و ہلال ہیں
عبداللہ و محمد و حیدر کے لال ہیں
بیٹے کئی عقیل کے بھی خورد سال ہیں
مسلم کے دو پسر ہیں جو یوسف جمال ہیں
ظاہر ہے صاف چہروں کی یہ آب و تاب سے
طفلی کے دن ہیں کھیل رہے ہیں شباب سے

(۱۱)

خوش ہیں کہ راہِ منزلِ صبر و رضا پہ ہیں
داماں پاکِ قتل گہہ نینوا پہ ہیں
کہتا ہے کون تختۂ ارضِ بلا پہ ہیں
غازی ہیں پشتِ زیں پہ تو گھوڑے ہوا پہ ہیں
ٹاپوں کے زیرِ عکس جو دشت و جبال ہیں
بکھرے ہوئے زمین پہ لاکھوں ہلال ہیں

(۱۲)

غازی ہیں سب بڑوں کے کٹا دینے کا شوق ہے
نیزوں کا شوق، برچھیاں کھانے کا شوق ہے
پردیس میں گھروں کے لٹانے کا شوق ہے
راہِ خدا میں خوں میں نہانے کا شوق ہے
ہنس ہنس کے کہہ رہے ہیں کہ منزل قریب ہے
ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں، ساحل قریب ہے

(۱۳)

پہنچے جو کربلا کی زمیں پر شہ انام
دیکھا کہ ہے یہ ایک عجب پُر فضا مقام
پُر کیف وہ ہوائیں وہ سبزے کا اہتمام
ساحل بنا تھا تختۂ باغِ ارم تمام
چشمہ رواں تھا دشت میں آبِ حیات کا
رہ رہ کے موج لیتا تھا دریا فرات کا

(۱۴)

صحرائے کربلا کی زمیں لالہ زار تھی
موسم تھا گل کا اوج پہ فصلِ بہار تھی
دنیا نمونۂ ورقِ زر نگار تھی
ہر ایک شے سے قدرتِ حق آشکار تھی
تھیں بہر سیر خلد سے حوریں جھکی ہوئی
پریاں کھڑی تھیں سرو گلستاں بنی ہوئی

کونپل نے سر اٹھایا تھا شوقِ نمود میں
کلیوں نے آنکھ کھولی تھی بزمِ وجود میں
پتے تھے مست حمدِ خدا کے سرود میں
شاخیں جھکی ہوئی تھیں رکوع و سجود میں
سجادے گل کے فرش زمیں پر بچھے ہوئے
لاکھوں تھے سبز پوش نمازی کھڑے ہوئے

(۱۶)

ڈالی ہر اک درخت کی پھولی پھلی ہوئی
ہر ہر دلہن کی مانگ میں افشاں چنی ہوئی
پانی پہ سبز سبز وہ شاخیں جھکی ہوئی
نرگس کی تھیں امام پہ آنکھیں لگی ہوئی
لالہ کے ہر مقام پہ روشن چراغ تھے
کلیاں کھلی تھیں غنچوں کے دل باغ باغ تھے

(۱۷)

پھیلے ہوئے تمام گلستاں میں پھول تھے
صحرا کی آستین و گریباں میں پھول تھے
میداں میں پھول، کوہ کے داماں میں پھول تھے
وادی میں پھول دشت و بیاباں میں پھول تھے
یہ گل نہیں تھے ٹکڑے تھے یاقوتِ خام کے
جلوے بکھر گئے تھے کسی لالہ فام کے

(۱۸)

چاروں طرف کھلے تھے شگوفے بہشت کے
کلیاں تھیں سب بہشت کی غنچے بہشت کے
کیاری ہر اک بہشت کی پودے بہشت کے
شاخوں پہ گا رہے تھے پرندے بہشت کے

تھے جشن پادشاہِ جہاں کے ورود کے
دریا بلند کرتا تھا نعرے درود کے

(۱۹)

زینب کے دونوں لال تھے خوش کہسار سے
قاسم تھے باغ باغ گلوں کے نکھار سے
اکبر نہال مستی سرو بہار سے
عباس کی لڑی ہوئی آنکھیں کچھار سے
ساحل جو کر رہا تھا اشارہ حسین کو
موجوں نے ہاتھ اٹھا کے پکارا حسین کو

(۲۰)

بس چلتے چلتے راہ میں گھوڑا ٹھہر گیا
حائل تھا اس کی راہ میں دریائے باصفا
لپٹا ہوا سموں سے تھا میدانِ کربلا
دیتا تھا اس کو آلِ محمد کا واسطہ
کہتا تھا آگے لے کے نہ جانا امام کو
مہمان میں بناؤں گا شاہِ انام کو

(۲۱)

بولی زمینِ دشت کہ مولا نثار ہوں
آقا کی مہربانی کی امیدوار ہوں
مدت سے ایک حرفِ غمِ انتظار ہوں
لیکن فریب خوردۂ لیل و نہار ہوں
ہو جاؤں مَس اگر کفِ پائے امام سے
بڑھ جائے آبرو مری دارالسلام سے

(۲۲)

فرمایا غم یہ تجھ سے اُٹھایا نہ جائے گا
مہمان بے کسوں کو بنایا نہ جائے گا
آفت سے غم زدوں کو بچایا نہ جائے گا
یہ زخم وہ ہے دل پہ جو کھایا نہ جائے گا
پہرے یہاں پہ بیٹھیں گے ہفتم کی رات سے
پانی بھی ہم نہ پائیں گے نہرِ فرات سے

(۲۳)

محشر یہاں پہ ہوئے گا عاشور کو بپا
ٹاپوں سے گونج جائے گا میدانِ کربلا
ہل جائے گا دلیروں کے نعروں سے نینوا
ہوگی غضب کی جنگ قیامت کا معرکہ
کاٹے یہاں پہ جائیں گے رشتے حیات کے
سوئیں گے میرے شیر کنارے فرات کے

(۲۴)

ہوگا شہید اکبرِ شیریں سخن یہیں
پامال ہوگا قاسمِ گل پیرہن یہیں
کھائے گا تیر اصغرِ غنچہ دہن یہیں
بس مختصر یہ ہے کہ لٹے گا چمن یہیں
یہ داغ بھی رہے گا دلِ روزگار میں
اجڑے گا باغِ فاطمہ زہرا بہار میں

(۲۵)

ایسا نہ ہو کہ سب کہیں دشت بلا تجھے
دنیا سمجھ لے بانیِ ظلم و جفا تجھے
سارا جہاں پکار اٹھے بے وفا تجھے
الزام یہ لگائے نہ خلقِ خدا تجھے
تیری نظر نے کھا لیا کنبہ بتول کا
ویران تو نے کر دیا روضہ رسول کا

(۲۶)

ظلم و ستم ہوا کیا تو دیکھتی رہی
سیّد کا گھر لُٹا کیا تو دیکھتی رہی
غربت میں سر کٹا کیا تو دیکھتی رہی
دامن ترا رنگا کیا تو دیکھتی رہی
بے کس کا خون ہو گیا تیری زمین پر
دھبّے لگے ہوئے ہیں تیری آستین پر

(۲۷)

کانپی یہ سن کے کرب و بلا کی زمیں تمام
کی عرض رو کے پیشِ امامِ فلک مقام
اے دیں کے بادشاہ شہنشاہِ خاص و عام
سینے پہ میرے قتل نہ ہوں گے یہ لالہ فام
یوں بے گناہ خون بہایا نہ جائے گا
مولا یہ بار مجھ سے اٹھایا نہ جائے گا

(۲۸)

فرمایا تو ضیا ہے رُخِ کائنات کی
ساحل پہ تیرے ٹھہرے گی کشتی نجات کی
ہوگی یہیں پہ فاش حقیقت حیات کی
قائم یہیں پہ ہوں گی مثالیں ثبات کی

چمکے گا اس زمیں پہ لہو بے گناہ کا
ابھرے گا نقشِ پاک یہیں لاالہ کا

(۲۹)

آگے بڑھوں یہاں سے نہیں اختیار میں
گذرا ہے یہ مشیتِ پروردگار میں
دریائے خوں بہے گا ترے لالہ زار میں
دھبے لگیں گے دامنِ فصلِ بہار میں
چہرے پہ خون سرخ شہیداں ملے ہوئے
آئے گی صبح چاک گریباں سلے ہوئے

(۳۰)

ہوگا غروب ماہ و امامت اسی جگہ
لائے گا رنگ خونِ شہادت اسی جگہ
پائے گی خلق درس ہدایت اسی جگہ
پنہاں ہے رازِ بخششِ اُمت اسی جگہ
بولی زمیں خدا کے ہے سب اختیار میں
کیا دخل مجھ کو مرضیٔ پروردگار میں

(۳۱)

راضی ہوں دینِ پاک کی دولت ملے مجھے
رنگیں قبائے خون شہادت ملے مجھے
تربیں یہاں بنیں یہ سعادت ملے مجھے
لاشوں کی پاسبانی کی عزت ملے مجھے
بڑھ جائے اوج میرا کہیں آسمان سے
زائر یہاں پہ آئیں جو ہندوستان سے

(۳۲)

تیار ہوں لہو میں نہانے کے واسطے
ماپوں کے زخم سینے پہ کھانے کے واسطے
کوئی نہ ہو جو قبر بنانے کے واسطے
موجود ہوں میں لاش اٹھانے کے واسطے
اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں سلاؤں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی

(بشکریہ آجکل)

حضرت بابا شیخ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ

پنجاب کا عظیم صوفی

۱۱۷۳ء ـــــــ ۱۲۶۵

حضرت بابا شیخ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے دادا شیخ شعیب، جو شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، کابل سے ترکِ وطن کر کے لاہور آئے تھے ۔ ان کے ہمراہ ان کے تین صاحبزادگان، مریدین، فوجی اور خاندان کے افراد تھے ۔ لاہور کی سرزمین راس نہ آنے پر وہ قصور میں مقیم ہوئے مگر سلطانِ وقت انھیں کیتھوال ضلع ملتان کا قاضی بنانا چاہتے تھے ۔ اس لیے حضرت شیخ شعیب ۱۱۵۷ء میں کیتھوال میں سکونت پذیر ہوئے ۔

شیخ شعیب کے صاحبزادہ شیخ جمال الدین سلیمان، جو سلطان محمود غزنوی کے بھانجے بھی ہیں، کی شادی کیتھوال میں شیخ وجیہہ الدین کی بیٹی "کلثوم بی بی" سے ہوئی جن کے بطن سے ۵۶۹ھ/۱۱۷۵ء میں پنجابی زبان کے پہلے شاعر، فلسفی، صوفی، حضرت بابا فریدؒ کی ولادت باسعادت ہوئی۔

بچپن

حضرت بابا فریدؒ کی والدہ محترمہ کلثوم بی بی ایک نیک دل اور زاہدہ عورت تھیں، حضرت بابا فریدؒ اپنی والدہ محترمہ سے بہت متاثر تھے ۔ آپ کے عہدِ طفولیت میں بعض ایسے غیر معمولی واقعات کا پتہ چلتا ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے ۔ کہ آپ پیدائشی طور پر ایک عظیم صاحب کمال صوفی، ولی، زاہد تھے، جس وقت آپ کا تولد ہوا تو رمضان المبارک کی چاند رات تھی مگر چاند نظر نہ آسکا ۔ آپکے والد محترم قاضی شہر تھے، لوگوں نے روزے کے متعلق آپ سے فتویٰ دریافت فرمایا ۔ اسی دوران ایک بزرگ حضرت بابا فریدؒ کی ولادت باسعادت کی مبارکباد دینے کے لئے تشریف لائے تھے ۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ بچہ ولی اللہ ہے ۔ اگر آج آپ نے دودھ نہ پیا تو واقعی رمضان کا دن ہے ۔ چنانچہ حضرت بابا فریدؒ کی والدہ محترمہ نے بتایا کہ آج آپ نے دودھ نہیں پیا ۔ جس پر لوگوں نے یقین کیا کہ وہ دن واقعی رمضان کا دن تھا جس کی بعد میں آس پاس کے شہروں سے بھی تصدیق ہوئی ۔

تعلیم

حضرت بابا فریدؒ انتہائی ذہین و فطین تھے، چار سال کی عمر میں والدہ محترمہ نے مکتب میں داخل کرایا تھا ۔ جہاں آپ نے جلد ہی قرآن شریف ناظرہ کر کے حفظ کر لیا تھا ۔ اور فارسی و عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی ۔ ان دنوں ملتان علوم و فنون دینی کا مرکز بنا ہوا تھا ۔ بڑے بڑے علماء و مشائخ وہاں موجود تھے ۔ آپ بھی اعلیٰ تعلیم کے لئے ملتان تشریف فرما ہوتے اس وقت آپکی عمر اٹھارہ برس کی تھی ۔ ملتان میں آپ کے خالہ زاد بھائی حضرت مخدوم بہاءالدین زکریا بھی موجود تھے ۔ مولانا منہاج الدین ترمذی کی مسجد کے مدرسہ میں قیام فرما کر تحصیل و تکمیل علوم میں مشغول ہوئے ۔

حضرت بابا فریدؒ حصول علم کے لئے قندھار بھی تشریف لے گئے جہاں آپ نے پانچ سال قیام فرما کر علوم کی دستارِ فضیلت حاصل کی ۔

ریاضت

تحصیل علم کے ساتھ عبادت و ریاضت اور گوشہ نشینی آپ کا معمول تھا ۔ جس کا چرچا زمانہ طالب علمی ہی میں ہونے لگا تھا ۔ آپ ایک روز کتاب "نافع" کے مطالعہ میں مشغول تھے ۔ اتفاق سے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی اس مسجد میں قیام فرما تھے چنانچہ حضرت نے بابا فریدؒ کو مخاطب ہو کر فرمایا ۔

مولانا یہ کیا کتاب ہے ۔؟

بابا فریدؒ نے فرمایا یہ نافع ہے ۔

اس پر خواجہ قطب الدینؒ نے فرمایا ۔

"آپ کو اس سے نفع ہوگا"

حضرت بابا فریدؒ نے جواب دیا ۔

"آپ کی عنایت و نظر سعادت سے فائدہ ہوگا"

بیعت

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ جب دہلی کے لئے روانہ ہوئے تو حضرت بابا فریدؒ بھی انکے ہمراہ ہوئے اور حضرت خواجہؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے ۔ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حضرت نے اس وقت آپ کو منع فرما دیا تھا کہ آپ تکمیل علوم و فنون میں

مشغول ہیں۔ چنانچہ تکمیل کے بعد آپ دہلی میں حضرت خواجہ سے بیعت ہوئے۔

گنج شکر

حضرت بابا فریدؒ کو شکر بہت مرغوب تھی شکر کے بارے میں چند کمالات بھی آپ کے بیان کئے جاتے ہیں جن کی بنا پر آپ "گنج شکر" کے نام سے ملقب ہوتے سیر الاولیاء میں لکھا ہے

آپ مسلسل روزہ رکھنے کی بنا پر بھوک کی شدت کی وجہ سے منہ میں پتھر کی ڈلیاں رکھتے تھے جو شکر کی ڈلی بن جاتی تھیں۔

سیر العارفین میں مرقوم ہے۔

"بابا فرید الدین مسعود! بدین پارہ گلی کہ در دہنت رسید و شکر گشت عجب نیست کہ حضرت تبارک و تعالیٰ وجود ترا گنج شکر گردانیدہ است ہموارہ شیرین خواہی شد"

ہانسی میں

حضرت بابا فریدؒ دہلی سے ہانسی تشریف فرما ہوئے۔ جہاں عقیدت کی وجہ سے لوگوں کا بے پناہ ہجوم ہونے لگا جس سے حضرت کے مشاغل میں خلل ہونے لگا۔ اس دوران میں شیخ جمال الدین ہانسویؒ آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے وہ حضرت بابا فریدؒ کے محبوب ترین شاگرد تھے۔ ہانسی میں حضرت شیخ بابا فریدؒ شیخ ہانسویؒ کی محبت میں ۱۲ سال قیام پذیر رہے۔ اور غالباً حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے وصال کے بعد ہانسی کو خیر باد کہا۔

فرید کوٹ

اس شہر کا نام پہلے "موکل ہر" تھا۔ جسے بعد میں حضرت بابا فریدؒ کے مقدس نام پر فرید کوٹ رکھا گیا۔

یہ واقعہ اس طرح سے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت بابا فریدؒ غالباً دہلی سے اجودھن تشریف لے جا رہے تھے۔ راستہ میں موکل ہر سے ½ ا میل کے فاصلے پر ایک جال کے درخت کے سایہ میں آرام فرما ہوئے۔ اور اپنی گدڑی جال کے درخت میں لٹکا کر موکل ہر کی جانب روانہ ہوئے۔

اتفاق سے موکل ہر راجہ کا اپنا محل تعمیر کرا رہا تھا جس کا یہ دستور تھا کہ جو اجنبی مسافر اس علاقہ کی حدود میں داخل ہوتا تھا۔ تو فوراً اس سے بیگار لی جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت بابا فریدؒ کو بھی بیگار میں پکڑا گیا مٹی اٹھانے کا کام سپرد ہوا لیکن جس وقت حضرت نے پہلی ٹوکری سر پر رکھنی چاہی تو وہ سر مبارک سے ایک بالشت اوپر اٹھ کر معلق ہو گئی۔ موکل ہر کے راجہ نے یہ صورت دیکھ کر معافی چاہی حضرت بابا فریدؒ نے سب کو معاف کیا راجہ نے عرض کیا کہ مجھے اس شہر کا نام "فرید کوٹ" رکھنے کی اجازت دی جائے۔ بابا فریدؒ نے اجازت مرحمت فرمائی جس سے شہر کا نام موکل ہر کے بجائے "فرید کوٹ" ہوا۔

انگشت ہائے مبارک

حضرت بابا فریدؒ نے اپنے مٹی سے بھرے ہوئے ہاتھ ایک جال کے درخت کے تنہ سے پونچھے

اس لکڑی پر حضرت کی انگلیوں کے نشانات واضح طور پر موجود ہیں۔ اس درخت کا ایک حصہ شہر فرید کوٹ میں ہے۔ جہاں ہزاروں عقیدت مند اس کی زیارت کرتے ہیں لکڑی کا یہ ٹکڑا ریاست کے قلعہ کے قریب ایک عالیشان عمارت میں رکھا گیا۔ اس عمارت میں ایک مسجد تعمیر کی گئی۔ جہاں ہر سال لنگر کے لئے ریاست کی طرف سے روپیہ ملتا تھا۔

لیسر بالی جنگل

حضرت بابا فریدؒ نے فرید کوٹ سے روانہ ہوتے وقت جال کے درخت پر اپنی گدڑی لٹکا دی تھی۔ ہوا تیز چلی تو بابا صاحبؒ کی گدڑی کیکر کے درخت پر دھجیاں ہو کر چمٹ گئی جس سے وہاں کے لوگوں میں عقیدت کی لہر دوڑ گئی۔ اور منت مانگنا شروع ہو گئیں۔ چنانچہ ببول کے درختوں میں دھجیاں باندھنے کا رواج ہو گیا اور یہ سارا جنگل لیر بالی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ پنجابی زبان میں "لیر" دھجی کو اور جال کے درخت کو "ِوالی" کہتے ہیں۔

چشتی سلسلہ

حضرت بابا فریدؒ پنجاب میں چشتی سلسلہ کے بانی ہیں۔ آپ کے مرشد کامل حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے بابا کو ہانسی جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اور فرمایا میں جانتا ہوں کہ تم ہانسی جاؤ گے۔ باباؒ نے جواب دیا۔ میں وہی کروں گا جو شیخ جی حکم دیں گے۔ فرمایا جاؤ یہ میری پیشین گوئی ہے کہ تم میری موت کے وقت نہ ہو گے"

چنانچہ جس روز حضرت خواجہ کا وصال ہوا تو باباؒ نے خواب دیکھا کہ حضرت خواجہ یاد فرما رہے ہیں۔ آپ سمجھ گئے کہ مرشد کا وصال ہو گیا ہے۔ آپ پریشان حال پانچویں روز دہلی پہونچے۔ جہاں حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ نے آپ کو خرقہ خلافت پیش فرمایا۔

حضرت باباؒ کے یوں متعدد خلفاء ہیں لیکن سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی، حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر کلیری، قطب ہانسی حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اور یہ تینوں بزرگ صاحب سلسلہ ہیں حضرت سلطان المشائخؒ سے سلسلہ نظامیہ، حضرت مخدوم صاحبؒ سے سلسلہ صابریہ اور قطب عالم سے سلسلہ جمالیہ جاری ہے۔

اجودھن

اجودھن کا دوسرا نام "پاک پٹن" ہے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ حضرت بابا کو اپنا خلیفہ مقرر کر چکے تھے۔ حضرت بابا فرید کی خواہش تھی۔ کہ وہ مزید ریاضت و عبادت میں وقت گذاریں۔ چنانچہ آپ ہانسی سے اجودھن "پاک پٹن" تشریف فرما ہوتے۔ جہاں آپ آخری وقت تک مقیم رہے۔

آپ کے ہمراہ دوسرے صوفیاء کرام بھی تھے۔ آپ جب عبادت میں مشغول ہوتے تو آپ کے روحانی کمالات کی شہرت سے لوگوں نے جوق در جوق آنا شروع کیا جس سے بھاری اژدھام رہنے لگا۔ اور عوام آپ کے روحانی فیض سے مستفید ہوئے۔

آخری دن

بابا فریدؒ کا وصال ۱۵ اکتوبر ۱۲۶۵ء میں اجودھن میں ہوا۔ آپ اپنے حجرہ میں تھے جہاں آپ مسلسل روزہ رکھنے کی وجہ سے بے حد کمزور ہو گئے تھے۔ اور اسی کمزوری کے عالم میں آپ کا وصال ہوا۔

پنبہ حلاج دار رسم کفن داری نہ بود
خانہ بر دوش فنا سامان داری ہم نداشت

عادات

آپ اپنی حیات میں نہایت سادہ اور درویشانہ زندگی گذارتے رہے۔ بسا اوقات آپکے متعلقین کو فاقوں کی نوبت آجاتی تھی۔ لذت نفس کو آپ عیوب سمجھتے تھے ایک بار فرمایا۔

لذت نفس کے لیے قرض لینے سے تو فقرا کا فاقہ سے مرجانا بہتر ہے۔ قرض اور توکل میں تو زمین آسمان کا بعد ہے۔

آپ کو شہرت اور نام و نمود سے بے حد نفرت تھی۔ خلوت کی زندگی پسند فرماتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ جو شخص شہرت و ناموری کا دلدادہ ہوتا ہے۔ وہ قرب خداوندی سے محروم رہتا ہے۔

حضرت بابا کا کھانا پینا نہایت سادہ تھا۔ وہ پیلو و کریل کے پھل پر گذارہ کرتے تھے۔ فتوحات بکثرت آتی تھیں مگر انھیں فقراء ومساکین میں تقسیم کر دیتے تھے۔

آپ کا لباس نہایت سادہ ہوتا تھا۔ بسا اوقات بوسیدہ اور پھٹے کپڑے زیب تن کئے ہوتے تھے۔

امراء و سلاطین

عوام میں آپکی عقیدت روز افزوں تھیں۔ اس لئے سلاطین وقت کی گردن بھی آپکے سامنے خم ہوتی تھی۔ بادشاہ آپ کو نذرانہ اور عطیات بھیجتے تھے۔ جنھیں آپ غریبوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔

سلطان غیاث الدین بلبن آپ کا بے حد عقیدت مند تھا۔ کیونکہ اس نے حضرت بابا سے کوئی دعا کرائی تھی۔ بعد میں غیاث الدین بلبن کی بیٹی کا عقد بھی حضرت بابا کے ساتھ ہوا جس کے ساتھ بادشاہ نے بہت سامال اور کنیزیں حضرت کو دی تھیں مگر اسے راہ خدا میں لٹا دیا گیا۔

سوشل تعلقات

حضرت بابا فریدؒ پہلے مشترکہ ہندو مسلم سنت ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہندو مذہبی مفکرین سے رابطہ رکھتے تھے۔ بہت سے ہندو جوگی ان کے جماعت خانے میں آتے اور وہ ان سے تبادلہ خیالات کرتے تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء بابا فریدؒ کے جماعت خانہ میں دو بار ان جوگیوں سے ملے۔ اور انھوں نے بنیادی انسانی اقدار اور روحانی مسائل پر گفتگو کی۔

حضرت شیخ فریدؒ نے اپنی بانی میں جو زبان استعمال کی ہے۔ اس میں ہندو جوگیوں کی اصطلاحات بھی پائی جاتی ہیں۔ جو آج کل اردو زبان میں استعمال کی جانے لگی ہیں۔

بابا فرید اور گورو گرنتھ صاحب

حضرت بابا فریدؒ پنجابی زبان کے پہلے تاریخی شاعر ہیں جن کا کلام سینہ بسینہ ہمارے پاس پہونچا۔ آپ کے اقوال و تعلیمات انتہائی موثر اور ایمان افروز ہیں۔ اور یہ بات اعتماد و یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس عظیم صوفی نے انسانیت کے روحانی جذبات کی بے مثال ترجمانی کی ہے۔ آپکی اخلاقی روحانی تعلیمات میں توحید خالص خدا پرستی پاکیزگی اور روحانیت کا پیغام ملتا ہے۔

گورو نانک جی بابا فریدؒ کی تعلیمات سے بے حد متاثر تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے پیروؤں کو اسی توحید، خدا پرستی، اور انسانیت دوستی کی تعلیم دی۔ اور حضرت بابا فریدؒ کے پیغام کو اپنے دھارمک اعتقادات میں شامل کیا۔ گورو گرنتھ صاحب کی تالیف و ترتیب گورو ارجن دیو نے ۱۶۰۴ء میں فرمائی۔ اور اس میں دو شلوک "بابا فریدؒ کے" عنوان سے ایک باب قائم کیا جس میں شیخ فریدؒ کے بارہ اشلوک شامل کئے گئے۔

گورو نانک جی کے پیروان شلوکوں کو گورو گرنتھ صاحب کا مقدس حصہ اور اس طرح سے ایک مسلمان بزرگ صوفی کی تعلیمات سکھ مذہب کے عقائد کا جزو بن گئی ہیں۔ اس حسین امتزاج نے اسلام اور سکھ مت کو قریب سے قریب تر بنا دیا ہے۔

تعلیمات

حضرت بابا فریدؒ کے بیشمار ملفوظات ہیں۔ جن میں سے چند پیش خدمت ہیں۔

۱۔ وہی درویش کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ جو آنکھوں سے اندھا ہو۔ یعنی جسے دوسرو کا عیب نظر نہ آتا ہو جو بہرہ ہو۔ بے ہودہ بات نہ کہے، جو گونگا ہو یعنی نہ کہنے کی بات زبان سے نہ نکالے۔ جو لنگڑا ہو۔ یعنی لذت نفس کے لئے قدم نہ اٹھائے۔

۲۔ درویشی میں سب سے بڑا کام دل کی اصلاح کا ہے۔ جب تک باطن برائیوں سے پاک نہ ہوگا دل کی اصلاح نہ ہوگی۔

۳۔ جو درویش عزت وجاہ کا طالب ہو۔ وہ درویش نہیں بلکہ مرتد طریقت ہے۔

۴۔ جو شخص فقراء کا لباس پہن کر عیش و تن پروری کا دلدادہ ہو۔ وہ انبیاء و اولیائے سلوک کے طریقہ کا خائن ہے۔

۵۔ علم بزرگی کا بادل ہے۔ جس سے رحمت حق کی بارش ہوتی ہے۔

۶۔ عشق اور معرفت میں وہی شخص کامل ہے جسے خدا کے سوا کچھ یاد نہ ہو۔

۷۔ فقراء اور اہل علم ہیں۔ اور علماء اہل عقل لیکن عشق اور عقل میں ضد ہے۔ کام کے آدمی وہی ہیں۔ جن میں یہ دونوں صفات موجود ہیں۔ نبی ان دونوں صفات کے جامع ہوتے ہیں۔

۸ــــ جب درویش پر محبت کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو اللہ کی تجلی کا نور اس کے دل پر اس قدر پڑتا ہے کہ سوائے خدا کے اور کچھ یاد نہیں رہتا۔

۹ــــ جو درویش بادشاہوں یا امیروں کے پاس جاتا ہے سمجھ لو کہ وہ نعمت سے محروم ہے۔ کیونکہ اگر وہ صاحب نعمت ہوتا تو کبھی مخلوق کے دروازے پر نہ جاتا۔

۱۰ــــ راہ فقیری میں وہی شخص ثابت قدم ہے۔ جسے روزی کا فکر نہ ہو۔ آج کھایا کل کیا کرونگا

۱۱ــــ جس طرح موت آدمی کی تلاش میں ہے۔ اس طرح رزق بھی تلاش کرتا ہے جو آدمی دنیا کا طالب ہے اس سے دنیا بھاگتی ہے۔ اور جو شخص دنیا سے بھاگ کر خدا کا طالب ہوتا ہے دنیا اس کی آرزو پوری کرتی ہے۔

۱۲ــــ موت کو کسی جگہ اور کسی وقت نہ بھولو۔

۱۳ــــ کوئی چیز دنیا میں صدقہ سے اچھی اور سخاوت سے بہتر نہیں۔

۱۴ــــ اگر دنیا کو دشمن بنانا ہو۔ تو تکبر اختیار کرو۔

۱۵ــــ آسودگی درکار ہو تو حسد سے دور رہو۔

۱۶ــــ کام کئے جاؤ تاکہ مرنے سے پہلے زندگی حاصل ہو جائے۔ انسان کو جو کچھ ملتا ہے مجاہدے سے ملتا ہے۔

۱۷ــــ جس شخص نے تمہارے ساتھ نیکی کی ہو اسے کبھی نہ بھولو۔

۱۸ــــ مہانوں کے ساتھ تکلف نہ برتو۔ مغرور اور سرکش لوگوں کے مقابلہ میں تکبر اختیار کرو۔

شجرہ نسب حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ

حضرت بابا فریدؒ کا شجرہ نسب حضرت امیرالمومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے ملتا ہے۔

حضرت بابا فریدؒ بن
شیخ جمال الدین سلیمان بن
شیخ شعیبؒ بن
شیخ محمد احمدؒ بن
شیخ یوسفؒ بن
شیخ شہاب الدین فرخ شاہؒ کابل بن
نصیر فخرالدین محمود بن
سلیمانؒ بن
شیخ مسعودؒ بن
شیخ عبداللہ واعظ الاصغرؒ بن
واعظ الاکبر ابوالفتحؒ بن
شیخ اسحاقؒ بن
شیخ ناصرؒ بن
شیخ عبداللہ بن
امیرالمومنین سیدنا عمر ابن الخطاب الفاروق اعظمؓ

بابا فریدؒ کے شلوک

شیخ فریدؒ کی بانی بہت طویل ہے۔ جسے گورو گرنتھ صاحب میں خاص مقام حاصل ہے۔ اس بانی کے کچھ شلوک پیش خدمت ہیں۔

فریدا جے توں عقل لطیف کالے لکھ نہ لیکھ
آپ نڑے گریبان میں سرنیواں کر دیکھ

اے فرید! اگر تو اپنے آپ کو بہت عقل مند سمجھتا ہے تو یہ فضول کے لیکھ مت لکھ۔ تو اپنے گریبان میں نظر ڈال کر دیکھ

فریدا جو تَیں مارن مکیاں تناں نہ مارے گھُم
آپ نڑے گھر جائیے کے پیر تناں دے چُم

اے فرید! جو آدمی تمکو مکہ مارے تو تم اس کو بدلے میں مکہ مت مارو۔ بلکہ اسکے پاس جا کر اُس کے پاؤں پڑو۔

فریدا خاک نہ نندئیے خاکو جیڈ نہ کوئے
جیوندیاں پیراں تلے جویاں اُپر ہوئے

اے فرید! انسان خاک سے پیدا ہوا اور خاک میں مل جائے گا۔ اس لئے خاک کی برائی مت کرو آج خاک پاؤں کے نیچے ہے جب انسان مر جاتا ہے تو یہی سر پر ہوتی ہے۔

فریدا گلیاں چِکڑ دور گھر نال پیارے نیو نہ ہوں
چلاں تاں بھجے کمبلی رہاں تاں تٹے نیو نہ ہوں

اے فرید! گلیوں میں کیچڑ بھرا پڑا ہے۔ اگر میں چلتا ہوں تو میری کملی بھیگتی ہے۔ اگر رک جاتا ہوں تو خدا سے میری پریت ٹوٹ

بھجو سجو کمبلی اللہ برسے مہیوں......!!
جائے ملاں تناں سجناں ٹوٹے ناہیں نہ یوں

میری کملی اور کپڑے تم بے شک بھیگ جاؤ کیونکہ یہ بارش اللہ کے حکم سے برس رہی ہے اور ایسی برسا بارش میں ہی جا کر خدا سے ملاقات کروں اور میری پریت نہ ٹوٹے۔

فریدا چار گنوایا ہنڈ کے چار گنوایا سم
سیکھا رب منگیسیا تو آئیو کیہڑے کم

اے فرید! چار پہر دن تو جھوٹے فریب میں ختم کیا۔ اور چار پہر رات نیند میں گزار دی۔ خدا پوچھے گا تو کس کام کے لئے دنیا میں گیا تھا۔

بڈھا ہویا شیخ فرید کنبن لگی دیہہ
جیسے سو برہیاں جیوناں بھی تن ہوسی کھیہہ

اے فرید! میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور میرا جسم کانپ رہا ہے۔ انسان کتنا بھی زندہ رہے آخر کو مرنا ہے یعنی دنیا فانی

فریدا کوٹھے منڈپ ماڑیاں ایت نہ لائے چت
مٹی پئی اتولویں کوئی نہ ہوسی مت

اے فریدا محل اور حویلیوں سے زیادہ پیار مت بڑھاؤ۔ انسان قبر میں دفن کیا جاتا ہے۔ تو بہت مٹی اوپر ڈالی جاتی ہے اور اس وقت یہ چیزیں کام نہیں آتیں۔

عبدالرحمان پرواز اصلاحی

مفتی صدر الدین خاں آزردہ

مرنے سے پہلے بیمار سنبھالا لیا کرتا ہے۔ مشرقی علوم و فنون کی ترقی ہو یا تہذیب و تمدن کا ارتقا۔ اخلاق و کردار کی جلوہ گری ہو یا شعر و سخن کی ہنگامہ آرائی، مغلیہ سلطنت کا آخری دور دہلی کا سنبھالا تھا۔ بادشاہت تو برائے نام رہ گئی تھی لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس دور نامسعود میں بھی دہلی کے اندر ہر فن کے کاملین کا ایک ایسا جمگھٹا ہو گیا جس کی نظیر ہندوستان تو ہندوستان دنیا کے کسی خطے میں بھی ملنی دشوار ہے۔

فضائل کی جامعیت اور محاسن کی فراوانی کے لحاظ سے حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے فرزندان نامدار حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت مولانا شاہ رفیع الدینؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالقادرؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالغنیؒ یکتائے عصر ہی نہیں بلکہ گم گشتگان راہ حقیقت کے لئے بحر ظلمات میں روشنی کا مینار تھے۔

تبحر علمی اور عبقریت میں حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ۔ مولانا عبدالحئی برھانویؒ مولانا فضل امام خیرآبادی۔ ان کے فرزند مولانا فضل حق خیرآبادی۔ نادرۂ روزگار تھے تو علم و فضل زہد و اتقا میں مولانا شاہ محمد اسحاقؒ۔ مولانا مخصوص اللہؒ۔ مولانا نصیر الدینؒ۔ مولانا عبدالخالق۔ مولانا مملوک علی۔ مولانا رشید الدین۔ مولانا محمد یعقوب۔ میاں صاحب سید نذیر حسینؒ جیسی یگانۂ اوصاف ہستیاں تھیں۔ جن کے دریائے فیض سے تشنگان علم دور دراز گوشوں سے آ آ کر سیراب ہوتے تھے۔

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ نواب قطب الدین خاں، جیسے جامع کمالات بزرگ تھے جن میں ریاست و امارت کے ساتھ علم و فن سے دلچسپی، زہد و ریاضت فقر و درویشی کی صفات حمیدہ جمع تھیں۔

مشاہیر علماء میں مفتی سید رحمت علی۔ مولانا نوازش علی، مولانا امان علی، مولوی محمد جان مولوی محبوب علی، مولانا علاء الدین، مولانا رستم علی، مولوی حاجی محمد۔ ملا سرفراز علی، مولوی محمد بخش عرف تربیت خاں، مولانا عبدالقادر رامپوری، ملا محمد سعید پشاوری، مولوی سدید الدین مولوی جلال الدین ہروری، اخوند شیر محمد قندھاری، مولوی کرامت علی اسرائیلی جیسے جید اور باصلاحیت اساتذہ تھے۔ جن کی علمی مجالس میں درسی فنون کی اعلیٰ اور منتہیانہ کتابوں کے نہ صرف اشکالات پر فاضلانہ و محققانہ گفتگو ہوتی تھی بلکہ ان کے دم قدم سے علوم اسلامیہ کی شمع پوری آب و تاب کے ساتھ ضیا گستر تھی۔

صوفیائے کرام اور مشائخ عظام میں حضرت شاہ غلام علی نقش بندی۔ شاہ ابوسعید لنگے فرزند شاہ احمد سعید و شاہ عبدالغنی۔ حضرت شاہ محمد آفاق۔ حضرت شاہ غیاث الدین۔ خواجہ محمد نصیر۔ (خواجہ میر درد کے نواسے) شاہ یوسف علی۔ شاہ محمد حیات۔ شاہ فدا حسینی شاہ توکل حسین۔ شاہ عسکری مجذوب۔ شاہ عبدالنبی۔ حضرت میر احمد دیوانہ۔ حضرت مرین علی شاہ اور حاجی غلام علی نقیب الاولیاء۔ نصیر الدین کالے میاں جیسے بزرگ اور درویش موجود تھے۔ جن کے فقر و درویشی کی عظمت کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور جن کے حلقہ ارادت میں ہزاروں بندگان خدا مادی ترغیبات سے بے نیاز ہو کر عبادت و ریاضت، اوراد و وظائف تزکیۂ نفس اور اصلاح باطنی میں مشغول تھے۔

اسی دور میں رئیس المجاہدین حضرت سید احمد شہید اور ان کے نامور رفقاء نے نہ صرف جہاد اسلامی کا غلغلہ بلند کیا بلکہ ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ہزاروں افراد میں دین کی عظمت و سربلندی کے لئے جان سپاری اور سرفروشی کا ولولہ پیدا کر دیا۔ دلوں میں ایمان و یقین کا ایسا شعلہ بھڑکا دیا جس کی تپش اور گرمی مدت ہائے دراز تک سرد نہ ہو سکی۔

اردو شاعری میں بانکپن اور نکھار در اصل اسی دور میں آیا۔ خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب۔ حکیم مومن خاں مومن۔ مولوی امام بخش صہبائی۔ مولوی عبداللہ خاں علوی۔ میر نظام الدین ممنون۔ نواب ضیاء الدین نیر درخشاں۔ نواب زین العابدین خاں عارف۔ حافظ عبدالرحمان خاں احسان۔ حکیم آغا خاں عیش۔ نواب غلام حسن محو۔ غلام علی خاں وحشت جیسے چمن معانی کے بلند پرواز طوطی اور گلشن خوش نوائی کے بلبلان نغمہ سنج تھے۔

اسی دور زوال میں مفتی صدر الدین خاں آزردہ جیسے صاحب فضل و کمال پیدا ہوئے۔ ان کی شخصیت مجموعہ اوصاف ہی نہیں گوناگوں محاسن کا گنجینہ تھی۔ عالم باعمل ہی نہیں بلکہ فقیہ بے مثل تھے۔ صرف و نحو، منطق و فلسفہ، ریاضیات و اقلیدس، معانی و بیان ادب و انشاء، فقہ و حدیث، تفسیر و اصول میں فرد فرید اور نادرۂ عصر تھے۔ علماء کی مجلس میں صدر نشین، شعراء کے جمگھٹے میں میر مجلس۔ حکام کے جلسوں میں موقر و ممتاز حکام رس و ذی اقتدار ہی نہیں بلکہ بے کسوں اور محتاجوں کے ملجا و ماویٰ، طالبان علم و فن کے استاد ہی نہیں، بلکہ سرپرست و مربی بھی تھے۔ اسی دور میں کسی مکتب خیال کے لوگ ہوں ان کی سیرت و شخصیت سے متاثر نظر آتے ہیں۔ کوئی نہیں جو ان کے اوصاف حمیدہ

اور خصائل پسندیدہ کا معترف اور ان کے علمی و ادبی ذوق کی بلندی کا مداح رہا ہے۔ زمانے نے جہاں بہت سے ارباب کمال کو طاق نسیان کے حوالہ کر دیا وہاں اب ایک صدی کے بعد ان کی شخصیت بھی اوجھل ہوتی جا رہی ہے۔ ذیل میں مفتی صاحب کے حالات، کارنامے ان کی علمی و ادبی زندگی کے پہلو ان کے کلام پر تبصرہ کرنے کے لئے اردو کے بے شمار .... تذکروں اور کتابوں سے مواد اکٹھا کر کے تفصیلی مقالہ پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ شاید دلچسپی کا باعث ہو۔

ولادت اور خاندان

مفتی صاحب کے جد اعلیٰ خواجہ بہاء الدین عمر ارزمی فاروقی شہنشاہ اکبر کے زمانے میں دہلی آئے اور بادشاہ کے ندماء میں شامل ہوئے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے وقت تک یہ خاندان تجارت پیشہ رہا۔ مولوی خیر الدین ابو الخیر وہ بزرگ ہیں جنھوں نے آبائی پیشہ چھوڑ دیا، علم و عرفان کی طرف مائل ہوئے اور سرچشمہ شریعت و طریقت ہوئے۔ فقہ کی مشہور کتاب فتاویٰ عالمگیری مرتب کرنے والوں میں موصوف ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ وہ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء دہلی میں مدفون ہیں۔ ان کے فرزند مولانا معز الدین امان اللہ شہید نے پدر بزرگوار سے بھی زیادہ عزت و شہرت حاصل کی۔ اپنے زمانہ کے شیخ الاسلام تھے۔ چنانچہ "شیخ الاسلام" سے ان کی تاریخ وفات کا حساب لگایا جاتا ہے۔ نادر شاہ، دہلی شاہ کی جنگ میں شہید ہوئے۔ مفتی صدر الدین آزردہ انھیں کے بھائی مولوی لطف اللہ کشمیری کے فرزند ارجمند ہیں۔

اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا کہ ۱۲۰۴ھ میں دہلی کے اندر مفتی صاحب پیدا ہوتے تاریخ ولادت لفظ "چراغ" سے نکلتی ہے۔ مفتی صاحب کے والد نجابت و شرافت ہی کے لحاظ سے ممتاز نہ تھے بلکہ ذی علم اور ذی حیثیت بھی تھے۔ دہلی کے شرفاء اور اپنے زمانے کے سربرآوردہ لوگوں میں ان کا شمار تھا۔

حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب کے ایک مکتوب سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ کے والد دہلی کے فضلائے معتبرین میں سے اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے مخلص احباب و شاگردوں میں سے تھے۔ چنانچہ مفتی صاحب جب حضرت شاہ عبد العزیز کے مدرسے سے فارغ التحصیل ہوئے اور بسلسلہ ملازمت کلکتہ جانے کا ارادہ کیا تو حضرت شاہ صاحب نے ازراہ شفقت مدرسہ کے مہتمم مولانا امین الدین[۲] کو مندرجہ ذیل تعارفی مکتوب تحریر فرمایا۔

"دریں ولا مولوی صدر الدین صاحب کہ از فضلائے نامدار ایں بلد ما ہوۂ اند و در اکثر فنون عقلی و نقلی از عربیت و ادب و اصول فقہ و کلام و ہم فنون فارسی مہارت دارند و اکثر مراجعت تحقیقات منفیہ علوم در فقیر خانہ نمودہ اند و معہذا نسبت ارادت و اتحاد با فقیر موروثی دارند و جد امجد ایشاں از فضلائے معتبر و مخلص اصحاب و تلامذہ در جناب حضرت والد ماجد فقیر بودند۔ نظم۔

الفوم اخوان صدق بینہم سبب من المودۃ لم یعدل بہ نسب

عازم دارالامارۃ کلکتہ بتقریبات چند در چند اند۔ انشاء اللہ تعالیٰ ملاقات سامی خواہند نمود مراعات مہمات مذکورہ در حسن تلقی و اعزاز و اکرام ایشاں مہما امکن مد نظر سامی باشد۔ والسلام"

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بھی آپکی خاندانی شرافت کا ان الفاظ کے ساتھ تذکرہ کیا ہے "فی الجملہ مولانا از دودۂ بزرگ است۔ بزرگانش از علم و اعتبار بودہ اند۔ مولد و منشاء وی ہمیں بقعۂ مبارک است"[۳]

دہلی کے مشہور عالم اور مناظر مولانا رشید دہلوی کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا۔ مولوی سدید الدین اور مولوی قوام الدین جیسے ارباب علم بھی اسی خاندان سے نسبت رکھتے تھے۔ ہر دور میں علم و فن اور وجاہت و ثروت ساتھ ساتھ اس خاندان میں قائم رہی۔ بزرگوں سے عقیدت و احترام، علماء و فضلاء کی قدر دانی اس خاندان کی مخصوص صفت تھی۔ ذہانت و فطانت اور علوم و فنون سے دلچسپی، فیاضی و سخاوت اور تہذیب و شائستگی کے اوصاف مفتی صاحب کو بڑی حد تک ورثے میں ملے تھے۔ پھر خاندان ولی اللہی کے فیضان نظر نے مزید چار چاند لگا دیئے۔

تعلیم و تربیت

ہر دور کا تعلیمی نظام اپنے عہد کی سماجی اور اقتصادی ضرورتوں کے مطابق ترتیب پاتا ہے۔ نصاب تعلیم اور اس کے مختلف مدارج و مراحل اسی کے لحاظ سے مقرر کئے جاتے ہیں۔ معاشی کفالت کے ساتھ مناصب اور عہدے۔ خوش الحالی اور فارغ البالی چشموں

۱۔ رسالہ معارف نمبر ۶، جلد ۵۹ ۱۹ء

۲۔ مولانا محمد امین کے متعلق "تذکرہ روز روشن" میں ہے کہ علمائے عالی مقام اور فضلائے ذی احترام میں سے تھے۔ سرکاری مدرسہ عالیہ کلکتہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ مختصرات انھوں نے مولوی جمال الدین بہاری اور مطولات مولوی محمد قائم الہ آبادی سے پڑھیں تفسیر و حدیث کی تعلیم حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی سے حاصل کی۔ انکی زندگی زیادہ تر درس و تدریس کے شغلے اور طاعت و عبادت میں گذری۔ میر زاہد پر حاشیہ لکھا، مسلم الثبوت کی شرح لکھنے کا آغاز کیا تھا کہ پیام اجل آ پہنچا۔ فارسی میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت مبارک میں ان کا قصیدہ بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ جس کا مندرجہ ذیل شعر تو اکثر ارباب علم کی زبانوں پر جاری ہے۔

مخدرات سراپردہ ہائے قرآنی چہ دلبرند کہ دل می برند پنہانی

روز روشن مصنفہ مظفر حسین ص ۶

مطبع شاہجہانی بھوپال ۱۲۹۷ھ

۳۔ اتحاف النبلاء المتقین باحیاء ماثر الفقہاء المحدثین مصنفہ نواب صدیق حسن ص ۲۶۱ مطبع نظامی ۱۲۸۰ھ

۴۔ گلشن بیخار ص ۱۲

میں عزت و مرتبہ حاصل کرنے کی فکر ہر دور میں موجود رہی ہے۔ لیکن یہ خصوصیت صرف مسلمانوں ہی کی رہی ہے کہ ان کا تعلیمی نظریہ دنیا کی تمام قوموں سے الگ اور جداگانہ رہا ہے۔ ان کے نزدیک علم کا سب سے بڑا مقصد دین کا حصول رہا ہے۔ اس کے بعد رہے دنیاوی مفادات تو اس کا درجہ ثانوی رہا ہے۔ اس زمانے میں بھی تمام تعلیمی تصورات میں اخلاقی و مذہبی رجحان کا غلبہ رہا۔ دنیاوی معاملات و ضروریات ہوں یا سماجی و معاشرتی تعلقات تمام اقدار کا محور دین ہی رہا۔ تعلیم سے لے کر ریاست و معیشت تک سب اسی کے دائرے میں تھے۔ اس لئے جو لوگ باقاعدہ علوم و فنون حاصل کرنا چاہتے تھے یا فقیہ و محدث اور عالم بننا چاہتے تھے ان کے لئے ملک کے ہر گوشے میں ایسے تعلیمی مراکز موجود تھے پھر بھی دلّی گہوارۂ علم تھی معقولات ہوں یا منقولات دونوں کے مراکز دلی میں پائے جاتے تھے۔ جہاں اس شہر میں دلی کے اندر شاہ غلام علی کی خانقاہ کا مدرسہ۔ بازار خانم کا مدرسہ اجمیری دروازے کا مدرسہ۔ غازی الدین خان کے مدرسے تھے وہاں خاندان ولی اللہی کی سب سے بڑی درسگاہ یعنی حضرت شاہ عبدالعزیز کا سرچشمۂ علم بھی جاری تھا۔ مفتی صاحب نے ہوش سنبھالا تو ولی اللہی مسند علمی پر حضرت شاہ عبدالعزیز اور ان کے بھائی حضرت شاہ رفیع الدین۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کو متمکن پایا۔ منقولات میں ان اصحاب ثلاثہ کا ڈنکا بج رہا تھا تو دوسری طرف معقولات میں حضرت مولانا فضل امام خیرآبادی کا سکہ چل رہا تھا۔

مفتی صاحبؒ نے ابتدائی تعلیم تو اپنے والد ماجد مولانا لطف اللہ کشمیری سے حاصل کی۔ علوم اسلامیہ میں عربی ادب، معانی و بیان، فقہ و اصول۔ کلام و تفسیر کے لئے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے سامنے زانوئے تلمذ کیا۔ حدیث و اصول حدیث، رجال و سیر وغیرہ کی کتابیں حضرت شاہ عبدالقادرؒ اور حضرت شاہ رفیع الدینؒ سے پڑھیں۔ کچھ دنوں حضرت شاہ محمد اسحاق سے بھی استفادہ کیا۔ منطق و فلسفہ، ریاضیات و اقلیدس وغیرہ کی تعلیم حضرت مولانا فضل امام خیرآبادی سے حاصل کی۔ حقیقت میں اس دور کے اندر یہی وہ اساتذۂ علم و فن تھے جو نہ صرف اپنے اپنے فنون میں دستگاہ کامل رکھتے تھے بلکہ پورے ہندوستان میں انھیں درجۂ استناد حاصل تھا۔ ملک کے گوشے گوشے سے شیدائیان علوم والہانہ طور پر انھیں کے کاشانۂ علمی پر آکر حاضری دیتے۔ اور انھیں کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے تھے۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی دونوں ہم سبق اور دوست تھے۔ منقولات کا درس خاندان ولی اللہی کے بزرگوں سے لیتے۔ اور معقولات مولانا فضل امام خیرآبادی سے پڑھتے۔

مولانا فضلؒ امام اس زمانے میں صدرالصدور تھے۔ فرائض منصبی کے علاوہ بقیہ اوقات میں طلبہ کو پڑھاتے۔ مکان کے علاوہ دربار آتے جاتے مولانا فضل حق اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ ہاتھی یا پالکی میں ساتھ جاتے اور اسباق بھی ساتھ ہی پڑھتے۔

تعلیم کے ساتھ تربیت کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ علم کی عظمت سکھائی جاتی تھی۔ استاد کی وقعت کے طریقے بتائے جاتے تھے۔ مولوی اکرام اللہ بروایت مفتی انعام اللہ گوپاموی مولانا احمد علی بروایت مولانا احمد علی اور مولانا بدرالدین علوی بروایت استاد العلماء مولانا لطف اللہ علی گڈھی اس کے راوی ہیں کہ ایک روز علامہ فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین خاں یہ باتیں کرتے آرہے تھے کہ اس خاندان کے لوگ علوم دینیہ، حدیث، فقہ، تفسیر وغیرہ خوب جانتے ہیں مگر معقولات نہیں جانتے۔ یہ دونوں شاہ صاحب تک پہنچے بھی نہ تھے کہ شاہ صاحب نے اپنے خادم کو حکم دیا کہ ایک بوریا مسجد سے باہر صحن میں ڈال دو۔ اور ایک مسجد کے اندر بچھا دو اور جب فضل حق اور صدرالدین آئیں تو ان کو وہیں صحن میں بٹھا دینا۔ ان کے آنے پر شاہ صاحب تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ میاں آج سبق پڑھانے کو جی نہیں چاہتا۔ البتہ یہ جی چاہتا ہے کہ کچھ معقولیوں کی خرافات پر گفتگو ہو۔

یہ دونوں اس میدان کے مرد تھے ہی فوراً بولے "جیسی حضرت کی خوشی" شاہ صاحب نے کہا کوئی مسئلہ لو قوی پہلو تم اختیار کرو اور کمزور مجھے دو۔ چنانچہ "حصول الاشیاء بانفسہا و باشباحہا" پر گفتگو شروع ہوئی۔ شاہ صاحب نے دلائل سے "باشباحہا" کے قول کو ثابت کر دکھایا۔ بالآخر دونوں کو اعتراف کرنا پڑا کہ شکست تو کھا گئے لیکن یہ شکست ضد سے کھائی ہے۔ علمیت سے نہیں۔ لاجواب تو ہو گئے لیکن بات وہی ٹھیک ہے جو ہم کہتے ہیں۔

شاہ صاحب نے فرمایا کہ "تم یہ نہ سمجھو کہ ہم کو معقول نہیں آتی۔ ہم نے اس کو ناقص اور واہیات سمجھ کر چھوڑ دیا ہے مگر اس نے ہمیں اب تک نہ چھوڑا وہ ابھی تک ہماری قدم بوسی کئے جاتی ہے"

مولانا فضل حق اور مفتی صاحب دونوں مولانا فضل امام سے منطق و فلسفہ کا درس لے رہے تھے۔ ایک بنگالی طالب علم بھی وہاں آگیا۔ اور مولانا سے بولا آپ کا نام سن کر دور سے آرہا ہوں۔ آپ نے اشارہ سے ایک جانب بیٹھنے کو کہا جب پڑھا چکے مخاطب ہوئے۔ طالب علم بولا۔ آپ سے مجسطی بطلیموس پڑھنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا میری رائے میں مولوی شاہ عبدالقادر کے درس میں جا بیٹھو۔ وہاں تمہاری مراد پوری ہو جائے گی طالب علم یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا سر جھکا کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ دوپہر کا کھانا محل سرا سے آیا۔ شام ہوتی مولانا صدرالصدوری کا کام انجام دے کر گھر آئے۔ فواکہات کا شغل کیا نماز عصر سے فارغ ہو کر محل سرا سے باہر آئے۔ مفتی صدرالدین خاں اور مولانا فضل حق آن بیٹھے۔ سبق ہونے لگا۔ حسن اتفاق سے درس میں مجسطی ہی کا سبق تھا۔ ادھر ملنے جلنے والے آگئے۔ بنگالی اپنی جگہ سے اٹھا۔ درس میں آبیٹھا۔ اور یہ رنگ دیکھتا رہا۔ احباب بات چیت کر کے سدھارے۔ مولانا آنکھوں میں آنسو لاکے بولا حضور مجھ سے ایسی کیا خطا ہوئی کہ مجھ کو ٹالا جارہا ہے حضور مجسطی پڑھا رہے تھے۔ مجھے حکم ہے شاہ صاحب

۱۔ تذکرہ علمائے ہند رحمان علی صفحہ ۹۳۔ و اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہا صفحہ ۲۴ مطبع نظامی ۱۲۸۰ھ و ابجد العلوم الجزء الثالث صفحہ ۱۹ .... مطبوعہ صدیقیہ بھوپال

۲۔ الثورۃ الہندیہ یعنی باغی ہندوستان صفحہ ۲۹ مرتبہ عبدالشاہد خاں شروانی۔

کے پاس جاتے ہیں۔ مولانا مسکرا دیئے۔ کہنے لگے میاں صحلی ہر کوئی مدرس پڑھا سکتا ہے مگر شاہ صاحب اس طرح پڑھاتے ہیں جیسے حکیم بطلیموس صاحب مجسطی پڑھاتا۔ تمہاری خوشی ہے مجھ سے بھی پڑھ لیا کرو!

سلسلۂ تلمذ

مفتی صدرالدین آزردہ کا سلسلۂ تلمذ یوں ہے۔

منقولات میں: ۱۔ مفتی صدرالدین آزردہ۔ ۲۔ حضرت شاہ عبدالعزیز و حضرت شاہ رفیع الدین و شاہ عبدالقادر۔ ۳۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔ ۴۔ شیخ ابوطاہر مدنی۔ ۵۔ شیخ ابراہیم کردی۔ ۶۔ احمد قشاشی۔ ۷۔ الشمس محمد بن احمد الرملی۔ ۸۔ الزین زکریا الانصاری۔ ۹۔ حافظ ابن حجر عسقلانی۔ ۱۰۔ ابراہیم بن احمد التنوخی المعروف بالبرہان الشافعی۔ ۱۱۔ الشیخ احمد بن ابی طالب الحاج۔ ۱۲۔ ابو عبداللہ الحسین بن مبارک الزبیدی البغدادی۔ ۱۳۔ ابوالوقت عبدالاول بن عیسیٰ بن شعیب بن اسحق السجزی الصوفی الہروی۔ ۱۴۔ جمال الاسلام ابوالحسن عبدالرحمن بن محمد الداؤدی۔ ۱۵۔ ابو محمد عبداللہ بن احمد بن حمویہ السرخسی۔ ۱۶۔ ابو عبداللہ محمد بن یوسف مطر الفربری۔ ۱۷۔ عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم البخاری۔

معقولات میں: ۱۔ مفتی صدرالدین آزردہ۔ ۲۔ مولانا فضل امام خیرآبادی۔ ۳۔ مولانا عبدالواحد کرمانی خیرآبادی۔ ۴۔ ملا محمد اعلم سندیلوی۔ ۵۔ مولانا کمال الدین سہالوی و ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی۔ ۶۔ ملا قطب الدین سہالوی شہید و ملا امان اللہ بنارسی۔ ۷۔ مولانا دانیال چوراسی۔ ۸۔ مولانا عبدالسلام دیوی۔ ۹۔ مولانا عبدالسلام لاہوری۔ ۱۰۔ امیر فتح اللہ شیرازی۔

مولانا دانیال چوراسی کا سلسلۂ تلمذ علامہ جلال الدین محقق دوانی اور ان سے سید شریف ابوالحسین جرجانی اور پھر علامہ جرجانی سے شیخ الرئیس بوعلی سینا المتوفی ۴۲۷ھ تک پہونچتا ہے!

صدرالصدوری کا منصب

یہ عہدہ تنخواہ اور منصب کے لحاظ سے انگریزی دور کے جج کے برابر تھا لیکن معزز ترین عہدہ شمار کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا عمل دخل بڑھا تو انگریزوں کو اس بات کی فکر ہوئی کہ مسلمانوں کے علماء، خاندانی شرفاء ارباب ذی علم و ذی وجاہت، افتاء و صدارت کے مناصب قبول کریں۔ اس لئے اس دور کے اکثر اکابر و افاضل کو اس عہدہ پر سرفراز کیا گیا۔

چوں کہ دہلی پایۂ تخت تھا۔ اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا مرکز۔ اس لئے یہاں کی صدارت کے لئے ایسے ارباب علم و فضل کو انتخاب کیا جاتا جو اس کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہوں۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کے والد ماجد مولانا فضل امام خیرآبادی صدرالصدور بنائے گئے۔ ان کے بعد ان کے شاگرد رشید مفتی صدرالدین آزردہ کو اس عہدہ پر سرفراز کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ان کے متعلق انگریزی ریذیڈنٹ نے اکبر شاہ ثانی بادشاہ سے بھی مشورہ کر لیا تھا۔

نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں۔

"مفتی صاحب کو انگریزی حکومت نے ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۷ء کے قریب صدرالصدور اور مفتی دہلی مقرر کیا اور اس حیثیت سے وہ غربی بلکہ مشرقی و شمالی دہلی میں فتوے دیتے تھے اور امتحان مدارس و صدارت حکومت دیوانی بھی ان کے سپرد تھی بیس سال تک وہ اس عہدے پر فائز رہے"۔[۴]

یہ منصب مفتی صاحب نے جس فرض شناسی، ذمہ داری اور دیانت کے ساتھ انجام دیا اس کی داد نہ صرف انگریزی حکومت کے اعلیٰ افسروں نے دی بلکہ عوام و خواص رعایا میں بھی اس کے چرچے رہے۔ انصاف و عدل گستری کے لئے مثال دی جاتی تو مفتی صاحب کے فیصلوں کی۔

بشیرالدین احمد کہتے ہیں۔

"عدل و انصاف، فریاد رسی عبادات افضل عبادات ہے۔ منصب صدارت کو اپنے ذمہ لیا اور برابر رعایت اور لگاؤ کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرتے رہے۔ لوگوں کے دلوں پر معدلت، راست بازی، حق پژوہی، دیانت و امانت کا نہ مٹنے والا سکہ بٹھا گئے۔ دل رنجور کے لئے مرہم کافور۔ ظالموں اور اشرار کے لئے تادیب دہی میں مشہور، دبدبہ و شوکت ظاہری سے ان کے دربار میں بولنا محال۔ کوئی زبان کھول سکے کیا مجال۔ باوجود مراتب بلند و مناصب ارجمند کے اخلاق محمدی سے متصف۔ افادۂ علوم و افاضت مسائل دینی کے وقت ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو عام آزادی ہے نہ روک ہے اور نہ ٹوک ہے"[۵]

مفتی صاحب کی ان خوبیوں کا ذکر نواب مصطفےٰ خاں بھی کرتے ہیں۔

"جھگڑوں کے فیصلہ کرنے پر مامور ہیں جو منصب اعلیٰ ہے اور جس کو اہل فرنگ کی اصطلاح میں صدرالصدور کہتے ہیں۔ فی زمانہ ان کی سلطنت میں اہل ہند کے لائق اس سے بڑا کوئی عہدہ نہیں ہے۔ مولانا نے اس دنیوی کسب معاش کے ذریعہ کو دینی ثواب حاصل کرنے کا وسیلہ بنا رکھا ہے۔ کیوں کہ ان کی تمام تر کوشش مخلوق کی حاجت

۱۔ مشاہیر جنگ آزادی صفحہ ۹۲ از مفتی انتظام اللہ شہابی۔ ۲۔ الثورۃ الہندیہ ۹۱ و ۹۲۔ ۳۔ صدرالصدور یا صدر کے عہدہ کے لئے اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ (۱۔۱۱۷) میں تفصیلات دیکھی جائیں۔ ۴۔ اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین ص ۲۶۲

۵۔ واقعات دارالحکومت جلد دوم ص ۱۲۸ مصنفہ بشیرالدین احمد شمسی پریس آگرہ ۱۹۱۹ء

روائی میں صرف ہوتی ہے۔ ان کے انصاف کی برکت ہر خاص و عام پر محیط ہے"

جس زمانے میں مفتی صاحب عدالت کیا کرتے تھے۔ دلی کی عدالتیں مشن کالج کشمیری گیٹ پر تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی میز پر ایک لمبا بانس رکھا رہتا تھا۔ جب عدالت میں زیادہ شور و غل ہوتا تھا تو بانس بجا دیا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں ایک ناخوش گوار واقعہ بھی پیش آیا۔ آپ مغلوں کی گلی میں مرزا محمد علی بیگ خلف مرزا خدا بخش خاں قزلباش رسالدار منیجر کے لڑکے کو گرفتار کرنے گئے تو مغل بچے مفتی صاحب سے بری طرح پیش آئے یہاں تک کہ مفتی صاحب اس کو گرفتار نہ کر سکے آپکی عمر میں یہ پہلا واقعہ تھا جو سخت تکلیف دہ گذرا۔

ایک دفعہ آپکے دوست مرزا غالب بہت مقروض ہو گئے۔ قرض خواہوں نے ان پر مقدمہ دائر کر دیا مفتی صاحب کی عدالت تھی جس وقت پیش ہوتے تو یہ شعر پڑھا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

یہ سنتے ہی مفتی صاحب نے اپنے پاس سے ان کے قرضے کا روپیہ ادا کر دیا۔[۲]
مفتی صاحب کی انصاف پسندی کی دھوم صرف عوام ہی تک نہ تھی بلکہ بادشاہ اور گورنر تک کو اس کا اعتراف تھا۔ بہادر شاہ کے روزنامچہ میں ہے کہ۔

" ۱۹ دسمبر ۱۸۵۵ء مولوی صدر الدین صاحب بہادر کے نذرانہ پیش کرتے وقت نواب گورنر جنرل بہادر کے سکریٹری نے کہا۔ آپ لوگوں کی دیانت داری اور انصاف پسندی نیک نامی اور علم فراست سے بہت مسرور اور رضامند ہیں۔

مغلیہ حکومت کے چل چلاؤ کے دن تھے۔ اس بات کو ہر دور اندیش نے محسوس کر لیا تھا۔ مفتی صاحب کو مغلیہ خاندان سے دیرینہ تعلق تھا۔ اس لئے بادشاہ کی جانب سے انھیں جو کچھ ملتا تھا اسے بہت عزیز رکھتے تھے اور بطور تبرک اس کی قدر کرتے تھے ناظر نذیر فسراق لکھتے ہیں۔

" صدر الصدور مفتی صدر الدین صاحب کو صدر الصدوری کی تنخواہ کے سرکار کمپنی سو روپیہ دیتی تھی۔ اور بادشاہ سلامت کے خزانہ سے مفتی کے منصب کے دو روپیہ آٹھ آنے ملتے تھے۔ وہ بھی محبوب علی خواجہ سرانے وزیر ہو کر بند کرا دیئے۔ مفتی صاحب نے بادشاہ سلامت کے ہاں ڈھائی روپیہ کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اور باقاعدہ مقدمہ لڑ کر روپے جاری کرائے صاحب کمشنر دہلی نے مفتی صاحب سے کہا۔ آپ کو ہماری سرکار ہزار روپیہ سے اوپر دیتی ہے آپ نے ڈھائی روپیہ کے لئے اتنی کھکیڑ کیوں اٹھائی۔ مفتی صاحب نے کہا۔ آپ کے ہزار بارہ سو روپئے پر ڈھائی بھاری ہیں۔ یہ تبرک ہے۔ اس پر ہمیں فخر ہے۔"

اس وقت علمائے دین اور مشائخ کا ایک طبقہ انگریزوں کی ملازمت کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ انگریزی حکومت کو غاصبانہ اور ظالمانہ حکومت خیال کرتا تھا حضرت شاہ عبد العزیز نے بھی فتویٰ دیا تھا کہ انگریزی حکومت سے تعاون جائز نہیں۔ اسی بنا پر حضرت شاہ عبد الغنی صاحب مہاجر مدنی بھی انھیں بزرگوں کی طرح مفتی صاحب کی صدر الصدوری کو خلاف تقویٰ سمجھتے تھے۔ حالانکہ مفتی صاحب کو آپ کی ذات والا صفات سے بڑی عقیدت تھی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ شاہ عبد الغنی صاحب کے یہاں کئی دن فاقہ ہوا۔ اس کا تذکرہ ان کی ماں نے کہیں کر دیا۔ اس کی خبر کسی ذریعہ سے مفتی صدر الدین خانصاحب کو بھی ہو گئی۔ مفتی صاحب نے تین سو روپیہ شاہ صاحب کی خدمت میں بھجوا دیئے۔ شاہ صاحب نے وہ روپے واپس کر دیئے۔ اس پر مفتی صاحب وہ روپیہ لے کر خود حاضر ہوئے۔ اور تخلیہ میں پیش کئے۔ اور فرمایا کہ شاید حضور کو خیال ہو کہ یہ صدر الصدور رشوت لیتا ہوگا۔ اس لئے میں عرض کرتا ہوں کہ میں رشوت نہیں لیتا بلکہ یہ روپے میری تنخواہ کے ہیں۔ آپ ان کو قبول فرما لیجئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ مجھے تو یہ وسوسہ بھی نہیں گذرا کہ تم رشوت لیتے ہو گے۔ میں البتہ تمھاری نوکری کو اچھا نہیں سمجھتا اس لئے میں ان کے لینے سے معذور ہوں"

تدریسی خدمات

مفتی صاحب کا تدریسی لحاظ سے بھی دلی کے سر برآوردہ علماء میں شمار تھا معقولات و منقولات میں اعلیٰ درجہ کی دستگاہ رکھتے تھے۔ علمی و ادبی ذوق کے علاوہ آپ کو جس کام سے سب سے زیادہ دلچسپی تھی وہ درس و تدریس کا مشغلہ تھا۔ فرائض منصبی کی ادائیگی کے بعد اونچے درجہ کے طلباء کو اپنے گھر پر پڑھاتے۔ علمائے سلف کے طریقہ پر بلا معاوضہ اور بلا اجرت درس دیتے۔ آپ کی آمدنی کا بڑا حصہ طلبہ کی کفالت پر خرچ ہوتا۔ طلبہ کا ماہانہ وظیفہ مقرر تھا۔ اور لباس تک آپ ہی دیتے تھے۔ جمعہ کو جو تعطیل ہوتی اس میں تمام طلبہ کو اپنے ہمراہ لیکر باغ جاتے۔ طرح طرح کے میوے اور لذیذ کھانے کھلا کر خوش ہوتے۔ آپ کی فیاضی، علم پروری اور طلبہ کے ساتھ حسن سلوک کی شہرت ہندوستان کے گوشے گوشے تک پہونچی ہوئی تھی۔ دور دور سے طلبہ آتے معقولات و منقولات کی تحصیل کرتے بہت سے استفادہ کرتے۔ کچھ بطور تبرک یا محض آپ سے نسبت تلمذ کے لئے چند اسباق فاتحہ فراغ پڑھ کر سند حاصل کرتے اور زمرۂ فضلاء میں شمار ہوتے۔ چنانچہ صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں۔

" و فضلائے عصر بتلمذ ایشاں سربلند دارند۔ خلقی کثیر فاتحہ فراغ در حلقہ درس ایشاں خواندہ اند مردم بلاد دور دست بعد تحصیل و تکمیل علوم متداولہ و فنون رسمیہ بخدمت ایشاں رسیدہ یک دو سبق یا مختصرے در علم خواندہ فراغ حاصل می نمودند۔ سند محصلین و اہل فضیلت معدودی شدند۔"

اس زمانے میں اسکولوں یا کالجوں یا موجودہ دور کے بعض عربی مدارس کے طریقہ پر جماعت بندی یا کلاس سسٹم نہ تھا۔ طلبہ کو اپنی دماغی صلاحیتوں کے اعتبار سے پوری آزادی کے ساتھ آگے بڑھنے کا موقعہ مل جاتا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں مفتی صاحب سے دلی میں پڑھتے تھے۔ مفتی صاحب نے انکی خاص دماغی حالت کو دیکھ کر ان کے لئے اسباق کا الگ انتظام کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ یہ بیان تقریباً نواب صاحب کے اپنے قلم کا قلم بند کیا ہوا ہے!

" ایک سال آٹھ ماہ کی مدت میں کتب دانش مندی کو سبقاً سبقاً حاصل کیا۔ تحصیل کی سند حاصل کی۔ کتب متداولہ علوم رسمیہ جن کو اس مدت میں حاصل کیا یہ ہیں ۱۔ مختصر المعانی تا آخر ۲۔ عبادات شرح وقایہ ۳۔ معاملات ہدایہ ۴۔ اوائل توضیح وتلویح اصول فقہ میں ۶۔ سلم ۷۔ مع ملا حسن ۸۔ وصدرا نش۔ ۹۔ و قاضی مبارک منطق میں ۱۰۔ میبذی تمام ۱۱۔ و قدرے شمس بازغہ ۱۲۔ وصدرا تا مبحث الاجسام تک ۱۳۔ میرزا ہد رسالہ جلال تا بحث دلالت ۱۴۔ میر زاہد شرح مواقف تا بحث وجود ۱۵۔ میرزا ہد رسالہ تا مذہب منصور ۱۶۔ صحیح بخاری کے تین جز سماعاً ۱۷۔ اول تفسیر بیضاوی قراۃً ۱۸۔ دیوان متنبی نصف اول ۱۹۔ بعض دیوان الحماسہ ۲۰۔ سبعہ معلقہ ۲۱۔ مقالہ اقلیدس ۲۲۔ قطبی مع میر ۲۳۔ شرح عقائد نسفی تمام ۲۴۔ حاشیہ بحر العلوم بر میر زاہد ۲۵۔ مقامات حریری وہمدانی ۲۶۔ و چند مقالات شرح مطالع سماعاً صفحہ ۲۴۶ "[1]

اس پر مولانا گیلانی لکھتے ہیں۔

" ایک سال آٹھ مہینے کی مدت کا خیال کیجئے اور چھبیس کتابوں کے اس پشتارے کو ملاحظہ کیجئے۔ آج کوئی باور کر سکتا ہے کہ نصاب نظامیہ کی یہ اعلیٰ سخت دشوار کتابیں ایک شخص نے ڈیڑھ سال دو مہینے میں پوری کرلیں۔ بلاشبہ جماعت کی پابندیوں کے ساتھ اس کا تصور دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ لیکن جس قسم کی آزادی مفتی صاحب نے نواب صاحب کو عطا کی تھی اور خدا نے جیسی طبیعت ان کو ارزانی فرمائی تھی آپ دیکھ رہے ہیں جو بات سوچی نہیں جا سکتی ہے وہ وقوع پذیر ہوتی تھی!"[2]

نواب صدیق حسن صاحب خود اپنی خود نوشت سوانح عمری " ابقاء المنن بالقاء المحن " میں بھی رقم طراز ہیں۔

" مفتی صاحب مرحوم سے علوم آلیہ ادب و منطق و حکومت و تفسیر و فقہ وغیرہ کو حاصل کیا۔ مفتی صاحب نے بعد ختم تحصیل بطاقہ سند مرحمت فرمایا۔ سلسلۃ العسجد میں وہ سند منقول ہے"[3]

اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

" میں یتیم پیدا ہوا۔ کوئی مرد گھر میں نہیں تھا۔ جو مجھ کو تعلیم و تربیت کرتا۔ اللہ تعالٰی نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے شوق کتاب بینی اور علم کا دیا۔ سوا ورق گردانی اور ہر کتاب کے مطالعہ کے کوئی شغل لہو و لعب مجھ کو نہ تھا۔ نہ کسی کھیل تماشہ کا شوق ذوق ہوا۔ یہاں تک کہ جب ذرا شدبد ہو گئی تو علم صرف و نحو پڑھ کر واسطے طالب علم کے دہلی گیا اور وہاں کتب درسیہ کو مفتی صدر الدین خاں مرحوم پر دو برس میں عرض کر کے فارغ ہوا"[4]

نواب صاحب نے مفتی صاحب کے بطاقہ سند کو اپنی کتاب " اتحاف النبلاء " میں بھی نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

" فقیر وقتی کہ در سنہ احدی وسبعین ومائتین والف از خدمت ایشاں جدا شدہ بطاقہ سند بثبت مہر بایں عبارت لطف فرمودند"

" مولوی صدیق حسن صاحب ذہن سلیم وقوت حافظہ وفہم درست ومناسبت تمام با کتاب ومطالعہ صحیح واستعداد تمام دارند۔ جملہ کتب معقول رسمیہ از منطق و حکمت واز علم دین اکثر از بخاری و چیزی از تفسیر بیضاوی وفقہ واصول وعقائد وکلام وعربیت از فقیر الکتاب خواندند ومستعدانہ فہمیدہ خواندند وباوجود آن بسعادت ورشد وصلاح ونیک نہادی وصفائی طینت وعزت واہلیت وشرم وحیاء در اقران وامائل خود ممتاز اندہ"[5]

مفتی صاحب قابل اور ہونہار شاگردوں کی تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ صلاحیت اور استعداد کے مطابق ان سے برتاؤ کرتے۔ ہمیشہ ان کی دلجوئی کرتے کثرت مشاغل کی بنا پر کبھی درس میں تاخیر ہو جاتی یا ناغہ ہو جاتا تو بہت افسوس کرتے۔

حکیم مولوی عبدالمجید خاں رامپوری مفتی صاحب سے پڑھتے تھے۔ مفتی صاحب بحالت طالب علمی ان کے کھانے کے کفیل تھے۔ سبق کے وقت کوئی صاحب مفتی صاحب سے ملنے آئے اس روز سبق ناغہ ہو گیا۔ دوسرے دن حکیم عبدالمجید خاں سبق کے وقت حاضر نہیں ہوتے۔ مولوی عالم مراد آبادی اور نواب قطب الدین خاں ہم سبق تھے۔ مفتی صاحب نے دونوں کو بھیجا کہ دیکھو عبدالمجید خاں کا کیا حال ہے۔ جب دونوں صاحب ملے تو حکیم صاحب نے کہا کہ اب ارادہ پڑھنے کا نہیں ہے۔ مفتی صاحب کو ان کی ذہانت کی وجہ سے بے حد خیال تھا۔ آئندہ کے لئے مفتی صاحب نے وعدہ کر لیا کہ سبق کے وقت کوئی اور کام نہ ہو گا۔ چنانچہ ولی عہد بھی تدریس کے وقت آجاتے تھے مگر مفتی صاحب جواب سلام کے سوا کوئی بات نہیں کرتے تھے"[6]

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مفتی صاحب محکمہ نزول کے کام میں اتنے مشغول ہوئے کہ درس کے لئے کوئی وقت نہ نکال سکے۔ کئی دن تک درس بند رہا۔ طلباء بخت پریشا

۱۔ کتب درسیہ کی مکمل فہرست نواب صدیق حسن خاں نے خود اپنے تذکرہ اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین میں صفحہ ۲۶۳ پر دی ہے (مطبع نظامی ۱۲۸۸ھ)

۲۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت صفحہ ۱۲ حصہ دوم۔

۳۔ ابقاء المنن بالقاء المحن صفحہ مطبع شاہجہانی بھوپال ۴۔ ابقاء المنن صفحہ ۸۹۔

۵۔ اتحاف النبلاء صفحہ ۲۶۳ ۶۔ تذکرہ کاملان رامپور مولفہ حافظ احمد علی خاں شوق صفحہ

ہوئے۔ آخر ایک منچلے شاگرد نے جرأت کر کے ایک نظم لکھی۔ جس کے اس شعر سے اس واقعہ کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

ہاتف بدست چپ سر بنی فشردہ گفت — بیماری نزول بہ صدر الصدور شد

اس نظم کا یہ اثر ہوا کہ مفتی صاحب نے درس کا سلسلہ شروع کر دیا![1]

مدرسہ دار البقاء کا قیام

عہد شاہجہانی کا مشہور مدرسہ دار البقاء کی عمارت شکستہ ہو گئی تھی۔ یہ مفتی صاحب کا بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اسے از سر نو تعمیر کرایا اور اس میں تعلیم و تعلم کا دوبارہ نظم و نسق قائم کیا چنانچہ سر سید احمد خاں آثار الصنادید میں لکھتے ہیں اور آپ کی علم نوازی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"(جامع مسجد کے جنوبی دروازہ کی طرف) مدرسہ دار البقا ہے۔ اگلے زمانے میں اس طالب علم رہا کرتے تھے۔ اور معقول اور منقول پڑھا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ بالکل خراب و برباد ہو گیا تھا۔ اور بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ زمانہ اہل اللہ سے خالی نہیں اور ہر وقت میں کوئی نہ کوئی صاحب ہمت عالی اور فطرت بلند ہوتا ہے۔ اور یہ ہمت اور دل اور جود و سخا سوائے اس کے جس پر اللہ کا سایہ رحمت ہو اور کسی کو میسر نہیں ہوتا۔ اس زمانے میں اللہ تعالے نے جناب مولانا مولوی محمد صدر الدین خاں بہادر صدر الصدور شاہجہان آباد کو ہمت بلند اور فطرت ارجمند عنایت کی ہے۔ شاید اگلے زمانے میں کسی کو نہیں ہوگی۔ جناب ممدوح نے اپنی عالی ہمتی سے اس دار البقا کو زر خطیر صرف کرا کر از سر نو مرتب کرایا ہے۔ اور شاہجہانی طور پر جو جو حجرے اس کے ٹوٹ گئے تھے ان کو نئے سرے سے بنایا ہے۔ اور مدرس نوکر ہیں۔ اور طالب علم پڑھتے ہیں۔ ان کی خبر گیری نان و پارچہ کی ان کی سرکار عالی سے ہوتی ہے۔ سبحان اللہ غور کرو کہ یہ چشمہ فیض ہے کہ ان کی ذات فیض آیات سے جاری ہے۔ اور شجر ہائے پر بار دین کو پانی دیتا ہے دنیا میں بجز نیک نامی کے کچھ نہیں رہتا ہے۔ اور عقبیٰ میں بجز اعمال کے اور کچھ نہیں جاتا ہے۔ یہ دونوں باتیں اللہ تعالے نے انھیں کے لئے پیدا کی ہیں"[2]

اس مدرسہ میں طلبہ کے جملہ اخراجات کے[3] علاوہ مدرسین کی تقرری اور ان کی تنخواہوں کی ذمہ داری بھی مفتی صاحب نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ اس مدرسہ کے مدرسین کے سلسلہ میں دو کے متعلق سر سید لکھتے ہیں۔

۱۔ "حاجی محمد صاحب ساکن ہیں نواح جونپور کے اور بعد ادائے حج بیت اللہ کے شہر شاہجہاں آباد میں وارد ہوئے۔ اور مولانا محمد اسحاق صاحب سے کتب حدیث کو تحصیل کیا۔ اگرچہ اور فنون سے بھی آگاہ ہیں لیکن فن حدیث کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ ورع و تقوی میں مستثنیٰ ہیں۔ راقم نے جناب مستطاب مولانا مخدومنا مولوی محمد صدر الدین خاں بہادر کی خدمت میں ان کو حاضر ہوتے دیکھا اور ان کے جوہر سے مطلع ہوا۔ اس واسطے کہ حاجی صاحب مولانا موصوف کی طرف سے مدرسہ دار البقا میں مدرس ہیں"[4]

۲۔ ملا سرفراز۔ یہ بھی بڑے مستعد شخص ہیں۔ کتب معقول و منقول و حکمت و ہندسہ و ہیئت بہت تحقیق سے پڑھاتے ہیں۔ حدیث و تفسیر جناب مولوی صدر الدین خاں بہادر سے پڑھی ہے اور اب جناب ممدوح کی طرف سے مدرسہ دار البقاء میں مدرس ہیں"[5]

مرحوم دہلی کالج سے تعلق

ہندوستان میں پہلی درسگاہ جس میں بلا لحاظ مذہب و ملت تعلیم کا مشترکہ نظم قائم کیا گیا وہ مرحوم دہلی کالج ہے۔ پہلے یہ غازی الدین خاں کا مدرسہ کہلاتا تھا۔ ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہو گیا۔ اس کالج کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور انگریزی کے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ اور ہر مضمون کے لئے اس زمانے کے جید اور با صلاحیت اساتذہ تعلیم دیتے تھے۔ اس کے نامور اساتذہ میں مولانا مملوک علی نانوتوی، مولوی سبحان بخش، ماسٹر وزیر علی، ماسٹر امیر علی، مولانا امام بخش صہبائی، ماسٹر رام چندر، پنڈت رام کشن، مولوی احمد علی، میر اشرف علی، ماسٹر حبیبی، مولوی حسن علی وغیرہ تھے۔

اس کالج کو گرچہ انگریزوں نے قائم کیا مگر اس سے وسیع النظری اور رواداری کی فضا قائم ہوئی۔ ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کے جذبات پروان چڑھے تحقیق و ریسرچ کا ذوق پیدا ہوا۔ علمی و ذہنی بیداری پیدا ہوئی۔ اردو کے صاحب طرز ادیب و نقاد اور چوٹی کے مصنف اور بلند پایہ شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ شمس العلماء محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، مولوی کریم الدین، ماسٹر پیارے لال اور ماسٹر رام چندر وغیرہ اسی کے تعلیم یافتہ تھے۔

مفتی صدر الدین آزردہ اس کالج کے ایک اہم ممبر اور ممتحن تھے۔ اس کے تعلیمی مشوروں اور کالج کی ترقی کے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ مولوی عبد الحق... لکھتے ہیں۔

"کالج کے انتظام کے لئے ایک مقامی مجلس تھی جو لوکل کمیٹی کہلاتی تھی۔ اس کا فرض تھا کہ وہ کالج کے تمام معاملات کی نگرانی کرے اور اس کی بہبودی پر نظر رکھے۔ لیکن اس کے اختیارات بہت محدود تھے۔ ہر انتظامی اور

۱۔ غدر کے چند علماء از مفتی انتظام اللہ شہابی صفحہ ۴۶ — ۲۔ آثار الصنادید مطبوعہ نول کشور ۱۸۷۶ء تیسرا باب صفحہ ۱۱ و ۱۲ اس کتاب کے ہر باب کے لئے الگ الگ ٹائٹل ہے اور یہ قدیم نسخہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ — ۳۔ نزہۃ الخواطر صفحہ ۲۲۱ میں ان وظیفہ خوار طلبہ کی تعداد ۵۰ دی ہے۔

۴۔ آثار الصنادید۔ چوتھا باب صفحہ ۲ — ۵۔ آثار الصنادید۔ چوتھا باب صفحہ ۲

تعلیمی امر کے لئے گورنمنٹ یعنی لفٹنٹ گورنر کی منظوری ضروری ہوتی تھی لیکن
مجلس کی رائے کی کالج کے معاملات میں گورنمنٹ وقعت کرتی تھی۔ اکثر
معاملات میں اسکی تجویز کے مطابق منظوری دیجاتی کیونکہ اس کے رکن
موزوں اور قابل لوگ ہوتے تھے۔ اور دلی۔ دلی والوں، اور دلی کالج
سے بہت زیادہ واقف تھے۔ اور سکریٹری تو کالج کا پرنسپل ہوتا تھا بقایا
سائیر مجلس کوئی بڑا سرکاری عہدہ دار ہوتا تھا۔ شروع شروع میں اس کے صدر
دہلی کے ریذیڈنٹ کمشنر مسٹر ر۔ ٹی۔ مٹکاف تھے۔ اور ارکان مسٹر کالون
جائنٹ مجسٹریٹ اور ڈاکٹر راس سول سرجن تھے مجلس کے ارکان میں نواب
حامد علی خاں شریک کئے گئے مسٹر ٹیلر مجلس کے سکریٹری اور کالج کے ....
سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوتے۔

۱۸۴۲ء میں علاوہ مذکورہ بالا صاحبوں کے مسٹر سی۔ گرانٹ۔ نواب حسام الدین (جو دہلی کے امراء میں سے تھے) اور مولوی صدر الدین صدر امین اعلیٰ بھی مجلس کے ارکان مقرر کئے گئے[1]

مفتی صاحب عربی اور فارسی کے امتحانات بھی لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۴۸ء میں امتحان ہوا تو ریاضیات اور تاریخ کے پرچے گورنمنٹ نے مرتب کرا کر بھیجے۔ باقی پرچے کالج کے مدرسین نے تیار کئے۔ باقی جماعتوں کا امتحان اردو کے مولوی مملوک علی نے اور انگریزی کا قائم مقام پرنسپل نے لیا۔ مسعودی، تاریخ یمینی، قدوری، میر قطبی، حماسہ حسینی کے پرچے گورنمنٹ نے بھیجے اور سنی اور شیعہ طلباء کی اعلیٰ جماعتوں کو دیئے گئے۔ انکے تحریری جواب مفتی صدر الدین صاحب نے معائنہ کئے۔ عربی کی باقی جماعتوں کا امتحان بھی مفتی صاحب ہی نے لیا۔ عربی جماعتوں کے پرچے ڈاکٹر اسپرنگر نے بھی دیکھے۔ فارسی جماعتوں کا امتحان بھی مفتی صاحب نے لیا۔ ان کی رائے میں ان جماعتوں کے طلباء کی قابلیت نہایت عمدہ تھی![2]

مفتی صاحب نہ صرف طلبا کے امتحانات لیتے بلکہ انعامات و تمغے دیکر انکی حوصلہ افزائی بھی فرماتے۔ مٹکاف صاحب مرگئے تھے۔ اس لئے کالج فنڈ سے ہر سال بیس روپئے کا تمغہ تیار کرایا جاتا تھا۔ اور انگریزی میں سب سے بہتر مضمون لکھنے والے کو ملتا تھا۔ اس سال یہ تمغہ بھگوان داس کو ملا۔ مفتی صدر الدین کا تمغہ اردو زبان میں بہترین مضمون لکھنے والے کو دیا جاتا تھا۔ وہ خواجہ ضیاء الدین کو ملا۔ مضمون کا عنوان تھا یہ شاہی اور مخلوط قسم کی حکومت میں کونسی بہتر ہے اور اسکی فضیلت کی کیا وجہ ہے۔؟"[3]

مفتی صاحب کے فیاضانہ سلوک اور طلبہ کی حوصلہ افزائی پر دہلی اردو اخبار نے انکی تعریف کی ہے لکھتا ہے۔

"ہم نہایت درست اپنی تحقیق سے لکھتے ہیں کہ حقیقت میں ہمارے صدر الصدور صاحب کی ذات مجمع الصفات بھی نہایت ارفع ہے۔ یکتائے روزگار ہے۔ اس حکومت اور ریاست و عظمت فضل اللہ دلی پر یہ حسن اخلاق اور پاس صفت وقار علمیت جو کہ نتیجہ کمال علم کا ہے۔ اس زمانہ میں بہت کم ہے۔ ہمارے ہندوستانی صاحبوں میں ایسا جامع کمالات مفقود پایا جاتا ہے۔"[4]

کالج میں طلبا کو وظائف دیئے جاتے تھے۔ اس میں مقابلہ ہوتا اور کامیاب طلبا وظیفہ کے مستحق گردانے جاتے۔ اس سلسلہ میں مفتی صاحب سے بھی مشورہ لیا جاتا تھا مولوی عبدالحق لکھتے ہیں

"۱۸۴۹ء شعبہ مشرقی (عربی) میں سال گذشتہ کے وظیفہ خواروں کے علاوہ چار اعلیٰ وظیفے پانے والے اور آٹھ ادنیٰ وظیفے والے تھے۔ جن میں ایک طالب علم نذیر احمد بھی تھا۔ (یعنی دلی کے مولوی نذیر احمد) انکے سوا، طلباء کو چار چار روپئے وظیفے دیئے جاتے تھے۔ شعبہ فارسی میں چار ادنیٰ وظیفہ پانے والے تھے جن میں ایک ذکاء اللہ بھی تھے سنسکرت شعبے میں ایک اعلیٰ وظیفہ پاتا تھا۔ اور سات کو چار چار روپئے کا وظیفہ ملتا تھا۔ اس سال ۴۲ بیرونی طلباء عربی و فارسی کے وظیفے کے مقابلے کے لئے شریک امتحان ہوتے۔ مفتی صدر الدین صاحب نے امتحان لیا۔ انمیں سے ۶ وظیفے کے قابل نکلے۔

اساتذہ کی تقرری میں بھی مفتی صاحب کا مشورہ شامل رہتا۔ چنانچہ دلی کالج میں مولانا امام بخش صہبائی کے تقرر کا عجیب واقعہ نقل کیا گیا ہے جس کا حالی نے بھی "یادگار غالب" میں ذکر کیا ہے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔

"۱۸۴۰ء میں جب آنریبل مسٹر ٹامسن لفٹنٹ گورنر مدرسے کے معائنے کے لئے آئے تو انھوں نے یہ تجویز کی کہ ایک مستند فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہیے۔ مفتی صدر الدین خاں صدر الصدور نے عرض کی۔ ہمارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین شخص ہیں۔ ایک مرزا نوشہ، دوسرے حکیم مومن خاں، تیسرے امام بخش صہبائی۔ لفٹنٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ بھلا یہ روگ کیوں پالنے لگے تھے۔ انھوں نے تو انکار کر دیا مومن خاں نے یہ شرط پیش کی کہ سو روپے ماہانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ انھوں نے یہ خدمت چالیس روپے ماہانہ کی قبول کر لی۔ بعد میں پچاس ہو گئے۔

سیاسی مہم پر

انگریز ریذیڈنٹ آپکی سیاسی سوجھ بوجھ اور معاملہ فہمی کے بڑے معترف تھے ڈیوڈ اکٹر لونی جو ۱۸۱۱ سے ۱۸۲۵ء تک دہلی کے ریذیڈنٹ رہے جب آپ راجستھان کی سیاسی مہم پر جانے لگے تو مفتی صدر الدین آزردہ جنرل ڈیوڈ اکٹر لونی کے ساتھ اجمیر نیمچ اور جے پور کے سفر میں ان کے ساتھ رہے۔ جنرل اور اس کے داماد کی کلید دانش رہے۔ چار سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ صاحب ممدوح نے انکی تعریف میں دفتر کے دفتر صدر کو لکھ مارے اور اس قدر ان پر اعتماد کیا، ریواں، سرپال اور راجہ جے پور کی والدہ کے درمیان تکرار کے تصفیہ میں مفتی صدر الدین کو پولیٹیکل ایجنٹ پر امین مقرر کیا۔ فاضل زود فہم خوش تقریر، دوست نواز اور دشمن گداز رہیں۔

۔ ۔ ۔

۱۔ مرحوم دہلی کالج صفحہ ۲۲ مصنفہ مولوی عبدالحق شائع کردہ انجمن ترقی اردو، کراچی (پاکستان) ۲۔ مرحوم دہلی کالج صفحہ ۵۲ و ۵۳ ۳۔ مرحوم دہلی کالج صفحہ ۵۲ ۴۔ دہلی کالج اردو اخبار ۲۶ دسمبر ۱۸۵۳ء

پروفیسر رشید احمد صدیقی

مولانا ابوالکلام آزاد — مرحوم

مولانا مرحوم سے خط و کتابت عمر بھر میں دو بار ہوئی ۔ ملاقات صرف ایک بار وہ بھی ان کے آفس میں چند منٹ کے لئے ۔ ٹویوٹی سوسائٹی سے متعلق غالباً ۱۹۴۸ء کے آخر میں ! اس طرح میں ان لوگوں میں ہوں جو مرحوم کے بارے میں براہ راست بہت کم واقفیت رکھتے ہیں ۔ مرحوم کی نجی ، قومی یا علمی زندگی سے اسی حد تک متعارف ہوں جس حد تک کتب رسائل، تقاریر اور مختلف اشخاص کی مدد سے میری جیسی محدود فہم و فکر کا آدمی مولانا جیسی عظیم شخصیت سے ہو سکتا ہے ۔

بہت سے دوسرے اصحاب کی مانند مولانا سے میری غائبانہ اس لئے بہت گہری عقیدت اس وقت سے ہے جب بلقان اور طرابلس کی جنگ برپا تھی ۔ الہلال میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے اور میں اسکول کا طالب علم تھا ۔ کیسے اچھے وہ دن تھے جب جینے کی ہر خوشی مجاہدوں کے نیار میں جان دینے کی اس دعوت و بشارت میں نہیں ہوتی تھی جو مولانا کی آتش نوائی میں ملتی تھی ۔

مگر وہ دور کتنا مسعود اور کتنا عجیب تھا جب اچھے اور بڑے کاموں کے لئے جیتے رہنے اور جان دینے دونوں کی یکساں خوشی ہوتی تھی ۔ گذرے ہوئے دنوں کی یاد کس کو نہیں عزیز ہوتی بالخصوص بوڑھوں کو جنھیں صرف ماضی کی جائے پناہ میسر ہوتی ہے ۔ اس لئے یہ کہنا کہ وہ عہد کتنا مسعود اور کتنا عجیب تھا واقعہ کے اعتبار سے ممکن ہے اتنا صحیح نہ ہو جتنا اپنی یاد کے اعتبار سے میرے لئے حسین و عزیز ہے ۔ بہرحال وہ زمانہ کب کا ختم ہوا اور زمانہ بھی کیا کرے اس کی تقدیر ہی یہ ہے ۔ آج مولانا آزاد بھی اس دنیا سے اٹھ گئے ۔ کس کو یاد کرکے کس کا ماتم کروں ۔!

مولانا ان برگزیدہ ہستیوں میں تھے جو اپنے عہد سے بڑی تھیں، وہ آزمندۂ عہد تھے اس لئے ان کی کشمکش ایسے لوگوں سے رہتی جو زائیدۂ عہد ہوتے ۔ وہ ہماری تاریخ، ہماری تہذیب اور ہمارے علوم کا اعتبار و افتخار تھے ۔ اس کا احساس آج ہو رہا ہے جب وہ ہم میں نہیں رہے ۔ کیا کیا جائے ایسا احساس بھی ایسے ہی وقت ہوتا ہے ۔!

سیاسی پلیٹ فارم پر مولانا کے آنے کا وہی زمانہ تھا جب مسلم یونیورسٹی کی تحریک ملک میں پھیل چکی تھی، اور ہز ہائی نس آغا خاں اور مولانا محمد علی اور شوکت علی بھی ہمارے ویسے ہی ہیرو بنے ہوئے تھے جیسے بلقان اور طرابلس کے جانباز مجاہد ۔ اس سے پہلے مسلم لیگ قائم ہو چکی تھی اور تقسیم بنگال اور اس کی تنسیخ کا عمل اور ردّ عمل بھی سامنے آچکا تھا ۔ برطانوی تسلّط سے نجات حاصل کرنے کے لئے مولانا آزاد نے ہندوستانی قومیت کے متحدہ محاذ کا انتخاب کیا ۔ اصولاً وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی تحریک اور مسلم لیگ کے پروگرام کی تائید میں نہ تھے، وہ ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف نہیں بلکہ دونوں کو انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونے کی دعوت دیتے تھے ۔ اس عقیدے کی حمایت میں ان پر کیسے کیسے حادثات نہیں گذر گئے ۔ دو چار سال نہیں کم و بیش نصف صدی تک گذرتے رہے ۔

قطع نظر اس سے کہ مولانا نے اپنی غیر معمولی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے کس محاذ جنگ کا انتخاب کیا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا ۔ مجھے جو چیز سب سے عجیب اور عظیم نظر آتی وہ ان کا اپنی فراست پر بھروسہ اور اپنے عقیدے کی پکی تھی ۔ کتنی مدت پہلے انھوں نے اسی فراست کی روشنی میں جو راستہ اختیار کیا اور جس منزل کو سامنے رکھا اس سے تمام عمر سرِمو انحراف نہیں کیا ۔ اس زمانے میں تذبذب اور تفرقے کی کیسی کیسی نزاع اور نزاکتوں کا سامنا ہوا اور ان کی زد میں آکر کیسے کیسے ساتھیوں نے فکر و عمل میں کیسے کیسے ردّ و بدل کئے لیکن مولانا نے اپنے اختیار کئے ہوئے راستے سے منہ نہ موڑا ۔ سیاست کے صحیفے میں اس طریق عمل کو کبھی کبھی نہیں بھی سراہا گیا ہے ۔ لیکن اس کو کیا کہئے کہ بالآخر ان تمام چھوٹے بڑے ساتھیوں اور سرداروں کو جو سیاست کے الیاس و خضر یا قیس و کوہ کن سمجھے جاتے تھے ۔ اسی راستے پر آنا اور اسی کعبۂ مقصود کی طرف پلٹنا پڑا جو مولانا کا بنایا ہوا تھا ۔

مولانا کا ایک فقرہ اس وقت یاد آرہا ہے جو کہیں نہ کہیں یا تو نظر سے گذرا ہے یا سننے میں آیا کچھ اس طرح کی بات کہی ہے، تم لوگ پانی اور کیچڑ کو دیکھ کر بارش کا یقین کرتے ہو میں اس کو ہوا میں سونگھ کر جان لیتا ہوں ۔ دنیا کے کم لیڈروں کو یہ درجہ نصیب ہوا ہے ۔

بلقان اور طرابلس کی جنگوں کا نعرہ مولانا کی زبان اور قلم سے نکل کر پہلی بار ہمارے کانوں میں گونجا اور دل میں اتر گیا ۔ ان کی تحریر و تقریر کی بجلیاں اور زلزلے ہندوستان میں وہی کام کر رہے تھے، جو مسلمان مجاہدین یورپ اور افریقہ کے میدان کارزار میں اپنے لہو اور تلواروں سے انجام دے رہے تھے یہاں تک کہ کبھی کبھی ہمارا تصور تاریخ کی کتنی صدیوں اور کھنڈروں کو روندتا کھوندتا اس عہد شرف و سعادت میں پہنچ جاتا جہاں شیدائیانِ اسلام داد شجاعت و شہادت دے رہے تھے ۔ اس زمانہ میں مولانا یا ان کے اخبار الہلال کے خلاف حکومت کوئی تادیبی کارروائی کرتی، اخبار سے ضمانت طلب کی جاتی یا مولانا کو نظر بند کر دیا جاتا تو ایسا ہی محسوس ہوتا جیسے مسلمانوں کا کوئی جانباز جنرل میدانِ جنگ میں اسیر ہو گیا یا کام آگیا ۔ بلقان اور طرابلس کے محاربے (حق و باطل کی جنگ) جہاں کہیں جب کبھی برپا ہوں گے مولانا کی تحریریں اور تقریریں دعوت دار و رسن دیتی رہیں گی ۔

یہ پہلا موقع تھا جب مولانا کی تحریروں کے طفیل ہندوستان کے مسلمانوں کو دور دراز بکھرے ہوتے مسلمانوں کی ابتلا و آزمائش میں شریک ہونے کا احساس و افتخار ہوا۔ گو یہاں اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے دکھ درد میں شریک ہونے کی توفیق باہر کے مسلمانوں کو کبھی نہیں ہوئی یہاں کے زعماء کو نہ عوام کو۔ اور یہ ہندوستانی مسلمان کا کارنامہ ہے جس کی ہندوستانی قومیت کی حامی سے کٹر سے کٹر ہندو اور جس کے اسلامی تصورات، مذہبی معتقدات اور دینی خدمات سے کٹر سے کٹر مسلمان انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ بایں ہمہ ہندوستانی قومیت کی حمایت میں جتنا ظلم و جور اپنے ملک کے مسلمانوں کے ہاتھوں مولانا ابوالکلام آزاد نے اٹھایا وہ ہندوستان میں شاید ہی کسی دوسرے مسلمان کے حصہ میں آیا ہو۔

گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگیوں میں ایک بات کتنی المناک لیکن اتنی ہی عظیم الشان نظر آتی ہے۔ مسلمانوں کی حمایت اور غم خواری میں اور اس وقت جب کہ مسلمانوں کے جان و مال و آبرو کی کوئی قیمت اور وقعت نہیں رہ گئی تھی۔ گاندھی جی اپنی ہی قوم کے ایک فرد کی گولی کا نشانہ بنے۔ مجھے اپنی لاعلمی پر ندامت ہو گی لیکن فرط افتخار سے سر اونچا ہو جائیگا اگر کبھی یہ معلوم ہو سکا کہ گاندھی جی کی طرح کسی بڑے مسلمان کو غیر مسلموں کی حمایت میں جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ہندوستان کی دو اتنی بڑی ہستیوں کے ساتھ ان کے ہم مذہبوں نے کیا سلوک کیا اس پر کسی اور کو نہیں ہم ہندوستانی مسلمانوں کو ضرور غور کرنا چاہئے۔

تقسیم ملک سے اب تک ہندوستان کی سیاست جن دشواریوں اور نزاکتوں سے گذری اور اب تک گذر رہی ہے اس کو تفصیل سے بیان کرنا نہ تو ضروری معلوم ہوتا ہے نہ میرے بس کی بات ہے۔ لیکن اس دوران میں حکومت ہندوستان کی خارجی اور اندرونی پالیسی پر مولانا کی سیاسی بصیرت، آئینی تدبر، اخلاقی بلندی، علمی فضیلت اور شخصی وقار کس طور پر اثر انداز ہوتا رہا کسی تفصیل کا محتاج نہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور نگہداشت کے نہایت درجہ مشکل اور نازک فرائض جس خاموشی دلسوزی اور قابلیت سے مولانا نے انجام دئے وہ انھیں کا حصہ تھا۔ مولانا کی خدمات کی اہمیت اس لئے اور بڑھ جاتی ہے کہ ان کو مسلمانوں کی حمایت اور ان کے گرتے ہوئے حوصلوں کو اونچا کرنے اور رکھنے کے فرائض ایسے حالات اور ایسے زمانے میں انجام دینے پڑے جو سے زیادہ مشکل اور نازک زمانہ مسلمانوں پر اس برصغیر میں شاید پہلے کبھی نہیں گذرا تھا۔

مولانا نے جس طرح جس حد تک جن دشواریوں سے دوچار رہ کر جس کامیابی کے ساتھ ہندوستان کے تباہ حال مسلمانوں کو تسکین دینے اور تقویت پہونچانے کی خدمت انجام دی اس سے بڑی خدمت اس سیکولر جمہوریہ کی ساکھ اندرون و بیرون ملک قائم کرنے میں کوئی اور نہیں انجام دے سکتا تھا۔ ہندوستان کی حکومت مولانا کی اس خدمت کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ کس عظمت اور کیسی عبرت کا یہ مقام تھا کہ یہ فریضہ یکہ و تنہا اس مسلمان کے حصے میں آیا جس سے زیادہ مطعون اور مغضوب تقسیم ملک کی لات سے پہلے مسلمانوں ہی کے نزدیک کوئی دوسرا مسلمان نہ تھا۔

ہندوؤں یا حکومت ہند میں یہ غیر معمولی ساکھ مولانا نے محض حسن اتفاق سے نہیں پیدا کر لی تھی۔ ہندو بھی ہمارے ہی آپ جیسے انسان ہیں۔ ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں اور رہے ہیں جن میں مولانا کسی سے پیچھے نہیں اور بہتوں سے آگے تھے۔ جن کا سابقہ انسانیت سے

نا آشنا ہستیوں سے ہوتا تو وہ ان میں بھی اپنی ہر دلعزیزی کا سکہ منوا لیتے۔ سفاکی و ناشائستگی سے نہیں برگزیدگی اور بہادری سے مولانا کو جبر و ملامت کی جن آزمائشوں سے گذرنا پڑا ہو گا تب کہیں جا کر یہ منزلت حاصل ہوئی ہو گی جو ہر برشاخ گل افعی گزیدہ بلبل را کا جیسا تجربہ مولانا کو گذرا ہو گا اس کا احساس ان لوگوں کو کیسے ہو سکتا ہے جو نہ اس صورت حال کے آشنا ہیں جن میں مولانا گرفتار تھے نہ اس کرب سے جو شاعر نے اس شعر میں بھر دیا ہے۔

حکومت میں مولانا کو بعض ساتھیوں کے تعصب اور تنگ نظری کا بھی مقابلہ کرنا پڑا تھا کس غیرت مند کو نہیں کرنا پڑا۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب نامساعد حالات کا ہجوم تھا ان پر جو گذرتی تھی اور کیا کچھ نہیں گذرتی تھی اس کو وقار اور خاموشی سے سہتے تھے مولانا کو اپنا ہم خیال بنانے ہی کبھی تامل نہیں ہوا لیکن اپنا غم گسار بنانا انھوں نے کبھی گوارا نہیں کیا۔ یہ ان کی طبیعت کا بڑا امتیاز خاصہ تھا۔ وہ اپنے عزائم کے سامنے کسی دشواری کو ناقابل تسخیر نہیں سمجھتے تھے دنیوی جاہ و منزلت سے بے نیاز تھے کسی سے جھگڑتے نہیں تھے۔ جھگڑنا اپنے رتبے سے فروتر سمجھتے تھے لیکن اس کی نوبت آجاتی تو اپنی سطح سے نیچے نہیں اترتے تھے۔ حریف کے مقابلے میں یہ ان کی پہلی جیت ہوتی تھی۔

علم کی معرفت اور مذہب کے شرف و سعادت نے ایسی بلند نظری اور خود اعتمادی پیدا کر دی تھی کہ وہ زندگی کے مصائب و مکروہات اور سیاست کے شور و فتن سے پراگندہ خاطر اور تلخ کام نہیں ہوتے تھے جو شخص ہار جیت دونوں میں اپنا سہارا خود ہو اس کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں جو نارمل ہوں اور اپنا سہارا خود ہوں۔!

یہاں دو واقعات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ایک دہلی کی سب سے بڑی مسجد میں پیش آیا دوسرا ہندوستان کے سب سے بڑے ایوان حکومت میں۔! ۱۹۴۷ء کے اکتوبر میں شمالی ہند کے مسلمان بالعموم اور دہلی کے بالخصوص تقسیم ہند کے تھپڑے سے ہراس اور درماندگی کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ ہندوستان میں کوئی مسلمان لیڈر ایسا نہیں رہ گیا تھا جو ان کو ڈھارس دیتا یا ان کی حمایت میں آگے آتا۔ بلکہ یہ کہنا بھی حقیقت سے بعید نہ ہو گا کہ لیڈر خود سراسیمہ اور درماندہ تھے۔

مولانا دہلی کی جامع مسجد میں تشریف لائے جو مسلمانوں کے جبروت و جلال، شوکت و شادمانی، اقبال و اختلال کی کتنی کروٹیں دیکھ چکی تھی مسلمانوں کے خاموش مایوس اور ملول مجمع کو دیکھا جیسا کہ آج سے پہلے انھوں نے نہ کسی اور نے ہندوستان میں کبھی دیکھا تھا۔ پھر جیسے بوڑھے سردار کی شریانوں میں خون کے ساتھ عزیمت اور حمیت کے شرارے کوندنے لگے ہوں لیکن اپنے پہ قابو رکھتے ہوئے جو اس کا ہمیشہ سے وطیرہ رہا تھا بولنا شروع کیا .... یہ تقریر اردو کے بیشتر اخبارات میں تمام و کمال چھپ چکی ہے اور پڑھنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کو اس کے اکثر ٹکڑے زبانی یاد نہ ہوں چاہا تھا کہ ناظرین کی خاطر جہاں تہاں سے اس کے اقتباسات ہی پیش کر دوں لیکن اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوتی کہ کس حصے کو حذف کیا جائے اور کس کو نہیں۔ اس تقریر پر تبصرہ بجائے خود ایک مضمون بن جاتا ہے اس لئے با دل ناخواستہ ارادے سے باز رہنا پڑا۔ جامع مسجد کی اس تاریخی تقریر سے مسلمانوں کے حوصلے بندھے اور خوف و مایوسی کی تاریکی چھٹنے لگی اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے زلزلے کے بعد زمین کی شکست و شکن میں ہماری اور اس زمین پر بسنے

والوں کے پاؤں میں استقامت آگئی ۔

کسے معلوم مولانا ان کی اس تقریر اور مجمع کے ہلکے گہرے نقوش جامع مسجد کے سنگ و خشت سقف و در، مینار و محراب نقش و نگار میں کس نامعلوم طریقے سے پیوست یا مرتسم ہو گئے ہوں ۔! اور خدا ہی جانتا ہے قوم کی تقدیر میں انکی بازگشت کب اور کس طور پر سنائی دے ۔

دوسری تقریر پارلیمنٹ میں پرشوتم داس ٹنڈن کے اس اتہام لگانے پر کرنی پڑی کہ وزارت تعلیمات ہندی سے سرد مہری برت رہی تھی اور اردو کی بے جا پاسداری کرتی تھی ۔ اس اتہام کے پیچھے کھلے چھپے کتنے اور الزامات تھے جن کا اندازہ کرنا ایسا کچھ دشوار نہیں ہے ۔ مولانا نے پارلیمنٹ کے آداب اور ضوابط اپنی رعایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جس وقار برہم اور صداقت بے باک سے جواب دیا وہ ایک ناقابل فراموش تاریخی واقعہ بن گیا ہے ۔ اس کی روئداد بھی اخباروں میں آچکی ہے جس کو دہرانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ۔ پوری پارلیمنٹ جس کے اراکین میں سے شاید بہتوں نے مولانا کی یہ تقریر پورے طور پر سمجھی بھی نہ ہو مولانا کے خطاب سے سناٹے میں آگئے ۔ سکوت کا یہ عالم تھا اور سطوت کا یہ سماں ہندوستانی پارلیمنٹ میں اس سے پہلے شاید ہی کبھی دیکھا گیا ہو ۔ اس کے بعد اردو کی حمایت کرنا شیوۂ شرافت و انصاف سمجھا جانے لگا ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے اس تاریخی جلسے میں جو دہلی میں گذشتہ موسم سرما میں ہوا تھا مولانا کی اردو کی حمایت میں آخری تقریر ہوتی ۔ اس کے بعد ہی اردو کا سب سے بڑا خطیب، اردو کا سب سے شاندار افتخار، جانے اردو ہی کی کتنی حسین اور عظیم شخصیت ہمیشہ کے لئے خاموشی ہو گئی ۔ اب دیکھئے اردو کے باب میں ....

کسے ہے حکم اذان لا الٰہ الا اللہ ۔!

رینائیسنس (احیائے علوم) اور ریفرمیشن (اصلاح دین) کی دو ایسی زبردست اور عدیم المثال انقلابی تحریکیں یورپ میں برسر کار آئیں جنھوں نے یورپ کو دنیا کی تمام دوسری اقوام سے یکلخت اس درجے بلند کر دیا کہ دوسری قوموں کو صدیوں بعد تک ان مدارج تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا ۔ ان تحریکوں نے جو کچھ دکھایا تاریخ عالم کے بڑے سے بڑے کشورکشاؤں کے حصے میں نہ آیا تھا ۔ انسان کی صلاح اور صحت مند پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے میں مذہب (اعتقاد) اور علوم بڑے زبردست اور پائدار محرکات ثابت ہوتے ہیں ۔ اسلام کا ظہور بجائے خود اصلاح ادیان اور احیاء علوم کی براہ راست بشارت تھا ۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رینائیسنس اور ریفرمیشن دونوں بڑی حد تک اسلام کا عطیہ ہیں ! لیکن مسلمانوں کی عام غفلت اور ان تحریکوں کے غیر معمولی غلبے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان حکومتیں اور مسلمانوں کے عقائد و اعمال دونوں مغربی افکار و استعمار کی زد میں آگئے ۔ اقبال نے ٹھیک کہا ہے کہ جو قومیں اپنے اعمال کا حساب نہیں لیتی رہتیں ان کو ایسے ہی برے دن دیکھنے نصیب ہوتے ہیں ۔ چنانچہ اب مسلمانوں کو ایک طرف اپنی حکومتوں کو دوسری طرف اپنے افکار و عقائد کو ان قوتوں سے محفوظ رکھنے کی مہم کا سامنا تھا ۔ حکومتوں پر کیا گذری یا گذر رہی ہے یہاں خارج از بحث ہے ۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ تبدیلی و اصلاح سب سے دیر میں حکومتیں قبول کرتی ہیں اور ان کا احساس و اظہار سب سے پہلے قوم کے ارباب فکر و نظر کرتے ہیں ۔ اسلامی عقائد و افکار کو مغربی اور مروجہ عقائد و افکار کی روشنی میں پرکھنے اور تعبیر کرنے کا فریضہ ہندوستان میں غدر کے بعد جن بزرگوں کے حصے میں آیا ان میں بعض یہ ہیں سرسید، جسٹس امیر علی، شبلی، اقبال، ابوالکلام اور مولانا مودودی ۔ ان سب کا مقصد ایک تھا ۔ طریقہ کار و اثرات لامحالہ جدا تھا یہ صورت حال مقامی نہ تھی عالم گیر تھی مصر اور دیگر بلاد اسلامیہ میں جمال الدین افغانی مفتی عبدہ رشید رضا وغیرہ کے سامنے بھی یہی مسائل تھے ۔

یہاں اس امر کی طرف بھی اشارہ کر دینا غیر متعلق نہ ہوگا کہ اسی زمانے میں بھی ہندو عقائد اور قومیت کے احیاء اور تشکیل نو کی تحریک تیزی سے بڑھ رہی تھی جس کے اہم مراکز دکن، بنگال اور پنجاب میں تھے یہی نہیں بلکہ بیسی کمپنیوں کی دیکھا دیکھی ہندو سرمایہ دار بھی صنعتی اور اقتصادی محاذ پر پورے طور سے منظم ہو چکے تھے ۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں کی کیا حیثیت بن گئی تھی اور مسلمانوں کی کیا رہ گئی تھی ۔

غدر کے بعد ہندوستان کے مسلمان جن دشواریوں میں مبتلا تھے ان میں بعض یہ تھیں ۔ مغلیہ حکومت کا خاتمہ اور انگریزی حکومت کا قیام، انگریزوں کا مسلمانوں سے برہم اور برگشتہ ہونا مسلمانوں کا ضرورت سے زیادہ کبھی آئین نو سے ڈرنا اور طرز کہن پہ اڑنا ۔ اسی طرح کبھی طرز کہن پہ اڑنا ۔ اسی طرح کبھی طرز کہن سے ڈرنا اور آئین نو پہ اڑنا ۔ مذہبی اور تہذیبی احیاء اور سیاسی، صنعتی، تعلیم میں ہندوؤں کی پیش قدمی مسلمانوں کی سیاسی کس مپرسی، اقتصادی بدحالی، صنعتی پسماندگی، تعلیمی پستی اور عام مایوسی اور درماندگی ۔ سرسید نے ان کا مداوا بحیثیت مجموعی علی گڑھ تحریک میں پیش کیا جس کی مرئی و متعین شکل مدرستہ العلوم کی تھی جو اب مسلم یونیورسٹی ہے ۔

مسلمانوں کے نزدیک اور مسلمانوں کے غدر انیسویں صدی کا سب سے المناک انقلابی حادثہ تھا جس نے ہندوستان میں ان کی کئی سو سالہ سیاسی اور تہذیبی حیثیت کو کلیتاً زیر و زبر کر دیا ۔ مسلمانوں میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے فکر و عمل کے لئے یہ صورت حال ایک بے اماں و بے درماں آزمائش سے کم نہ تھی ۔ بنظر بریں علی گڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی کی اس بنیادی اور تاریخی حیثیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دونوں مسلمانوں کی تقریباً ہمہ جہت آباد کاری و بحالی کا مشن بھی تھیں اور مشین بھی ۔! اور اپنے گوناگوں مقاصد کے حصول میں جو کبھی کبھی ایک دوسرے کے ضد معلوم ہوتے تھے براہ راست یا بالواسطہ اس حد تک کامیاب ہوتے جس حد تک ہندوستان کا کوئی اور مسلم ادارہ اب تک کامیاب نہیں ہوا تھا ۔

کچھ تعجب نہیں سرسید اور ان کے رفقاء نے علی گڑھ تحریک اور مدرستہ العلوم (مسلم یونیورسٹی) کو کسی نہ کسی حد تک دانستہ یا نادانستہ طور پر رینائیسنس اور ریفرمیشن کی روشنی میں آگے بڑھانے کی کوشش کی ہو ۔ اس خیال کو اس بناء پر اور تقویت پہونچتی ہے کہ اصلاح دین کی تحریک دہلی میں مدتوں سے برسرکار تھی جو سرسید کے عہد میں اور زیادہ نمایاں ہو گئی تھی ۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا گھرانا اس تحریک میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھا ۔ اسی اصلاح دین سے احیائے علوم کے چشمے پھوٹتے تھے پرانے زمانے میں مسلمان ہی نہیں دوسری اقوام میں بھی علوم کا سرچشمہ مذہب تھا ۔ ہندوستان میں اس وقت مسلمان جن حالات و حوادث سے دوچار تھے انکے پیش نظر علی گڑھ تحریک میں کچھ اور مقاصد بھی شامل کر لئے گئے تھے ۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں رینائیسنس اور ریفرمیشن کی قیادت کے لئے جس عظیم اور جامع حیثیات شخصیت کی ضرورت تھی وہ صرف سرسید کی تھی ۔ انیسویں صدی کے خاتمہ پر سرسید رحلت فرما گئے بیسویں صدی کے عشرہ اول میں مسلمانوں کی سیاسی اقتدار کی

زندگی نے جو رنگ اور رُخ اختیار کیا اس کے بارے میں یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس کی قیادت اتنی حرکی اکم اور رہبر جیسی نہ تھی جتنا کہ وقت کا تقاضا تھا۔ اس وقت ایک نئے سر سید کی ضرورت تھی میرے نزدیک یہ رول مولانا ابوالکلام آزاد نے ادا کیا۔

سر سید ہی کی طرح وہ اعلیٰ خاندانی روایات، اسلامی علوم، اسلامی تاریخ، اسلامی عقائد، اسلامی اقدار اسلامی تہذیب و اخلاق کے حامل اور مبلغ ہونے کے علاوہ سیاسی بصیرت رکھتے تھے۔ زندگی اور زمانے کے نئے تقاضوں اور رجحانات کو پہچانتے تھے اور ان سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت اور طاقت رکھتے تھے۔ مخالفت کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو اس کا مقابلہ شرافت قابلیت اور پامردی سے کرتے تھے۔ عربی فارسی، اردو شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق اور تحریر و تقریر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ البتہ ایک بات جو سر سید اور مولانا کو ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ سر سید عامۃ الناس سے بڑا گہرا قریبی اور ہمہ وقت کا تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے نہ ہوتے ہوئے بھی جیسے انہیں میں سے ہوں۔ ان کے پاؤں زمین میں بڑی مضبوطی سے گڑے ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ چھوٹے بڑے ہر پیمانے پر سوچتے تھے اور اسی کے مطابق کام کرتے تھے۔ سر سید کے عہد میں مسلمانوں پر غدر کی تباہ کاریوں کا شدید اور عالمگیر اثر تھا سر سید کا کمال اور کارنامہ یہ تھا کہ دور اور دیر کی اسکیموں کی بروئے کار لانے کے علاوہ موقع آن پڑتا تو وہ فرسٹ ایڈ کو ان کے بعد آنے والوں نے خود غرضی یا کجی کی بنا پر مستقل علاج سمجھ لیا اور کبھی لازمہ صحت۔!

مولانا ابوالکلام آزاد عوام کے آدمی نہ تھے۔ کتنے خواص کو بھی ان کے ہاں عوام کے درجے پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ شاید انھوں نے اقبالؔ کے عقاب کی طرح چٹانوں کی بلند ویران تنہائیوں میں اپنی دنیا بنا رکھی تھی۔ یہ بحث آگے بھی آئے گی۔

یہاں علی گڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ مولانا ان تحریکوں کی تائید میں نہ تھے۔ یونیورسٹی جن شرائط پر یا جن حالات میں قبول کی گئی اس کے خلاف مولانا کی لکھنؤ میں جو تقریر ہوئی اور اس پر جو مضامین انھوں نے سپرد قلم کئے وہ کچھ اور نہیں تو بے مثل خطابت، شدید طنز اور اعلیٰ انشاپردازی کے اعتبار سے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے لیکن تقسیم ملک کے بعد حالات دگرگوں ہوئے تو مسلم یونیورسٹی کو ہر گزند سے محفوظ رکھنے میں مولانا نے جو خدمات انجام دیں وہ بھی اس ادارے کی تاریخ میں کبھی فراموش نہ کی جائیں گی۔ ان میں ایک ڈاکٹر صاحب کو علی گڑھ کی وائس چانسلر شپ قبول کرنے پر آمادہ کرنا بھی تھا۔ حالات و حادثات کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور مولانا دونوں علی گڑھ کے خلاف تھے لیکن وقت آیا تو انہی دونوں کو اس کی حمایت و حفاظت کے فرائض ادا کرنے پڑے۔! "محبت خانے" کی یہ "کرامت" کیا کم ہے۔

"کہ چوں خراب شود خانہ خدا گردد!"

ایسے لوگ کم دیکھے گئے ہیں جو اس کم عمری میں اپنے آپ کو دنیا کے راستوں پر نہیں اپنے راستے پر چلنے کے لئے تیار کر لیتے ہوں۔ مولانا ابوالکلام ایسے ہی تھے۔ دنیا کے راستے پر چلنے والے دنیا کے اشارات کے محتاج ہوتے ہیں، "مردان کار آگاہ" کے بنائے ہوتے راستے پر چلنے کے لئے خود دنیا ان کے اشارے کی محتاج و منتظر ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مولانا تمام عمر خود کسی کے مشورے یا مدد کے محتاج نہیں ہوئے ان کی مدد اور مشورے کے محتاج و منتظر دوسرے رہے وہ صرف اپنے بنائے ہوئے معیار خوب و زشت کی پابندی کر سکتے تھے۔

مولانا عزلت نشین، دیر آشنا اور کم آمیز تھے۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ہر قوم ہر ملک اور ہر زمانے کے "خاصان بارگاہ" سب سے کنارہ کش ہو کر زندگی کا وہ زمانہ جو ترغیبات نفس کا اعتبار سے غفلت اور غلبے اور ضمیر و دانش کے اعتبار سے نیم رس ہوتا ہے۔ عبادت و ریاضت میں گذارتے ہیں۔ اس خلوت، عبادت اور ریاضت (اعتکاف) کا مقصد مطالعہ ذات اور محاسبہ نفس ہوتا ہے۔ اس سے ان پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ انکی زندگی کا مشن کیا ہے اور وہ خلق خدا کی کس خدمت پر مامور (من اللہ) ہونے والے ہیں۔ ان مراحل سے گذرنے کے بعد وہ دعوت حق اور خدمت خلق کے لئے عامۃ الناس میں آتے ہیں۔ یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مولانا اپنی زندگی کے کسی خاص عہد میں اس مرحلے و منزل سے گذرے یا نہیں اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس مطالعے اور مجاہدے میں کسی نہ کسی حد تک مولانا آخر دم تک منہمک رہے۔ اپنے محاسبہ کے لئے اپنی کمین گاہ میں بیٹھنا ایک بات ہے اور بہت بڑی بات ہے اور اپنی بنائی ہوئی جنت یا خانقاہ میں .... بیٹھ جانا قطعاً دوسری بات ہے اور بہت معمولی بات ہے۔ اول الذکر حالت وسیلہ ہے۔ ایک بڑے مقصد کا اور موخر الذکر بجائے خود ایک مقصد ہے لیکن ادنیٰ مقصد ہے۔ ایک پناہ لیتا ہے دوسرا پناہ بنتا ہے! اتنا ہم سب جانتے ہیں کہ مولانا کا مزاج خانقاہی نہ تھا۔ آخرت میں مولانا کے ساتھ جنت کیا سلوک کرے وہ تو مجھے نہیں معلوم، دنیا میں تو مولانا نے جنت کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا۔

مولانا نے جس طرح عامۃ الناس کی رہبری کی وہ اتنی "پیغمبرانہ" نہ تھی جتنی وہ آمرانہ یا مدعیانہ۔ وہ اتنے پبلک کے نہیں جتنے لیڈروں کے لیڈر تھے۔ مولانا اپنے آپ کو عوام سے زیادہ خواص کی راہ نمائی پر مامور سمجھتے تھے۔ اگر اس طبقے کے لئے علیحدہ پیغمبر ہوتے ہیں تو مولانا ان میں سے یقیناً ایک تھے۔

مولانا کا اسلوب تحریر ان کی شخصیت تھی اور ان کی شخصیت ان کا اسلوب دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ صاحب طرز کی ایک نشانی یہ بھی ہے۔ مولانا کے لکھنے کا انداز لب و لہجہ اور مواد کلام پاک سے لیا جو انکے مزاج کے مطابق تھا۔ مولانا پہلے اور آخری شخص ہیں جنھوں نے براہِ راست قرآن کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ بنایا۔ وہی انداز بیان اور زور کلام اور وعید و تہدید کے تازیانے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ پہاڑوں پر رعشہ سیماب طاری کر دیتا ہے مولانا کی تحریروں میں وہ نرمی اور نوازش نہ ملے گی جو پیغمبروں کی دعوت میں ملتی ہے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں مولانا کی طبیعت پیغمبری کے رول سے اتنی سازگار نہ تھی جتنی خدائی کے رول سے خدا پیغمبروں کی طرح انسانوں میں گھلا ملا نہیں ملتا اس لئے کہ پیغمبروں کی طرح وہ انسانوں میں سے نہیں ہوتا اس لئے خدا کے خطاب کرنے کا انداز پیغمبر یا انسان کے طرز خطاب سے جدا گانہ ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر یہ بھید کھلنے لگتا ہے کہ مولانا کی تحریروں میں انانیتی رنگ اور خطابت کا غلبہ کہاں سے آیا۔

صحف سماوی میں جو باتیں بتائی گئی ہیں انسان نے ہمیشہ ان کو اپنے بہترین احساسات کے مطابق فنون لطیفہ میں تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مذہبی افکار کو شعر و ادب سے اور شعر و ادب کو مذہبی افکار سے سب سے زیادہ تازگی اور توانائی ملی ہے۔ فارسی اور اردو نظم میں رومیؔ اور اقبالؔ نے جس حرارت دینی، علمی تبحر، عصری بصیرت، شاعرانہ حسن کاری اور فنی قدرت

سے کلام پاک کو متعارف کیا اسکی جھلک اگر کہیں ملتی ہے تو دانتے، اور ملٹن کی نظموں میں جو عیسوی تصورات مذہب کی زہین منت ہیں ان مشہور عالم شعراء کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جنت اور جہنم کے اسلامی تصورات سے بھی خوشہ چینی کی ہے ۔ کلام پاک کی تعلیمات و تصورات کو اردو میں اس بصیرت و برنائی سے پیش کرنا کہ وہ اتنا کلام ہی نہیں بندوں کا عمل صالح بھی معلوم ہو معمولی ذہن و دماغ کا کام نہیں ۔ اردو نثر میں یہ کارنامہ مولانا آزاد کا ہے ۔

عربی زبان کے معیار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیا کے دور دراز گوشوں میں آغاز اسلام سے آج تک یکساں بلند ہے جس کا سب سے بڑا سبب کلام پاک کی غیر متبدل زبان و بیان اور اس کے معانی و مطالب کا عالمگیر اثر اور نفوذ ہے ۔ ان قوموں سے قطع نظر جن کی مادری زبان عربی ہے بے شمار ایسے مسلمان ہیں جن کی مادری زبان کچھ اور ہے لیکن کلام پاک کی تلاوت و ترتیل، اور اوراد و وظائف کے التزام مذہبی فرائض بجالانے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر روزانہ کی زندگی میں عربی فقروں کے زبان زد ہوتے رہنے سے عربی ان کی زندگی میں دخیل اور انکے ذہنوں میں پیوست ہو گئی ہے اس کے علاوہ مسلمانوں کے چھوٹے بڑے بے شمار عربی مدارس ہیں جہاں قدیم زمانے سے آج تک اسکی مکمل تعلیم دی جاتی ہے ۔ اب سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی تصنیفی اور ادبی زبان بھی عربی تھی ۔ ایک حد تک فارسی کو بھی یہی درجہ حاصل ہے ۔

یہاں عربی اور فارسی زبانوں کی خوبیوں پر تفصیل سے گفتگو کرنا مقصود نہیں ہے ۔ بتانا صرف اتنا ہے کہ عربی میں کلام پاک کا ہونا عربی زبان کی شہرت اور بقا کی ایسی ضمانت ہے جس کو زوال نہیں اور اس زبان کا صحیح عمل اور دخل جہاں کہیں جس زبان اور قوم میں ملے گا اس میں حسب استعداد عربی زبان اور عرب قوم کی تازگی اور توانائی ملے گی ۔ فارسی اور عربی شعر و ادب پر مولانا کو جو غیر معمولی عبور تھا اور ان کا ذوق جس طرح انکی ذہن و فکر میں رس بس گیا تھا وہ مولانا کے قلم اور زبان سے اردو میں سہ آتشہ ہو کر نمودار ہوا ۔

یہ بات صرف عربی فارسی زبانوں تک محدود نہیں ہے ۔ زبان کے معیار کو بلند اور کارآمد رکھنے میں الہامی اور کلاسیکی زبانوں کی اہمیت مسلم ہے بشرطیکہ اور یہ بہت بڑی شرط ہے کہ ان زبانوں کا اثر اور انکی افادیت بولنے اور لکھنے والوں کی عملی زندگی میں مسلسل اور مؤثر طریقے پر ملتی ہو ۔ زبان نہ اپنے حسب نسب کے اعتبار سے ترقی کرتی ہے نہ زبان کے بے وقوف دوستوں کے حسب نسب سے وہ ترقی کرتی ہے ۔ بولنے اور لکھنے والوں کی ہر طرح کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھنے سے ۔!

سر سید، شبلی، حالی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد سب کے انداز میں لکھنے والے ہمارے یہاں مل جائیں گے لیکن مولانا کا پیرو ایک نہ ملے گا ۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پیروکان ملنا ہمارا کی بڑائی میں کوئی اضافہ ہے ۔ اگر کوئی یہ کہے کہ مولانا کا اسٹائل اب اردو کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں یا مولانا کی تحریروں میں اسٹائل کا غلبہ اور مواد کی کمی ہے یا مولانا کے مضامین کا ترجمہ کسی ایسی زبان میں جو عربی فارسی کی جینیس سے ناآشنا ہو کامیاب نہ ہوگا تو میں اس سے "جدال سعدی" قسم کی تفریح پر بھی آمادہ نہ ہوں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ بے مثل اسلوب جس میں عجم کا حسن طبیعت اور عرب کے سوز دروں "کے ساتھ" شکوہ ترکمانی ذہن ہندی نطق اعرابی" بھی ملتا ہے مولانا پر ختم ہو گیا ۔! ایک جگہ عرفی نے اپنے انداز خاص سے ماتم کیا ہے کہ تمام شہر و خریدار جہان مارے لیکن ۔

نیافتم کہ فروشند بخت کہ در بازار
نصیب کی طرح اسٹائل کا بھی یہی حال ہے بالخصوص مولانا کے اسٹائل کا ۔!

صحافت کو ادب میں جگہ نہیں دی گئی ہے اس کی سرگرمیاں بالعموم روزمرہ کے حالات و مواد اشاعت پر رائے زنی تک محدود ہوتی ہیں ۔ مسائل حاضرہ پر تبصرہ اور خبریں پڑھ کر ہم دوبارہ اخبار کی طرف التفات نہیں کرتے ۔ اخبار کے بارے میں کبھی کبھی ایک کہاوت بھی سننے میں آجاتی ہے یعنی اتنا باسی جتنا کہ گذرے ہوئے دن کا اخبار! ہمارے بعض بڑے اچھے شاعر اور نثر نگار صحافت کے نشے یا طلسم میں ایسے اسیر ہوئے کہ آخر تک نکل نہ پائے اور ان کی تحریریں "صحافتی" قرار پائیں ۔

مولانا کا ابتدائی عہد (جنگ بلقان سے پہلی جنگ عظیم تک) اردو صحافت کا زریں دور تھا گذشتہ پچاس سال میں اردو کے اچھے سے اچھے اخبار اور ان کے مدیر قوم اور ملک سے روشناس ہوئے جنھوں نے الدھر جرنلزم کو بڑی ترقی دی لیکن سوا مولانا کے کسی اور کو ایڈیٹر کی حیثیت سے ادب کی صف اول میں جگہ نہ ملی اور صرف الہلال اور البلاغ کے مضامین کو علمی اور ادبی درجہ نصیب ہوا ۔

بذات خود میں نہ مولانا کی متداول معنوں میں صحافی سمجھتا ہوں نہ الہلال اور البلاغ کو صرف اخبار مولانا کسی مسئلے پر سرسری طور سے نہ غور کرتے تھے نہ اظہار خیال بلکہ اس کا التزام رکھتے تھے کہ جو بات کہی جائے وہ مسلمات کی روشنی کی تاب لاسکے کسی بڑی حقیقت سے رشتہ رکھتی ہو اور علمی و ادبی معیار پر صحیح اترے ۔ ادارت کے معروف پروگرام اور گریز پا لمحات میں اس التزام کا نباہنا تقریباً ناممکن ہے ۔ صرف مولانا ایسا کر سکتے تھے ۔ اردو صحافت کو مولانا نے کلاسکس کا درجہ عطا کیا ۔ مولانا کی تحریر صحافتی نہیں تصنیفی ہوتی تھی ۔ نظر حکیمانہ، انداز خطیبانہ اور آہنگ ملہمانہ ۔! ان کی تحریروں تقریروں نیز ان کے سراپا کا جب کبھی خیال آتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ازمنۂ قدیمہ میں یونان کے زندہ جاوید رزمیہ نگار مصروف کار ہوں ۔ اپنے زمانے اور اپنے دیار میں مولانا یونانی دیوتاؤں سے کم نہ تھے ۔

مولانا کے ہاں انشاپردازی کے ایک سے زیادہ اسالیب ملتے ہیں ۔ الہلال میں دعوت دار و رسن ہے ۔ تذکرے میں دعوت دید و شنید، غبار خاطر میں دعوت نوش و نشیار، تفسیر قرآن کا لب و لہجہ علمی اور عالمانہ ہے ۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا

غالباً الہلال اور تذکرہ ہی کے زمانے میں مولانا نے تفسیر کا کام شروع کر دیا تھا ۔ کلام پاک کا ترجمہ کرنا آسان نہیں ہے لیکن تفسیر کا کام بار رہا مشکل اور نازک ہے ۔ اس لئے کہ اس میں عربی زبان و بیان پر عبور ہونے کے علاوہ اقوام عالم کی تاریخ پر نظر، عقیدے کی پختگی اور سیرت کی پختگی و پاکیزگی لازمی شرائط ہیں تفسیر میں مفسر کے نقطہ نظر کا راہ پا جانا جتنا نامناسب ہے اتنا ہی ناگزیر بھی ہے ۔ تفسیر میں ایسے مقامات اکثر آتے ہیں جہاں تاویل و تعبیر کے ایک سے زیادہ پہلو نکلتے ہیں چنانچہ الہامی اور مذہبی کتابوں پر معتقدین اور منکرین نے بربنائے اعتقاد و عناد یا انتقاد اب تک جتنے متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے وہ شاید ہی کسی اور نوعیت کی کتاب کے بارے میں دیکھنے میں آئے ہوں ۔

تفسیر لکھنے والوں کا کبھی کبھی مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کی تاویل کلام الہی

کے ضمن ہی میں مولانا نے اپنی تفسیر میں رجو شاید پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی) اس [illegible] کلام الٰہی میں اپنے نقطۂ نظر کا جواز نکالنے کے بجائے کلامِ پاک ہی کے نقطۂ نظر کو بلفظہٖ پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام بڑی دیانت اور جرأت کا ہے۔

قلعۂ احمد نگر کے ایام اسیری میں مولانا کا غبارِ خاطر لکھنا ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔ غبارِ خاطر کہنے کو تو مولانا کے خطوط ہیں اور نواب صدر یار جنگ مرحوم کے نام لکھے گئے ہیں لیکن مولانا کے انداز طبیعت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اکثر ایسا محسوس ہوا جیسا مولانا نے یہ خطوط دراصل اپنے ہی نام لکھے ہوں۔ اس لئے کہ یہ اتنے خطوط نہیں معلوم ہوتے جتنی خود کلامی۔ مولانا اپنے سوا کسی سے اتنے بے تکلف نہیں ہو سکتے تھے کہ اس کو ایسے خطوط لکھتے۔ اپنے سے بھی مولانا بڑی مشکل سے بے تکلف ہوتے تھے۔

یہاں پہنچ کر کچھ اس طرح کا احساس ہونے لگتا ہے جیسے کسی نے اپنے عزیز یا دوست سے دانستہ یا نادانستہ تمام عمر بے التفاتی برتی ہو لیکن آخر میں تلافیٔ مافات کا خیال آتے تو اس پر نوازشوں کی بارش کر دے۔ مولانا نے سیاست کے خارزار اور قومی زندگی کی بے آب و گیاہ وادی میں تمام عمر اپنے نفس کو ہر لذت سے محروم اور ہر محرومی سے دوچار رکھا لیکن آخر زمانے میں جب اس فروگذاشت کا خیال آیا تو اس پر اپنے اعتماد کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ یہ خطوط ایک طور پر نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ مولانا کے اپنے نفس سے بدلے ہوئے خوشگوار رویے کا۔!

دوسری بات جو مولانا کی انشا پردازی کے بارے میں ان خطوط سے منکشف ہوتی ہے وہ ان کی طبیعت کا انبساط اور شگفتہ شاداب اور صحت مند انشا پردازی پر ان کی غیر معمولی قدرت ہے۔ غبارِ خاطر میں مولانا کی حسنِ طبیعت کا وہ اظہار ملتا ہے جو رقعاتِ غالب میں غالب کا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غبارِ خاطر سے پہلے مولانا کی انشا پردازی پر ابتدا سے جو خطیبانہ اور ملہمانہ رنگ طاری تھا اس کا فشار اگر بالکل دور نہیں تو بہت کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ غبارِ خاطر وجود میں نہ آتا تو مولانا کی شخصیت اور انشا پردازی کا ایک بڑا دل آویز پہلو ہماری نظروں سے اوجھل رہتا۔

الہلال اور تذکرہ کے عہد میں مولانا کا جو اسلوبِ تحریر ملتا ہے وہ اقتضائے زمانہ کے مطابق تھا اور نہ اپنی شوکت اور خوبصورتی کے باوجود زمانے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا لیکن غبارِ خاطر کا اسلوب اردو میں نامعلوم مدت تک زندہ رہے گا۔ اکثر جی چاہنے لگتا ہے کاش اس اسلوب کے ساتھ مولانا کچھ دن اور جیتے ہوتے پھر ہمارے ادب میں کیسے کیسے نسرین و نسترن اپنی بہار دکھاتے اور خود مولانا کے جذبِ تخیل کی کیسی کیسی کلیاں شگفتہ ہوتیں۔

ملک کی آزادی کی تحریک میں مسلمان اکابر کو اسیری نصیب ہوتی تو بالعموم ان کا ذہن مذہبی کتابوں کے مطالعہ کی طرف مائل ہوتا۔ ان میں سے اکثر اپنے تاثرات بھی قلمبند کرتے۔ آزاد فضا کی حشر سامانیوں کے بعد جیل کی ساکن بے رنگ اور ویران زندگی کی معمولات کا سامنا ہو تو اسیروں کا افکار اور جذبات کی اپنی بنائی ہوئی بے کنار دو قلموں دنیاؤں میں پناہ لینا فطری ہے جو ان کو پہلے نصیب نہ ہوتی۔ یہ مسلمانوں ہی پر موقوف نہیں یہ صورتِ حال سب پر گذری ہے کسی نے لڑکی کو خطوط لکھے کسی نے بیوی کو کسی نے اپنے آپ کو۔!

قیاس یہ ہے کہ جس زمانے میں مولانا رانچی میں نظر بند تھے تفسیر کا کام جس کی ابتدا الہلال اور البلاغ کے صفحات سے ہو چکی تھی بڑی تندہی سے شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں مولانا کی سرگرمیاں تمام تر سیاسی، مذہبی یا مذہبی سیاسی نوعیت کی تھیں جن کا کبھی کوئی سیاسی پہلو ہوتی تھا اور کبھی اس کے برعکس۔ جہاں تک خیال ہے یہ تفسیر نا تمام رہی اور صرف دو جلدیں شائع ہوئیں۔ رانچی سے احمد نگر تک کی مدت اتنی تھی کہ یہ کام مکمل ہو سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا اور آخری اسیری کا زمانہ مولانا نے کتاب النبی کی تفسیر لکھنے کے بجائے "کتابِ دل" کی تفسیر لکھنے میں صرف کیا۔ ایسا تو کہ زندگی کے آخری دور میں مولانا "لازمانی" اور "لامکانی" کے بجائے "زمینی و زمانی" ہو گئے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یہ تبدیلی بڑی مبارک اور انقلابی تھی۔!

جیسا کہ اس سے پہلے ظاہر کر چکا ہوں تقسیمِ ملک کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے وہ تنہا سہارا رہ گئے تھے۔ حکومت کے بڑے سے اہم منصب پر فائز رہ کر اور بے شمار نزاکتوں میں گھرے ہونے کے باوجود مولانا نے یہ فرض جس خوبی سے انجام دیا وہ بیان سے باہر ہے۔ مولانا کے اٹھ جانے کے بعد کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ منصب ان پر ختم ہو گیا ہو۔!

یہاں پہنچ کر یہ بات دل میں آتی ہے کہ حکومت کیسی ہی ہو آزادی اور تندہی سے قوم کی خدمت کا کام حکومت سے باہر ہی رہ کر زیادہ مؤثر طور پر انجام دیا جا سکتا ہے۔ کچھ اور نہیں تو اس بنا پر کہ حکومت میں رجعت پسندی اور عامۃ الناس میں ترقی پسندی کی استعداد غالباً ہے اول الذکر کی تقدیر سکونی ہے مؤخر الذکر کی حرکی۔ قطع نظر اس سے کہ مولانا حکومت سے کس درجہ وابستہ ہو گئے تھے، اس سے باہر نکل سکتے بھی تھے یا نہیں ان کو نکلنے بھی دیا جاتا یا نہیں، ان کی صحت اس کی کہاں تک متحمل ہوتی، کبھی کبھی یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ کاش وہ حکومت کے محدود اور گھٹن افشار حلقے سے نکل کر ہماری جمہوریہ کی دستور میں ہندی مسلمانوں کو وہ مشکل لیکن اہم بالشان مقام دلا سکتے جو مسلمانوں کا حق بھی ہے اور ذمہ داری بھی۔!

جی ایسا کیوں چاہتا ہے شاید اس لئے کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی دور دور ایسا نظر نہیں آتا جس کے سپرد ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت و ہدایت کی ذمہ داری اعتبار و اختیار کے ساتھ کی جا سکے۔ اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی!

طامس مان

مترجمہ اختر انصاری

گوئٹے

پیدائش خاندان اور شخصیت

گوئٹے اور اس کی شخصیت کے متعلق یہ مختصر مضمون ٹامس مان کے ایک طویل مقالے کے ابتدائی حصے کا ترجمہ ہے یہ طویل مقالہ ٹامس مان نے گوئٹے کے انتخاب نظم و نثر پر ایک مقدمے کے طور پر لکھا ہے خود ٹامس مان کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ موجودہ دور میں جرمنی کا سب سے بڑا مصنف خیال کیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں اس نے لٹریچر کا نوبل پرائز حاصل کیا۔ اور ۱۹۵۵ء میں اس کا انتقال ہوا۔ (مترجم)

اگست ۱۷۴۹ء کی اٹھائیسویں تاریخ تھی اور دوپہر کا وقت۔ فرینکفرٹ کے ایک معزز گھرانے میں ایک اٹھارہ سال کی کم سن ماں کی کوکھ کی غیر معمولی تکلیف میں ایک بچے نے جنم لیا۔ اس کا بدن نیلا ہو رہا تھا اور وہ بظاہر مردہ تھا۔ گویا اس دنیا کی روشنی سے اس کو کوئی علاقہ نہیں ہے۔ گویا زندگی کی اس شاہراہ پر گامزن ہونے کا وہ قطعی کوئی ارادہ نہیں رکھتا جس کے لئے یہ مقدر ہو چکا تھا کہ وہ ایک وسیع و عریض، گل پوش، مسرت بھرے مشاغل سے لبریز، انسانی سعادتوں سے بھرپور، اور مثالی شاہراہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ماں کے بطن کے بعد وہ براہ راست زمین کے بطن میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ کئی منٹ گزر جانے کے بعد بچے کی دادی نے جو پلنگ سے لگی بیٹھی تھی کراہتی ہوئی ماں سے کہا "الیزبتھ! بچہ زندہ ہے۔!" یہ ایک عورت کی آواز تھی جس کی مخاطب ایک دوسری عورت تھی اور بس! محض ایک انسانی آواز محض ایک بشاشت آمیز گھریلو پیغام۔! تاہم ساری دنیا اور ساری انسانیت کو اس آواز کا مخاطب ہونا چاہیے تھا۔ اور آج بھی پوری دو صدیوں کے بعد اس آواز کی بہجت آفرین گونج قائم ہے، جس طرح آئندہ صدیوں تک قائم رہے گی۔ جب تک روئے زمین پر زندگی اور محبت کا وجود باقی ہے، جب تک زندگی خود اپنی محبت میں غرق ہے، یا اپنے حلاوت بھرے غم سے تھکتی ہے اور یا اپنے وجود سے بیزار ہوتی ہے، اس وقت تک ایک عورت کے منہ سے نکلنے والی یہ آواز، یہ سادہ بے لوث پکار، "وہ زندہ ہے" یونہی گونجتی رہے گی، یونہی موسیقیاں، باقی رہے گی۔

وہ بچہ جس نے اس روز تاریکی سے بڑھ کر روشنی میں قدم رکھا جس کا حلق آواز سے خالی تھا، اور جس کا جسم جسدِ بے روح معلوم ہوتا تھا، بڑی لمبی عمر لے کر آیا تھا۔ قدرت کو یہ منظور تھا کہ وہ بے پایاں تحمل کا مالک ہو، اور صحیح معنوں میں رشیوں اور پیغمبروں کی سی طویل زندگی بسر کرے، نشو و نما اور احیار کی عظیم الشان صلاحیتوں کا ثبوت دے، اپنی انسانی تقدیر کو بدرجہ اتم پورا کرے، اور وجود کی اس عالی مقامی پر قابض و متصرف ہو جو سلاطین اور اقوام کو جھکنے پر مجبور کر دے، اور جس کی قدرتی نمود و پیدائش کو خود اس نے ایک موقع پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ تحقیق و تفحص کا موضوع بنایا۔ موسم گرما کی جس دوپہر کو وہ پیدا ہوا تھا اس کو ماضی کے آغوش میں گئے ہوئے تراسی برس ہو چکے تھے تاریخ کے مہیب اور کوہ پیکر واقعات اس کی نظروں کے سامنے سے گذر چکے تھے اور اس کے دل و دماغ پر چھاپہ مار چکے تھے۔ ہفت سالہ جنگ، امریکہ کی جنگ آزادی انقلاب فرانس، نپولین کا عروج و زوال، مقدس رومانی سلطنت کا اختلال و انتزاع، نئی صدی کے آغاز کے ساتھ روئے زمین اور دنیا کے ماحول کی تغیر، بورژائی عہد کی ابتدا، مشینی دور اور انقلاب جولائی۔ پیر ہشتاد سالہ جو یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے، اپنی میز پر بیٹھا ہے، سپید مو اور بے لوچ۔ اسکی پتلیوں کے چاروں طرف بڑھاپے کے مخصوص حلقے ہیں جس سے اس کی بھوری اور ایک دوسرے سے قریب واقع ہونے والی آنکھیں پرندوں کی آنکھوں کی مانند معلوم ہوتی ہیں۔ دائمر کا وہ مکان ہے جو بہت پہلے انسان کے پرستارانہ جذبات کے لئے ایک سجدہ گاہ بن چکا ہے۔ وہ اپنے دار المطالعے میں جس کو دانستہ طور پر سامان آسائش سے بری

لکھا گیا ہے، اپنی میز پر بیٹھا ہے، اور عمیق تصور و تفکر کے عالم میں اپنے قدیمی دوست، ماہر سیاست و ماہر لسانیات، ولیلم فان ہمبولٹ کے نام جو برلن میں ہے اپنا آخری خط لکھتا ہے۔

"اعلیٰ ترین ذہانت کا وصف یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو جذب کر لیتی ہے
اور پچا لیتی ہے اور اس کے باوجود اپنی ازلی تقدیر کو جسے ہم کردار کے نام سے
موسوم کرتے ہیں خفیف سے خفیف صدمہ بھی نہیں پہونچنے دیتی، بلکہ حتی الامکان
اس کو پختہ تر اور عظیم تر بناتی ہے۔ انسان کے قویٰ اپنی آزاد جبلی معروفیت میں
تربیت، تعلیم، تفکر، کامیابی، ناکامی، شکست اور پھر مزید تفکر کے ذریعہ اکتسابی
خصوصیات اور وہبی اوصاف کو متحد کر کے ایک ایسی متوازن اور ہم آہنگ
وحدت کو وجود میں لاتے ہیں جو سارے عالم کو متحیر کر دیتی ہے۔ تمہارا مخلص
دوست ہے، ڈبلیو، فان گوئٹے"

کتنی پر شوکت سادگی ہے! ذاتی قدر و قیمت کا یہ جائزہ کس درجہ سادہ و پُر کار ہے اس میں بیک وقت ایک طفلانہ معصومیت بھی ہے اور ایک عبقری نیت بھی، فرحت انگیزی بھی اور ہیبت آفرینی بھی اس سے سترہ سال پیشتر، چھیاسٹھ برس کی عمر میں اس نے اپنی زندگی کی ایک ایسی ہی جھلک اپنی ایک نظم میں پیش کی تھی جو پڑھنے والے کو مذکورۃ بالا عالم کو متحیر کر دینے والے فقرے کی طرح متاثر بھی کرتی ہے اور چونکاتی بھی ہے۔ اس وقت وہ ایک نوخیز خاتون، ایک نئی نویلی دلہن مریان فان ولیمر کے ساتھ جو دیوان مشرق و مغرب میں زلیخا کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے، ایک ایسا معاشقہ کر رہا تھا۔ جو بے وقت کی راگنی ہوتے ہوئے بھی فنی نقطۂ نظر سے ایک مناسب وقت اور یقیناً نتیجہ خیز معاشقہ تھا اور یاد رہے کہ یہ اس کا آخری معاشقہ ہرگز نہیں تھا۔ اپنے آخری معاشقے کا شکار وہ چوہتر سال کی عمر میں ہوا جب کہ سیکس وائمر کی ریاست اعلیٰ کا یہ والا مرتبت وزیر با تدبیر، یہ شہرۂ آفاق شاعر، مرین باد میں ایک دفعہ پھر رقص گاہ کا کہنیا بن گیا، اور عشق، پیار، شیفتگی اور وارفتگی کے تمام ساز و سامان سے مسلح ہو کر ایک سترہ سالہ کی چھوکری کے ساتھ بیاہ رچانے پر کمر بستہ ہو گیا۔ نتیجہ کچھ نہیں نکلا کیوں کہ اس کے خاندان نے اس کے خلاف ایک متحدہ محاذ ترتیب دے لیا اور خود وہ دوشیزہ بھی شادی کی کچھ بہت زیادہ آرزومند نہیں تھی۔ گو یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اس نے پھر کسی دوسرے کے ساتھ بھی شادی نہیں کی۔ بہر حال ۶۶ برس کی عمر میں، جب کہ وہ ایک والہانہ محبت میں گرفتار تھا اور محبوبہ بھی اپنے نرم مزاج شوہر کی آنکھوں کے سامنے جذباتی ایسی سپردگی اور ربودگی کے ساتھ اسکی دلدادہ تھی، اس نے یہ اشعار موزوں کئے ؎

پھول کھلنے کا سماں ہے روز و شب — دل محبت میں جواں ہے روز و شب
برف کے گالوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں — ایٹنا آتش فشاں ہے روز و شب

نور برساتی ہو تم مثلِ سحر — ایک فسردہ کوہ کی دستار پر
اور دلِ حاتم میں ہے عزلت گزیں — اک تب و تاب، اک بہار کیف اثر

ایٹنا کی آتش فشانی محض شاعرانہ مبالغہ ہے۔ جہاں تک میں اسے جانتا ہوں اس کا دل کبھی کسی عورت کے لئے آتش فشاں کی مانند نہیں دہکا۔ وہ ہر قسم کی آتش فشانی کے خلاف تھا۔ یہاں تک کہ سائنس کی دنیا میں بھی اسکی یہی روش تھی۔ لیکن وہ ایک فسردہ کوہ کی دستار

ذاتی شرف و وقار کا یہ بیان جو تعلی سے مبرا ہے اور بے غرضانہ صداقت سے لبریز، اپنے اندر کتنی عظمت رکھتا ہے! کتنی بڑی بات ہے اپنے متعلق یہ کہنا، اپنے متعلق یہ کہنے کا حق رکھنا کہ میں ایک ایسے عظیم القدر اور رفیع الشان پہاڑ کی مانند ہوں جو اپنی حزن پرور برگزیدگی میں بلند ہے اور بعید ہے اور اس کے باوجود ایک پیار بھرا حسن ہے جو اس پر رنگ و نور کی لطیف پھواریں برساتا ہے، جو اسکی مہیب عظمت سے خوف نہیں کھاتا بلکہ اسے چومتا ہے، اسے سنوارتا ہے، اسے تب و تاب بخشتا ہے، وہ حسن جو سحر کی مانند ہے۔

علاوہ ازیں غیر جرمن قاری کی خاطر یہ بتانا ضروری ہے کہ نظم کی ہیئت کے پیش نظر دوسرے بند کے تیسرے مصرع میں "دو مارگن روٹے" کا قافیہ ہونا چاہئے۔ یہ قافیہ جسے مصنف نے شرارتاً ایک مشرقی نام حاتم کے پردے میں چھپایا ہے اور جسے قاری کی متعجب اور محظوظ سماعت توقع کے مطابق خود بخود مہیا کر دیتی ہے، اصل نام یعنی گوئٹے ہے۔

یہ ایک شاندار انا پرستی ہے جس سے ہم دوچار ہوتے ہیں، ایک خود مستی جو اتنی پُر وقار ہے جو اپنی تکمیل، اپنی بالیدگی، اور اپنے مختلف عناصر و اجزا کی چھان پھٹک میں اس شدت اور تسلسل کے ساتھ منہمک رہتی ہے کہ اس کے لئے خود پسندی جیسے ہلکے لفظ کا استعمال یقیناً نامناسب ہے یہ دراصل ایک گہری انبساطی کیفیت ہے جو انا اور اس کے تدریجی ارتقا میں ڈوبنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ہم کو شاعری اور صداقت، جیسی تصنیف ارزانی کی جو دنیا کی بہترین اور یقیناً دلفریب ترین خود نوشت سوانح عمری ہے۔ یہ صیغۂ واحد متکلم میں گویا ایک ناول ہے جو ایک عدیم المثال اور ناقابل تقلید دل پذیری کے ساتھ یہ بتاتا ہے کہ فطانت کس طرح وجود میں آتی ہے۔ کس طور سے مرفہ الحالی اور جوہر اصلی کسی پُر اسرار مشیت کی تعمیل میں باہم شیر و شکر ہوتے ہیں۔ اور شخصیت کی کلی کیوں کر رحمت و رافت کی دھوپ میں کھلتی ہے۔ شخصیت! گوئٹے نے اس چیز کو وہ فانی انسان کی سب سے بڑی خوش طالعی اور خوش قسمتی!" بتایا، لیکن یہ حقیقت میں کیا چیز ہے، کن عناصر سے ترتیب پاتی ہے، اس میں کیا راز ہے۔ اور راز اس میں یقیناً ہے۔ یہ خود اس نے بھی واضح نہیں کیا صحیح اور نپے تلے الفاظ کے استعمال سے اس کو جو دلچسپی تھی اس کے باوجود اس کا یہ خیال تھا کہ ہر بات گفتنی اور لائق تصریح نہیں ہوتی۔ بہر حال شخصیت کے لفظ اور مظہر کے ساتھ ہم خالص ذہنی، عقلی، اور قابل تجزیہ امور کی دنیا سے رخصت ہوتے ہیں وہ جو سارے عالم کو متحیر کر دیتا ہے" اور بحث تمحیص کا موضوع نہیں بن سکتا۔

گوئٹے کی موت کے چند روز بعد ولیلم فان ہمبولٹ نے جو نہایت سلجھی ہوئی نظر رکھتا تھا اس عجیب امر پر اظہار خیال کیا کہ یہ شخص بغیر کسی شعوری ارادے اور کوشش کے محض اپنے وجود کی بنا پر بے حد و نہایت اثرات پیدا کرنے کا باعث ہوا تھا۔ اس نے لکھا یہ چیز اس تخلیقی کام سے بالکل علیحدہ ہے جو اس نے مفکر و مصنف کی حیثیت سے سرانجام کیا۔ یہ اسکی عظیم اور منفرد شخصیت کا کارنامہ ہے۔" اس جملے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ لفظ محض ایک لسانی پینترا ہے کسی ایسے مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر ہیں، کسی ایسی تخلیق کو ظاہر کرنے کے لئے جس کے سوتے ذہنی نہیں بلکہ حیاتی ہیں۔ شخصیت جو ہمہ گیر جاذبیت اور عالمگیر کشش رکھتی ہے یقیناً ایک مخصوص اور زبردست نہ کہ سادہ و ناتراشیدہ قوت حیات کی ساختہ و پرداختہ ہے قوتِ حیات جو طاقت اور کمزوری کا آمیزہ ہے، ایک ایسے تناسب کے ساتھ اور ایک ایسے عمل کے

ذریعے جو سرت سے بھرے ہوئے جرہانی ارزوں ہی سے ایک رازدار ہے ۔

صدیوں کی جرمن زندگی پر اگر نظر ڈالی جائے تو نسل اور خون کے ایک دھارے کا پتہ چلتا ہے جو بظاہر معمولی اور ناقابل لحاظ ہے یقیناً مادر فطرت کے سامنے کوئی مخصوص نصب العین نہیں ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ عملاً ایک نصب العین ہے۔ ایک مخصوص نصب العین! چنانچہ گوئٹے اپنی انّا جتایا کی زبان سے یہ الفاظ ادا کرتا ہے ۔

"ناممکن ہے کہ ایک قبیلہ غیر متوقع طور پر کسی دیوزاد کو جنم دے یا کسی عفریت کو وجود میں لائے صرف اچھے یا بُرے انسانوں کی ایک نسل ہی پایانِ کار مسرت یا تباہی پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے "

دیوزاد اور عفریت یعنی فوق الفطرت مخلوق۔ اسکے ذہن میں دونوں کا خیال بیک وقت آتا ہے۔ وہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ جس طرح ابتہاج و مسرت میں ہمیشہ دہشت کا بھی ایک پہلو ہوتا ہے۔ اسی طرح دیوزاد میں بھی عفریتی انداز کا پایا جانا لازمی ہے صاف اور سیدھی نثر میں وہ اس بات کو یوں کہتا ہے "جب خانوادے ایک طویل مدت تک قائم رہتے ہیں تو بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ صفحۂ ہستی سے محو ہونے سے قبل وہ ایک ایسے شخص کو وجود میں لاتے ہیں جو ایک مجموعہ ہوتا ہے۔ اور ایک مظہر ہوتا ہے اپنے اجداد کے تمام اوصاف کا، نیز انکے ایسے میلانات کا جو مخفی رہے اور بروئے کار نہ آسکے " یہ بات مختصر انداز میں کہی گئی ہے، بے غرضانہ تلقین کا رنگ رکھتی ہے، انسان اور فطرت کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور اس کا اپنے فوق الفطرت وجود سے سوچ سمجھ کر استنباط کی گئی ہے لیکن ایسا ہوتا کیوں کر ہے؟ امتزاج و التیام کا عمل کیونکر آگے بڑھتا ہے۔ ؟ نہایت خاموشی کے ساتھ اور بہت ہی دھیمے انداز میں مختلف قبائل پھیلتے پھولتے ہیں اور آپس میں شادیاں کرتے ہیں۔ قدیم رواج کی پیروی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے والا معمولی دستکار اپنے استاد یعنی مستری کی لڑکی سے شادی کرتا ہے۔ نوابی محل سرا کی کنیز سرکاری امین یا ناظم ضلع سے بیاہی جاتی ہے۔ پیدائش اور موت کے درمیان اختلاط و موانست کا یہ ضروری عمل جاری رہتا ہے اور بظاہر کوئی اہمیت بھی نہیں رکھتا لیکن پھر بتدریج اس تعزیر کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے جو ملکیت، ثقافت، شائستگی اور نجابت سے وابستہ ہے، یہاں تک کہ انجام کار ایک سٹی مجسٹریٹ کو وجود میں لانے کا باعث بنتا ہے ۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لنڈھائمر خاندان نے ٹکسٹر خاندان کے ساتھ جو جرمنی کے جنوب سے آکر... فرینکفرٹ میں بس گیا تھا سلسلۂ ازدواج قائم کیا، اور پھر اس طرح ٹکسٹر خاندان نے گوئٹے خاندان کے ساتھ جس کا وطن اصلی شمال میں تھورنگیین فارسٹ اور ہرز کے پہاڑوں کا درمیانی علاقہ تھا، شادی بیاہ کے ناتے جوڑے ۔

میرا خیال ہے کہ اس عظیم شاعر کی فطرت کا بہترین، صحت مند ترین اور سب سے زیادہ فیصلہ کن عنصر لنڈھائمر خاندان کا وہ خون ہے جو قدیم رومن سرحد کے قرب و جوار سے آیا، جہاں بحیرۂ روم اور روحشیانہ نسلی دھارے قدیم الایام سے متحد ہوتے چلے آرہے تھے۔ یہ اسکی نانی کا ورثہ تھا جو پیدائش کے لحاظ سے لنڈھائمر خاندان سے اور شادی کے اعتبار سے ٹکسٹر خاندان سے تعلق رکھتی تھی، اور ایک مضبوط، سیدھی سادھی، شریف النفس بھورے رنگ کی عورت تھی تصویروں اور شبیہوں سے پتہ چلتا ہے کہ اپنی پیشانی، اپنے سر اور دہانے کی بناوٹ اپنی اطالوی آنکھیں، اور اپنی جنوبی رنگت اس نے یہیں سے ورثے میں پائی۔ اور یقیناً یہی ماخذ

اصلی تھا اس کے کلاسیکی رجحان کا، اسکی ہیئت پرستی اور وضاحت پسندی کا۔ اس کی تخیلیت، طنز و طعن اور دلکشی کا، اور جرمن کردار سے اس کی ناخوشی کا جو کبھی تنقید کی شکل اختیار کرتی ہے اور کبھی بیزاری کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے ۔

ان سب کے باوجود ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہی جرمن کردار اس پُرخلوص اور کھردرے عوامی انداز کا ایک اہم جزو تھا جو اس نے ہنس سخس اور مارٹن لوتھر کی نسل سے ورثے میں پایا چنانچہ یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ شاید ہی کبھی کسی ایسے ٹھیٹھ جرمن شخص نے المانویت پر ایسی سخت اور ظالمانہ تنقید کی ہو، اور یہ کہ جرمنوں کی وحشت دشمنی (یعنی خود دشمنی) کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی ۔

حیاتی نقطۂ نظر سے وہ خاندان جو اس مظہر یعنی اس دیوزاد کو وجود میں لانے والا تھا یقیناً کچھ بہت ہونہار نظر نہیں آتا تھا اس کا دادا فریڈرخ جارج گوئٹے جو درزی تھا بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ مرضی طور پر اضمحلالِ قویٰ کا شکار ہو گیا تھا۔ اس نے دو مرتبہ شادی کی اور گیارہ بچوں کا باپ بنا جن میں اکثر بچپن ہی میں فوت ہو گئے صرف تین ایسے تھے جو اس کے بعد تک زندہ رہے۔ ان میں سب سے بڑا بلاشبہ فاتر العقل تھا اور ۴۲ سال کی عمر میں شدید اختلالِ حواس کے عالم میں جاں بحق ہوا شاعر کا باپ یوہان کیسپر گیارہ بہن بھائیوں میں سے دسواں تھا۔ یعنی اپنے عمر زدہ والدین کی بڑھاپے کی اولاد۔ اسکا وجود اس امر کی جیتی جاگتی شہادت تھی۔ یہ ماہر قانون جسکے پاس "سلطانی مشیر" کا خریدا ہوا خطاب بھی تھا کچھ عجب آزردہ منش اور چڑچڑے مزاج کا انسان واقع ہوا تھا۔ ایک طول زاہد عزلت گزیں جو کبھی اپنے پیشۂ قانون کے سلسلے میں کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ نوادرات کا جمع کرنا اسکا پسندیدہ مشغلہ تھا جس میں وہ بیحد غلو سے کام لیتا تھا اس کی فضیلت مآبی اور ادعائیت ناقابل برداشت تھی۔ وہ ایک بد دماغ مراقی تھا جسکے پیچیدہ دلوں العمل میں ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی بہ آسانی خلل انداز ہو سکتا تھا۔ الزبتھ نے جس کا باپ ٹاؤن مجسٹریٹ اور ماں لنڈھائمر خاندان کی خاتون تھی اور جو ایک شگفتہ مزاج لڑکی تھی جب اس سے شادی کی تو اسکی عمر صرف سترہ سال کی تھی، یعنی شوہر کی عمر میں بالکل نصف۔ اس نے ہرگز کسی دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا، کیونکہ اسے اپنی زندگی کا بہترین حصہ ایک خود سر اور جابر بوڑھے کی نرس کی حیثیت سے گزارنا پڑا۔ الزبتھ کا باپ یوہان وولف گانگ ٹکسٹر بھی کم سے کم اپنی جوانی میں ضرور ایک "روحِ شاداں و فرحاں" رہا ہوگا، جیسا کہ گوئٹے اپنی ماں کو کہا کرتا تھا۔ گویا وہ ایک اوباش تھا جو بیاہ عورتوں کے پیچھے بھاگا پھرتا تھا اور کبھی کبھی جھلائے ہوئے شوہروں کے ہتھے بھی چڑھ جاتا تھا مگر وہ ایک مجموعۂ اضداد تھا۔ ان حرکتوں کے باوجود اسمیں پیش گوئی کی صلاحیت تھی غیب بینی کی قوت تھی، اور اپنی پیرانہ سالی میں۔ وہ اسی سال کی عمر میں مرا۔ اسنے سنجیدگی متانت بااخلاقی اور عزو وقار کا ثبوت دیکر اپنے دور شباب کی بے عنوانیوں اور ہرزہ کاریوں کی جو بہت احسن تلافی کر دی ۔ اس نے اپنے آخری سال ایک پہیے دار کرسی میں ایک مسلوب الحواس مریض کی حیثیت سے گذارے۔

"سلطانی مشیر" کی بیوی الزبتھ کے یہاں چھ بچے ہوئے جنمیں پانچ پیدائش کے دو تین دن بعد ہی عالم ارواح کی جانب منہ موڑ گئے صرف ایک بہن کورنیلیا نے اپنے بھائی وولف گانگ کا بچپن کے بعد تک ساتھ دیا۔ یہ ایک بدبخت آزردہ مزاج لڑکی تھی جو اعصابی اور جلدی امراض کی شکار تھی۔ وہ سرد مہر اور لاجنسی تھی، اور جیسا کہ اسکے بھائی نے کہا، بیوی بننے کے بجائے راہبہ بننے کیلئے پیدا ہوئی تھی۔ تاہم اس نے شادی کی اور زچگی میں جسکے خیال نے اسکو پہلے ہی سے متنفر کر رکھا تھا جاں بحق ہوئی صرف وہی ایک تھا جو جیا، اور اس

بھر پور طور سے جیا گویا چھیوں بہن بھائیوں کی زندگی اسی کے حصے میں آگئی اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ صحت و توانائی جس سے دوسرے محروم رہے تھے اور جسے پا سنے ایک غیر ارضی ترحم دلوں کیساتھ متصف ہونیکی کوشش کی، اس کے

عمیق حنفی اردو سروس آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی

امیر خسرو اور عصر جدید

ہم نے سمجھنے سمجھانے کے کام کو آسان بنانے کے لیے بعض تصورات کی تخصیص و تحدید کے لیے اور تمیز و شناخت کے مدارج طے کرنے کے لیے چند مفروضات وضع کیے اور انھیں تعریف و تسمیہ کے احاطے میں گھیر لیا۔ انسانی مقدرات کی ستم ظریفیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان اپنی سہولیت اور اعانت کے لیے اسماء و صفات، اصطلاحات و تعریفات کی تخلیق کرتا رہتا ہے اور پھر اپنی ہی مخلوق کا تابع ہوتا چلا جاتا ہے۔ اپنے تصورِ عصر ہی کو لے لیجیے۔ زمین کا اپنے محور پر گردش کرتے رہنا یا اپنے مدار پر سورج کے طواف کے مسلسل عمل پہ قائم رہنا ایک مستقل آہنگ کا حامل ضرور ہے بے شک شب و روز کا تغیر اور بہار و خزاں کا تبادل ایک جچی ہوئی گٹھی ہوئی نہ بدلنے والی لے کا دائرہ بناتا ہے جسے ہم عصر، زمان یا وقت کہتے ہیں، گھڑیاں، جنتریاں، زائچے، رصدگاہیں اسی بنیادی لے کو تال میں بانٹ کر اس کی خالی بھری ماترائیں گنتی رہتی ہیں بس اتنی سی بات ہے جس نے قصۂ جدید و قدیم کا طول اختیار کر لیا اور ایک لا متناہی بحث کی طرح ڈال دی، اساطیر، داستانیں، تاریخ، سوانح، روزنامچے اسی بحث کے مختلف ابواب ہیں۔ انسانی تجربے کی اس ایک جہت نے دوسری تمام جہات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ کائنات کے رقص کی یہ لے جسے ہم عصر یا زمان یا وقت کہتے ہیں اس کے مرکزی سُر اور بنیادی نغمے سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے۔

دراصل زیرِ قلم مضمون "طرحی" ہے اور اس کے عنوان کے ترکیبی الفاظ نے مجھے اس پر اونچی آواز میں سوچ بچار کرنے کی ترغیب دی ہے عصر، زمان یا وقت، تقدیم و تاخیر، تسلسل و تواتر اور حقائق کے ترتیبی تناسب اور آہنگ کا نام ہے۔ زمان کا تصور مکان سے علیحدہ اور ماورا ایک نقطۂ موہوم بن کر رہ جاتا ہے۔ کوئی عہد بالکلیہ نہ ماضی ہے نہ حال نہ مستقبل۔ حرکت و رفتار، خواہ اجسام کی ہو خواہ اذہان و افکار کی، فصلِ مکانی ہی کی طرح فصلِ زمانی کو بھی کم کرتی چلی جاتی ہے۔ قدامت میرے نزدیک جمود و تعطل کا نام ہے تو جدت حرکت و رفتار کا۔ فاصلوں کو مکانی اکائیوں سے ناپنے کے بجائے اگر زمانی اکائیوں سے ناپ کر دیکھا جائے تو یہ تجربہ صرف دلچسپ ہی نہیں مفید بھی ہوگا۔ مثلاً دہلی سے بمبئی کتنے گھنٹے کا فاصلہ ہے۔ ہماری زمین سے چاند کتنے دنوں کی دوری پر ہے؟

جغرافی مظاہر، معاشی وسائل، سیاسی نظام اور تصورات جرم و سزا ادوارِ تاریخ کو ایک دوسرے سے متمائز بے شک کرتے ہیں لیکن یہ اختصاصِ زمان و مکان آدم تا ایندم کی داستان کے کلی تناظر میں محض تدریسی اور تدریجی نوعیت رکھتے ہیں۔ خطوطِ اطوال حاضر

نقشوں ہی پر نظر آتے ہیں، کائنات میں نہیں۔ سیکنڈوں، منٹوں اور گھنٹوں کے نشانات گھڑیوں پر ہی ملتے ہیں سورج کے ڈائل پر نہیں۔ زمان و مکان کی مغائرت کا انحصار اس پر...... زیادہ ہے کہ محسوس کرنے والے کا احساس کس حد تک زمان و مکان کے کسی خاص نقطے پر ساکت و جامد ہو گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ میر و میرزا کے اکثر و بیشتر اشعار ہمیں کسی مغائرت یا اجنبیت کا احساس نہیں دلاتے بلکہ ہمیں اپنے عہد کے محسوس ہوتے ہیں لیکن جانشینانِ داغ کے اکثر و بیشتر اشعار جیتے جاگتے کھنڈروں کا احساس دلاتے ہیں اور اس کی معاشرت کی کلاسیت اور قانونِ ارتقاء کی بنیادی روایت کا عرفان و شعور جن شعراء کو حاصل ہے انھیں میں کلی شاعر .... قرار دیتا ہوں اور ان کے باسی پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

امیر خسرو اور ہمارے درمیان ساڑھے چھ صدیاں حائل ہیں لیکن دراصل یہ فاصلہ اتنا ہے جتنا ہمارے اور الماری یا کتب خانے یا کتب فروش کی دکان کے درمیان ہے۔ اور جب کلامِ خسرو کا سحرِ حلال مسامات جاں تک اتر جاتا ہے تو فضائے شعر کی اجنبیت یا محاورے کی قدامت اس قلبی اور روحانی ارتباط میں حائل نہیں ہوتی۔ جیسے ہمارا استغراق، زمان و مکان کے فاصلوں کو بیک جست طے کر کے پیدا کر لیتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم احساس کی سطح پر امیر خسرو کا فیضِ صحبت حاصل کریں، شعور کی سطح پر تاریخ اور معاشرت کے علمی اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے تقابل ادوار سے استفادہ کریں۔ امیر خسرو کی جامع الصفات شخصیت تاریخ ہند کے ایک ایسے دور میں طلوع ہوئی تھی جو کئی اعتبار سے عبوری نوعیت رکھتا تھا۔ ملک کی سیاست، عمرانیات، اقتصادیات، فکری اور ذہنی اعتقادیات ایک نئی صورت اختیار کر رہی تھیں۔ تخت اور تختے کے درمیان ایک بالشت کا فاصلہ بھی نہ تھا۔ زندگی کا نشیمن شاخِ آہو پر تھا۔ انتشار کے سمٹنے اور پھیلنے پر اس دور کی تاریخ کے ورق بدلتے تھے۔ عیش و عشرت کے ادوار خوابِ خرگوش کی طرح جب لمحۂ ہوش کی گرفت میں آ جاتے تھے تو شاہی خاندان کے معصوم افراد کے خونِ ناحق کا منظر سامنے ہوتا تھا شمال مغربی سرحدوں سے قتل و غارت کے خوگر مغلوں کے غول کے غول پنجاب اور دہلی کی طرف تباہی کی آندھی بن کر لپک رہے تھے میوات کے جنگل میواتیوں کو لوٹ مار اور قتلِ عام کی ترغیب دے کر دہلی کی طرف مائل کر رہے تھے۔ سیاست میں مرکزیت اور لامرکزیت کی کشمکش نمایاں تھی۔ دہلی کا .... قائم مزاج کے زیادہ سے زیادہ حصوں کو اپنے زیرِ اقتدار کے

سامنے ہی لانا چاہتا تھا اور علاقائی سردار، امیر اور راجگان آزادی اور خود مختاری کے دل و جان سے خواہاں تھے۔ علمائے شریعت حامئے سلطنت کے مطیع و فرمانبردار تھے تو اولیائے طریقت عوام الناس کی اخلاقی، روحانی اور انسانی قدروں کے عقابِ احتجاج کو اپنے ہاتھوں پر بٹھائے ہوئے تھے۔ ملتان کے مسلمان سود خور بھی ہندو سود خوروں سے کم نہ تھے۔ اجناس کی قیمتوں کا گھٹنا بڑھنا، ساہوکاروں کے اشارۂ ابرو کا تابع تھا۔ ملاوٹ اور کم تولنے کا رواج بھی عام تھا۔ علاء الدین خلجی کی اصلاحات کا باعث یہی سبب تھا۔ ملکِ "بالا" سے آنے والے ترک، سرزمینِ ہند کی اجنبی آب و ہوا اور تہذیبی فضا میں اپنے آپ کو الگ تھلگ پاتے تھے۔ ان کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا تو اس سرزمین کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہو کر اپنے آپ کو گم کر دیں یا تعلی و تکبر کی ہوا سروں میں لئے ہوئے اپنے شیرازی، سمرقندی، بخاری اور ماوراء النہری ہونے پر فخر کرتے رہیں اور اپنے محدود حلقے میں بند رہیں۔ پھلنے پھولنے والے درختوں کی طرح اپنی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں اتار دیں یا بے برگ و ثمر آکاس بیل کی طرح سایہ دار درختوں کا خون چوسنے کے لئے ان کی پھننگوں پر اپنے وجود کے جال پھیلا دیں۔

امیر خسرو نے ۱۲۵۳ء سے ۱۳۲۵ء تک کئی آتار چڑھاؤ دیکھے۔ ان کے حساس ذہن نے اپنے سامنے بدلتے ہوتے رنگ و آہنگ کا بہت قریب سے ادراک کیا اور ان تبدیلیوں کو ضبطِ تحریر میں لا کر آنے والی کئی پیڑھیوں کے لئے محفوظ کر دیا۔ ایک مؤرخ کی حیثیت سے امیر خسرو بہ زمانی اہمیت رکھتے ہیں۔ عہدِ بلبن سے لے کر عہدِ غیاث الدین تغلق تک کے بہت سے واقعات اور ان کے سن و سال کی معلومات کے واحد، مستند اور معتبر راوی امیر خسرو ہی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بعض بے لطف واقعات کے سلسلے میں وہ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں، ایک ایسی خاموشی جسے آج کے بعض مورخین مجرمانہ قرار دیتے ہیں۔ جلال الدین خلجی کا قتل۔ نظامی خانقاہ اور دیری اور تغلق آباد کے درباروں میں بیک وقت یکساں سرفرازی اور دل نوازی کا حاصل کرنا بھی آج کے بعض مورخوں کے لئے ایک عقدۂ لاینحل ہے اور اس حقیقت کو وہ امیر خسرو کے حق میں نہیں سمجھتے۔ امیر خسرو کے اطوار و اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں "ناوابستگی" کے قائل تھے اور جیب و دامن کے رشتے کو قلب و روح کا رشتہ نہیں بناتے تھے۔ ملازمت کے باوجود ذہنی وابستگی اور فکری تلوث سے اوپر رہنا پسند کرتے تھے۔ یوں دیکھا جائے تو تیرہویں چودہویں صدی کے مورخین تنقید و تصفیہ کے فرائض سے کم آشنا ہوتے تھے اور احوال واقعی کے اظہار یا اخفا ہی پر اپنے فرائضِ منصبی کا دارومدار رکھتے تھے۔

امیر خسرو کا رویہ ایک محبِ وطن کا رویہ ہے، وہ اپنے ہندی ہونے پر فخر کرتے ہیں اور اپنے ہم عصر ترک دانشوروں کے برعکس ایک خوش گوار استثنا بن جاتے ہیں۔ وہ سرزمینِ ہند کے بارے میں صرف یہی نہیں کہتے کہ ؎ "ہست مرا مولد و ماویٰ و وطن" بلکہ یہ بھی کہتے ہیں ؎

دیں ز رسول آمدہ کای زمرۂ دیں   حبِ وطن ہست ز ایماں بہ یقیں

مثنوی "نہ سپہر" میں ملکِ ہند اور اہلِ ہند کی فضیلت و افضلیت کی کئی حجتیں پیش کرتے ہیں اور کھلے دل سے ہند کی برتری کے راگ الاپتے ہیں۔ اس مثنوی کے ایک سو بارہ اشعار عرب و عجم پر ہند کی برتری کے دلائل پیش کرتے ہیں۔ افراطِ اشیاء و اسباب و معاش، اعتدالِ آب و ہوا، طائرِ فردوس یعنی طاؤس کا کمال رقص اور طائرِ مینا کا ساتھ رہنا، ہندی پھولوں کی دلآویز رنگت اور خوشبو، اہلِ ہند کی وفاداری اور مسلمانانِ ہند کا راہِ حق پر ہونا، ان جذباتی دلائل کے علاوہ امیر خسرو نے عقلی حجتیں بھی پیش کی ہیں ؎

ترجیحِ اہلِ ہند بر اہلِ عجم ہمہ   در زیرکی و دانش و دانائی و ہوشیار

ہندوستانی زبانوں بالخصوص سنسکرت کو امیر خسرو فارسی و عربی کے درمیان مقام فضیلت عطا کرتے ہیں۔ ہندی علم ریاضی و ہیئت و نجوم، وید مقدس وغیرہ کی تقدیس و تعریف سے امیر خسرو کا کلام پرہیز نہیں کرتا۔ امیر خسرو دور آبے کو "ہندوستان" کہتے ہیں اور سارے ملک کو یعنی برصغیر کو "ہند" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ "ہند" کے اس کلی تصور رکھنے کے سلسلے میں بھی انھیں داد ملنی چاہئے۔

امیر خسرو کے ذہنی اور فکری مسائل میں سے کئی ایک ہمارے مسائل سے مماثلت رکھتے ہیں۔ وہ اس برصغیر اور اس کی آب و ہوا اور تہذیبی فضا میں اپنی شخصیت کی جڑیں اتارنا چاہتے تھے اور ہم ان جڑوں کی تلاش کر رہے ہیں یعنی امیر خسرو کے سامنے کائی سطح پر جو سوال تھا وہی سوال زمانی سطح پر ہمارے سامنے ہے۔ دہلی، ملتان، اندھ، لکھنوتی، دیوگیری، ورنگل، ہوار سمندر وغیرہ کی شہری معاشرت انھیں بے حد پرکشش معلوم ہوتی ہے۔ ہند کے تیوہار اور شاہانہ تقریبات میں انھیں دلکشی نظر آتی ہے۔ محنت، ہنرمندی، فن کاری کے وہ مداح ہیں اور ہندی مصنوعات کی عظمت اور افادیت کے قائل، اس طرح امیر خسرو میں ایک سیکولر اور متحدہ رنگ تہذیب کے وطنِ واحد کے تصور کی ابتدائی شکل دکھلاتے ہیں جو انکے عہد کی اصلی اور تحفظات کی محدود فضا سے اوپر اٹھا ہوا ہے۔ ان کی شاعری کی فضا ایرانی تورانی سے زیادہ ہندوستانی ہے۔ ہندی الفاظ اور محاورے کا بے تکلف استعمال انکی معوری "کو "سبکِ ہندی" کا بے مثال نمونہ بنا دیتا ہے۔

"اعجازِ خسروی" کے رسائل اور "غرۃ الکمال" کا دیباچہ امیر خسرو کی نثریات اور جمالیات سے ہمیں روشناس کراتا ہے۔ ان کے اسالیب کا مطالعہ آج بھی دلچسپی کا سامان فراہم کرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ "مدرسوں" کا اسلوب تیرہویں، چودہویں صدی میں بھی ناپسندیدہ تھا۔ طنز و مزاح میں ابتذال کو گوارا کر لیا جاتا تھا اور طنز و تمسخر میں طبع آزمائی کرنا امیر خسرو جیسے سربلند ادیبوں کے لئے بھی ہیٹی کی بات نہ تھی۔ "اعجازِ خسروی" کے رسائل میں ہمیں امیر خسرو کی ذات سے ملنے کا موقع ملتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امیر خسرو شاعری کی زبان و اسلوب کو حقیقی فطری، سادہ اور راست رکھنے کے خواہش مند ہیں اور نثر کی زبان و اسلوب کو مرصع و مسجع۔ امیر خسرو کی شاعری میں تدقق، تعقل اور تحقق کے رویے نمایاں ہیں اور جذبہ و احساس کی معقول صورت زیادہ نظر آتی ہے۔ ان کی صنعتوں کا دارومدار ذاتی تجربے اور ماحول پر ہے اور ان کا تخیل حقیقت سے دامن کشاں نہیں ہوتا۔

شاعری میں ہیئت و اسالیب کے تجربوں کے سلسلے میں بھی امیر خسرو کا مطالعہ تہی دامن نہیں لوٹاتا۔ استعمالِ قوافی اور صنعتِ معمہ کے علاوہ مثنوی "نہ سپہر" میں نئی بحروں کا تجربہ قابلِ غور ہے۔ آج کی مختلف البحور اور کثیر الاوزان نظموں کا نسب نامہ سات سو برس پہلے

سے شروع کیا جاسکتا ہے۔ ملوکیت اور تصوف سے قریبی تعلق کے باوصف امیر خسرو کی شاعری کا مرکزی کردار انسان ہے۔ انسانی وجود احاطہ کرنے والے رنج و غم اور انبساط و مسرت کے لمحات انکی شاعری میں کثرت سے ملتے ہیں۔ فطرت اور تمدن دونوں سے بیک وقت لطف اندوز اور مستفید ہونے والی طبیعت امیر خسرو کو ملی ہے۔ ہر بڑے شاعر کی بہت سی جہات امیر خسرو کی بھی ہو سکتی ہیں جنمیں سے ایک بہت بڑی جہت یہ تھی کہ اس زمانے کے سیاسی . . . . سے دربار اور خانقاہ سے آشیر واد حاصل کر کے بھی اپنی انفرادیت اور شناخت کی شناخت کو کیسے قائم رکھا جاتا ہے وہ محفل اور ہر صحبت میں گھل مل جاتے ہیں۔ بالکل پانی کی طرح کہ جس میں مل جاتا ہے ویسا ہی رنگ اختیار کر لیتا ہے لیکن اپنی نمی اور روانی کو نہیں کھوتا۔

امیر خسرو کی ہشت پہلو اور جامع صفات شخصیت کے تین پہلو ہر زمانے کے لوگوں کے لئے دلچسپی، افادیت اور معنویت رکھتے ہیں۔ ایک ذہین اور حساس انسان کی حیثیت سے جس نے اپنے عہد کے تقریباً تمام علوم کی آگاہی حاصل کی، ایک مورخ جس نے منظوم پیرائے میں اپنے عہد کے واقعات و حالات اور مناظر و مناظر کو شاعرانہ حسن و خوبی کیسا تھ بیان کر دیا اور اپنے عہد کی سماجی معاشی اور معاشرتی حقیقتوں کو عمرانی نقطہ نگاہ سے کریدنے کی کوشش کی، اور ایک شاعر جس نے فارسی کو ہندیایا اور ترک ہوتے ہوئے بھی مقامی زبانوں اور اسالیب کو اپنایا اور برتا۔ امیر خسرو کی موسیقی دانی پر تو کوئی شک و شبہ نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کا اس میں ذاتی دخل اور تجربہ کسی اندرونی یا اہم علم نہادت کے بغیر مشکوک ضرور ہے۔ اسی طرح انکی ہندی شاعری کے نمونے بھی تا حال مستند و معتبر قرار نہیں دیئے جا سکے عصر حاضر میں امیر خسرو کے متعلق کو عقیدتوں کے بنے ہوئے جالوں سے گزر کر امیر خسرو کی ذات تک رسائی حاصل کرنا ہوگی۔ انکے دواوین کے دیباچے اور "اعجاز خسروی" کے رسائل کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ صرف سبک ہندی کی فارسی بلکہ تیرھویں چودھویں صدی کی ہند و ستانی لسانیات معنیات اور اسلوبیات کے تدریجی ارتقا پر روشنی ڈال سکتا ہے مثلاً "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں عربی اور فارسی شاعری کا تقابلی مطالعہ تنقیدی شعور کا ثبوت بین ہے، اسی دیباچے میں شعر میں چار اشکال کا ذکر ملتا ہے۔ یابس، معتدل، رطب اور مغرق۔ یابس میں صنعت لفظی موجود تو رہتی ہے مگر سلاست نہیں کھوتی اور طراوت معنی رکھتی ہے۔ رطب میں سلالت و جذالت غالب رہتی ہے اور رعایت لفظی بہ تکلف نہیں برتی جاتی مغرق میں رعایت بے ارادہ طریقے سے آجائے تو آجائے ورنہ شکل ایسی ہے کہ آگ کی طرح پنجہ ڈال کر اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ یہ وہ روحانی شراب ہے جو کاسہ مہتاب میں کھینچی جاتی ہے اور ایک وجدانی لذت رکھتی ہے۔ اسی دیباچے میں شاعری کی پانچ بہچانیں بتائی گئی ہیں۔ فاضلانہ، حکیمانہ، ہنکو طبعانہ، عاشقانہ اور شاعرانہ۔ فاضلانہ وہ ہے جس میں صنعت لفظی کا جی کھول کر استعمال کیا گیا ہو اور فارسی میں عربی کی (غیر متوازن و غیر متناسب) آمیزش کی گئی ہو حکیمانہ یعنی وہ جسے سنائی و ناصر خسرو وغیرہ نے برتا اور پسند کیا، وہ ہنکو طبعانہ ہو جو شن زندہ ہنکو طبعانہ طرز کی شاعری غزلوں میں بہت ملتی ہے "انچنا است کہ یکی گر دما نہ معین غزلہا تر بدیا آید و سفینہا ساز و و آوازا ان تو اند گزشت "عاشقانہ وہ جس میں رقت، غلبات، سوزش و شورش ہو۔ شاعرانہ دانش وہ جس میں جملہ طرزوں کا معتدلانہ امتزاج پایا جاتا ہو۔

باشی جو معلم سستا بنیاد شاعر باشی ولی نہ استاد

کیا ایسی تقاضا ہر دور میں نہیں کیا گیا؟ کیا ہمارے دور میں نہیں کیا گیا؟ کیا ہمارے دور میں جدید شعرا و ناقدین اسی بنیادی تقاضے کو لے کر اپنی شعریات کی عمارت نہیں اٹھا رہے ہیں؟

خسرو اپنی حقیقت پسندی کے باعث ہمارے اور قریب آجاتے ہیں۔ اپنی مثنویوں میں جہاں واقعات نگاری منظر کشی اور خاکہ نگاری کی مثالیں پیش کرتے ہیں، اس کی وجہ سے وہ اپنے عہد کے تجربے کے عینی اور معروضی مگر حساس شاہد ہی بن جاتے ہیں۔ یہ وہی رویہ ہے جسے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے شاعری کے لئے تجویز کیا کہ شاعر کی شخصیت اس کے شعری اور تخلیقی تجربے میں ملوث نہ ہو بلکہ محض کی حیثیت رکھے۔

"اعجاز خسروی" میں اسالیب کا ذکر آج کے متعلمین ادب کے لئے بہت اہم ثابت ہو سکتا ہے علمائے محقق کا اسلوب، داستان نگاروں کا اسلوب، فضلا کا اسلوب، خطیبوں کا اسلوب، مدرسوں کا اسلوب، عوام کا اسلوب، اہل حرفہ دکر خسنا اروں کا اسلوب اور مزاح نگاروں مسخروں اور نقالوں کا اسلوب۔ ان تمام اسالیب میں قابل مذمت ٹھہرا ہے مدرسوں کا اسلوب اور آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے کہ شاعری میں بھی خسرو "استادی" کے قائل نہیں۔ ان گذارشات سے مقصد یہ ہے کہ آپ اس نقطے کو نظر انداز نہ کریں کہ امیر خسرو محض شاعر یا وقائع نویس نہیں ہیں بلکہ با شعور اور صاحب علم متعلم جمالیات و شعریات بھی ہیں۔

امیر خسرو کی شخصیت کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ جس تالاب میں بھی رہے کمل کی طرح رہے بیشتر مقامات پر انھوں نے آنکھیں اور کان تو کھلے رکھے مگر زبان کو جنبش نہ دی۔ وہ معروضی حسیت کا مالی کرتا رہیں۔ انکی تحریروں میں روشن ترین عبارتیں وہ ہیں جن میں ان کی اپنی دھرتی کا حسن، رنگ و بو اور رعنائی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا تعلق غالب اور فاتح طبقے سے تھا لیکن ان کا شعری اور فکری رویہ کسی احساس برتری اور عصبیت کی بدبو نہیں رکھتا۔ محاربات کے بیان کی بات اور ہے کہ ایسے مواقع پر خسرو بھی اپنے ہم عصر مورخین کے محاورے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی ان کا قلم کف در دہاں نہیں ہوتا۔ ایک مورخ کے لئے امیر خسرو اطلاعات و معلومات کا بے پناہ ذخیرہ پیش کر سکتے ہیں، منگولوں کے غولوں کا اسرار اور سلاطین دہلی کی دفاع اور سرکوبی کی کوششیں، عہد بلبن میں بنگال کے حاکم کی بغاوت اور اس کا فرد کرنا، عہد خلجی میں راجپوتانہ، گجرات اور دکن کی مہمات، علاء الدین کی اصلاحات مبارک شاہ خلجی کا قتل غیاث الدین تغلق کے معرکے اور تخت نشینی وغیرہ ایسے واقعات ہیں جن کے بارے میں امیر خسرو کے بیانات حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔ امیر خسرو اپنے عہد کے پہلے مورخ ہیں جنہوں نے تہذیب، رسوم و رواج، صنعت و حرفت، معیشت و معاشرت، علوم و فنون اور عقائد وغیرہ پر توجہ کی اور بیش قیمت معلومات ہمارے لئے چھوڑیں۔ اس عہد کے بعض اہم واقعات کی تاریخوں کا تعین امیر خسرو کی اعانت کے بغیر ناممکن تھا۔

امیر خسرو کے سوانح نگار ڈاکٹر وحید مرزا ان کی بذلہ سنجی اور حسِ لطیف کو، انکی رواداری اور وسیع المشربی، سخاوت کو، صاف گوئی اور غیر منافقانہ رویے کو ان کی ہمہ گیر شہرت و مقبولیت کے اسباب میں شمار کرتے ہیں۔

امیر خسرو کی اہمیت اور معنویت اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک کہ انسان، اسکی تاریخ اور اسکے احساس و اظہار کے تجربات میں ہماری دلچسپی ختم نہ ہو جائے اپنے عہد کے سب سے بڑے سیاسی امرا یعنی بادشاہ کے مصاحب، اپنے عہد کے سب سے بڑے ولی کامل یعنی حضرت نظام الدین اولیاء کے چہیتے مرید اور اپنے عہد کے سب سے بڑے فن میں یکتا و یگانہ شاعر حضرت امیر خسرو بیک وقت متناقض، متخالف جہتوں میں سفر کرنے کے سلسلے میں ایسے چراغ راہ ہیں جسے بدلنے والے ادوار بجھا نہیں سکتے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی رکن مجلس ادارت "اوقات"

علّامہ اقبالؔ کا نظریہ اجتہاد

علامہ اقبالؔ مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :-

میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص زمانۂ حال کے (اصول قانون) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ہدایت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانین اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں۔ غرض یہ وقت عملی کام کا ہے، کیوں کہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جارہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"

(اقبال نامہ، جلد اول ص ۵۰)

اس اقتباس سے اندازہ ہوگا کہ علامہ کو تدوینِ فقہ جدید کی ضرورت و اہمیت کا احساس کس شدت سے تھا، سوال یہ ہے کہ یہ احساس کیوں تھا؟ اس کے جواب میں خود فرماتے ہیں۔

"چوں کہ ذات الٰہیہ ہی فی الحقیقت روحانی اساس ہے زندگی کی لہذا اللہ کی اطاعت فطرت صحیحہ کی اطاعت ہے، اسلام کے نزدیک حیات کی یہ روحانی اساس ایک قائم و دائم وجود ہے جسے ہم اختلاف اور تغیر میں جلوہ گر دیکھ سکتے ہیں۔ اب اگر کوئی معاشرہ حقیقت مطلقہ کے اس تصور پر مبنی ہے تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ثبات اور تغیر دونوں خصوصیات کا لحاظ رکھے، اس کے پاس کچھ تو اس قسم کے دوامی اصول ہونے چاہئیں جو حیات اجتماعیہ میں نظم و انضباط قائم رکھیں، کیوں کہ مسلسل تغیر کی اس بدلتی ہوئی دنیا میں ہم اپنا قدم مضبوطی سے جما سکتے ہیں تو دوامی اصول کی ہی بدولت، لیکن دوامی اصولوں کا یہ مطلب تو ہے ہی نہیں کہ اس سے تغیر اور تبدیلی کے جملہ امکانات کی نفی ہو جائے، کیوں کہ تغیر وہ حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے اللہ کی ایک بڑی آیت قرار دیا ہے، اس صورت میں تو ہم اس شے کو جس کی فطرت ہی حرکت ہے، حرکت سے عاری کر دیں گے، اسی کا نتیجہ ہے کہ گذشتہ پانچ سو برس سے عالم اسلام پر جمود طاری ہے"۔

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۲۲۸)

اس اہم منصوبہ کی تکمیل بلند پایہ اور وسیع النظر علماء کے ہاتھوں ہی ہو سکتی تھی اسی بناء پر علامہ نے ایک طرف مولانا سید سلیمان ندوی کو اس طرف متوجہ کیا جیسا کہ اقبال نامہ میں درج ان کے نام کے خطوط سے ظاہر ہے، دوسری جانب ۲۶ رجب مولانا محمد انور شاہ کشمیری دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس سے مستعفی ہو گئے تو علامہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مولانا کو لاہور بلانے کی کوشش کی تاکہ وہ اور مولانا دونوں مل جل کر تدوین فقہ جدید کا کام کریں (حیات انور مرتبہ سید ازہر شاہ قیصر کشمیری میں راقم الحروف کا مضمون) لیکن جب کہیں سے۔۔ اتنے برخاست کے باعث انھیں طبقۂ علماء کی طرف سے مایوسی ہو گئی تو انھوں نے اس موضوع پر انگریزی زبان میں خود ایک کتاب تصنیف کرنے کا ارادہ کر لیا، لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ان کی صحت خراب رہنے لگی اور کچھ مصروفیتیں بھی بڑھ گئی تھیں۔ اسی بناء پر وہ اس ارادہ کو اختتام تک نہیں پہونچا سکے۔ اس سلسلہ میں تھوڑا بہت جو کچھ لکھا تھا وہ یادداشتوں کی شکل میں تھا، ان کے ایک حصہ کا عکس اقبال اکاڈمی کراچی کے شکریہ کے ساتھ چراغ راہ کراچی کے اسلامی قانون نمبر کی جلد اول کے شروع میں شایع کر دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ تدوین فقہ جدید کی عمارت اس وقت تک کھڑی نہیں ہو سکتی جب تک کہ پہلے اجتہاد کی اہمیت و ضرورت اور اس کی اصل حقیقت کو ذہن نشین نہ کر لیا جائے علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں :-

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی ہیئت ترکیبی میں وہ کون سا عنصر ہے جو اس کے اندر حرکت اور تغیر کو قائم رکھتا ہے۔ اس کا جواب ہے اجتہاد!

(تشکیل ص ۲۲۸)

اب آئیے دیکھیں کہ اجتہاد کے متعلق علامہ اقبال کا نقطۂ نظر کیا ہے، اس کی تعریف کیا ہے اور وہ اس کے لئے کیا تجویز کیا تکنیک یا طریقہ کار کرتے ہیں۔

اجتہاد کے متعلق نقطۂ نظر

باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں مغربی تہذیب و تمدن جو اپنے ساتھ علوم و فنونِ جدیدہ کا ایک عظیم کارواں رکھتا تھا اس کے فروغ، مغربی اقوام کے سیاسی استیلاء اور سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی ترقی کے دور رس اور گہرے اثرات جب ایشیا و اقوام مشرق پر پڑنے شروع ہوئے تو ترکی میں شیخ الاسلام اور مصر کے علماء جامعہ ازہر کے جمود فکر اور حالات زمانہ سے بے توجہی اور بے حسی کے باعث ترکی اور مصر میں چند انقلاب پسند نوجوانوں کے

ترکی میں آزادی، مساوات اور جمہوریت کے نام سے ایسی تحریکیں پیدا ہوئیں جن کے دستور العمل میں نہ صرف یہ کہ مذہب کو کوئی مقام حاصل نہیں تھا بلکہ بہت سے بنیادی امور میں وہ اسلام کے خلاف تھیں ترکی میں .... ادھر عرب ممالک میں عرب قومیت کے تصورات نے ان اسلام دشمن عناصر کو اور زیادہ قوت دی چنانچہ اس زمانہ میں ترکی اور مصر و شام میں جو وسیع لٹریچر شایع ہوا ہے، اس کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ تحریکیں کھلم کھلا اسلام سے بغاوت کے مترادف تھیں اور ان کا مقصد ماضی سے یک قلم اپنا رشتہ منقطع کر کے مغربی طرز کی قومیت پر اپنے لئے ایک جدید عمارت تعمیر کر لینا تھا۔ مصر و شام میں اگرچہ ان تحریکوں کو سیاسی طور پر بڑی کامیابی نہیں ہوئی لیکن ترکی میں یہی تحریک تھی جو کمال اتاترک کی حکومت کے روپ میں منتہائے عروج کو پہونچی اور سیاسی اعتبار سے بہمہ وجوہ کامیاب ہوئی۔

علامہ اقبال جمود اور قدامت پرستی کے سخت مخالف اور حرکت اور شاہین و عقاب کی خوئے شکار افگنی کے اس درجہ مداح تھے کہ انھیں مسولینی اور ہٹلر کی ثناخوانی میں بھی دریغ نہیں ہوا لیکن اس کے باوجود اقبال اور اقبالیات کا ہر طالب علم جانتا ہے وہ فرنگی سیاست اور اس کے دو ذائیدہ بت قومیت اور وطنیت کے شدید مخالف اور نقاد تھے، ان کا کلام منثور و منظوم اس سے بھرا پڑا ہے، چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

"میں نے اپنی عمر کا نصف حصہ اسلامی قومیت اور ملت کے اسلامی نقطۂ نظر کی تشریح و توضیح میں گذرا ہے، محض اس وجہ سے مجھ کو ایشیا کے لئے اور خصوصاً اسلام کے لئے فرنگی سیاست کا یہ نظریہ ایک خطرۂ عظیم محسوس ہوتا تھا"

(انوار اقبال۔ بشیر احمد ڈار ص ۱۶۸)

یہاں مثال کے طور پر اس سلسلہ میں نظم اور نثر کے دو نمونے پیش خدمت ہیں ایک رباعی میں کہتے ہیں:۔

تو اے کودک منش خود را ادب کن ۔۔۔ مسلمان زادۂ، ترک نسب کن
برنگ احمر و خون و رگ و پوست ۔۔۔ عرب نازد اگر ترک عرب کن

اب نثر ملاحظہ کیجئے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اس زمانے میں سب سے بڑا دشمن اسلام اسلامیوں کا نسلی امتیاز و ملکی قومیت کا خیال ہے، پندرہ برس ہوتے جب میں نے پہلے پہل اس کا احساس کیا۔ اس وقت میں یورپ میں تھا اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا" (انوار اقبال ص ۱۷۶)

ایک زمانے میں انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی کی نسبت جو رباعی کہی تھی جس پر مولانا کی طرف سے وضاحت کے بعد انھوں نے اپنی معذرت بھی شایع کر دی تھی (انوار ص ۱۸۰) درحقیقت اس کا مبنی بھی علامہ کا یہی نظریہ تھا۔

اس بنا پر ظاہر ہے ترکی اور مصر میں ترک قومیت اور عرب قومیت کے زیر اثر اصلاح و تجدید کی جو تحریکیں پیدا ہو رہی تھیں اور جو اسلامی قوانین و ضوابط میں بے جھجک قطع و برید اور ترمیم و تنسیخ کی داعی تھیں علامہ انھیں کس طرح بنظر استحسان دیکھ سکتے اور انھیں اجتہاد کا نام دے سکتے تھے، علامہ کے خیال میں ان تحریکوں کا سرچشمہ اجتہاد نہیں تھا بلکہ وہ آزاد خیالی تھی جس میں تجدد کے دست شوق نے تعلیم سے بالکل عرب نژاد کر لی اور اس کی جھلک ان کی دی تھی اس آزاد خیالی کی انہوں نے ہر جگہ پر کس کر مذمت کی اور مسلمانوں کے حق میں اسے مہلک قرار دیا ہے کہتے ہیں۔

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی ۔۔۔ رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار ۔۔۔ انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

اس کے برعکس علامہ کے نہایت مقرب اور تربیت یافتہ نذیر نیازی لکھتے ہیں۔

"اجتہاد سے مقصود ہے زندگی کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالنا حضرت علامہ کا موقف بہرحال اس مسئلہ میں یہی تھا" (تشکیل ص ا ف) اس معاملہ میں ان کے حزم و یقین اور خلوص کا یہ تھا کہ ایک خط میں کمال جوش سے لکھتے ہیں۔

"جن لوگوں کے عقائد و سنت کا ماخذ کتاب و سنت ہے اقبال ان کے قدموں میں ٹوپی کیا سر رکھنے کو تیار ہے اور ان کے ایک لحظ کی صحبت کو دنیا کی تمام عزت و آبرو پر ترجیح دیتا ہے" (انوار اقبال ص ۱۸۶)

انھیں اسی پر اصرار ہے کہ کوئی نظریہ کیسا ہی پرفریب اور خوشنما ہو بہرحال مسلمانوں کا فرض ہے کہ اسے قبول کرنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ وہ اسلام کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے کہ نہیں!

(انوار اقبال ص ۱۶۷)

اب جب کہ اجتہاد سے متعلق علامہ کا نقطۂ نظر متعین ہو گیا، ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اجتہاد کی تعریف اور اس کی تکنیک کیا ہے؟ اگرچہ متفرق طور پر اجتہاد سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار علامہ نے اپنے کلام منثور و منظوم میں مختلف مواقع پر کیا ہے لیکن انھیں جو کچھ کہنا تھا اس کو یکجائی طور پر اپنے خطبہ میں جمع کر دیا ہے جو وہ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ میں چھٹا خطبہ ہے جیسا کہ نذیر نیازی صاحب مقدمہ میں لکھا ہے۔ اس خطبہ کا اصل عنوان تھا "اسلام کی ترکیب میں حرکت کا اصول" لیکن خطبات کے اردو ترجمہ کی بات ہوئی تو اس کا عنوان "الاجتہاد فی الاسلام" کر دیا گیا، لیکن خطبات کے اصل انگریزی ایڈیشن میں اصل عنوان یعنی ... کو قائم رکھا گیا ہے"

اب جو کچھ عرض کیا جائے گا اس خطبہ کی روشنی میں ہوگا۔

اجتہاد کی تعریف

اجتہاد کی تعریف کیا ہے؟ فرماتے ہیں۔ لغوی اعتبار سے اجتہاد کے معنی ہیں کوشش کرنا لیکن فقہ اسلامی کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے وہ کوشش جو کسی قانونی مسئلہ میں آزادانہ رائے قائم کرنے کے لئے کی جائے، اور جس کی بنا، جیسا کہ میں سمجھتا ہوں قرآن مجید کی اس آیت "والذین جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا" پر ہے پھر حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے کا مطلب اور بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ متعین ہو جاتا ہے، یہ وہی حدیث ہے جو عام طور پر حدیث معاذ کے نام سے مشہور ہے۔

اجتہاد کی قسمیں

تدوین فقہ اور مذاہب اربعہ کے قیام کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد علامہ فرماتے

"ان مذاہب کے نزدیک اجتہاد کے تین درجے ہیں، (۱) تشریع یا قانون سازی میں مکمل آزادی لیکن جس سے عملاً صرف موسسین مذہب ہی نے فائدہ اٹھایا (ب) محدود آزادی جو کسی مخصوص مذہب فقہ کے حدود کے اندر ہی استعمال کی جا سکتی ہے (ج) اور وہ مخصوص آزادی جس کا تعلق کسی ایسے مسئلہ میں جس کو موسسین مذہب نے جوں کا توں چھوڑ دیا ہو قانون کے اطلاق سے ہے مگر ہم اس خطبہ میں اپنا دائرہ بحث اجتہاد کی پہلی قسم یعنی قانون سازی میں کامل آزادی تک محدود رکھیں گے واضح رہنا چاہیئے کہ علامہ نے یہاں اجتہاد کی جو پہلی قسم بیان کی ہے، اصول فقہ کی اصطلاح میں اسے اجتہاد مطلق کہتے ہیں اور یہی اس خطبہ کا موضوع بحث ہے۔

احکام اسلام کے ماخذ

کامل آزادی کے الفاظ سے کسی شخص کو دھوکا نہیں ہونا چاہیئے کیوں کہ جمہور امت کی طرح علامہ کے نزدیک بھی اسلامی قانون کے مآخذ چار چیزیں ہیں یعنی قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔

قرآن مجید

قرآن مجید کی تعلیمات کی اسپرٹ اور روح کلام پر لکھتے ہیں "جب ہم ان اصولوں کا جائزہ لیتے ہیں جن پر قرآن مجید نے قانون کی بنا اٹھائی ہے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان سے نہ تو فکر انسانی پر کوئی روک ٹوک قائم ہوتی ہے نہ وضع آئین و قوانین پر چنانچہ یہی اصول تھے جو فقہائے متقدمین کے پیش نظر تھے اور جن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے متعدد نظامات قائم کئے جن حضرات نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے، خوب جانتے ہیں کہ اسلام نے بہ لحاظ ایک نظام مدنیت و سیاست جو کامیابی حاصل کی ہے اس کا تقریباً نصف حصہ ہمارے فقہاء کی قانونی ذہانت و فطانت کا مرہون احسان ہے لیکن موجودہ زمانے میں اجتہاد کے لئے قرآن مجید سے کیا مدد مل سکتی ہے؟ اس کے جواب میں عبارت مذکورہ بالا کے بعد ہی فوراً علامہ فرماتے ہیں۔

"لیکن اس ساری جامعیت اور ہمہ گیری کے باوجود ہمارے نظام فقہ بالآخر افراد کی ہی ذاتی تعبیرات کا نتیجہ ہیں اور اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن پر قانون کے نشو و نما کا خاتمہ ہو چکا ہے۔" (تشکیل ص ۲۵۹) اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"اب کہ زمانہ بدل چکا ہے اور دنیائے اسلام ان نئی نئی قوتوں سے متاثر اور دوچار ہو رہی ہے جو فکر انسانی کے ہر سمت میں نشو و نما کے باعث پھیل رہی ہیں، کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں مذاہب فقہ کی خاتمیت پر اصرار کرتے رہنا چاہیے۔ ائمہ مذاہب کا یہی دعویٰ تھا کہ ان کے استدلالات اور تعبیرات حرف آخر ہیں؟ ہرگز نہیں۔" (ص ۲۶۰)

حدیث

علامہ فرماتے ہیں "اسلامی قانون کا دوسرا بنیادی مآخذ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو ماضی اور حال ہر زمانہ میں بڑی شدید بحثوں کا موضوع رہی ہیں۔ جہاں تک مسئلہ اجتہاد کا تعلق ہے ہمیں چاہیئے ان احادیث کو جن کی حیثیت سر تا سر قانونی ہے ان احادیث سے الگ رکھیں جن کا قانون سے کوئی تعلق نہیں ہے، پھر اول الذکر احادیث کی بحث میں بھی ایک بڑا اہم سوال یہ ہوگا کہ ان احادیث میں عرب قبل اسلام کے اس رسم و رواج کا جسے جوں کا توں چھوڑ دیا گیا جس میں حضور رسالت مآب نے تھوڑی بہت ترمیم کر دی کسی قدر حصہ موجود ہے لیکن یہ وہ حقیقت ہے جس کا انکشاف مشکل ہی سے ہو سکے گا کیوں کہ علماء متقدمین شاذ و نادر اس رواج کی طرف اشارہ کرتے ہیں" آگے چل کر فرماتے ہیں۔ "یاد رکھنا چاہیئے کہ سب سے بڑی خدمت جو محدثین نے شریعت اسلامیہ کی انجام دی ہے انھوں نے مجرد غور و فکر کے رجحان کو روکا اور اس کے بجائے ہر مسئلہ کی الگ تھلگ شکل اور اس کی انفرادی حیثیت پر زور دیا، لہذا احادیث کا مطالعہ اگر اور زیادہ گہری نظر سے اور ان کا استعمال ہم یہ سمجھتے ہوئے کریں کہ وہ کیا روح تھی جس کے ماتحت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام قرآنی کی تعبیر فرمائی تو اس سے ان قوانین کی حیاتی قدر و قیمت کے فہم میں اور بھی آسانی ہو گی جو قرآن پاک کے قانون کے متعلق قائم کئے ہیں۔"
(تشکیل ص ۲۶۷)

اجماع

فرماتے ہیں "فقہ اسلامی کا تیسرا مآخذ اجماع ہے اور میرے نزدیک اسلام کے قانونی تصورات میں سب سے زیادہ اہم لیکن عجیب بات ہے کہ صدر اسلام میں اس نہایت ہی اہم تصور پر نظری اعتبار سے خوب خوب بحثیں ہوتی رہیں لیکن عملاً اس کی حیثیت کبھی ایک خیال سے آگے نہیں بڑھی، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ممالک اسلامیہ میں یہ تصور ایک ادارہ کی صورت اختیار کر لیتا شاید اس لئے کہ خلافت راشدہ کے بعد جب اسلام میں مطلق العنان حکومت نے سر اٹھایا تو یہ بات اس کے مفاد کے خلاف تھی کہ اجماع کو ایک مستقل تشریعی ادارہ کی شکل دی جائے اموی اور عباسی خلفاء کا فائدہ اسی میں تھا کہ اجتہاد کا حق بحیثیت افراد مجتہدین کے ہاتھ میں ہی رہے۔ بجائے اس کے کہ اجتہاد کے لئے ایک مستقل مجلس قائم ہو جو بہت ممکن ہے انجام کار حکومت سے بھی زیادہ طاقت حاصل کر لیں۔" آگے چل کر فرماتے ہیں "لیکن اس سلسلہ میں دو سوال جواب طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ کیا اجماع قرآن مجید کا ناسخ ہے؟ ایک اسلامی مجلس میں تو یہ سوال اٹھانا ہی غیر ضروری ہے لیکن ہم یہ سوال اٹھا رہے ہیں تو محض اس غلط بیانی کے پیش نظر جو ایک مغربی نقاد نے اپنی تصنیف "اسلامی نظریہ ہائے مالیات" میں کی ہے جسے کولمبیا یونیورسٹی نے شائع کیا ہے اس کتاب کے مصنف نے کوئی سند پیش کئے بغیر یہ لکھ دیا ہے کہ احناف اور معتزلہ کے نزدیک اجماع قرآن مجید کا بھی ناسخ ہے، حالاں کہ اسلامی فقہ میں اس قسم کی غلط بیانی کی تائید میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ مثال بھی نہیں پیش کی جا سکتی اور نہ احادیث میں اس قسم کا کوئی اشارہ ملتا ہے" پھر فرماتے ہیں "میرے خیال میں مصنف کو جو غلط فہمی ہوئی وہ لفظ "نسخ" سے ہوئی جسے فقہائے متقدمین نے استعمال تو کیا ہے مگر جس کا مطلب جیسا کہ شاطبی نے "الموافقات" میں تصریح کر دی ہے کہ اجماع صحابہ کے سلسلہ سے مراد ہے کسی حکم قرآنی کی توسیع یا تحدید۔

اس کے بعد ایک بہت ہی نازک مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں "لیکن فرض کیجیے، صحابہ کسی امر پر متفق ہیں، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے فیصلہ کی پابندی ہمارے لئے بھی ضروری ہے؟ شوکانی نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مذاہب اربعہ نے اس مسئلہ میں جو کچھ کہا ہے اسے نقل کر دیا ہے میری رائے میں اس مسئلے کا فیصلہ یوں ہونا چاہیئے کہ ہم ایک امر واقعی اور امر قانونی میں فرق کریں، مثلاً اس مسئلہ میں کہ آخری دو سورتیں یعنی معوذتین قرآن پاک کا جزو ہیں یا نہیں اور جن کے متعلق صحابہ کا اتفاق ہے کہ یہ سورتیں قرآن کا جزو ہیں، ہمارے لئے صحابہ کا اجماع حجت ہے کیوں کہ یہ صرف صحابہ تھے جو اس امر واقعہ کو ٹھیک ٹھیک جان سکتے تھے۔ اب رہی دوسری

صورت یعنی جو امر قانونی ہو اتو یہ مسئلہ تعبیر [illegible] امام کرخی کی مسند پر رکھنے کی جرأت کرسکتے ہیں کہ اس صورت میں صحابہ کا [illegible] سے ثبوت نہیں ہوگا۔"

قیاس

اس کے متعلق لکھتے ہیں۔ چوتھا ماخذ قیاس ہے یعنی قانون سازی میں مماثلتوں کی بناء پر استدلال سے کام لینا معلوم ہوتا ہے وہ سب ملک جو اسلام کے زیر نگین آئے حنفی الخیال فقہاء نے ان کے زرعی اور اجتماعی حالات کو دیکھتے ہوتے محسوس کیا کہ احادیث سے اس سلسلہ میں جو نظائر ملتے ہیں ان سے بحیثیت مجموعی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا لہٰذا انھیں اپنی تعبیرات میں قیاس سے رجوع کرنا پڑا اس کے برعکس فقہاء حجاز نے جو عربوں کے دل و دماغ کو خوب سمجھتے تھے، عراقی فقہاء کی منطقیانہ موشگافیوں کے خلاف شدت سے احتجاج کیا۔ فقہائے متقدمین کی یہی تلخ بحثیں تھیں جن سے بالآخر قیاس کے حدود اس کے شرائط اور صحت و عدم صحت کی تعریف میں نقد و جرح سے کام لیا گیا، لہٰذا یہی قیاس جو شروع شروع میں مجتہدین کی ذاتی رائے کا ایک دوسرا نام تھا، آخر کار شریعت اسلامیہ کے لئے حرکت اور زندگی کا سرچشمہ بن گیا...... لہٰذا آگے چل کر مذہب حنفی میں وہ سب نتائج جو ان نتائج سے مرتب ہوتے جذب ہوتے چلے گئے، اس بناء پر یہ مذہب اپنی بنیاد اور اساسات میں کامل آزاد ہے اور یہی وجہ ہے کہ بمقابلہ دوسرے مذاہب فقہ اس میں کہیں زیادہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ جیسے جیسے حالات ہوں اپنی قوت تخلیق سے کام لیتے ہوتے ان کے ساتھ مطابقت پیدا کرے۔ بہرحال اگر مذہب حنفی کے اس بنیادی اصول قانون یعنی قیاس کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر کام میں لایا جائے تو جیسا ہے امام شافعی کا ارشاد ہے وہ اجتہاد کا ہی دوسرا نام ہے اور اس لئے نصوص قرآنی کے اندر رہتے ہوتے ہمیں اس کے استعمال کی پوری آزادی ہونی چاہئے پھر بحیثیت اصول قانون اس کا اندازہ صرف اس بات سے ہو جاتا ہے کہ بقول قاضی شوکانی زیادہ تر فقہاء اس امر کے قائل تھے کہ حضور رسالت مآب کی حیات طیبہ میں بھی قیاس سے کام لینے کی اجازت تھی۔"

(تشکیل ص ۲۷۳-۲۷۴)

خطبہ پر ایک تجزیاتی اور تنقیدی نظر

یہاں تک علامہ نے اس خطبہ میں اجتہاد اور اس کے ماخذ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ہم نے نذیر نیازی صاحب کے اردو ترجمہ سے مدد لے کر ان کو علامہ کے الفاظ میں درج کردیا ہے۔ اب ہم اس پر اپنے معروضات پیش کرتے ہیں۔

۱۔ علامہ نے اجتہاد کی ضرورت و اہمیت اور اس کا دروازہ بند نہ ہونے کی جو بات کہی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی کا ارشاد بھی یہی ہے۔ اپنی کتاب مسوی کے مقدمہ (ص ۱۲) میں فرماتے ہیں۔

"و آں کہ گفتیم اجتہاد در ہر عصر فرض ست بجہت آنست کہ مسائل کثیر الوقوع غیر محصور اند و معرفت احکام الہٰی در آں واجب و آنچہ مسطور و مدون شدہ است غیر کافی، و در آں اختلاف بسیار کہ بدون رجوع بادلہ حل اختلاف نتواں کرد، و طرق آں تا مجتہدین غالباً منقطع پس بغیر عرض بر قواعد اجتہاد راست نیاید۔"

اسی بات کو مولانا عبد العلی بحر العلوم شرح مسلم الثبوت میں زیادہ صراحت سے کہا ہے،

لکھتے ہیں۔

"و اما الاجتهاد المطلق فقالوا اختتم بالائمة الاربعة حتى اوجبوا تقليد واحد من هؤلاء على الأمة وهذا كله هوس من هوساتهم لم يأتوا بدليل ولا يعبأ بكلامهم۔"

رہا اجتہاد مطلق، تو بعض لوگ کہتے ہیں یہ چار اماموں پر ختم ہو گیا، چنانچہ امت پر ان کی تقلید لازم ہے لیکن یہ ان کی من مانی بات ہے، ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور ان کا کلام قابل اعتبار نہیں ہے۔

اور یہ اقوال تو عہد سلف کے ہیں آج پورا عالم اسلام اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت کے نعروں سے گونج رہا ہے اور گذشتہ چند برسوں میں مصر، شام، بیروت اور عراق اور عالم اسلام کے دوسرے گوشوں میں اجتہاد اور اس کے متعلقہ مسائل پر بڑی اچھی اچھی کتابوں کا انبار لگ گیا ہے اقبال کی چشم تصور نے اس دور کو پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اور اس لئے انھوں نے بجا طور پر کہا تھا۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

۲۔ لیکن مجتہد کے لئے کن اوصاف و کمالات کا حامل ہونا ضروری ہے؟ علامہ نے اس خطبہ میں اس پر روشنی نہیں ڈالی ہے صرف ایک مقام پر اس قدر کہا ہے کہ "آج جو مسئلہ ترکوں میں درپیش ہے کل دوسرے بلاد اسلامیہ کو پیش آنے والا ہے اور اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا فی الواقع اسلامی قانون میں نشوونما اور مزید ارتقاء کی گنجائش ہے؟ لیکن اس سوال کے جواب میں ہمیں بڑی زبردست کاوش اور محنت سے کام لینا پڑے گا، گو ذاتی طور پر مجھے یقین ہے کہ اس سوال کا جواب اثبات میں ہی دیا جاسکتا ہے۔" (تشکیل ص ۲۵۱)

اسی سلسلے میں آگے چل کر انھوں نے کہا ہے کہ اجتہاد صحیح معنی میں وہی شخص کر سکتا ہے جس میں حضرت عمرؓ کی اسپرٹ موجود ہو اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت عمرؓ ایک طرف دین اور شریعت کے محرم اسرار تھے اور دوسری جانب ان کی فہم و فراست کی انگلی نبض دوراں پر تھی، اس جامعیت کے باعث جب کبھی ان کے سامنے کوئی نیا مسئلہ یا معاملہ آتا تھا تو وہ اس کی گرہ اپنی عقل کے ناخن سے بآسانی کھول سکتے تھے۔ علامہ اقبال کو اپنے متعلق مجتہد ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں ہوا غالباً ان کو اصول فقہ اور اصول حدیث کا بحیثیت فن کے مطالعہ کی بھی فرصت نہیں ملی۔ البتہ اسلام کے ایک عظیم مفکر تھے اس بناء پر اجتہاد اور اس کے متعلقہ مسائل کی نسبت انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ فنی نہیں بلکہ مفکرانہ ہے اگرچہ ان کے فکر کا کمال یہ ہے کہ ان کے فکر کے قامت موزوں پر جامہ زیبا بڑی حد تک راست آتا ہے اب ہم ان کے افکار متعلقہ کا جائزہ اسی حیثیت سے لیں گے۔

۳۔ علامہ نے اسلامی قانون کے ماخذ چار بتائے ہیں، لیکن یہ چار ماخذ وہ ہیں جو اصول ہیں۔ ان کے علاوہ چند فروعی ماخذ بھی ہیں مثلاً استحسان، استصحاب حال، مصالح مرسلہ عرف، عادات و رسوم یا الامر لا ضرر ولا ضرار، الاصل فی الاشیاء الاباحۃ، الحدود تندرء بالشبہات وغیرہ طوفی نے اپنے رسالہ میں ان کو اس قدر وسعت دی ہے کہ ان کی تعداد انیس تک پہونچا دی ہے لیکن یہ مستقل بالذات ماخذ نہیں ہیں، ان کی روشنی میں جو حکم مستنبط ہوگا وہ اسی وقت قابل قبول ہوگا جب کہ وہ قرآن و سنت کے کسی منطوق، منصوص یا مفہوم حکم کے خلا

ہو۔ اس بنا پر بات الٹ پلٹ کر کتاب و سنت کی ہی طرف آجاتی ہے، خود علامہ اس نظریہ کے بڑی سختی اور شدت کے ساتھ حامل ہیں اور جو نظریہ ان کو قرآن یا سنت سے ٹکراتا نظر آتا ہے اسے بے تکلف رد کر دیتے ہیں، چنانچہ شیخ محی الدین ابن عربی کے متعلق ایک خط میں صاف لکھتے ہیں۔ "اس وقت میرا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت کی تعلیمات تعلیم قرآن کے مطابق نہیں ہیں اور نہ کسی تاویل و تشریح سے اس کے مطابق ہو سکتی ہیں" (انوار اقبال ص ۱۷۸)

ایک خط میں فنا کی نسبت لکھتے ہیں "یہ ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفہ ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے، میرے عقیدے میں یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اس تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں" (انوار اقبال ص ۲۱۸)

اسی بنیاد پر انھوں نے انوار اقبال کے بعض خطوط میں وحدت الوجود کے عقیدہ اور عجمی تصوف کی مخالفت کی ہے اگرچہ خالص اسلامی تصوف اور اس کے علمبردار صوفیائے کے وہ بے حد مداح اور عقیدت مند ہیں۔

خطبۂ پیش نظر میں علامہ نے ترکوں کی تحریک آزادی اور ترکی کے ایک شاعر ضیا کی بڑی تعریف کی ہے اور اس کے انقلابی اشعار نقل کئے ہیں لیکن اس کے باوجود ضیا نے سماجی اصلاح کے سلسلہ میں جو باتیں قرآن اور اسلام کے خلاف کہی ہیں علامہ نے بڑی شدت سے ان کا رد کیا ہے مثلاً ترکی شاعر نے تین چیزوں میں مردوں اور عورتوں کی برابری کا مطالبہ کیا تھا ایک طلاق دوسرے حق علیحدگی اور تیسرے وراثت۔ علامہ اس کے رد میں لکھتے ہیں۔

"رہا ترکی شاعر کا مطالبہ، میں سمجھتا ہوں وہ اسلام کے عائلی قانون سے واقف نہیں تھا، وہ نہیں سمجھتا کہ قرآن مجید نے وراثت کے بارے میں جو قاعدہ نافذ کیا ہے اس کی معاشی قدر و قیمت کیا ہے۔ شریعت اسلامی میں نکاح کی حیثیت ایک عقد اجتماعی کی ہے اور بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ بوقت نکاح شوہر کا حق طلاق بعض شرائط کی بنا پر خود اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اس طرح مرد اور عورت میں طلاق کے معاملہ میں تو برابری ہو جاتی ہے لیکن وراثت میں دونوں میں برابری کا مطالبہ غلط فہمی پر مبنی ہے" اس امر پر کافی بحث کرنے کے بعد فرماتے ہیں "دراصل قرآن مجید کا قانون وراثت جو بقول فان کریمر شریعت اسلامیہ کی ایک نہایت ہی اچھوتی شاخ ہے اس کی تہ میں جو اصول کام کر رہے ہیں ان پر مسلمان ماہرین قانون نے ابھی تک کما حقہ توجہ نہیں کی"

آخر اس بحث کو ان جملوں پر ختم کرتے ہیں "میرا خیال ہے کہ جہاں ہم نے اپنی شریعت کا مطالعہ اس انقلاب کے پیش نظر جو معاشیات کی دنیا میں ناگزیر ہے ہمیں شریعت کے بنیادی اصولوں میں ایسے پہلو نظر آجائیں گے جو آج تک ہم پر منکشف نہیں ہوئے پھر اگر ایمان و یقین سے کام لیا گیا تو ان میں جو حکمت پوشیدہ ہے ہم اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے" (تشکیل ص ۲۶۲، ۲۶۳)

اسی طرح ترکی شاعر کا مطالبہ تھا کہ نماز، اذان اور قرآن کی تلاوت سب بجائے عربی کے ترکی زبان میں ہوں، علامہ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ بے شک کسی مذہب کے روحانیت خیز افکار کا مادری زبان میں مطالعہ جس قدر موثر ہوتا ہے اتنا غیر مادری زبان میں نہیں ہوتا لیکن اس کے بعد فرماتے ہیں "وہ بایں ہمہ باعتبار ان وجوہ کے جن کا ذکر آگے آئے گا۔ شاعر کا یہ اجتہاد سخت قابل اعتراض ہے"

۴۔ سطور بالا میں آپ نے دیکھا کہ قرآن مجید کی حقانیت و صداقت اور اس کی ابدیت پر علامہ اقبال کے ایمان اور اس پر جزم و یقین کا کیا عالم ہے اس کے نصوص اور اس کی اسپرٹ کے خلاف کسی نظریہ اور کسی فکر کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں یہاں تک کہ انھوں نے بیانگ دہل کہہ ہی دیا کہ۔

نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو پھر قرآن کی بنیاد پر اجتہاد کے ذریعہ موجودہ مسائل و معاملات کا حل کیوں کر پیش کیا جا سکتا ہے اور ایک ہر آن تغیر پذیر دنیا میں قرآن سے کس طرح ہدایت اور رہنمائی مل سکتی ہے جس کا اقبال نے بڑے شد و مد سے بار بار ادعا کیا ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے اصول فقہ پر ایک نظر ڈالنی ہوگی، قرآن مجید میں جو آیات متشابہات ہیں ان کا ذکر نہیں کیوں کہ ان کی نسبت تو خود قرآن میں جتا دیا گیا ہے کہ "لا یعلم تاویلہ الا اللہ" اللہ کے سوا کوئی ان کا صحیح مصداق نہیں جانتا، لیکن جو آیات محکمات ہیں اور جن پر اسلامی قانون کی پوری عمارت کھڑی ہے ان کی تشریح اور تفسیر میں بھی فقہا اور مفسرین کے درمیان ایسے اختلافات ہیں کہ ایک ہی آیت سے ہر فقیہ نے کسی مسئلہ میں اپنے فیصلہ کے لئے اس سے استدلال کیا ہے، اس اختلاف کی اساس کبھی قرآن ہی کی کوئی دوسری آیت ہے، کبھی کوئی حدیث اور کوئی اثر ہے، کبھی اہل مدینہ کا تعامل ہے، کبھی صرف و نحو کا کوئی قاعدہ ہے، کبھی علم معانی اور بلاغت کا کوئی نکتہ ہے اور کبھی قیاس ہے، چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

الف۔ مطلقہ عورتوں کی عدت کیا ہے؟ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تین ایام ماہواری ہیں اور امام شافعی کے نزدیک تین طہر، دونوں کا استدلال قرآن مجید کی آیت "والمطلقات یتربصن بانفسہن ثلاثۃ قروء" سے ہے امام صاحب کا استدلال یہ ہے کہ چوں کہ طلاق و سنت طہر میں طلاق دینا ہے، اس بنا پر پورے تین قروء اسی وقت ہوتے ہیں جب کہ ان سے مراد ایام ماہواری لئے جائیں ورنہ وہ تین سے کم ہوں گے یا اس سے زیادہ امام شافعی کا استدلال یہ ہے کہ ثلاثۃ کا لفظ اسم عدد مونث ہے اس بنا پر نحو کے مشہور قاعدہ کے مطابق اس کا تمیز یعنی معدود مذکر ہونا چاہئے اور وہ طہر ہی ہے۔

ب۔ روزہ کب افطار کرنا چاہئے؟ احناف کے نزدیک سورج ڈوبتے ہی اور شوافع کے نزدیک کچھ دیر کے بعد جب اندھیرا ہو جائے اور دونوں کا استدلال آیت "ثم اتموا الصیام الی اللیل" سے ہے کیوں کہ ایک کے نزدیک غایت داخل ہوتی ہے اور دوسرے کے نزدیک داخل نہیں ہوتی، رہیں احادیث اور آثار وہ بھی اس بارے میں مختلف ہیں۔

ج۔ جس جانور کے ذبح کرتے وقت تسمیہ یعنی خدا کا نام نہ لیا گیا ہو کیا وہ حلال ہے؟ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حلال نہیں ہے اور امام شافعی کے نزدیک حلال ہے، دونوں کا استدلال قرآن مجید کی آیت "ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ" سے ہے، امام صاحب کا استدلال تو صاف ظاہر ہے کیوں کہ آیت کا منطوق یہی ہے لیکن امام شافعی فرماتے ہیں کہ آیت کا مطلب ہے کہ جس جانور پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو اس کا کھانا حرام ہے اور دلیل یہ ہے کہ اس حکم کو "وانہ لفسق" سے مقید کیا گیا ہے اور قرآن میں ہی اس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ کسی جانور پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، یہ سب کے نزدیک حرام ہے، تیسرا وہ جس پر نہ اللہ کا اور نہ غیر اللہ کا کسی کا نام نہیں لیا گیا، یہ مختلف فیہ ہے، امام صاحب کے نزدیک حرام اور امام شافعی کے نزدیک حلال۔

د۔ کیا ضرورت سے زیادہ چیزیں رکھنی جائز ہیں؟ اس کے متعلق حضرت ابوذر غفاری

کی صاف طور پر کہی گئی ناجائز ہے اور ان کا استدلال قرآن مجید کی اس آیت سے تھا۔ یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو۔ اسی طرح ان کی رائے تھی کہ گھر میں سونا چاندی [illegible] حرام ہے اور ان کا استدلال اس آیت سے تھا جس میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں قیامت کے دن ان کی پیشانیوں اور ان کے پہلوؤں کو اسی سے داغا جائے گا۔ [illegible] امت نے حضرت ابو ذر غفاریؓ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا پہلی آیت کے متعلق انھوں نے کہا کہ یہ حکم ایک خاص وقت کے لئے تھا جب کہ مسلمان دشمنوں سے برسر جنگ تھے اور ان کو روپیہ کی ضرورت تھی اور دوسری آیت ان لوگوں کے حق میں ہے جو با کی پوجا کرتے ہیں اور اس سے اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا نہیں کرتے ۔

یہ چند مثالیں بطور نمونہ نقل کی گئی ہیں ورنہ فقہ اور اصول فقہ کی کتابیں ان سے بھری ہوئی ہیں ان سے اندازہ ہوگا کہ آیات و محکمات کی تاویل و تفسیر کا میدان کتنا وسیع ہے اور اس میں جو اختلافات پیدا ہوئے ہیں اور جن وجوہ و اسباب سے پیدا ہوتے ہیں ان کے باعث اسلامی قانون میں کس قدر وسعت اور لچک پیدا ہو گئی ہے اسلامی قانون کی یہی وہ صفت ہے جس کے باعث وہ ان تمام ہمہ گیر اور معاشی مشکلات اور مسائل و معاملات کو کامیابی سے حل کر سکا جو پہلی اور دوسری صدی میں برق رفتار فتوحات کے باعث مختلف اقوام و ملل کے ساتھ اختلاط و ارتباط کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے ۔

علامہ اقبال ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پورے قرآن کی ایک روح ہے جسے دین فطرت یا فطرت اللہ کہتے ہیں یہ ازلی اور ابدی ہے، یہ جس طرح ماضی کے ایک مخصوص پیکر میں جلوہ آرا تھی، اسی طرح وہ حال اور مستقبل کے پیکر میں جلوہ ریز ہو کر عظمت انسان کا نقش ثبت کر سکتی ہے ۔

اس روح قرآنی کا مرتبہ و مقام لفظی، نحوی و صرفی اور منطقی بحث تمحیص اور بات لال و استشہاد سے بہت بلند اور برتر ہے اور یہ وہی روح ہے جو حضرت عمرؓ کے اجتہادات میں جاری و ساری تھی، اس سلسلہ میں دو مثالیں سنئے ان سے مطلب اور واضح ہوگا۔

ایک مرتبہ اسپین کے عبدالرحمٰن الداخل الاموی نے رمضان المبارک کے روزہ کی حالت میں ایک جاریہ سے مقاربت کر لی اور پھر علماء سے مسئلہ پوچھا تو انھوں نے کفارہ صوم کو کفارۂ ظہار پر قیاس کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا کفارہ ہے علی الترتیب ایک غلام آزاد کرنا، ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا اور پھر ساٹھ روزے رکھنا، ایک مالکی المذہب عالم غالباً حضرت ابو اللیث بھی اس مجمع میں تشریف رکھتے تھے انھوں نے علماء سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ کفارہ کا مقصد سزا دینا ہے تاکہ اس حرکت کا اعادہ نہ ہو اور ایک بادشاہ کے حق میں ساٹھ روزے رکھنا ہی سزا ہو سکتا ہے نہ کہ غلام آزاد کرنا اور ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا، سب علماء حضرت ابو اللیث کے تفقہ پر حیران رہ گئے اور ان سے اتفاق کیا [illegible] ابن تیمیہ کا ہے کہ گرمی کا موسم تھا اور اسلامی فوج جنگ کی تیاری کر رہی تھی [illegible] رمضان آگیا [illegible] ابن تیمیہ نے فرمایا۔ مسافر اور بیمار کے لئے روزہ کی قضا رخصت [illegible] ہے اور یہ مشقت اور وہ بھی ایک نہایت ضروری اور اہم خدمت ملک و ملت [illegible] جاتی ہے اس لئے [illegible] کی اجازت یہاں بھی ہونی چاہئے غرض کہ یہی [illegible] کے نزدیک کتاب اللہ کا اجتہاد [illegible] ہونا چاہئے۔
[illegible] حدیث کی نسبت [illegible] ہیں لیکن علامہ احادیث

کو ایک اور ہی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی سفارش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سنت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال یا خاموش رضامندی پر مشتمل ہے وہ قرآن کی روح اور اس کی تعلیمات کی تعبیر اور تشریح کا ایک عملی پیکر ہے، چناں چہ حضرت عائشہؓ نے حضورؐ کے متعلق جو فرمایا کان خلقه القرآن اس کا مطلب بھی یہی ہے پھر چوں کہ قانون تشریع کے مطابق ہر پیغمبر کی شریعت ایک آئینہ ہوتی ہے جس میں اس قوم کے عادات و خصائل و رسم و رواج اور طور و طریق کی صورت نظر آسکتی ہے اس پر جس کو ہم سنت کہتے ہیں اس کا سب سے بڑا تشریعی اور قانونی فائدہ یہ ہے کہ اس سے یہ معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اصول اور اس کی تعلیمات کو اس زمانے کے حالات و خیالات اور رسوم و عوائد پر منطبق کر کے ان چیزوں کا حک و فک ترمیم و تنسیخ اور اثبات و نفی کا عمل جاری کیا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بحیثیت شارع کے یہ عمل اصلاح و ہدایت کے سلسلہ میں کسی ایک خاص نقطۂ نظر اور مطمح نگاہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی وہ بنیادی نقطۂ نظر تھا جس کی رعایت سے ایک ہی معاملہ میں کبھی آپ نے ایک شخص کو ایک حکم دیا اور دوسرے شخص کو دوسرا حکم دیا، اور کبھی ایک ہی شخص کو کسی معاملے میں ایک وقت ایک حکم دیا اور دوسرے وقت اسے دوسرا حکم دیا جس طرح ہمیشہ روشنی ایک ہی ہوتی ہے لیکن بلب کی شکل و صورت اور اس کے رنگ بدلنے کے باعث روشنی کا ظہور مختلف مظاہر میں ہوتا ہے اسی طرح حضورؐ کا بنیادی نقطۂ نظر ہر جگہ اور ہر مقام پر ایک ہے لیکن حسب ضرورت و مصلحت احکام نے تنوع کی شکل لی، اس کا ظہور [illegible] رہتا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہی روح محمدیؐ ہے جو آپ کے تمام اقوال و افعال میں یکساں طور پر رواں دواں ہے، اقبال کہتے ہیں کہ دیدۂ بینا اور دل روشن کے ساتھ سنت کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں اس روح محمدی کی معرفت اور اس سے آشنائی پیدا کرنی چاہئے، بس یہی روح قرآنی اور روح محمدیؐ ہے جو ابدی ہے، عالم گیر اور ہمہ گیر ہے اور اسی کے ذریعہ ایک تغیر پذیر دنیا میں ہم ثبات اور قرار حاصل کر سکتے ہیں اور امامت اقوام کا فرض انجام دے سکتے ہیں ۔

اسی مضمون کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا اور رہتی دنیا تک کے لئے رسول من اللہ تھے اس بنا پر ہم فرض کر سکتے ہیں کہ آپ آج بھی دنیا میں موجود ہیں اور آپ کا قیام یورپ کے کسی مقام میں ہے۔ اب سوچئے کہ اگر واقعی ایسا ہوتا تو تمدن جدید کی کن چیزوں کو آپ بعینہٖ اختیار کر لیتے کن چیزوں کو بالکل ختم کر دیتے اور جن چیزوں میں خیر و شر دونوں مخلوط ہوتے، ان میں کس طرح ترمیم و تنسیخ کرتے کہ خیر کا حصہ غالب اور شر کا حصہ مغلوب ہو جاتا کتب سیر و تاریخ سے ثابت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں سے جنگ کرنے پر مجبور ہو گئے تو آپ نے عرب کے مشہور ہتھیار دبابہ وغیرہ کا استعمال اور ان کی ساخت کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے دو شخصوں کو یمن کے جرش نامی ایک مقام پر بھیجا پس آپ آج ہوتے تو کیا سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم کا اعلیٰ اہتمام و انتظام نہ فرماتے؟ اسی طرح عبادات سے قطع نظر موجودہ سماجیات اور معاشیات میں آپ جو اصلاح فرماتے اس کی شکل کیا ہوتی اور اس زمانے میں اسلام کو الحق یعلو ولا یعلیٰ کا مصداق کیوں کر بناتے! درحقیقت علامہ اقبال کی سب تحریروں کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ اجتہاد کے سلسلہ میں ان کے غور و فکر کی لائن یہی ہے۔ اسی عالم جذب و شوق میں [illegible] سے کہتے ہیں ۔

معمار حرم باز بتعمیر جہاں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے، علامہ مجتہد نہیں تھے اور نہ انھیں اس کا دعویٰ تھا بلکہ ان کی انتہا کا عالم تو یہ تھا کہ ایک مرتبہ انھوں نے اجتہاد پر ایک مضمون سپرد قلم کیا لیکن چونکہ خود ان کو اپنے بہت سے نکات پر اعتماد نہیں تھا اس بنا پر اسے شائع نہیں کیا۔ (اقبال نامہ ج ا ص ۱۴۲)

تاہم ایک مفکر اور متجسس کی حیثیت سے انھوں نے بعض اسلامی احکام و مسائل پر غور کیا ہے اور اپنی رائے ظاہر کی ہے لیکن ان کی بالغ نظری اور سلامت طبع کی داد دینی چاہئے کہ آج ان میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس میں سب نہیں تو بعض بلند پایہ عالم ان کے ہم نوا نہ ہوں، ہم ذیل میں اس کی چند مثالیں تحریر کرتے ہیں۔

زمین کی ملکیت مطلقہ

خواجہ عبدالرحیم بارایٹ لا کو ان کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک زمین وغیرہ ایک امانت ہے ملکیت مطلقہ جس کو قدیم و جدید قانون دان تسلیم کرتے ہیں، میری ناقص رائے میں اسلام میں نہیں ہے، فقہا میں بہت سا اختلاف ہے۔ (انوار اقبال ص ۲۴۵)

اس رائے پر بہت سے احباب کو تعجب ہوگا لیکن اس سلسلہ میں امام ابو یوسف کی کتاب الخراج اور ماوردی کی کتاب الاحوال میں جو کچھ ہے اس سے قطع نظر، ایک زمانے میں معارف اعظم گڑھ میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی اور مولانا ظفر احمد تھانوی کے درمیان اسی موضوع پر بحث چلی تھی اور دونوں طرف سے متعدد مقالات شائع ہوئے تھے، مولانا گیلانی زمین کی ملکیت مطلقہ کے منکر تھے اور دوسری دلیلوں کے ساتھ ان کا استدلال قرآن مجید کی آیت "والارض وضعہا للانام" سے تھا کہ اس میں لام انتفاع کا ہے، مولانا ظفر احمد اس رائے کے مخالف تھے۔

اسلام اور سوشلزم

اس رائے سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ سوشلزم کے حامی تھے، چنانچہ غلام السیدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں "کارل مارکس پہلا شخص ہے جس نے (مذہب کے لئے) افیون کا لفظ استعمال کیا ہے، میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان ہی مروں گا، میری رائے میں تاریخ انسانیت کی مادی تشریح غلط ہے میں روحانی اقدار میں یقین رکھتا ہوں مگر قرآنی مفہوم میں، میں نے ہمیشہ ان روحانی اقدار پر تنقید کی ہے جو افیون کا سا کام کرتی ہیں، رہا سوشلزم! تو اسلام خود ایک سوشلزم کی شکل ہے جس سے اب تک مسلمانوں نے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔ (اقبال نامہ ج ا ص ۳۱۹)

علامہ کی یہ رائے ممکن ہے اس زمانے میں عجیب معلوم ہو لیکن آج عالم اسلام میں ہر جگہ اس کا چرچا ہے اور مصر و شام میں اس موضوع پر بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور بعض مسلمان حکومتوں نے اسے اپنے دستور میں شامل کر لیا ہے۔

ارتداد سے نکاح فسخ نہیں ہوتا

فقہ حنفی کی عام کتابوں میں یہ ہے کہ ہر ارتداد سے نکاح فسخ ہو جاتا ہے چنانچہ ہدایہ میں بھی یہی ہے علامہ اس سلسلہ [illegible] ارتداد کو جو شکل دی گئی ہے وہ کیا صحیح ہے اس ملک میں ہمارے [illegible] مسلمانان ہند چونکہ غیر معمولی طور پر قدامت پسند ہیں اس لئے ہندوستانی عدالتیں مجبور ہیں کہ فقہ اسلامی کی مستند کتابوں سے سر مو انحراف نہ کریں اس

صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ تو بدل رہے ہیں لیکن یہ مسلک جہاں تھا وہیں کھڑا ہے۔
(تشکیل ص ۲۹۱)

اس سلسلہ میں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جن دنوں میں علامہ نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا اس کے چند برسوں بعد ہی ہندوستان میں مردوں کے سخت ظلم و ستم اور فقہ کی تنگ دامانی کے باعث مسلمان عورتوں پر جو قیامت گزر رہی تھی آخر کار اس نے علماء کو بھی ادھر متوجہ کیا چنانچہ مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی نے اس زمانے کے اکابر و مشاہیر علماء کے مشورہ اور تائید سے عورتوں کے ان مسائل و معاملات کے بارے میں ایک طویل مگر نہایت مدلل تحریر بصورت فتویٰ مرتب کی جس میں تفویض طلاق اور عورتوں کے حق تفریق کے علاوہ ارتداد کے باعث فسخ نکاح کے مسئلہ پر بھی سیر حاصل گفتگو کر کے ہدایہ کے مندرجات کا رد کیا گیا تھا اور احناف کے مسلک کے خلاف دوسرے ائمہ کے مذہب پر فتویٰ دیا گیا تھا۔ ہند اور بیرون ہند کے اجلہ علماء کی نہایت پرزور تصدیقات و تصویبات کے ساتھ جب یہ ضخیم رسالہ "الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ" کے نام سے خانقاہ تھانہ بھون سے شائع ہوا تو پورے ملک میں اس کی دھوم مچ گئی اور لاکھوں ستم رسیدہ و بے کس عورتوں کو جہاں نصیبی و مایوسی کی تاریکیوں میں امید کی ایک کرن نظر آئی، علامہ اقبال کی نظر سے غالباً یہ ضرور گزرا ہوگا اور انھوں نے خوش ہو کہا ہوگا۔

جو تیری خو تھی وہی میرا مدعا ہوا

مہدی اور نزول مسیح کا عقیدہ

ضیاء الدین صاحب برنی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں "جو مہدی و مسیح کے متعلق جو احادیث ہیں ان پر علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں مفصل بحث کی ہے ان کی رائے میں یہ تمام احادیث کمزور ہیں جہاں تک اصول فن تنقید احادیث کا تعلق ہے میں بھی ان کا ہمنوا ہوں مگر اس بات کا قائل ہوں کہ مسلمانوں میں کسی بڑی شخصیت کا ظہور ہوگا، احادیث کی بنا پر نہیں، بلکہ اور بنا پر میرا عقیدہ یہی ہے۔" (انوار اقبال ص ۳۴۱)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا عقیدہ مہدی اور حضرت عیسیٰ کے نزول کا ہی ہے لیکن اقبال اس میں بھی منفرد نہیں ہیں جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے، ابن خلدون تو اس کے قائل تھے ہی نہیں، ان کے علاوہ عہد حاضر کے عظیم مفکر و محقق اسلام سابق شیخ جامعہ ازہر قاہرہ شیخ محمود شلتوت بھی اس کے قائل نہیں تھے، چنانچہ ان کے فتاویٰ کا ضخیم مجموعہ جو قاہرہ کے مطبع دار القلم سے شائع ہوا ہے اس میں ص ۵۹ سے ص ۸۲ تک آیات احادیث اور اجماع کی روشنی میں انھوں نے اس پر مفصل اور مبسوط کلام کر کے اس عام خیال کی جو عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے تردید کی ہے۔ ان مثالوں سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ علامہ پر آزاد خیالی کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا، ان کی بعض آرا مسلمانوں کی اکثریت کے کیسی ہی خلاف ہوں مگر اس میں بھی وہ تنہا نہیں ہیں، بلکہ مستند علماء ان کے ہم خیال ہیں، تعبیر و تشریح اور تاویل و تفسیر کا فرق ہو سکتا ہے لیکن انھوں نے جو کچھ کہا ہے قرآن و سنت کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے کہا ہے۔

اجماع اور قیاس

اب رہے احکام کے باقی دو مآخذ یعنی اجماع اور قیاس! تو اگرچہ یہ کہنے کو دو ہیں لیکن

لیکن درحقیقت ایک ہی ہیں، اجتہاد اگر انفرادی ہو تو قیاس ہے اور اگر اجتماعی ہو تو اسے اجماع کہتے ہیں، جو مذہب دنیا کے تمام انسانوں کو ہر زمانہ میں ان کے تمام دینی اور دنیوی معاملات و مسائل میں رہنمائی عطا کرنے کا مدعی ہو وہ تاریخ کے ہر دور اور وقت کے ہر نئے موڑ میں اس وقت تک فعال اور متحرک رہ ہی نہیں سکتا جب تک اس کے ہاں قیاس اور اجماع کے ادارے نہ ہوں لیکن افسوس ہے کہ تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں قیاس سے تو کام لیا جاتا رہا مگر اجماع سے کام نہیں لیا گیا، بہرحال اجتہاد کا قیام ان کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

علامہ اقبال کی رائے موجودہ زمانے میں مسلمان حکومتوں کی پارلیمنٹ یا مجالس مقننہ یہ کام کر سکتی ہیں چنانچہ اس خطبہ میں انھوں نے اس رائے کا اظہار کیا ہے لیکن اس میں جو اشکال ہے علامہ اس سے بے خبر نہیں ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

"سوال یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں تو جہاں کہیں مسلمانوں کی کوئی قانون ساز مجلس قائم ہوگی اس کے ارکان زیادہ تر وہی لوگ ہوں گے جو فقہ اسلامی کی نزاکتوں سے ناواقف ہیں اس لئے اس کا طریقہ کار کیا ہوگا؟ کیونکہ اس قسم کی مجالس شریعت کی تعبیر میں بڑی بڑی شدید غلطیاں کر سکتی ہیں۔ ان غلطیوں کا ازالہ یا ان کے کم سے کم امکان وقوع کی صورت کیا ہوگی۔؟"

آگے چل کر وہ خطرہ کے سدباب کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

"شریعت اسلامی کی غلط تعبیرات کا سدباب ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ بحالت موجودہ بلاد اسلامیہ میں فقہ کی تعلیم جس نہج پر ہو رہی ہے اس کی اصلاح کی جائے، فقہ کا نصاب مزید توسیع کا محتاج ہے لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ جدید فقہ کا مطالعہ بھی باحتیاط اور سوچ سمجھ کر کیا جائے۔" (تشکیل ص ۲۷۱)

لیکن ہمارے خیال میں اس تجویز سے اصل اشکال کا حل پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ فقہ کا کوئی ایسا وسیع اور جامع نصاب اگر تیار ہو بھی گیا جیسا کہ ہو گیا ہے اور عرب ممالک میں رائج ہے تو آخر اس کو پڑھنے پڑھانے والے علماء ہی ہوں گے اور غالباً مجالس مقننہ کی ممبری کے لئے اس نصاب فقہ کو پڑھنے کی شرط مناسب نہ ہوگی البتہ اس سلسلہ میں علامہ اقبال نے اپنے ۱۹۳۲ء کے مشہور خطبہ صدارت میں جو تجویز پیش کی تھی وہ زیادہ قابل عمل اور لائق غور ہے، وہ فرماتے ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ علماء کی ایک اسمبلی تشکیل دی جائے جس میں وہ مسلمان قانون دان بھی شامل ہوں جنھوں نے علم جدید حاصل کیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی روح کے عین مطابق موجودہ حالات کی روشنی میں اسلامی قانون کا تحفظ کیا جائے اس کو وسعت دی جائے اور اگر ضروری محسوس ہو تو نئی تاویل کی جائے، تاکہ کوئی بھی قانون جو مسلم پرسنل لاء کی تعریف میں آتا ہے اس جماعت کی منظوری سے پہلے قانون سازی کے لئے پیش نہ کیا جا سکے۔" اس سے غالباً علامہ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ملک میں پارلیمنٹ کے ساتھ ایک راجیہ سبھا اسٹیٹ اسمبلی کے ساتھ ایک کونسل ہوتی ہے، اسی طرح اسلامی ممالک میں مجلس مقننہ کے ساتھ علماء کی ایک اسمبلی ہونی چاہئے۔

خطبہ کے آخر میں فرماتے ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ اجتہاد کی اس مختصر بحث سے آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ ہمارے اصول فقہ ہوں یا انفساسات فقہ ان میں آج بھی کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کی وجہ سے ہم اپنے موجودہ طرز عمل (یعنی فکری جمود اور اجتہاد سے اجتناب) کو حق بجانب ٹھہرائیں، اس کے برعکس اگر ہمارے افکار میں وسعت اور وقت نظر موجود ہے اور ہم نئے نئے احوال اور تجربات سے فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ فقہ اسلامی کی تشکیل میں جرأت سے کام لیں۔

اس موقع پر علامہ ایک نہایت اہم تنبیہ کرتے ہیں اور وہ اس کے بعد فرماتے ہیں "لیکن یہ اس زمانے کے ظروف اور احوال سے محض مطابقت پیدا کرنے کا نہیں ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اہم ہے" آگے چل کر کہتے ہیں۔

"یقین کیجئے یورپ سے بڑھ کر آج انسان کے اخلاقی ارتقاء میں بڑی رکاوٹ کوئی اور نہیں ہے اس کے برعکس مسلمانوں کے نزدیک ان بنیادی تصورات کی اساس چونکہ وحی و تنزیل ہے جس کا صدور ہی زندگی کی انتہائی گہرائیوں سے ہوتا ہے اس لئے وہ اپنی ظاہری خارجیت کو ایک اندرونی حقیقت میں بدل دیتی ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اس خطبہ میں خصوصاً اور دوسرے خطبات میں عموماً علامہ اقبال نے اسلامی قانون کا ایک ایسا دقیق اور غامض فلسفہ بیان کیا ہے کہ اگر وہ اجتہاد کے ذریعہ متشکل اور مشخص ہو جاتا اور اس کی عملی تشکیل بھی ہو جاتی ہے تو وہ دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیتا لیکن صد حیف وہ جس نے خود اپنے متعلق کہا تھا۔

از تب و تابم نصیب خود بگیر
بعد ازیں ناید چو من مرد فقیر

وہ صرف ایک شاعر، ایک آرٹسٹ اور ایک فلسفی ہو کر رہ گیا اور جو تب و تاب اس کی ہستی بے قرار کا جوہر تھا، اس پر کسی کی نگاہ نہ گئی۔ آج جب کہ برصغیر ہند و پاک میں اقبال صدی تقریبات بڑے اہتمام اور شان و شوکت سے منائی جا رہی ہیں کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اقبال کے فکر کے اس اہم پہلو پر بھی توجہ کی جائے، اور ایک ادارہ صرف اسی مقصد کے لئے قائم کیا جائے کہ پہلے اقبال کے فلسفہ قانون اسلامی کا وسیع اور عمیق مطالعہ ان کے پورے مجموعہ نثر و نظم کی روشنی میں کرے اور پھر اس کی بنیاد پر تدوین فقہ جدید کا کام کرے۔ یہ نہایت وسیع اور کٹھن ہے لیکن ضروری ہے اور اقبال کے ساتھ عقیدت و ارادت کا حق صحیح معنی میں اسی وقت ادا ہو سکتا ہے۔

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

بیگم صالحہ عابد حسین رکن مجلس ادارت "ارتقاء"

حالی عورت کا محسن

یہ خواتین کا سال ہے۔ اس سال دنیا جہان کی عورتیں اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کر رہی ہیں اور ان کے ساتھ مرد بھی عورتوں کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کی تلافی کرنے اور ان کے حالات سدھارنے اور ان کے حقوق کو دلوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہندوستان میں قانونی طور پر تو عورت کو وہ سب حقوق حاصل ہیں جو مرد کو ہیں اور اس کی سماجی حیثیت سدھارنے کی بھی کوششیں کی گئی ہیں۔ لیکن جب ہم ان کروڑوں عورتوں کو دیکھتے ہیں جو اب بھی بہت سی ناانصافیوں، حق تلفیوں اور سماج یا مرد کے مظالم کا شکار بنی ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے اور اس میں صرف مرد ہی نہیں خود عورت اپنے حق کے لئے کوشش نہ کرے گی۔ اس وقت تک خود اس کی حالت نہیں ساری قوم اور ملک کی حالت میں سدھارنا ممکن نہیں ہے۔ آج سے سو سوا سو برس پہلے ہندوستان میں پہلے پہل عورت کے حقوق کے لئے اس کی تعلیم کے لئے آواز بلند ہوئی تھی۔ اور اس کو احساس دلایا گیا تھا کہ عورت کے ساتھ کیا کیا ناانصافیاں ہو رہی ہیں۔

اس ضمن میں خواجہ الطاف حسین حالی کا نام سب سے پہلے آسکتا ہے یوں تو حالی نے ساٹھ سال تک ملک و قوم، ادب، شاعری و تنقید کی اور ساتھ ہی سماج اور تہذیب کی خدمات انجام دیں اور کئی چیزوں میں ان کو اولیت کا شرف حاصل رہا ہے مثلاً وہ اردو کے پہلے نقاد ہیں پہلے سوانح نگار ہیں لیکن عورتوں کے حقوق کے لئے سب سے پہلے جو آواز پچھلی صدی میں بلند ہوئی نظم میں نثر میں بھی اور عملی طور پر بھی جس ہستی نے عورتوں کے لئے جی جان سے کوششیں کیں وہ خواجہ الطاف حسین حالی کی ذات تھی۔

یوں تو مولانا حالی کے زمانے میں اور بھی کئی ہستیاں ایسی گذری ہیں جنھوں نے ادب شاعری تعلیم اور سماج کی دنیا میں انقلاب پیدا کئے اور ساری زندگیاں اس کام میں صرف کر دیں ان بزرگ ہستیوں میں سر سید احمد کا نام سب سے روشن ہے۔ لیکن وہ گوشہ جس میں عورت چھپی ہوئی تھی سر سید کی نظر سے چوک گیا۔ ان کا خیال تھا کہ مرد جب تعلیم پا جائے گا تو عورت کی تعلیم اور اصلاح کا کام خود بخود ہو جائے گا۔ آج کے زمانے کے مرد اور عورتیں اس وقت کی عورت کی حالت کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ عورت کے لئے تعلیم کے دروازے بند تھے سوا رواجی مذہبی تعلیم کے اور وہ بھی زیادہ تر زبانی ہوتی تھی۔ کم سنی کی شادی کا رواج عام تھا۔ بیوہ ہو جانے پر عورت کی ساری زندگی عبرتناک حد تک دکھ بھری تھی۔ سماجی حقوق بالکل حاصل نہ تھے۔ شادی بیاہ میں بھی اس کی رائے کی کوئی اہمیت نہ تھی مگر اس کی پستی کا، دکھ کا، کسی کو احساس نہ تھا۔

حالی کے دردمند اور حساس دل نے عورت کی حالت دیکھی اس کا درد سمجھا اور اس کو پستی اور ذلت سے نکال کر انسانیت کے اونچے سنگھاسن پر بٹھانے کی جدوجہد شروع کردی اس ضمن میں انھوں نے دو طرح کے کام انجام دیئے۔ ایک عملی کوشش جس کا دائرہ محدود تھا۔ مگر وہ یہ جانتے تھے کہ اگر ٹھہرے پانی میں ایک بار تموج پیدا ہو جائے تو جمود ٹوٹ جاتا ہے اور چراغ سے چراغ جلتا رہتا ہے دوسرے زبان قلم سے عورتوں کے حقوق کے لئے جہاد کرنا۔ چنانچہ انھوں نے نظم و نثر میں عورتوں کے لئے متعدد چیزیں لکھیں جس کی روشنی آج تک پھیلی ہوئی ہے۔

عملی طور پر انھوں نے ایک سچے مصلح کی طرح سب سے پہلے اپنے قصبہ اور گھرانے میں عورتوں کو حقوق دلوائے۔ مثلاً کم عمری کی شادی کو بند کرایا۔ بیوہ کی شادی کو کسی حد تک رواج دیا کم سے کم یہ احساس لوگوں کے دلوں سے دور کیا کہ بیوہ کا دوبارہ نکاح کرنا کوئی بری بات ہے۔ شادی کے وقت لڑکیوں کی رائے اور پسند کو اہمیت دینا ضروری بتایا۔ اگرچہ ان کے گھرانے کی عورتوں کو پڑھنا تو آتا تھا یعنی مذہبی کتابیں پڑھا دینے کا رواج تھا مگر حالی نے ان کو لکھنا سکھانا بھی شروع کیا پھر حالی نے ایک قدم اور بڑھایا اور لڑکیوں کے لئے ایک چھوٹا سا اسکول قائم کیا جس میں پڑھانے کے لئے دلی سے ایک استانی بلائی گئی۔ چند سال میں لڑکیاں استانی کے برابر ہو گئیں پھر کوئی اچھی استانی نہ ملنے کے باعث یہ اسکول بند کرنا پڑا مگر جمود ٹوٹ چکا تھا۔ دیئے سے دیا جلنا شروع ہوا۔ پانی پت میں عورتوں کی تعلیم کا رواج بڑھتا گیا۔

حالی جیسا کہ ہم نے کہا صاحب قلم تھے۔ وہ جانتے تھے کہ لوگوں کے ذہن شعر و ادب سے کتنے متاثر ہوتے ہیں چنانچہ انھوں نے عورتوں کے لئے اصلی جدوجہد قلم ہی کے ذریعے کی یہاں ہم چند مثالوں سے اپنے اس دعوے کی وضاحت کریں گے۔

نثر میں علاوہ مضامین کے انھوں نے قصے کے پیرائے میں ایک کتاب "مجالس النساء" لکھی جو دو حصوں میں ہے اسے ہم ناول تو نہیں کہہ سکتے، قصہ بھی برائے نام ہے۔ کتاب مکالمے میں ہے۔ جس میں اولاد کی تعلیم و تربیت کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ یہ سمجھایا ہے کہ اولاد کی تربیت ایک بہت بڑا فرض ہے جو عورت پر عائد ہوتا ہے وہ اگرچہ اسے پورا کرتی ہے مگر صحیح طریقے سے نہیں۔ بچے کی اچھی تربیت اور تعلیم ملک اور قوم کی بھی بڑی خدمت ہے جو عورت کر سکتی ہے پہلے حصے میں حالی نے ایک استانی جی (جن کو اس وقت آتو جی کہتے ہیں) اور ایک بیوہ خاتون کا مکالمہ دکھایا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ لڑکیوں کی تربیت کے بہترین اصول کیا ہیں۔

یہ کتاب نہایت سادہ سہل رواں اور روزمرہ کی بامحاورہ زبان میں لکھی گئی ہے۔ باوجود نصیحت کی کتاب ہونے کے واعظانہ خشکی نام کو نہیں ہے یہ کتاب پچیس تیس سال تک یوپی اور پنجاب کے زنانہ اسکولوں کے کورس میں شامل رہی اور خدا جانے کتنے ذہنوں کو اس نے متاثر کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ آج بھی یہ کتاب اتنی ہی مفید ہے اگرچہ اب اسے لوگوں نے بھلا دیا ہے۔ تعلیم و تربیت کے علاوہ اور بھی کتنی مسائل ضمنی طور پر اس کتاب میں آگئے ہیں جو اس وقت بہت زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ آج بھی انکی اہمیت اتنی ہی ہے۔ اس لئے کہ بہت سے گھرانے ایسے ہیں جنھوں نے صرف ظاہری تعلیم پائی ہے اس کی روح کو نہیں سمجھا۔ "مجالس النساء" میں زبیدہ خاتون اپنے بیٹے کو بتاتی ہیں کہ جب انکی شادی کا وقت آیا تو باپ نے ان سے رضامندی حاصل کی تھی۔ اس کا فدرانا اقتباس ہم یہاں دیں گے۔

"بیٹا تم خدا کے فضل سے پڑھی لکھی قابل اور ہوشیار ہو ہر ایک بات کی برائی بھلائی کو خوب جانتی ہو۔ تم کو زیادہ سمجھانے کی کچھ ضرورت نہیں میر سید علی کے گھرانے کا حال تمھاری اماں بہشتن تم سے کہہ چکی ہیں۔ ان کے یہاں کے مرد عورت کا چال چلن جو میں نے سنا ہے بہت اچھا ہے۔ ان کا بیٹا احمد علی بھی ظاہر میں نہایت سعادت مند اور اہل معلوم ہوتا ہے جو کچھ تمہاری مرضی ہو بے تکلف کہہ دو۔"

ایک جگہ عورت کو تعلیم یافتہ اور شائستہ ہونے کی اہمیت اور ضرورت بتاتے ہوئے مرد اور عورت کے رشتے کو تمثیل کے پیرائے میں یوں سمجھایا ہے۔

"مرد کو ایسا سمجھو جیسے پیاسا اور عورت کو ایسا سمجھو جیسے چشمہ اگر چشمے کے گرد درختوں کا سایہ بھی ہے اور چاروں طرف سبزہ بھی لہلہا رہا ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی ہے تو بے اختیار یہ جی چاہے گا کہ دو چار گھڑی یہاں بیٹھ کر سبزے کی بھی سیر دیکھے جو نرا چشمہ ہی چشمہ ہے اور کچھ ایسی فضا کی جگہ نہیں ہے تو پانی پی کر اپنا راستہ لے گا۔۔"

نثر سے زیادہ جوش اور شدت کے ساتھ حالی نے نظم میں عورت کے لئے آواز اٹھائی۔ ایک چھوٹی سی نظم میں بے جوڑ شادیوں کی طرف متوجہ کر کے بتاتے ہیں کہ اس سے لڑکی کی زندگی کس طرح برباد ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شاعرانہ حسن تو نہیں مگر بات جو کہی گئی ہے وہ کل بھی درست تھی اور آج بھی کس حد تک اکثر گھرانوں پر صادق آتی ہے۔ چند شعر یہ سنئے۔

چھان میں اس کی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہو۔
پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہو بر

بدمزاجی ہو جہالت ہو کہ ہو بد چلنی
کچھ برائی نہیں ڈو تو نتا ہے داماد اگر

یہ وہی ناشدنی ریت ہے جس کے کارن
بچیاں بھیڑیوں سے پاتی ہیں پیوند اکثر

اپنا اور بیٹیوں کا جب کہ نہ سوچیں انجام
جاہلیت سے کہیں ہے یہ زمانہ بدتر

لیکن حالی کی وہ شاہکار نظمیں جنھوں نے صحیح معنوں میں ہندوستانی سماج میں ایک طرح کا انقلاب پیدا کر دیا اور ہر کس و ناکس کو عورت کی حالت اور اس کے حقوق کا احساس دلایا!

وہ ہیں چپ کی داد اور بیوہ کی مناجات ان نظموں کی ظاہری اور معنوی خوبیوں اور اس کے گہرے تاثر اور حسن و خوبی کا اعتراف اردو کے ہر نقاد اور ہر صاحب ذوق اور اہل دل نے کیا ہے صرف ایک کی رائے سن لیجئے۔ مولوی عبدالحق جو اردو کے مشہور نقاد اور ادیب تھے فرماتے ہیں۔

"مناجات بیوہ اور چپ کی داد دو ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں کیا کسی زبان میں نہیں ملتی۔ یہ نظمیں نہیں دل و جگر کے ٹکڑے ہیں لکھنا تو بڑی بات کوئی انھیں بے چشم نم پڑھ بھی نہیں سکتا۔"

چپ کی داد تو اعتراف ہے عورت کی عظمت کا۔ اس خدمت ایثار اور بے نفسی کا جس سے وہ ساری عمر کام لیتی ہے۔ اس میں حالی کے مخاطب صرف مسلمان عورت نہیں۔ صرف ہندوستانی عورت نہیں۔ وہ ساری دنیا کی عورت سے مخاطب ہیں اس نظم کی عظمت اور اہمیت کا پورا اندازہ تو نظم پڑھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے یہاں نمونے کے طور پر چند شعر کہیں کہیں سے دیکھئے۔

اے ماؤں بہنوں بیٹیوں دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھیں قوموں کی عزت تم سے ہے

نیکی کی تم تصویر ہو عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں ایماں سلامت تم سے ہے

فطرت تمھاری ہے حیا طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبادت تم سے ہے

مردوں میں ست والے تھے جو ست بیٹھے اپنی کھو
دنیا میں اے ست ... لے دیکھے اب ست تم سے ہے

وہ اس نظم میں عورت کے ہر روپ کا تذکرہ کرتے ہیں ہر ہر منزل پر اس کی خدمت بے نفسی اور ایثار کو سراہتے ہیں وہ عورت نہیں جو مرد کی محبوبہ اور محض حسن و جمال کا مجسمہ ہے نہ وہ عورت جو اس کی کام جوئیوں کا آلہ ہے۔ یہ عورت بیٹی ہے، بہن ہے، بیوی ہے ماں ہے۔

ماں کی عظمت کا ذکر یوں تو ہر قوم کے ادب میں آتا ہے مگر حالی نے جس انداز میں اس کو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ سب سے جدا ہے۔ چند شعر سنئے۔

تھا پالنا اولاد کا مردوں کے بوتے سے سوا
اگر یہ اے دکھیاریوں خدمت تمھارے سر پڑی

پیدا اگر ہوتیں نہ تم بیڑا نہ ہوتا پار یہ ......
چیخ اٹھتے دو دن میں اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ

دنیا کو بتاتے ہیں کہ انسانی تہذیب میں عورت کا مقام کیا ہے

وہ وقت اور دنیا کے معلوم کے وعظ و پند سے
ظلمت میں باطل کی ہوا دنیا میں نور حق عیاں

وہ علم اور حکمت کے بانی جن کی تحقیقات سے
ظاہر ہوئے عالم میں اسرار زمین و آسماں

۱؎ اچھی خوراک کا۔

کیا صوفیاں باصفا، کیا عالمان باخدا

کیا انبیاء کیا اولیاء کیا غوث کیا قطب نوبل

کیا پھول پھل یہ سب اسی کر مد پوڑے کے دیکھئے

سینچا تھا ماؤں نے تمھیں خون جگر سے اپنے ہاں

وہ عورت کو صرف اشرف المخلوقات نہیں کہتے بلکہ فخر انسانیت تصور کرتے ہیں ؎

کی تم نے اس دار المحن میں جس تحمل سے بسر

زیبا ہے گر کہیئے تمھیں فخر بنی نوع بشر

لیکن حالی کا دل اس خیال سے محزون ہوتا ہے کہ اس ہستی کے ساتھ مرد کی دنیا میں ہمیشہ ناانصافی ہوتی آئی ہے جس میں سب سے بڑا ظلم یہ کہ اسے علم کی روشنی سے محروم رکھا گیا

جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں

آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر

جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آب حیات

ٹھہرا تمھارے حق میں وہ زہر ہلاہل سربسر

کہتے ہیں کہ دنیا کے سب دانا اور حکیم اس خوف سے کانپتے رہے کہ تم پر علم کا پرچھاواں نہ پڑ جائے۔ کیوں؟ اس لئے ۔

ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق

تعلیم پاکر آدمی بننا تمھیں زیبا نہیں

اور وہ بے دھڑک کہتے ہیں ؎

آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب

دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

انھیں اندھیرے میں روشنی کی کرن بھی نظر آرہی ہے ؎

اٹکے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں سچائی کے سوا

پر فتح جب پائی سچائی ہی نے آخر پائی ہے

اور بیوہ کی مناجات میں تو شاعر کے دل کا سارا درد و گداز سمویا ہوا ملتا ہے۔ اس وقت ہندوستانی بیوہ کی جو حالت تھی یہ نظم اس کا آئینہ ہے اور کمسن بیوہ کے دل پر جو کچھ گذرتی تھی اس کے جذبات کی اس طرح عکاسی کی گئی ہے کہ پڑھنے والا تڑپ جاتا ہے۔ آج ہندوستان سے یہ خراب رواج اگرچہ بڑی حد تک ختم ہوگیا ہے تو اس کی پہلی اور سب سے پر اثر کوشش حالی ہی نے کی تھی۔ کیسے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس نظم کے حسن و خوبی درد و اثر گہرائی اور گیرائی کا جب تک اس کو پورا نہ پڑھیں۔ کہیں سے نمونے کے طور پر دو دو چار چار شعر سن لیجئے۔ بیوہ مخاطب ہوتی ہے اپنے خالق سے ؎

اے ساری دنیا کے مالک — راجا اور پرجا کے مالک!

سب سے انوکھے سب سے نرالے — آنکھ سے اوجھل دل کے اجالے

بانوِ جگت کی کھینے والے — دکھ میں تسلی دینے والے

پھر اس سے فریاد کرتی ہے ؎

دل پر میرے داغ ہیں جتنے — منہ میں بول نہیں ہیں اتنے

پیت نہ تھی جب پایا پیتم — جب ہوئی پیت گنوایا پیتم

باغ میں سیلانی جب آئے — پھول نہ تھے کھلنے ابھی پائے

پھول کھلے جس وقت چمن میں — جا جوتے سیلانی بن میں

اسی کے دن اور رات کی ذرا سی جھلک دیکھئے ؎

دن ہیں بھیانک رات ڈراونی — یوں گذری یہ ساری جوانی

خیر سے بچپن کا ہے رنڈاپا — دور پڑا ہے ابھی بڑھاپا

بیوہ کی حالت اس وقت کیا تھی ؎

روتے تو سب رہتے ہیں گھر کے — رونے نہیں دیتے جی بھر کے

ہنستے تو ہنستا عیب ہے ہم کو — کیوں کر الٹی کاٹئے غم کو

سوچ میں بری سارا گھر ہے — میرے چلن پہ سب کی نظر ہے

دنیا کا بیوہ کے ساتھ کیا سلوک تھا ؎

آپ کو ہوں ہر وقت مٹاتی — پہنتی اچھا میں ہوں نہ کھاتی

مگر ؎

جل جاؤں گر خاک میں بھی میں — بچ نہ سکوں طعنوں سے کبھی میں

چین گر اپنی بانٹ میں آتا — کیوں تو عورت ذات بناتا

اور آخر میں بیوہ کی زبان سے وہ بات کہلواتے ہیں جو اس نظم کا حاصل ہے ؎

اے بے آسوں کے کھویا — اے ڈوبے بیڑے کے کھویا

کیجو میری کشتی پانی — آپہنچا ڈباؤ پانی

اپنے لئے کچھ کہہ نہیں سکتی میں — پر یہ کہے بن رہ نہیں سکتی میں

میں ہی اکیلی نہیں ہوں دکھیا — پڑی ہے لاکھوں پر یہی بپتا

بالیاں اک اک ذات کی لاکھوں — بیاہیاں اک اک رات کی لاکھوں

شرط سے پہلے بازی ہاری — بیاہ ہوا اور رہی کنواری

کوئی نہیں جو غور کرے اب — نبض یہ اس کی ہاتھ دھرے اب

بے دردوں سے پڑا ہے پالا — تو ہی اب ان کا ہے رکھوالا

چوٹ نہ جل کے دل کو لگی ہو — وہ کیا جانے دل کی لگی کو

غرض خواجہ الطاف حسین حالی کا نام عورت کے حقوق کے لئے آواز بلند کرنے میں اس کے حقوق دلوانے اس کی سماجی حالت سنوارنے اس کے ساتھ کی گئی حق تلفیوں کی مذمت اور تلافی کرنے اور انسانی برادری میں برابر کا درجہ دلانے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ حالی عورت کے بہت بڑے محسن تھے ۔

تاریخ آواز دیتی

حق

فلسفیانہ فکر کے چشمے حضرت مسیحؑ سے چھ سو سال قبل دنیا کے چار تمدنی مرکزوں یعنی ایران، چین ہندوستان، اور یونان میں پھوٹے تھے۔ ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں فکر کا ایک نیا چشمہ ریگ زارِ عرب سے پھوٹا۔ جو اتنا بڑھا اور پھیلا کہ ایک بحرِ بیکراں بن گیا۔ دنیا کی طاقتور ترین سلطنتیں اس سیلِ بے پناہ میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں اور ایک صدی کے اندر وہ اس زمانہ کی دنیائے معلوم کے نصف حصہ پر چھا گیا۔

اس نے اعلیٰ درجہ کے متمدن شہروں کو وجود دیا۔ اس سلطنت کا بجٹ دورِ وسطیٰ کی دنیا کے تمام بجٹوں کے مقابلہ میں زیادہ وسیع تھا۔ اس کے کارخانوں میں ایسی مصنوعات تیار ہوتی تھیں۔ جو مشرق و مغرب دونوں جگہ قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھیں۔ دنیا میں سب سے پہلے اسی سلطنت نے صنعتی پیمانے پر بارود تیار کی جو قرونِ وسطیٰ میں ایک ایسی ہی ایجاد تھی جیسی کہ جوہری بم آج کے زمانہ میں۔ انھوں نے زراعت کی ترقی کے لیے نہروں کا ایک جال بچھا دیا۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے سارے یورپ کے لیے شہری زندگی، حفظانِ صحت، زراعت، تعمیرات آب پاشی، خوش نویسی، ملباس، غذا کے مثالی نمونے قائم کیے اور یہ سب کچھ اس وقت سے صدیوں پہلے کی باتیں ہیں جب کہ کولمبس مغرب کی جانب "بلکہ مشرق" کی جستجو میں نکلا تھا۔ یہ سب کچھ اس وقت سے صدیوں پہلے کی باتیں ہیں جب کہ نہ تو لندن کی سڑکوں پر کوئی سرکاری چراغ نظر آتا تھا نہ پیرس کی شاہراہیں فرش بندی سے استحکام پذیر ہوئی تھیں۔ یہ سب کچھ اس وقت سے صدیوں پہلے کی باتیں ہیں جب کہ جرمنی فرانس اور انگلستان کے حکمرانوں کے قصور و محلات ہنوز اصطبلوں سے بمشکل ہی بہتر ہوتے تھے۔ جن میں نہ دودکش کا پتہ ملتا تھا اور نہ روشن دان کا وجود۔ اور یہ سب کچھ اس وقت سے بھی صدیوں پہلے کی باتیں ہیں جب کہ یورپ کے پیشوایانِ مذہب غسل و طہارت اور تبدیلِ لباس سے مہینوں محترز رہنے کو نیکی اور پاکبازی ... سمجھتے تھے۔

۷۶۲ء میں پہلے عباسی خلیفہ المنصور نے اپنے نئے دارالخلافہ بغداد کی بنیاد ڈالی اس نے اپنے گرد مختلف علاقوں کے علماء و فضلاء جمع کیے اور دوسری زبانوں سے سائنس اور ادبی تصانیف کے ترجمے کی حوصلہ افزائی کی۔ ۸۳۲ء میں خلیفہ المامون نے بغداد میں بیت الحکمت کی بنیاد رکھی اور اس کے ساتھ ایک رصدگاہ ایک کتب خانہ اور ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا۔ عربی ترجموں کا یہ کام اس قدر وسیع تھا کہ قیام بغداد کے اسّی سال کے اندر اندر ارسطو کی تصانیف کے بیشتر حصے عربوں کی تحویل میں آگئے۔ یہ سب کچھ دنیائے اسلام میں اس وقت ہو رہا تھا جب کہ اہلِ مغرب فکرِ یونان سے قریب قریب ناآشنا تھے۔ ہٹی کے الفاظ میں "یہاں مشرق میں ہارون الرشید اور المامون یونانی و فارسی کے فلسفے کی چھان بین کر رہے تھے۔ تو وہاں مغرب میں ان کے ہم عصر شارلیمان اور اس کے امراء محض اپنے نام کے حروف ہجی لکھنا سیکھ رہے تھے۔"

۱۰۶۵ء میں نظامیہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ تین صدیوں بعد اس نے مستنصریہ کی شکل اختیار کی۔ مستنصریہ اس اعتبار سے اپنی نوعیت کا ادارہ تھا کہ اس کے ساتھ ایک اسپتال منسلک کیا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ تمام ممالک محروسہ میں اس طرح کے سیکڑوں مدرسے قائم ہو گئے یورپ کے علماء و فضلاء علم کی پیاس بجھانے کے لیے ان جامعات میں جوق در جوق آیا کرتے تھے۔ جس طرح آج ہمارے طلبہ یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں جاتے ہیں۔

عباسی دور میں کاغذ سازی ایک گھریلو صنعت بن چکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثرت سے کتابیں لکھی جانے لگیں اور بڑے بڑے کتب خانے کثیر تعداد میں تیار ہو گئے۔ دسویں صدی میں کتب خانہ قرطبہ میں تقریباً چار لاکھ کتابیں تھیں (بعض چھ لاکھ کی تعداد بتاتے ہیں) اور اس زمانہ میں یورپ کے کسی کتب خانے میں بھی غالباً دس ہزار سے زائد کتابیں نہیں ہوتی تھیں کیتھولک انسائیکلوپیڈیا کے بیان کے مطابق کنٹربری کا کتب خانہ تیرہویں صدی میں، اپنی ۵۰۰۰ کتابوں کے ساتھ مسیحی کتب خانوں کی فہرست میں پہلے نمبر پر نظر آتا ہے۔

مسلمانوں کو اسکندریہ، شام اور ایران سے ایک روایت کہنہ ملی تھی۔ لیکن انھوں نے یورپ کو ایک بالکل ہی نئی اور تازہ روایت عطا کی۔ مثلاً قانون میں مسلمانوں نے ایک بالکل ہی نئے علم کی تخلیق کی جسے اطلاقی علم شہادت (حدیث) کہا جا سکتا ہے۔ تاریخ میں ہیروڈوٹس کے بعد مسلمان ہی پہلے عظیم ترین مورخ گذرے ہیں۔ مورخ طبری (متوفی ۹۲۳ء) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ چالیس سال تک روزانہ اوسطاً چالیس صفحات لکھتا رہا۔ مسعودی (متوفی ۹۵۷ء) نے ایشیا کے تقریباً تمام ملکوں کی سیاحت کی۔ البیرونی (المتوفی ۱۰۴۸ء) پہلا شخص تھا جس نے سب سے پہلی مرتبہ تاریخی تحقیق کے اصول منضبط کیے۔

ابن خلدون (المتوفی ۱۴۰۶ء) کے متعلق کلوسیو کہتا ہے کہ "ابن خلدون ایک بانیِ ماہرِ معاشیات، گذرا ہے جو سیاسی معاشیات کے اصولوں کو اس وقت سمجھ چکا تھا اور ان اصولوں کو بڑی قابلیت و مہارت کے ساتھ زمانے میں منطبق کر چکا تھا جب کہ مغربی محققوں کو ان کی ہوا تک نہ لگی تھی۔"

جغرافیہ میں نویں صدی کے نصف اول میں خوارزمی اور اس کے شرکا کار نے معلوم کیا تھا کہ زمین کا محیط بیس ہزار اور اس کا نصف قطر ۳۵۰۰ میل ہے۔ یہ صحت نہایت حیرت انگیز ہے۔ دنیائے اسلام میں یہ سرگرمیاں ایسے زمانے میں جاری تھیں جب کہ سارے کا سارا یورپ زمین کے چپٹی ہونے کا قائل تھا۔ بارھویں صدی کے وسط میں الادریسی نے دنیا کا ایک نقشہ بنایا اس نقشہ میں اس نے دریائے نیل کا منبع بھی دکھایا جسے اہل یورپ کہیں انیسویں صدی میں جا کر دریافت کرنے کے قابل بنے مسلمانوں نے اہل یورپ کو زمین گول ہونے کا عقیدہ اور مد و جزر کے اسباب کا تقریباً صحیح نظریہ منتقل کیا۔

فلکیات کے مطالعہ کے لئے جگہ جگہ رصدگاہیں قائم تھیں۔ اشبیلیہ کی رصدگاہ کے بارہ میں ڈریپر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "مسلمانوں .... " کے ملک بدر ہو جانے کے بعد یہ رصدگاہ کلیسا کے گھنٹہ گھر میں تبدیل کر دی گئی کیوں کہ ہسپانی باشندے اس کے استعمال کا کوئی اور طریقہ جانتے ہی نہ تھے۔ زرقالی نے ایک جدید قسم کا اصطرلاب بنایا اور پہلی مرتبہ اوج شمس بلحاظ کواکب کی حرکت کو ثابت کیا۔ اس کے حساب سے اس اوج کی پیمائش ۱۲۰۴ ۔ ۱۲ برآمد ہوتی ہے جب کہ حقیقی پیمائش صرف تھوڑے سے فرق کے ساتھ ۸ ۔ ۱۱ ہے۔ عمر خیام نے ایک تقویم تیار کی جو موجودہ جارجوی تقویم کے مقابلہ میں زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ خیام کی تقویم سے پانچ ہزار سال میں صرف ایک دن کا فرق آتا ہے۔ اس طرح کی بے شمار تحقیقات ہیں۔

ریاضی میں عرب مسلمانوں کے واسطہ سے ہندی اعداد یورپ تک پہونچے چنانچہ اسی لئے آج تک انھیں .... کہا جاتا ہے۔ احمد نہاوندی (۱۰۳۰ء) نے کسور کی تقسیم اور جذر المربع دریافت کرنے کے طریقوں کی وضاحت قریب قریب جدید انداز میں پیش کی ہے۔ خوارزمی کی کتاب "الجبر والمقابلہ" سولہویں صدی تک یورپی جامعات کی ریاضی کی اہم ترین درسی کتاب کی حیثیت سے استعمال ہوتی رہی۔ ہم علم مثلث میں نسبت و تناسب کے جو بنیادی نظریئے استعمال کر رہے ہیں، ان میں اکثر ایسے ہیں جو ایک صابی المذہب مسمی البتانی (المتوفی ۹۲۰ء) نے مسلمانوں کی زیر سرپرستی دریافت کئے تھے۔

طبیعیات میں عرب مسلمانوں نے بہت سے کارنامے دکھائے۔ ابن الہیثم نے یہ دریافت کیا کہ کسی قسم کا وزن لطیف اور کثیف فضا میں مختلف ہوتا ہے۔ وہ فضا کے وزن کو ٹوری سیلی سے پانچ سو سال پہلے ہی جان گیا تھا۔ اور کشش ثقل کا ایک واضح تصور رکھتا تھا۔ اپنے بعض تجربوں میں اس نے مکبّر عدسوں کے نظریئے کے انکشاف کی پیش بینی کی ہے اور یہ انکشاف واقعی طور پر اٹلی میں تین سو سال بعد ہوتے ہیں۔ تیرھویں صدی کے اوائل میں مسلم سائنس دانوں نے ہو اچکی ر) اور شیشے کے آئینہ کا انکشاف کیا اور یورپ کو ان کے استعمال کے طریقے سکھائے۔ ابن سینا نے معدنیات پر ایک رسالہ لکھا جو مغرب میں علم طبقات الارض کے سرچشمے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

تاریخ طبیعی میں ان کے کارنامے ہیں۔ مثلاً البیطار نے ایسے دو سو پودوں کی تفصیلات پیش کی ہیں جن کے متعلق سابقین کو کوئی علم نہ تھا۔ عربوں نے نباتاتی معلومات میں بہ حیثیت مجموعی دو ہزار پودوں کا اضافہ کیا۔

طب میں تو ان کے کارنامے بے شمار ہیں، الرازی (متوفی ۹۲۳ء) کا رسالہ ..... "الجدری الحصبہ" پہلا رسالہ ہے جس میں چیچک اور خسرے کی معالجاتی تفصیل صحت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

ابن البیطار (۱۲۴۸ء) کی کتاب "الادویۃ المفردۃ" یورپ میں صدیوں تک معیاری سمجھی جاتی رہی۔ لاطینی زبان میں اس کا جو ترجمہ ہوا، چودھویں صدی کے دوران میں اور اس کے بعد اس کے چھبیس اڈیشن طبع ہوئے۔

الزہراوی نے "التعریف" لکھی، اس کتاب میں آلات جراحی کی تشریحی تصویریں دی گئی تھیں جن سے مغربی جراحی کی تاسیس میں بڑی مدد ملی۔ ابن سینا کی کتابیں یورپ کی جامعات میں طب کی درسی کتابوں کی طرح استعمال ہوتی رہیں۔ اس کے رسالہ "القانون" نے ہٹی کے الفاظ میں بارھویں صدی سے تیرھویں صدی تک مغرب میں علوم طب کے عظیم رہنما کی خدمت انجام دی ہے۔

پندرھویں صدی کے آخری تیس برسوں میں اس کتاب کے پندرہ لاطینی اڈیشن شائع ہوتے ولیم اوسلر نے اپنی کتاب ایولیوشن آف میڈیکل سائنس میں لکھا ہے۔

"ابن سینا کا رسالہ القانون اتنی طویل مدت تک طبی انجیل کی طرح پڑھا جاتا رہا کہ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔"

حقیقت یہ ہے کہ جدید دوا سازی کا پورا ہیولی (با ستثناء چند) عربوں ہی کا تیار کیا ہوا ہے (سر تھامس کلفر ڈایسٹ، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔)

بریفالٹ نے اپنی کتاب.................. میں سائنٹی طریق میں مسلمانوں کے کئے ہوئے اضافوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"راجر بیکن نے عربی سائنس سیکھی تھی۔ نہ تو راجر بیکن کو اور نہ اس کے بعد اس کے کسی ہم نام کو یہ حق پہونچتا ہے کہ تجربی طریق کی ترویج کا سہرا اس کے سر باندھا جائے۔ راجر بیکن کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ مسیحی یورپ میں مسلم سائنس اور طریق کا مقلد اور مبلغ تھا اور وہ یہ اعلان کرنے سے کبھی تھکتا ہی نہ تھا کہ اس کے ہم عصروں کے لئے حقیقی علم تک رسائی حاصل کرنے کے لئے عربی سائنس سے وقوف پیدا کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔"

فلسفہ میں دیکھئے تو وہاں بھی یہی عالم ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ الغزالی کی فکر میں ڈیکارٹ سے لے کر برگساں تک تمام مغربی فلسفے کے اہم خدوخال کی پیش بینی پائی جاتی ہے۔ ڈیکارٹ کی طرح وہ بھی اپنے نفسی جائزے سے نتائج اخذ کرتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ڈیکارٹ کے پاس کلام کا حرف آغاز یہ ہے کہ "میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں" اور الغزالی کے کلام کا حرف آغاز یہ ہے کہ "میں ارادہ کرتا ہوں اس لئے میں ہوں۔"

یہ الکندی تھا نہ کہ ڈیکارٹ جس نے دنیا کے سامنے پہلے یہ نظریہ پیش کیا کہ فلسفیانہ تحقیق کے لئے ریاضیاتی منہاج کا استعمال لازمی ہے الکندی نے کانٹ سے نو سال پہلے اور ہیلیسن سے آٹھ سو سال پہلے واضح صورت میں یہ نظریہ پیش کیا کہ تخیل دوسرے

...یا ہے معلم اول ارسطو
...پہلے ارتقار کا تخیل

...افت کیا کہ

شورش کاشمیری

تاریخ کی پکار

دورِ جدید [illegible] کے نام

آپ کیا چیز ہیں تاریخ کے ایوانوں میں
آپ نے کون سے عنوان کئے ہیں قائم
جرأت و غیرت و ایثار کے افسانوں میں
کے برس آپ رہے ہیں پسِ دیوارِ قفس؟
کس قدر عمر گذاری ہے گراں جانوں میں
داستاں کوئی بھی تحسین قلم تک پہنچی
تذکرہ آپ کا لکھا گیا زندانوں میں
آپ لکھا کریں اسلاف کو غدارِ وطن
اک پہیلی ہیں مگر آپ مسلمانوں میں
اس بڑے بول کو اب کون یہاں سنتا ہے
آپ ہیں ملت بیضا کے نگہبانوں میں
آپ جس رنگ میں چاہیں ہمیں بدنام کریں
آپ کی بات چلے گی نہ مسلمانوں میں

جانِ من! آپکے افکار تہی مغز کی خیر!
آگ لگ جائیگی تاریخ کے ایوانوں میں

...وش عکاسی کی تخیل کو بنانے یا حسن ے ایجا...
نے فلم بندی کو نو سو سال پہلے دیکھ لیا ہوتا۔

بارہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ابن رشد کو دنیائے یورپ میں اس قدر مقبولیت ہوگئی۔ اور اس کا فلسفہ رائج عیسائیوں کے حق میں اتنا زبردست خطرہ بن گیا تھا کہ ۱۲۱۰ء میں پیرس کی کونسل کو ارسطو کی طبیعی تاریخ اور اس پر لکھی ہوئی ابن رشد کی شرحوں کی تعلیم و تدریس کو ممنوع قرار دے دینا پڑا۔ ابن رشد نے یورپ کے ذہن میں چار سو سال سے زائد عرصہ تک حکمرانی کی اور اطالوی نشاۃ ثانیہ کی بنیادیں اسی کے ہاتھوں نے رکھیں۔ کولٹن ابن رشد کی اثرانگیزی کا موازنہ موجودہ زمانہ میں ڈارون کی اثرانگیزی کے ساتھ کرتا ہے مگر اس کے درست اترنے کے لئے ڈارونیت کو ابھی مزید تین سو سال تک زندہ رہنا ہوگا۔

یہ ہے فلسفہ و سائنس میں اس قوم کا ماضی جس کی آج یہ حیثیت ہوگئی گویا فلسفہ و سائنس میں ہم نے دنیا کو راستہ دکھایا تھا۔ مگر آج ہماری جگہ متبع کے مقام پر بھی نظر نہیں آتی۔ آج دنیا کی ترقی یافتہ قومیں فلسفہ و سائنس میں اتنے آگے ہیں کہ ہم ان کے پیچھے بھی نہیں۔ جو پیش رو تھے وہ پس رو ہوگئے۔ مگر دنیا کا قانون ہے کہ تاریخ بھی اپنے آپ کو دہرائیگی۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہم بھی تاریخی قوتوں کا ساتھ دیں ہم اپنے عمل سے تاریخ کو یہ موقع دیں کہ وہ اپنا کردار انجام دے سکے۔ تاریخ ہمیں آواز دیتی ہے، وہ ہمارے انتظار میں ہے۔ آیئے ہم چل پڑیں۔ آیئے ہم دوبارہ ماضی اور حال کے سرے ملا دیں تاکہ مستقبل ہمارے لئے ہو، جس طرح ماضی ہمارے لئے تھا۔

پطرس (سید احمد شاہ بخاری)

مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہی حالت ہماری تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر کار گزر جاتی تھی۔ میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی موٹر کار کو دیکھوں مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے، اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن میں گھر آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف اے میں پڑھی تھی اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔

میں کچھ دیر تک آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور مرزا سے مخاطب ہو کر بولا۔

"مرزا ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے۔"

مرزا صاحب بولے "بھئی کچھ ہو گا ہی نا آخر۔"

میں نے کہا "میں بتاؤں تمہیں۔"

کہنے لگے "بولو۔"

میں نے کہا "کوئی فرق نہیں۔ سنتے ہو مرزا کوئی فرق نہیں۔ ہم میں اور حیوانوں میں ... کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں۔ ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ تم میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو۔ کہہ دو گے۔ حیوان جگالی کرتے ہیں۔ تم جگالی نہیں کرتے۔ ان کی دم ہوتی ہے۔ تمہاری دم نہیں۔ لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں۔ لیکن ایک بات میں، میں اور وہ بالکل برابر ہیں۔ وہ بھی پیدل چلتے ہیں۔ میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے۔ جواب نہیں۔ کچھ ہے تو کہو۔ تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس دن سے پیدل چل رہا ہوں۔

پیدل۔ تم پیدل کے معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے۔ یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں اور دوسرا اٹھاتا ہوں۔ دوسرا رکھتا ہوں پہلا اٹھاتا ہوں۔ ایک آگے، ایک پیچھے ایک پیچھے ایک آگے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بیکار ہو جاتے ہیں تخیل رہ جاتا ہے آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔"

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران میں کچھ اس بے پروائی سے سگریٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بے پروائی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے از حد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف سے پھیر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین نہیں آتا۔ گویا میں جو تکالیف بیان کر رہا ہوں۔ وہ محض خیالی ہیں یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابلِ توجہ ہی نہیں یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا "اچھا مرزا یوں ہی سہی۔ دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں۔"

میں نے اپنے دانت بھینچ کر لئے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا۔ میں مسکرا دیا لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لئے بالکل تیار ہو گیا تو میں نے چبا چبا کر کہا۔

"مرزا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا بولے "کیا کہا تم نے۔ کیا خریدنے لگے ہو؟"

میں نے کہا "سنا نہیں تم نے۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں؛ بعض لوگ کار کہتے ہیں لیکن چونکہ تم ذرا کند ذہن ہو اس لئے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیئے۔ تاکہ تمہیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔"

مرزا بولے "ہوں۔"

اب کے مرزا نہیں میں بے پروائی سے سگریٹ پینے لگا۔ بھویں میں نے اوپر کو چڑھا لیں۔ سگریٹ والا ہاتھ میں منہ تک اس انداز سے لاتا اور ہٹاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر

مدرکات یعنی ادراک بالحواس اور عقل کا واسطہ ہے۔

مسلم فکر کی تاریخ میں الفارابی کو بالاتفاق "معلم ثانی" تسلیم کیا گیا ہے معلم اول ارسطو کو مانا گیا ہے۔ ابن مسکویہ، رومی اور ابن سینا نے ڈارون سے نو سال پہلے ارتقاء کا تخیل پیش کیا۔

وہ ابن الہیثم ہے جس نے نفسیات کے اس قانون کو سب سے پہلے دریافت کیا کہ پے در پے لمحاتی ارتسامات سے ایک ارتسام مسلسل پیدا ہوتا ہے، یہ ایک ایسا قانون ہے جس کی بازیافت سے ہمارے زمانہ میں سینما معرض وجود میں آیا۔ اگر ابن الہیثم کے زمانہ کے لوگ عکاسی کی تختیوں کو بنانے یا عکس کے ابھارنے کے کیمیائی عمل سے واقف ہوتے تو دنیا نے فلم بندی کو نو سو سال پہلے دیکھ لیا ہوتا۔

بارہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ابن رشد کو دنیائے یورپ میں اس قدر مقبولیت ہو گئی۔ اور اس کا فلسفہ رائج عیسائیوں کے حق میں اتنا زبردست خطرہ بن گیا تھا کہ ۱۲۱۰ء میں پیرس کی کونسل کو ارسطو کی طبیعی تاریخ اور اس پر لکھی ہوئی ابن رشد کی شرحوں کی تعلیم و تدریس کو ممنوع قرار دے دینا پڑا۔ ابن رشد نے یورپ کے ذہن میں چار سو سال سے زائد عرصہ تک حکمرانی کی اور اطالوی نشاۃ ثانیہ کی بنیادیں اسی کے ہاتھوں نے رکھیں۔ کولٹن ابن رشد کی اثر انگیزی کا موازنہ موجودہ زمانہ میں ڈارون کی اثر انگیزی کے ساتھ کرتا ہے مگر اس کے درست اترنے کے لئے ڈارونیت کو ابھی مزید تین سو سال تک زندہ رہنا ہوگا۔

یہ ہے فلسفہ و سائنس میں اس قوم کا ماضی جس کی آج یہ حیثیت ہو گئی گویا فلسفہ و سائنس میں ہم نے دنیا کو راستہ دکھایا تھا۔ مگر آج ہماری جگہ متبع کے مقام پر بھی نظر نہیں آتی۔ آج دنیا کی ترقی یافتہ قومیں فلسفہ و سائنس میں اتنے آگے ہیں کہ ہم ان کے پیچھے بھی نہیں۔ جو پیش رو تھے وہ پس رو ہو گئے۔ مگر دنیا کا قانون ہے کہ تاریخ بھی اپنے آپ کو دہرائیگی۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہم بھی تاریخی قوتوں کا ساتھ دیں ہم اپنے عمل سے تاریخ کو یہ موقع دیں کہ وہ اپنا کردار انجام دے سکے۔ تاریخ ہمیں آواز دیتی ہے، وہ ہمارے انتظار میں ہے۔ آیئے ہم چل پڑیں۔ آیئے ہم دوبارہ ماضی اور حال کے سرے ملا دیں تاکہ مستقبل ہمارے لئے ہو، جس طرح ماضی ہمارے لئے تھا۔

شورش کاشمیری

تاریخ کی پکار

کچھ دنوں بعد مورخ یہ لکھے گا صاحب
آپ کیا چیز ہیں تاریخ کے ایوانوں میں
آپ نے کون سے عنوان کئے ہیں قائم
جرأت و غیرت و ایثار کے افسانوں میں
کے برس آپ رہے ہیں پس دیوارِ قفس؟
کس قدر عمر گذاری ہے گراں جانوں میں
داستاں کوئی بھی تحسین قلم تک پہنچی
تذکرہ آپ کا لکھا گیا زندانوں میں
آپ لکھا کریں اسلاف کو غدارِ وطن
اک پہیلی ہیں مگر آپ مسلمانوں میں
اس بڑے بول کو اب کون یہاں سنتا ہے
آپ ہیں ملت بیضا کے نگہبانوں میں
آپ جس رنگ میں چاہیں ہمیں بدنام کریں
آپ کی بات چلے گی نہ مسلمانوں میں

جانِ من! آپکے افکار تہی مغز کی خیر!
آگ لگ جائیگی تاریخ کے ایوانوں میں

مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہی حالت ہماری تھی۔ دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر کار گزر جاتی تھی۔ میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی موٹر کار کو دیکھوں مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے، اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن میں گھر آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف اے میں پڑھی تھی اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔

میں کچھ دیر آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور ان سے مخاطب ہو کر بولا۔

"مرزا ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے۔؟"

مرزا صاحب بولے "بھئی کچھ ہوگا ہی نا آخر"

میں نے کہا "میں بتاؤں تمھیں۔؟"

کہنے لگے "بولو"

میں نے کہا "کوئی فرق نہیں۔ سنتے ہو مرزا کوئی فرق نہیں۔ ہم میں اور حیوانوں میں.... یعنی مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں۔ ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ تم میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو۔ کہہ دوگے۔ حیوان جگالی کرتے ہیں۔ تم جگالی نہیں کرتے۔ ان کی دم ہوتی ہے۔ تمہاری دم نہیں۔ لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں۔ لیکن ایک بات میں میں اور وہ بالکل برابر ہیں۔ وہ بھی پیدل چلتے ہیں اور میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ اس کا تمھارے پاس کیا جواب ہے۔ جواب نہیں۔ کچھ ہو تو کہو۔ بس تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس دن سے پیدل چل رہا ہوں۔

پیدل۔ تم پیدل کے معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے۔ یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں اور دوسرا اٹھاتا ہوں۔ دوسرا لگاتا ہوں پہلا اٹھاتا ہوں۔ ایک آگے، ایک پیچھے ایک پیچھے ایک آگے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بیکار ہو جاتے ہیں۔ تخیل مر جاتا ہے۔ آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔"

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران میں کچھ اس بے پروائی سے سگریٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بے پروائی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے ازحد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف سے پھیر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین نہیں آتا۔ گویا میں جو تکالیف بیان کر رہا ہوں۔ وہ محض خیالی ہیں یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابل توجہ ہی نہیں۔ یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا "اچھا مرزا یوں ہی سہی۔ دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں۔"

میں نے اپنے دانت بھینچ کر لئے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا میں مسکرا دیا لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لئے بالکل تیار ہو گیا تو میں نے چبا چبا کر کہا۔

"مرزا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں"

یہ کہہ میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا بولے "کیا کہا تم نے۔ کیا خریدنے لگے ہو"

میں نے کہا "سنا نہیں تم نے۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں بعض لوگ کار کہتے ہیں لیکن چونکہ تم ذرا کند ذہن ہو اس لئے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیئے۔ تاکہ تمھیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔"

مرزا بولے "ہوں"

اب کے مرزا نہیں میں بے پروائی سے سگریٹ پینے لگا۔ بھویں میں نے اوپر کو چڑھا لیں۔ سگریٹ والا ہاتھ میں منہ تک اس انداز سے لاتا اور ہٹاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر

رنگ کریں

تھوڑی دیر کے بعد مرزا پھر بولے "ہوں"

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے۔ مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا مرزا کچھ بولیں تاکہ مجھے معلوم ہو کہ ان پر کس قدر رعب پڑا ہے لیکن مرزا نے پھر کہا "ہوں"

میں نے کہا "مرزا جان میں جانتا ہوں کہ تم نے اسکول اور کالج اور گھر پر تین زبانیں سیکھی ہیں اور اس کے علاوہ تمہیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی اسکول اور کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے۔ پھر بھی اس وقت تمہارا کلام "ہوں" سے آگے نہیں بڑھتا تم جلتے ہو مرزا، اس وقت تمہاری جو ذہنی کیفیت ہے اس کا اظہار کوئی زبان نہیں کر سکتی"

مرزا صاحب کہنے لگے "نہیں یہ بات نہیں۔ میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا تم نے کہا میں ایک موٹر خریدنے لگا ہوں۔ تو میاں صاحبزادے خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لئے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے"

یہ نکتہ مجھے بھی نہیں سوجھا تھا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے کہا "میں اپنی کئی قیمتی اشیا بیچ سکتا ہوں"

مرزا بولے "کون کون سی مثلاً ؟"

میں نے کہا "ایک تو میں اپنا سگریٹ کیس بیچ ڈالوں گا"

مرزا کہنے لگے "چلو دس آنے تو یہ ہو گئے۔ باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے تو سب کام ٹھیک ہو جائے گا"

اس کے بعد ضروری یہی معلوم ہوا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے روک دیا جائے چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش ہو رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں۔ بہت سوچا۔ آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں۔ اس سے یک گونہ اطمینان ہوا۔

مرزا بولے "میں تمہیں ایک ترکیب بتاؤں۔ ایک بائیسکل لے لو"

میں نے کہا "وہ روپیہ کا مسئلہ تو پھر جوں کا توں رہا"

کہنے لگے "مفت"

میں نے حیران ہو کر پوچھا "مفت وہ کیسے ؟"

کہنے لگے "مفت ہی سمجھو۔ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے۔ البتہ تم احسان قبول کرنا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے"

ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچے کی مسرت جوانی کی خوش دلی ابلتے فواروں کی موسیقی، اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہی ہنسی ہنسا اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ یک لخت کوئی خوشخبری سننے سے دل کی حرکت بند ہو جانے کا جو خطرہ ہوتا ہے اس سے محفوظ ہوں تو میں نے پوچھا "یہ کس کی ہے"

مرزا بولے "میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے، تم لے لو"

میں نے کہا "پھر کہنا"

کہنے لگے "پھر کہتا ہوں ایک بائیسکل میرے پاس ہے جو بیکار پڑی ہے تمہاری ہے تم لے لو"

یقین مانئے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ چودھویں صدی میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا کہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ میں اٹھ کر سرک کر مرزا کے پاس ہو گیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔

میں نے کہا "مرزا سب سے پہلے میں اس گستاخی اور درشتی اور بے ادبی کے لئے معافی مانگتا ہوں جو ابھی ابھی میں نے تمہارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی۔ دوسرے آج میں تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے معاف کر دو گے۔ میں ہمیشہ تم کو نہایت کمینہ، ممسک، خود غرض اور عیار انسان سمجھتا رہا ہوں۔ دیکھو ناراض مت ہو۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ میں کتنا قابل نفرت، تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں، مجھے معاف کر دو"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے اسکی گود میں سر رکھ دیتا لیکن مرزا صاحب کہنے لگے۔

"واہ اس میں میری فیاضی کیا ہوئی۔ میرے پاس ایک بائیسکل ہے جیسے میں سوار ہوا ویسے تم سوار ہوئے"

میں نے کہا "مرزا مفت میں نہ لوں گا، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا"

مرزا کہنے لگے "بس اسی بات سے میں ڈرتا تھا تم حساس اتنے ہو کہ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے حالانکہ خدا گواہ ہے احسان اس میں کوئی نہیں"

میں نے کہا "خیر کچھ بھی سہی، تم سچ مچ مجھے اس کی قیمت بتا دو"

مرزا بولے "قیمت کا ذکر کر کے تم گویا مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی وہ تو بہت زیادہ تھی اور اب تو وہ اتنے کی رہی بھی نہیں"

میں نے پوچھا "تم نے کتنے میں خریدی تھی ؟"

کہنے لگے "میں نے پونے دو سو روپے میں لی تھی لیکن اس زمانے میں بائیسکلوں کا رواج ذرا کم تھا۔ اس لئے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں"

میں نے کہا "کیا بہت پرانی ہے"

بولے "ایسی پرانی بھی کیا ہوتی۔ میرا لڑکا اس پر کالج آیا جایا کرتا تھا اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے۔ آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہیں جنہیں کالج کے سرپھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ پرانی بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے"

"مگر مرزا پونے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا۔ اتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے، میں تو اس سے آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا"

مرزا کہنے لگے "تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی مانگتا ہوں۔ اول تو قیمت لینا نہیں لیکن ...."

میں نے کہا "نہ مرزا قیمت تو تمہیں لینی پڑے گی۔ اچھا تم یوں کرو۔ میں تمہاری جیب

میں کچھ روپے ڈال دیتا ہوں۔ تم گھر جاکے گن لینا اگر تمہیں منظور ہوئے تو کل بائیسکل بھیج دینا ورنہ روپے واپس دے دینا۔ اب یہاں بیٹھ کر میں تم سے سودا چکاؤں، یہ کچھ دکانداروں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔"

مرزا بولے "بھئی جیسے تمہاری مرضی۔ میں تو یہی کہتا ہوں کہ قیمت ویمت جانے دو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نہ مانو گے۔"

میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا۔ میں نے سوچا استعمال شدہ چیز کی لوگ عام طور پر آدھی قیمت دیتے ہیں لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ مرزا میں تو آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا، تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا، وہ بے چارا تو بلکہ یہی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو لیکن مفت میں کیسے لوں، آخر بائیسکل ہے۔ ایک سواری ہے، فٹنوں اور گھوڑوں اور موٹروں اور تانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ بکس کو کھولا تو معلوم ہوا کہ ہست و بود کل چھیالیس روپے ہیں چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں، پینتالیس یا پچاس ہوں جب ہی بات ہے۔ پچاس تو ہو ہی نہیں سکتے اور اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس ہی کیوں نہ دیئے جائیں۔ جن رقموں کے آخر میں صفر آتا ہے وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول ہوتی ہیں۔ بس ٹھیک ہے۔ چالیس روپے دے دوں گا۔ خدا کرے مرزا قبول کرلے۔

باہر آیا۔ چالیس روپے مٹھی میں بند کر کے میں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیئے اور کہا "مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا لیکن اگر ایک مفلس دوست کی حقیر سی رقم منظور کرنا تمہیں اپنی توہین معلوم نہ ہو تو کل بائیسکل بھجوا دینا۔"

مرزا چلنے لگے تو میں نے پھر کہا کہ "مرزا کل ضرور صبح ہی صبح بھجوا دینا۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے پھر ایک دفعہ کہا "دو کل صبح آٹھ نو بجے تک پہنچ جائے۔ دیر نہ کرنا.... خدا حافظ.... اور دیکھو مرزا میرے تھوڑے سے روپیوں کو زیادہ نہ سمجھنا.... خدا حافظ.... اور تمہارا بہت بہت شکریہ، میں تمہارا بہت ممنون ہوں، اور میری گستاخی کو معاف کر دینا، دیکھنا کبھی کبھی یونہی بے تکلفی میں.... کل صبح آٹھ نو بجے تک.... ضرور.... خدا حافظ۔"

مرزا کہنے لگے "ذرا اس کو جھاڑ پونچھ لینا اور تیل وغیرہ ڈلوا لینا میرے نوکر کو فرصت ہوئی تو میں خود ہی ڈلوا دوں گا ورنہ تم خود ڈلوا لینا۔"

میں نے کہا "ہاں ہاں وہ سب کچھ ہو جائے گا تم کل ضرور بھیج دینا، اور دیکھنا آٹھ بجے تک یا ساڑھے آٹھ بجے تک پہونچ جائے۔ اچھا.... خدا حافظ۔"

رات کو بستر پر لیٹا تو بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا، یہ ارادہ تو پختہ کر لیا کہ دو تین دن کے اندر اندر دلی کی تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈروں کو نئے سرے سے دیکھ ڈالوں گا۔ اس کے بعد اگلی گرمی کے موسم میں ہو سکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کروں گا۔ صبح صبح ہوا خوری کے لئے ہر روز نہر تک جایا کروں گا۔ شام کو ٹھنڈی سڑک پر جہاں اور لوگ سیر کو نکلیں گے، میں بھی سڑک کی صاف شفاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ ہاتھ دانت کی ایک گیند کی مانند گزر جاؤں گا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی بائیسکل کے چمکیلے حصوں پر پڑے گی تو بائیسکل جگمگا اٹھے گی اور ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ ساتھ اڑ رہا ہے، وہ مسکراہٹ جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں ابھی میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی، بار بار دل چاہتا ابھی بھاگ کر جاؤں اور اسی وقت مرزا کو جگا لاؤں

رات کو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدایا مرزا بائیسکل دینے پر رضامند ہو جائے۔

صبح اٹھا تو اٹھنے کے ساتھ ہی نوکر نے یہ خوش خبری بھی سنائی کہ "حضور وہ بائیسکل آگئی ہے۔"

میں نے کہا "اتنی سویرے۔"

نوکر نے کہا "وہ تو رات ہی کو آگئی تھی۔ آپ سو گئے تھے، میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور ساتھ ہی مرزا صاحب کا آدمی ٹھیریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔"

میں حیران تو ہوا کہ مرزا صاحب نے سائیکل بھجوا دینے میں اس قدر عجلت سے کیوں کام لیا لیکن اس نتیجے پر پہونچا کہ آدمی نہایت شریف اور دیانت دار ہیں، روپے لے لئے تھے تو بائیسکل کیوں روک رکھتے۔

نوکر سے کہا "دیکھو یہ اوزار یہیں چھوڑ جاؤ اور دیکھو بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھاڑو، اور یہ موڑ پر جو بائیسکل والا بیٹھتا ہے، اس سے جاکر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ، اور دیکھو، ابے بھاگا کہاں جا رہا ہے، ہم ضروری بات تم سے کہہ رہے ہیں۔ بائیسکل والے سے تیل کی ایک کپی بھی لے آنا اور جہاں جہاں تیل دینے کی جگہ ہے وہاں تیل دے دینا اور بائیسکل والے سے کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دے دے جس سے تمام پرزے ہی خراب ہو جائیں۔ بائیسکل کے پرزے بڑے نازک ہوتے ہیں اور بائیسکل باہر نکال کر رکھو، ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ہم ذرا سیر کو جا رہے ہیں۔

"اور دیکھو صاف کر دینا اور بہت زور زور سے کپڑا بھی مت رگڑنا، بائیسکل کا پالش گھس جاتا ہے۔"

جلدی جلدی چائے پی غسل خانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ "چل چل چنبیلی باغ میں" گاتا رہا۔ اس کے بعد کپڑے بدلے اوزار کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔

برآمدے میں آیا تو برآمدے کے ساتھ ہی ایک عجیب و غریب مشین پر نظر پڑی۔ ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے۔؟"

نوکر بولا "حضور یہ بائیسکل ہے۔"

میں نے کہا "بائیسکل، کس کی بائیسکل۔؟"

کہنے لگا "مرزا صاحب نے بھجوائی ہے آپ کے لئے۔"

میں نے کہا "اور جو بائیسکل رات کو انھوں نے بھیجی تھی وہ کہاں گئی۔؟"

کہنے لگا "یہی تو ہے۔"

میں نے کہا "کیا بکتا ہے۔ جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی، وہ بائیسکل یہی ہے۔؟"

کہنے لگا "جی ہاں۔"

میں نے کہا "اچھا" اور پھر اُسے دیکھنے لگا۔

"اس کو صاف کیوں نہیں کیا۔؟"

"حضور دو تین دفعہ صاف کیا ہے۔"

"تو یہ میلی کیوں ہے۔؟"

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب نہ سمجھا۔

"امتحان لیا۔؟"

"بائیسکل ٹھیک کروانے لایا ہوں"

"کیا۔؟"

"حضور وہ جو تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں، وہ نہیں ملتے"

"کیا وجہ۔؟"

"حضور دھروں پہ میل اور زنگ جما ہے۔ وہ سوراخ کہیں بیچ میں ہی دب دبا گئے ہیں"

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا، جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا، اتنا ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے لیکن مجمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ کلی اوپساہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی اور جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا لیکن اب اس سوراخ میں سے آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا "حضور وہ تیل تو سب ادھر اُدھر بہہ جاتا ہے، بیچ میں تو جاتا ہی نہیں"

میں نے کہا "اچھا اُوپر اُوپر ہی ڈال دو۔ یہ بھی مفید ہوتا ہے"

آخرکار بائیسکل پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مُردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اترائی تھی۔ اس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی لیکن اس رفتار سے جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے، اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونی شروع ہوئیں۔ ان آوازوں مختلف گروہ تھے "چیں چاں چوں" قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں "گھٹ گھٹ۔ کھڑکھڑ۔ کھڑڑ" کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں "چر۔ چرخ چرچرخ" قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔ زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھی۔ میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا، زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑ چڑ بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے کو بھی حرکت کرتا تھا چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑ جاتا تھا، اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ مڈگارڈ تو تھے سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے۔ ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت طمانیت دھوپ سے بچے رہیں گے۔ اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو زور سے اُوپر سے اٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کے یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو پچھلا اور اگلے پہیے کو ملا کر "چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ"..... کی صدا نکل رہی تھی جب اتار پر بائیسکل ذرا تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوتے۔ اِدھر اُدھر کے لوگ چونکے ماؤں نے اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیا "کھڑڑ کھڑڑ" کے بیچ میں پہیوں کی آواز جدا سنائی دے رہی تھی لیکن چونکہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لئے "چوں چوں پھٹ" کی آواز نے اب "چچوں چچوں پھٹ" کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تمام بائیسکل کسی افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔

اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گزری چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے رہا تھا لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتاً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لئے میں ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا تو میرے گھٹنے میری ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے کمر دوہری ہو کر باہر کو نکلی ہوتی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیے کی اٹکھیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدی کا نیچا ہونا از حد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس لئے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کر لوں۔ چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرا لیا اور نیچے اترا۔ بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں ایک خاموشی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل کے اسٹیشن سے نکل کر باہر آ گیا ہوں۔ جیب سے میں نے اوزار نکالا۔ گدی کو اونچا کیا۔ کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہو گیا۔

دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا۔ تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا، جو ہینڈل پر رکھے تھے اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو اور مشابہت کا احساس تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں دائیں بائیں جانب لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی مڑ مڑ کر دیکھنے لگتا تھا لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لئے میری مصیبت ضیافت طبع کا باعث نہ ہو۔

ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا تھوڑی دیر کے بعد گدی بھی پھر نیچی ہو گئی اور میں تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے کہا "دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے" گویا اس بدتمیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔ میں نے اتر کر پھر ہینڈل اور گدی کو اونچا کیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہو جاتا وہ لمحے جن کے دوران میں میرے ہاتھ اور میرا جسم برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں، بہت ہی کم تھے اور ان میں بھی میں یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب کے گدی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل۔ چنانچہ نڈر ہو کر نہ بیٹھتا بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہو جاتا۔

جب دو میل گزر گئے اور بائیسکل کی اٹھک بیٹھک نے ایک مقرر باقاعدگی اختیار کر لی تو فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہئیں چنانچہ بائیسکل کو ایک دکان پر لے گیا۔

بائیسکل کی "کھڑکھڑ" سے جتنے لوگ کام کر رہے تھے سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا "ذرا اس کی مرمت کر دیجئے"

ایک مستری آگے بڑھا۔ لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ٹھوک بجا کر دیکھا معلوم ہوتا تھا اس نے بڑی تیزی کے ساتھ سب حالات کا اندازہ لگا لیا ہے۔ لیکن پھر مجھ سے پوچھنے لگا "کس کس پرزے کی مرمت کرائیے

میں نے کہا "بڑے گستاخ ہو تم۔ دیکھتے نہیں کہ صرف ہینڈل اور گدی کو ذرا اونچا کر کے کسانا ہے۔ بس اور کیا ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کر دو اور بتاؤ کتنے پیسے ہوتے "

مستری کہنے لگا "مڈگارڈ بھی ٹھیک نہ کر دوں "

میں نے کہا "ہاں، وہ بھی ٹھیک کر دو "

کہنے لگا "اگر باقی چیزیں بھی ٹھیک کرا لیں تو اچھا ہو "

میں نے کہا "اچھا کر دو "

بولا "یوں تھوڑی ہو سکتا ہے۔ دس پندرہ دن کا کام ہے۔ آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے "

"اور پیسے کتنے لو گے "

کہنے لگا "بس تیس چالیس روپے لگیں گے "

ہم نے کہا "بس جی جو کام تم سے کہا ہے کر دو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو "

تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گدی پھر اونچی کر کے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا تو مستری کہنے لگا "میں نے کس تو دیا ہے لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے "

میں نے کہا "ہیں! بدتمیز کہیں کا۔ دو آنے پیسے مفت میں لے لئے "

بولا "جناب آپ کو بائیسکل بھی تو مفت میں ملی ہو گی۔ یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا۔ للو یہ وہی بائیسکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے۔ پہچانی تم نے بھئی صدیاں ہی گزر گئیں لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی "

میں نے کہا "واہ مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے اور ان کو ابھی کالج چھوڑے دو سال بھی نہیں ہوئے "

مستری نے کہا "ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی سائیکل تھی "

میری طبیعت یہ سن کر کچھ مردہ سی ہو گئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لئے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے۔ اس لئے ٹانگوں اور کندھوں اور کمر اور بازوؤں میں جابجا درد ہو رہا تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا۔ لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا۔ ورنہ میں پاگل ہو جاتا اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا جس میں مرزا کی مکاری، بے ایمانی اور دغابازی پر ایک طویل تقریر کرتا۔ کل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیسکل کو اونے پونے داموں بیچ کر جو وصول ہو اسی پر صبر شکر کروں۔ بلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ سہی۔ چالیس کے چالیس روپے ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک دکان آئی وہاں ٹھہر گیا۔

دکان دار بڑھ کر میرے پاس آیا۔ لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کبھی کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں۔ آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ "یہ بائیسکل ہے "

دکاندار کہنے لگا "پھر۔؟"

میں نے کہا "لو گے۔؟"

کہنے لگا "کیا مطلب۔؟"

میں نے کہا "بیچتے ہیں ہم "

دکاندار نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے پھر بائیسکل کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کون سی ہے۔ آخر کار بولا "کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر "

ایسے سوالوں کا خدا جانے کیا جواب ہوتا ہے میں نے کہا "کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے ان کا مصرف کیا ہو گا۔؟"

کہنے لگا "وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کوئی اس کو لے کر کرے گا کیا۔؟"

میں نے کہا "اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا "

دکاندار بولا "اچھا! چڑھ گیا پھر؟"

میں نے کہا "پھر کیا، پھر چلائے اور کیا۔؟"

دکاندار بولا "اچھا۔ ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا۔ یہ بائیسکل بکنے آئی ہے "

جن حضرت کا اسم گرامی خدا بخش تھا انھوں نے بائیسکل کو دور ہی سے یوں دیکھا جیسے بو سونگھ رہے ہیں۔ اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا میرے پاس آئے اور کہنے لگے "تو آپ سچ مچ بیچ رہے ہیں۔؟"

میں نے کہا "تو اور کیا محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لئے میں گھر سے یہ بہانہ گھڑ کر لایا تھا۔؟"

کہنے لگا "تو کیا لیں گے آپ؟"

میں نے کہا "تمھیں بتاؤ "

کہنے لگا "سچ مچ بتاؤں۔؟"

میں نے کہا "ہاں "

پھر کہنے لگا "سچ سچ بتاؤں۔؟"

میں نے کہا "اب بتاؤ گے بھی یا یونہی ترساتے رہو گے "

کہنے لگا "تین روپے دوں گا اس کے "

میرا خون کھول اٹھا اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کانپنے لگے۔ میں نے کہا۔

"او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں۔ لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لئے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر میں بائیسکل پر سوار ہو گیا اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔

[illegible] ہوں مگر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زمین یک لخت [illegible]
سے آگئی ہے۔ آسمان میرے سر پر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے بیچ سے گزر گیا اور ادھر ادھر
کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بدل لی ہے۔ حواس بجا ہوئے تو معلوم
ہوا میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں گویا بڑی مدت سے مجھے اس بات کا شوق تھا جو
آج پورا ہوا۔ ارد گرد کچھ لوگ جمع تھے جن میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے وہ دکان تھی
جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گرد و پیش پر
غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلا پہیہ بالکل الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا
ہے اور باقی بائیسکل میرے پاس پڑی ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا، جو پہیہ الگ ہو گیا
تھا، اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ میں باقی ماندہ بائیسکل کو تھاما اور چل کھڑا ہوا
یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی۔ ورنہ حاشا وکلا وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی کہ میں اس
کو اس حالت میں ساتھ ساتھ لئے پھرتا۔

جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ یہ تم کیا کر رہے
ہو۔ کہاں جا رہے ہو۔ تمہارا ارادہ کیا ہے۔ یہ دو پہیے کا ہے کو لئے جا رہے ہو۔

سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ سب
لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور چلتے جاؤ۔ جو ہنس رہے ہیں۔ ان کو ہنسنے دو
اس قسم کے بے ہودہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ آخر ہوا کیا۔ محض ایک
حادثہ۔ بس دائیں بائیں مت دیکھو چلتے جاؤ۔

لوگوں کے ناشائستہ کلمات ابھی سنائی دے رہے تھے۔ ایک آواز آئی "بس حضرت
[illegible] ایک [illegible] پہیہ [illegible] دوسرے صاحب بولے "یہ بائیسکل [illegible]
[illegible] ایک سادہ لوح [illegible] جا رہے تھے میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔
" دیکھو بیٹا یہ سرکس کی بائیسکل ہے۔ اس کے دونوں پہیے الگ الگ ہوتے ہیں"

لیکن میں چلتا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار
میں ایک عزیمت پائی جاتی تھی۔ میرا دل جو کئی گھنٹوں سے ایک کشمکش میں پیچ و تاب
کھا رہا تھا، اب بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ میں چلتا گیا۔ چلتا گیا حتی کہ دریا پر جا پہنچا۔ پل کے اوپر
کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کر کے اس بے پروائی کے ساتھ دریا میں پھینک
دیا جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے۔ اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ مرزا بولے "اندر آجاؤ"
میں نے کہا "آپ ذرا باہر تشریف لایئے۔ میں آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر
وضو کئے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں"

باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار ان کی خدمت میں پیش کیا جو انہوں نے بائیسکل
کے ساتھ مفت ہی مجھ کو عنایت فرمایا تھا۔

اور کہا۔

"مرزا صاحب آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجئے میں اب اس سے
بے نیاز ہو چکا ہوں"

گھر پہنچ کر میں نے پھر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایف
اے میں پڑھی تھی۔ (شکریہ آجکل)

مقالہ نگار حضرات سے گذارش

"**اوقاف**" میگزین ایک اسلامی ملی میگزین ہے۔ جس کے لئے معیاری علمی مقالات درکار ہیں۔ مقالہ و مضامین نگار حضرات
سے درخواست ہے کہ وہ اپنی تخلیقات اوقاف کو بھیجیں اور حسب ذیل امور کا لحاظ رکھیں۔

۱.... مضامین یا نظم علمی، تاریخی، اصلاحی، ادبی ہونے چاہئیں۔ اختلافی مضامین سے احتراز کیا جائے۔

۲.... اوقاف کے انتظام اور اس کے استعمال سے متعلق مضامین، اطلاعات، پالیسی اور پروگرام خاص طور پر شریک اشاعت ہوں گے۔

۳.... مضامین صاف اور کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوئے ہوں۔

۴.... جو مضامین اوقاف کے معیار کے مطابق نہیں ہوں گے، شریک اشاعت نہیں کئے جائیں گے۔

۵.... مختلف وقف بورڈوں، سنٹرل وقف کونسل اور اسلامی تقریبات سے متعلق تصاویر بھی شائع کی جائیں گی۔ ان تصاویر کے ساتھ
مختصر رپورٹ آنی ضروری ہے۔

(ادارہ)

از افکار عالیہ حضرت علامہ خاکیؒ امروہوی

نعت پاک

برقِ جلالِ مہ لقا، شرقِ جمال ہیں بھی آ — دوزخِ ہجر کو بجھا، خُلدِ وصال میں بھی آ

قہرِ جلالِ دلربا، مہرِ جمال میں بھی آ — جزم فراق تا کجا، عزم وصال میں بھی آ

شاہد حال عاشقاں، موجدِ کیفِ صادقاں — بزمِ سرور کر بپا، رنج و ملال میں بھی آ

ساقیٔ نہرِ سلسبیل، نفس نے کر دیا ذلیل — جامِ طہور کر عطا دستِ سوال میں بھی آ

عرش ہے تخت گاہِ نور، فرش ہے منصۂ ظہور — قرۃِ چشم پر حیا بدر کمال میں بھی آ

تشنۂ آفتابِ حشر، کہتے روزِ بعثتِ نشر — کوثرِ جامِ مصطفےٰ آبِ زلال میں بھی آ

امتِ مسلمہ کے دل، رہ گئے صرف آب و گل — کیف میں ان کو پھر بھی لا، بانگِ بلال میں بھی آ

عقل و قیاس سے بعید، ذات و صفات میں وحید — کچھ تو نشان دے بتا، وہم و خیال میں بھی آ

قبلہ قلبِ سالکاں، کعبۂ جانانِ عارفاں — جلوۂ حال مصطفےٰ، محفل قال میں بھی آ

اخترِ برجِ ہاجرہ، گوہر درجِ آمنہ — اپنی چمک دمک دکھا سوقِ جدال میں بھی آ

تیغ و سناں سے ڈر نہ جائے رعب عدو سے بھر نہ جائے
خاکی کو دے مٹے بلے دورِ قتال میں بھی آ

سید مرغوب امین کاظمی امروہوی

”بت کدۂ نو“

منقلب نظم جہاں بدلی ہے بزمِ کائنات
اک نئے انداز سے ابھرے جہاں کے سومنات
آذر تہذیب مغرب نے تراشے چھانٹ کر
نسل، قومیت، زباں، تہذیب کے لات و منات
جال پھیلا کر سیاسی شاطروں نے آخرش
اِن بتوں کی چاہ سے بھر دی فضائے شش جہات
اہل عالم کو دکھا کر حریت کا سبز باغ!
دے کے امداد و ترقی کے فریب و مسکرات
نوعِ انسانی کو آخر پارہ پارہ کر دیا
چھین کر سرمایۂ الفت جو ہے اصلِ حیات
اقتدار اپنا اٹھا کر بھی وہی ہیں مقتدر
اہل مشرق لے رہے ہیں آج بھی ان سے زکات
عالمِ اسلام میں باقی نہ تھا دینی شعور
کھا گئے توحید کے فرزند اس بازی میں مات
چھوڑ کر اسلام کے زرّیں اصولِ زندگی!
جن میں پنہاں ہے بلا شک سارے عالم کی نجات
مردِ مومن ان بتوں کی چاہ میں لٹوا گیا
نقدِ الفت، غیرت، خود داری و عزم و ثبات

جناب لفٹنٹ کرنل رابرٹ میک کیرسن سی، آئی۔ ای۔ ایم۔ ڈی کونور، مدراس،

غذا کا مقصد

پیدائش کے وقت سے لے کر پچیس برس کی عمر تک ہمارے جسم میں مسلسل نشو و نما ہوتا ہے جس کے بعد جسم کی تعمیر مکمل ہو جاتی ہے۔ نشو و نما کے اس زمانہ میں اور اس کے بعد بھی تمام زندگی کے دوران میں جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ مسلسل کام یا حرکت کرتا رہتا ہے۔ قلب کی حرکت خون کو جسم کے ہر حصہ تک پہونچاتی ہے۔ پھیپھڑے ہوا کو اندر کھینچتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی آکسیجن بھی داخل ہوتی رہتی ہے جس کے بغیر کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا، اور یہ ضرر گیسوں کو جو جسم کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں، ناک کے ذریعہ سے خارج کرتے ہیں۔ معدہ اور آنتیں غذا کو ہضم کر کے دوران خون میں وہ اشیا پہنچاتے رہتے ہیں جو جسم کے نشو و نما، اس کی مرمت اور اس کے افعال کی انجام دہی کے لئے نہایت ضروری ہوتی ہیں، آنتیں، گردے اور جلد جسم کے بیکار مادوں کو خارج کرتے رہتے ہیں۔ دماغ جسمانی افعال کی رہنمائی کرتا ہے اور عضلات ہاتھ پاؤں کو حرکت دیتے ہیں۔

ہمارا جسم لاکھوں خلیوں سے مرکب ہے اور سرگرمی سے کام کرتے رہنے کی وجہ سے ان خلیوں میں مسلسل شکست و ریخت واقع ہوتی رہتی ہے اس لئے بیکار خلیوں کی جگہ جدید کار آمد خلیوں کی اور ناقص خلیوں کی مرمت کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہذا غذا کا اولین مقصد جسم میں ان اجزا کا مہیا کرنا ہے جو اس کے نشو و نما اور مرمت کے لئے نہایت ضروری ہیں۔

جسمانی افعال کی تکمیل کے لئے جن کی بہت سی قسموں سے ہم واقف بھی نہیں ہیں، توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ غذا کا دوسرا مقصد ان اجزا کا فراہم کرنا ہے جن سے جسم میں توانائی پیدا ہو سکے۔ توانائی کی پیدائش کے دوران میں حرارت بھی پیدا ہوتی ہے جس سے جسم گرم رہتا ہے۔

غذا کے دوسرے اغراض بھی ہیں لیکن وہ سب ان ہی دو اغراض کے ذیل میں آجاتے ہیں یعنی جسم کے نشو و نما اور مرمت اور توانائی و حرارت کی پیدائش، اور یہ دونوں ایک اہم بالشان مقصد انجام دیتے ہیں یعنی ان سے ہماری قوتِ حیات تکمیل کے انتہائی درجہ پر قائم رہتی ہے۔ لہذا ہم صرف زندہ رہنے ہی کے لئے نہیں کھاتے بلکہ اس لئے بھی کھاتے ہیں کہ تمام وظائف حیات عمدگی کے ساتھ انجام دیئے جا سکیں۔

جسم کا نشو و نما یا اس کی تعمیر

بعض لحاظ سے جسم کا نشو و نما ایک مکان کی تعمیر سے مشابہت رکھتا ہے۔ جب ہم کوئی مکان بنانا چاہتے ہیں تو ان مختلف تعمیری اشیاء کو منتخب کر لیتے ہیں جن کی ہم کو ضرورت ہوتی ہے بنیاد کے لئے پتھر، دیواروں کے لئے اینٹ، دروازوں اور کھڑکیوں کے لئے لکڑی وغیرہ۔ چونکہ پتھر، اینٹ اور لکڑی میں جان نہیں اس لئے یہ چیزیں خود مکان کی شکل اختیار نہیں کر سکتیں لہذا تعمیری اجزا کو تیار کرنے اور ان کو موزوں جگہ استعمال کرنے کے لئے کاریگروں اور معماروں کی ضرورت پڑتی ہے کیسی اچھی یا بری تعمیر کا انحصار تعمیری اشیاء کی برائی یا اچھائی پر ہوتا ہے۔ بالکل یہی حال جسمانی عمارت کے نشو و نما کا ہے۔ اگر تعمیر خراب ہوگی تو اس کو ہمیشہ مرمت کی ضرورت پیش آتی رہے گی۔

جو غذا ہم کھاتے ہیں آنتیں ان میں سے ان تعمیری اجزا کو منتخب کر لیتی ہیں جو جسمانی عمارت کی ساخت کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ یہ اجزا خون کی نالیوں میں پہونچ جاتے ہیں جو ایسے اجزا کو ان اعضا تک پہونچا دیتی ہیں جن کی ان کو ضرورت ہے لیکن جسم کو بنانے والی اشیا یعنی پروٹینز اور معدنی نمک تقریباً ویسی ہی بے جان ہیں جیسی کہ مکان کی تعمیری اشیاء ان سے خود بخود جسم کے مختلف حصوں کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اس کام کے لئے معماروں کی ضرورت ہوگی جسم کا سب سے بڑا معمار ہماری قوت حیات ہے، جس کے کئی مددگار ہیں۔ ان مددگاروں میں سے بعض مددگار "حیاتین" کہلاتے ہیں۔ کیونکہ وہ زندگی کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ یہ جسم کے بنانے اور اس کی مرمت میں تقریباً وہی کام انجام دیتے ہیں جو کسی مکان کے بنانے میں سنگ تراش معمار اور بڑھئی انجام دیتے ہیں۔ ان کاریگروں کے ناموں کی طرح حیاتین کے بھی خاص خاص نام ہیں اور حیاتین ا۔ ب۔ ج۔ د۔ اور ہ کہلاتے ہیں یہ اپنی نوع کا کام کرتے ہیں مگر ان میں سے ہر ایک پورے جسم کی تعمیر میں ایک دوسرے کی مدد کرتا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کہ سنگ تراش پتھر جماتا ہے۔ معمار اینٹ رکھتا ہے اور بڑھئی کھڑکیاں اور دروازے تیار کرتا ہے اور یہ سب کے سب ایک ہی عمارت کی تکمیل کرتے ہیں۔ چنانچہ حیاتین ا خاص طور پر آنکھ، پھیپھڑے، معدہ اور آنتوں پر، حیاتین ب دماغ، اعصاب، گوشت یا عضلات اور عضلات قلب، معدہ اور آنتوں پر، حیاتین ج خون پر اور حیاتین د دانتوں اور ہڈیوں پر عمل کرتے ہیں۔ یہ تمام حیاتین اور یہ تمام تعمیری اجزا صرف صحیح قسم ہی کی غذا میں پائے جاتے ہیں لیکن اگر غذا غلط قسم کی ہوگی تو اس میں نہ تو ایسے تعمیری اجزا ہوں گے اور نہ حیاتین جو جسم کے نشو و نما اور مناسب تعمیر کے لئے کافی ہو سکیں چنانچہ پورے جسم یا اس کے بعض حصوں کا نشو و نما ناقص رہے گا اور یہ اپنے مقررہ افعال انجام نہیں دے سکیں گے۔ اور یہ اسی طرح ہے جس طرح کہ ناقص تعمیری اشیا یا غیر ماہر معماروں کی وجہ سے مکان کی چھت میں درزیں آجاتی ہیں اور یہ ٹپکنے لگتی ہے۔ اسی طرح ہڈیاں جن کا

کام جسم کو سہارا دینا ہے۔ ٹیڑھی ہو جائیں گی یا ٹوٹ جائیں گی اور بعض جن سے غذا چبائی جاتی ہے اور اکل طرح ہیں خراب اور بوسیدہ ہو جائیں گے عضلات ڈھیلے پڑ جائیں گے اور ان میں چلنا، حرکت، محنت، مشقت یا کھیل کود کے قابل نہیں رہیں گے اور پھیپھڑے جن کا کام جسم کو آکسیجن پہنچانا ہے کمزوری کی وجہ سے پورا کام انجام نہ دے سکیں گے یا معدہ اور آنتیں جن کا کام غذا کا ہضم کرنا اور تحلیل کرنا اور فضلے کو جسم کے باہر نکالنا ہے بہت کمزور ہو جائیں گے اور اپنا کام پورا نہ کر سکیں گے۔ بہت سی بیماریوں کے پیدا ہونے کا یہی سبب ہوتا ہے۔

بعض لحاظ سے انسانی جسم بھاپ کے انجن سے مشابہت رکھتا ہے، اگرچہ وہ انجن سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور مکمل ہے انجن باعتبار ساخت کے مکمل ہو تو بھی بھاپ کے بغیر نہ تو کوئی حرکت کر سکتا ہے اور نہ کوئی وزن کھینچ سکتا ہے۔ انجن کے متحرک کرنے کے لیے جتنی بھاپ کی ضرورت ہوتی ہے وہ پانی کو آگ کے ذریعہ سے گرم کرنے سے پیدا کی جاتی ہے اور آگ لکڑی یا کوئلے جیسی اشیا کے ایندھن سے تیار ہوتی ہے۔ بھاپ سے تیار ہوتے ہی انجن کے اسطوانوں (سلنڈروں) میں پہنچ جاتی ہے یہاں یہ فشاروں کو دباتی ہے جس سے انجن کے پہیے متحرک ہو جاتے ہیں اور پورا انجن کام کرنے لگتا ہے۔ ایندھن سے حرارت اور حرارت سے بھاپ تیار ہوتی ہے اور بھاپ انجن کو متحرک کرنے کے لئے توانائی مہیا کرتی ہے، انجن جس تیزی سے حرکت کرے گا بھاپ بھی اسی تیزی سے خارج ہوتی رہے گی اور انجن کو جتنا بھاری بوجھ کھینچنا پڑے گا بھاپ کی مقدار بھی اتنی ہی زیادہ ضروری ہوگی اور اس لئے ایندھن کی ضرورت بھی زیادہ ہوگی تقریباً یہی حال انسانی جسم کا بھی ہے۔ ساخت کے اعتبار سے انسانی جسم مکمل ہونے کے باوجود بھاپ یا دوسرے لفظوں میں توانائی کے بغیر اپنا کام انجام نہیں دے سکتا۔

انسانی جسم کے لئے توانائی مہیا ہونے کا طریقہ بھی تقریباً ویسا ہی ہے جیسا کہ بھاپ کے انجن کے لئے ہم میں سے ہر ایک جسم میں ایک قسم کی آگ یا حرارت موجود رہتی ہے جس کو ہم "گرمیٔ حیات" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ہم اس کو دیکھ تو نہیں سکتے لیکن اس کا وجود اپنے جسم کے اندر محسوس کرتے ہیں کیوں کہ اس سے ہمارا جسم گرم رہتا ہے۔ بھاپ کے انجن کی آگ کی طرح اس کو بھی ایندھن کی ضرورت ہے۔ یہ ایندھن ہماری غذا کے اجزا سے مہیا ہوتا ہے اور یہ چربی، کاربوہائیڈریٹس ہیں جن کو اسی لئے "ایندھنی غذا" بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے اندر توانائی کی بہت بڑی مقدار موجود رہتی ہے۔ ان اجزا سے اور پروٹینوں سے جو انسانی جسم کی تعمیر و مرمت کے پورے ہونے کے بعد بچ رہتی ہیں ہماری اندرونی "گرمیٔ حیات" توانائی پیدا کرتی ہے اور جسمانی انجن کو اپنا کام انجام دینے کے قابل بناتی ہے جسم جتنا زیادہ کام کرے گا اتنا ہی زیادہ ایندھن درکار ہوگا۔ ہمارے جسم میں جو پانی ہوتا ہے وہ بھی اس توانائی کے پیدا ہونے میں مدد دیتا ہے۔

جسمانی قوت کے حصول کا دوسرا ماخذ سورج کی روشنی ہے۔ جس سے وہ توانائی بھی فراہم ہوتی ہے جو ہماری غذا کے کاربوہائیڈریٹس میں جمع ہوتی ہے۔

بھاپ کے انجن میں آگ اس وقت تک ٹھیک طور سے نہیں جلے گی جب تک کہ اس کو کافی ہوا میسر ہو۔ یہ سب جانتے ہیں کہ آگ کو دہکانے کے لئے دھونکنی سے کس طرح کام لیا جاتا ہے۔ یہ ہوا کی آکسیجن ہی ہے جو آگ کو روشن کرتی اور بھڑکاتی ہے۔ بالکل یہی حال زندگی کی آگ کا ہے اس کو بھی ہوا کی آکسیجن کی ضرورت ہے۔ ہمارے پھیپھڑے جو آکسیجن مہیا کرتے ہیں۔ بھاپ کے انجن کی آگ سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح جسم کے اندر کی آگ ہمیں حرارت مہیا کرتی ہے۔ ہم کو زیادہ مقدار میں پانی پینے کی اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ اس آگ سے ہماری حرارت زیادہ نہ ہو جائے یا ہمارا خون گاڑھا نہ ہو جائے یا ہمارا گوشت اور ہماری جلد بہت خشک نہ ہو جائے۔

جو چیزیں ہمارے جسم کی مناسب پرورش، نشوونما، مرمت، صحت اور اس کے انجام دہی کے لئے ضروری ہیں وہ چار قسم کی ہیں۔ ہوا۔ سورج کی روشنی۔ پانی اور غذا کے ساتھ ورزش اور نیند بھی ضروری ہیں جن کا ذکر اس مضمون کے احاطہ سے باہر ہے۔

غذا کے ضروری اجزا یا حصے پانچ قسم کے ہیں یعنی پروٹینز، معدنی نمک، چربی، کاربوہائیڈریٹس اور حیاتین۔ ان اجزا میں سے ہر ایک اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ کوئی دوسرا۔ ہر ایک اپنا صحیح کام انجام دینے کے لئے دوسرے کا محتاج ہے۔ ہماری غذا ان کی صحیح مقدار اور صحیح قسم پر مشتمل ہونی چاہئے۔ جو اشیائے خوردنی قدرت ہمارے استعمال کے لئے مہیا کرتی ہے ان میں سے ہر ایک میں ان ضروری اجزا کی کچھ نہ کچھ مقدار لازماً ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ مختلف خوردنی اشیا کو کون سے ایسے طریقے سے ملایا جائے کہ ہماری روزمرہ کی غذا میں ان پانچ ضروری اشیا کی صحیح قسمیں صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہوں۔

تین طرح کے آدمی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ قیامت کے روز میں تین طرح کے آدمیوں سے خود لڑوں گا۔

(۱) جس نے میرے نام سے اور میری قسم سے عہد و پیمان کر کے عہد شکنی کی۔

(۲) جس نے آزاد شخص کو بیچ کر اس کی قیمت چٹ کر لی۔

(۳) جس نے کسی کام پر مزدور کو لگایا پھر اس نے کام تو پورا لے لیا مگر اس کی مزدوری نہیں دی۔

(بخاری)

مولانا سید ابن الحسن صاحب فکر ایم اے

مسئلہ غذائیات

جب سے بڑھے غذاؤں میں، روز نئے تکلفات
صحتِ جسم چل بسی، گھٹ گئی مدتِ حیات

سلسلۂ غذا میں بھی اس نے بنائی تھیں حدیں
ہاتھ میں جس خدا کے ہے سب کی حیات اور ممات

عہدِ جدید کی ہوا، اہلِ جہاں کو لے اڑی
بڑھ گئے لوگ توڑ کر دائرۂ تعینات

دشمنِ اعتدال ہے، یہ نئی روشنی کا دور
رات کو دن بنا دیا دن کو بنا دیا ہے رات

کھانا کچھ اور تھا ہمیں، کھانے لگے کچھ اور ہم
کیسے نظامِ جسم کی پوری ہوں پھر توقعات

ہر سبب و نتیجہ کا رشتہ اٹل ہے دہر میں
کوششِ لذتِ غذا، بن گئی غم کی واردات

ایک نے جب پکایا گوشت مرچیں بہت سی جھونک دیں
دوسرا بے حد و حساب کھا گیا قند اور نبات

چند دنوں میں ہو گیا، ایک کا ہاضمہ خراب
ایک کا کثرتِ شکر سے ہوا خون بد صفات

معدہ کا حال کیا ہوا اُس کا نہیں خیال کچھ
ذائقۂ زباں پہ ہے سب کی نگاہِ التفات

ایسے بھی ہیں جو مر گئے کھا کے نفیس و تر غذا
ایسے بھی ہیں جو سو برس کھاتے رہے ہیں "دال بھات"

ایک تو قلتِ غذا سے رہا خوب تندرست
ایک کو کثرتِ غذا بن گئی باعثِ وفات

پیٹ کو اتنا بھر لیا، روح کثیف ہو گئی
بڑھتا گیا غذا کا بار، مٹ گئی دل کی کائنات

ایک زمانہ وہ بھی تھا روح تھی اصلِ زندگی
اب تو "وٹامنوں" میں ہے جسم کا جوہرِ حیات

کوئی تو ضبطِ نفس سے اپنی بڑھا رہا تھا عمر
کوئی شعاعِ مہر سے لیتا تھا قوتِ حیات

کھانا ہے زیست کے لئے، زیست نہیں ہے غذا
حضرتِ شیخ نے کہی خوب یہ فلسفہ کی بات

عکسِ جمالِ سرمدی، قالب آدمی میں روح
نورِ خدائے لم یزل، جسم میں جلوۂ حیات

دہر میں جس کو بھر کے پیٹ ملتی نہ تھی غذا کبھی
توڑے اسی نے کعبہ میں عزّہ لات اور منات

کس نے کھجوریں کھائیں اور دعوتِ حق جہاں کو دی
کس کی تھیں خشک روٹیاں مخزن صد تجلّیات

غارِ حرا میں جبرئیل کس پہ یہ لائے تھے وحی
کون ہوا تھا فاقوں میں فاتحِ قلبِ شش جہات

غزوۂ بدر و اُحد میں کون تھا ماہرِ غذا
پیٹ پہ رکھ کے بارِ سنگ کس نے عرب کو دی نجات

آب و غذا سے بے نیاز کس نے کی کربلا میں جنگ
پانی کی ایک بوند بھی دے نہ سکا جسے فرات

رشتۂ روح و تن کو دیکھ جیسے کلام حق میں ہے
آیۂ محکمات سے، واسطۂ تشبّہات

تحت میں ہے خیال کے ہر عمل و نظامِ جسم
اسکے ہیں شاہد قوی اب بھی بہت سے واقعات

راؤں میں ہے جو اختلاف آج اسی سبب سے ہے
معرضِ غور و بحث ہیں مسئلہ غذائیات

غم ہے اگر غذائے دل، دہر میں قحطِ غم نہیں
کھائیے غم جناب فکر اور بڑھائیے حیات

اطلاعات

امداد گھر وجے واڑہ

مسلم وقف کمیٹی وجے واڑہ، لائق مبارک باد ہے کہ جس نے مسجد سراتے سے متعلق اوقافی جائداد پر سات منزلہ عمارت امداد گھر کی تعمیر کے ذریعہ اوقافی جائدادوں کے صحیح استعمال اور منشائے وقف کی تکمیل کے لئے غالباً ملک بھر میں اپنی نوعیت کا پہلا قدم اٹھایا ہے۔ وجے واڑہ کی مسجد سرائے کو سابق ریاست حیدرآباد کی امداد و اعانت حاصل تھی، حالات کی تبدیلی کے بعد دردمندان ملت نے اس مسجد کی اوقافی جائداد کے صحیح استعمال کے لئے صحیح قدم صحیح سمت میں اٹھایا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شہر حیدرآباد میں جہاں اوقافی جائدادیں نسبتاً زیادہ ہیں، کافی مالیت کی ہیں اور جن کے صحیح استعمال سے بہت زیادہ اثباتی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ وجے واڑہ نے اپنے تجربہ کو حیدرآباد میں تقلید کے لئے بطور مثال پیش کیا ہے۔ مرکزی وزیر اوقاف جناب شاہنواز خاں نے کل وجے واڑہ میں مسجد سراتے سے متعلق اوقافی جائداد پر سات منزلہ امداد گھر کی تعمیر کے لئے سنگ بنیاد رکھا ہے۔ دہلی کے بعض اخباروں کے بموجب جناب شاہنواز خاں کی رہنمائی میں دہلی میں وقف بورڈ کی جائدادوں کے سروے اور آمدنی سے استفادہ کے لئے نئی توانائی سے کام ہو رہا ہے۔ اب شاہنواز خاں صاحب نے وجے واڑہ میں وقف بورڈ کے نئے اہم تعمیری کام کے لئے ۲ لاکھ روپے مرکزی وقف کونسل سے قرض دیئے ہیں اور ۵ لاکھ روپیہ کے صرفہ سے تعمیر ہونے والی عمارت کا کام آغاز ہو رہا ہے۔ مرکزی وقف بورڈ نے بلا شبہ ایک اہم کام کے لئے درست فیصلہ اور اچھی مدد کی ہے۔ جس کے لئے وہ مستحق تحسین ہے اور یہ امید ہے کہ وجے واڑہ کی طرح جہاں اور بھی ایسی عملی اسکیمات پیش ہوں، ایسے تجربے کئے جائیں گے۔

اس موقع پر پروفیسر ہمایوں کبیر مرحوم کی ایک تقریر یاد آرہی ہے جو انھوں نے ۲۷ فروری ۱۹۶۵ء کو مرکزی وقف کونسل میں کی تھی اور بتلایا تھا کہ ملک بھر میں ایک لاکھ سے زائد اوقافی جائدادیں ہیں اور ان کی مالیت تقریباً ایک ارب روپیہ ہو سکتی ہے۔ انھوں نے یہ تخمینہ لگایا تھا کہ اگر ان اوقافی جائدادوں کا انتظام ٹھیک طریقہ پر رہے تو سالانہ ۵ کروڑ روپیہ کی آمدنی ہو سکتی ہے۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے جو کچھ تخمینے کئے تھے وہ بالکل درست ہیں لیکن بد قسمتی سے اوقافی جائدادوں کا حال بڑا ابتر ہے۔ آندھرا پردیش کا تجربہ تبلاتا ہے کہ اوقافی جائدادوں پر ناجائز قبضے بھی بکثرت ہیں اور جناب سید رحمت علی صدر نشین مسلم وقف بورڈ آندھرا پردیش کے اس بار بار انتباہ سے بھی اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ اوقافی جائدادوں کے متولی، ان جائدادوں کا بہترین انتظام نہیں کر رہے ہیں یعنی اوقافی جائدادوں کے تعلق سے ہم اپنی ملی و سماجی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر رہے ہیں۔ اگر اس امانت کو ہم بہتر طور پر رکھیں تو یقیناً پروفیسر ہمایوں کبیر کے بموجب ان جائدادوں سے سالانہ ۵ کروڑ روپیہ کی آمدنی ممکن ہے جو مسلمانوں کی دینی و فنی تعلیم اور معاش وغیرہ کے لئے کام آسکتی ہے۔

اب امداد گھر وجے واڑہ نے اوقافی جائدادوں کے بارے میں ایک نیا راستہ دکھلایا ہے، یہ امداد گھر دوران تعمیر ہی میں پیشگی کرایہ وغیرہ سے تکمیل کے لئے ما بقی سرمایہ حاصل کرے گا اور جب مکمل ہو جائے گا سالانہ ۲ لاکھ کی آمدنی حاصل ہو سکے گی۔ اگر دردمندان ملت دوسرے شہروں میں بھی اوقافی جائدادوں کے استعمال اور تعلیمی ترقی کے لئے ایسے کسی پروگرام کے ساتھ آگے بڑھیں تو یقیناً مرکزی وقف کونسل سے ایسی امداد کی توقع کی جا سکتی ہے۔ امداد گھر وجے واڑہ کی تعمیر کے لئے وقف کمیٹی وجے واڑہ کے ارکان اور بالخصوص جناب آصف پاشا اور منیجنگ ٹرسٹی مسٹر احمد علی لائق مبارک باد ہیں کہ انھوں نے وجے واڑہ میں اردو تعلیم ذاکر حسین کالج اور دینی نصاب وغیرہ کے لئے منظم طریقہ پر کام کیا ہے۔ اس کام میں جناب ابراہیم علی انصاری اور جناب رحمت علی صدر نشین وقف بورڈ کی دلچسپی بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ یہ اور خوشی کی بات ہے کہ سابق مرکزی وزیر ڈاکٹر کے ایل راؤ نے جو وجے واڑہ سے پارلیمنٹ کے رکن ہیں اس اسکیم کو آگے بڑھانے اور منظور کرانے میں حصہ لیا ہے یہ خوشی اور دو بالا ہوتی ہے جب کہ سنگ بنیاد کی تقریب میں چیف منسٹر مسٹر وینگل راؤ بھی شریک رہے اور مسلم نوجوانوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے اپنے کو شریک اور وابستہ کیا۔

پروفیسر کبیر نے کونسل کے کسی اجلاس میں کہا تھا کہ ملک کے بدلے ہوئے حالات میں اوقافی جائدادوں سے دینی تعلیم کے علاوہ فنی تعلیم پر بھی توجہ کرنی چاہیے چونکہ مسلمانوں کی معاشی پستی کے ازالہ کے لئے فنی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ وقف کمیٹی وجے واڑہ نے امداد گھر سے استفادہ کے لئے طلباء کو وظائف اور تعلیمی امداد کا بھی پروگرام بنایا ہے لیکن فنی و پیشہ ورانہ تعلیم کے لئے بھی پہل کی جانی چاہیے۔

مرکزی وقف کونسل نے غالباً پہلی مرتبہ ایک جامع اسکیم کے لئے عملی تعاون کیا ہے۔ ایسی تجاویز کیلئے خود عملی سطح پر بھی اتفاق رائے اور عملی کام بنیادی اہمیت رکھتا ہے ایسے وقت جبکہ اوقافی جائدادوں کی حالت زار پر افسوس ہی زیادہ ہوتا ہے، اب وجے واڑہ میں جو تعمیری کام انجام پایا ہے وہ دردمندان ملت کے لئے لمحہ فکر ہے کہ ایسے چھوٹے اور بڑے کام اور اقدام کیلئے ارادہ اگر ہو تو عمل کیلئے راستے ہموار ہو جانے میں اور اسلاف کی امانتیں ہمارے بہتر حال اور معاشی و فنی ترقی کی ضمانت بھی بن سکتی ہیں۔

اوقافی ٹرسٹوں کے پراجیکٹوں کی ممکنہ مالی امداد کا تیقن

وجے واڑہ میں "امداد گھر" کے سنگ بنیاد کی تنصیب کی رسم

وجے واڑہ ۔ ۳ م رجولائی (پی ٹی آئی) چیف منسٹر آندھرا پردیش مسٹر این جے وینگل راؤ نے آج کہا کہ ریاستی حکومت ریاست کے مختلف اوقافی ٹرسٹوں کے زیر اہتمام پراجیکٹوں کو بلا لحاظ مذہب و ملت عوام کی فلاح و بہبود کے لئے ممکنہ مالی امداد موثر طور سے فراہم کرے گی مسجد سرائے وقف وجے واڑہ کے احاطہ میں "امداد گھر" کے سنگ بنیاد کی تنصیب کی رسم انجام دینے کے بعد چیف منسٹر نے اس پراجکٹ کی عمل آوری کے ذمہ دار تمام شخصیتوں بالخصوص سابق مرکزی وزیر ڈاکٹر کے ایل راؤ کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ۔ اس پراجکٹ کے تحت قلب شہر میں ۲ ۱/۲ ۲۴ لاکھ روپئے کی لاگت سے کئی منزلہ تجارتی عمارت تعمیر کی جارہی ہے جس کی تکمیل پر اس سے سالانہ ۲ لاکھ ۴۲ ہزار روپئے کی خام آمدنی ہوگی ۔ مسجد سرائے کی کمیٹی زاید آمدنی کو مذہبی و جامعاتی تعلیم کو فروغ دینے بے سہارا اور معذور افراد کے ہوم قائم کرنے غریب اور مستحق لڑکیوں کی شادی کرنے ۔ ضعیف افراد کو وظائف اور غریب طلباء کو وظیفے دینے کے لئے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتی ہے مرکزی منسٹر آف اسٹیٹ زراعت، آبپاشی و اوقاف مسٹر شاہنواز خاں سنگ بنیاد کی تنصیب کی رسم انجام دینے والے تھے لیکن وہ دیگر مصروفیات کی بناء پر شرکت نہیں کر سکے ان کی تقریر جلسہ میں سنائی گئی جس میں مسٹر شاہنواز خاں نے کہا کہ شہری اوقافی جائیدادوں کو ترقی دینے کی اسکیم حکومت نے کئی مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے شروع کی ہے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اوقافی اراضیات پر عمارتوں کی تعمیر سے ناجائز قبضوں کی روک تھام کی ضمانت ملے گی انھوں نے کہا کہ اوقافی جائیدادوں پر ناجائز قبضے بدقسمتی سے ہمارے ملک میں عام ہوگئے ہیں مسٹر شاہنواز خاں نے کہا کہ حکومت ہند نے ملک کے مختلف علاقوں میں اوقافی جائیدادوں کو ترقی دینے کے مقصد سے مواز نہ میں ایک علحدہ مد بنائی ہے ۔ جاریہ سال کے دوران اس

[illegible]
[illegible]
[illegible]
وجے واڑہ [illegible]
حکومت ہند نے [illegible] کیا ہے ا
اور یہ دوسروں کے لئے مثال بن
ہے پنجاب اور دہلی میں بھی اسی [illegible]
ہیں مسٹر حسن الدین احمد آئی اے ایس آفیسر [illegible]
سنائی ریاستی
کہا کہ یہ پراجکٹ [illegible]
ہے انھوں نے حکومت [illegible]
سے پراجکٹ کی تکمیل کے لئے
نہیں بلکہ وجے واڑہ میں [illegible]
ریاستی اسمبلی اور صدرنشین ریاستی مسلم [illegible]
تعمیرات عامہ نے بھی تقاریر کیں مسٹر احمد [illegible]
آصف پاشاہ ریاستی وزیر اوقاف [illegible] نے چیف منسٹر [illegible] [illegible]
آئی کے بموجب چیف منسٹر نے اپنی تقریر میں کہا کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی برقراری میں آندھرا
سارے ملک کی ریاستوں میں سب سے آگے ہے ۔

کتبہ عبدالغفور خان
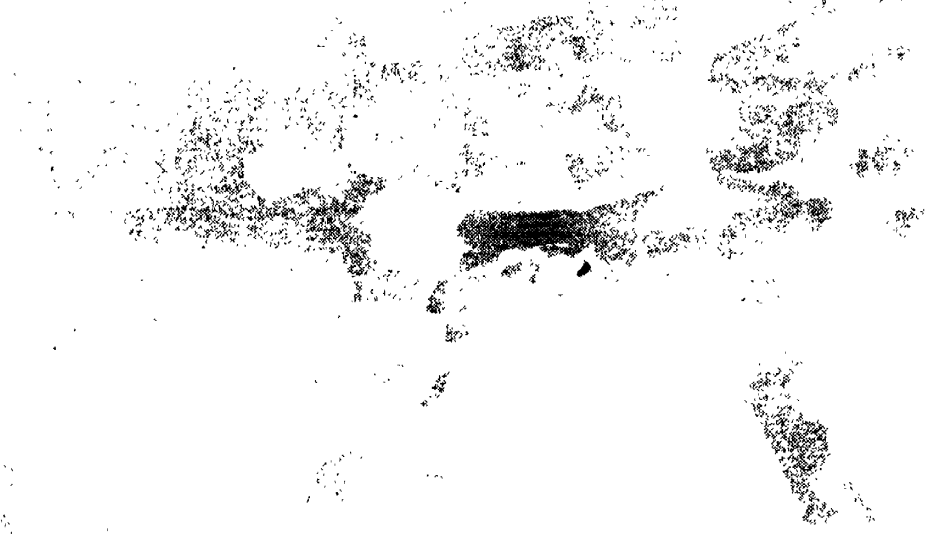
اوقافی ٹرسٹوں کے پراجکٹوں کی ممکنہ مالی امداد کا تیقن

وجے واڑہ میں "امداد گھر" کے سنگ بنیاد کی تنصیب کی رسم، چیف منسٹر مسٹر ڈنگل راؤ کی تقریر

وجے واڑہ۔ ۴ر جولائی (پی ٹی آئی) چیف منسٹر آندھرا پردیش مسٹر جے ونگل راؤ نے آج کہا کہ ریاستی حکومت ریاست کے مختلف اوقافی ٹرسٹوں کے زیر اہتمام پراجکٹوں کو بلا لحاظ مذہب وملت عوام کی فلاح وبہبود کے لیے ممکنہ مالی امداد یقینی طور سے فراہم کرے گی مسجد سرائے وقف وجے واڑہ کے احاطہ میں "امداد گھر" کے سنگ بنیاد کی تنصیب کی رسم انجام دینے کے بعد چیف منسٹر نے اس پراجکٹ کی عمل آوری کے ذمہ دار تمام شخصیتوں بالخصوص سابق مرکزی وزیر ڈاکٹر کے ایل راؤ کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ اس پراجکٹ کے تحت قلب شہر میں ۲۴ لاکھ روپیے کی لاگت سے کئی منزلہ تجارتی عمارت تعمیر کی جارہی ہے جس کی تکمیل پر اس سے سالانہ ۴ لاکھ ۴۲ ہزار روپیے کی خام آمدنی ہوگی۔ مسجد سرائے کی کمیٹی زاید آمدنی کو مذہبی وجامعاتی تعلیم کو فروغ دینے بے سہارا اور معذور افراد کے ہوم قائم کرنے غریب اور مستحق لڑکیوں کی شادی کرنے۔ ضعیف افراد کو وظائف اور غریب طلباء کو وظیفہ دینے کے لیے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتی ہے مرکزی منسٹر آف اسٹیٹ زراعت، آبپاشی واوقاف مسٹر شاہنواز خاں سنگ بنیاد کی تنصیب کی رسم انجام دینے والے تھے لیکن وہ دیگر مصروفیات کی بناء پر شرکت نہیں کرسکے ان کی تقریر جلسہ میں سنائی گئی جس میں مسٹر شاہنواز خاں نے کہا کہ شہری اوقافی جائیدادوں کو ترقی دینے کی اسکیم حکومت نے کئی مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے شروع کی ہے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اوقافی اراضیات پر عمارتوں کی تعمیر سے ناجائز قبضوں کی روک تھام کی ضمانت ملے گی انھوں نے کہا کہ اوقافی جائیدادوں پر ناجائز قبضے بدقسمتی سے ہمارے ملک میں عام ہوگئے ہیں مسٹر شاہنواز خاں نے کہا کہ حکومت ہند نے ملک کے مختلف علاقوں میں اوقافی جائیدادوں کو ترقی دینے کے مقصد سے موازنہ میں ایک علیحدہ مد بنائی ہے۔ جاریہ سال کے دوران اس مقصد کے لیے دس لاکھ روپیہ کی رقم فراہم کی گئی ہے مسٹر شاہنواز خاں نے کہا کہ مرکزی وقف کونسل نے اس پراجکٹ کے لیے گذشتہ سال ایک لاکھ روپیہ کی منظوری دی تھی انھوں نے تین لاکھ روپیے کی مزید منظوری دی ہے اس طرح جملہ ۴ لاکھ روپیے منظور کیے جاچکے ہیں وجے واڑہ کا "امداد گھر" اپنی قسم کا پہلا پراجکٹ ہے جس کے لیے وقف ترقیاتی اسکیم کے تحت حکومت ہند نے مالیہ فراہم کیا ہے اس پراجکٹ پر کامیابی کے ملک گیر اثرات مرتب ہوں گے اور یہ دوسروں کے لیے مثال بن جائے گا۔ ہمارا مقصد وقف ترقیاتی کارپوریشن قائم کر[نا] ہے پنجاب اور دہلی میں بھی اسی قسم کے پراجکٹوں کے لیے تفصیلی منصوبے مرتب کیے جار[ہے] ہیں مسٹر حسن الدین احمد آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی وقف کونسل نے مسٹر شاہنواز خاں کی تق[ریر] سنائی ریاستی وزیر جنگلات واوقاف مسٹر ابراہیم علی انصاری نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ یہ پراجکٹ وقف بورڈ اور حکومت سے متعلقہ مختلف افراد کے مسلسل ٹیم ورک کا نتیجہ ہے انھوں نے حکومت کی جانب سے دی جانے والی امداد کا خیر مقدم کرتے ہوئے تمام ا[فراد] سے پراجکٹ کی تکمیل کے لیے ممکنہ تعاون کی اپیل کی کیوں کہ یہ پراجکٹ کسی ایک فرقہ کے لیے نہیں بلکہ وجے واڑہ میں سکونت پذیر تمام فرقوں کے لیے ہے مسٹر سید رحمت علی ڈپٹی اسپیکر ریاستی اسمبلی اور صدر نشین ریاستی مسلم وقف بورڈ اور مسٹر سی ایچ وینکٹ راؤ ریاستی و[زیر] تعمیرات عامہ نے بھی تقاریر کیں مسٹر احمد علی صدر نشین یتیم خانہ ٹرسٹ نے اظہار تشکر کیا۔ م[سٹر] آصف پاشاہ ریاستی وزیر قانون ومجالس نے چیف منسٹر اور دیگر مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ یو این آئی کے بموجب چیف منسٹر نے اپنی تقریر میں کہا کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی برقراری میں آندھرا پردیش سارے ملک کی ریاستوں میں سب سے آگے ہے۔

کمترین عبدالغفور خان

The AUKAF Quarterly

Sardar Patel Marg, AMBALA Cantt.